خطباتِ آزادی

حصہ اوّل

(قبل آزادی کانگریس کے صدارتی خطبات)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

بہ اشتراک

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

خطباتِ آزادی

حصہ اوّل

(قبل آزادی کانگریس کے صدارتی خطبات)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک -1، آر کے. پورم، نئی دہلی-110066

بہ اشتراک

اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

Khutbat-e-Azadi Part-I

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت

پہلا اتر پردیش اردو اکادمی ایڈیشن : 1982

پہلا قومی اردو کونسل ایڈیشن : 2005، تعداد 1100

قیمت : 200 روپے

شمار سلسلۂ مطبوعات : 1224

ISBN : 81-7587-093-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای-میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی- 110006

فہرست مضامین

ترتیب	خطبات آزادی (حصہ اول)			صفحات
-1	حکیم اجمل خاں	احمد آباد	1921	7
-2	سی۔آر۔داس		1921	13
-3	سی۔آر۔داس	گیا	1922	43
-4	مولانا محمد علی جوہر	کوکاناڈا	1923	101
-5	مولانا ابوالکلام آزاد	دہلی	1923	169
-6	مہاتما گاندھی	بلگام	1924	225
-7	مسز سروجنی نائیڈو	کان پور	1925	253
-8	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	مدراس	1927	267
-9	پنڈت موتی لال نہرو	کلکتہ	1928	307
-10	پنڈت جواہر لال نہرو	لاہور	1929	347
-11	سردار ولبھ بھائی پٹیل	کراچی	1931	373
-12	ڈاکٹر راجندر پرشاد	بمبئی	1934	389
-13	پنڈت جواہر لال نہرو	فیض پور	1936	425
-14	نیتاجی سبھاش چندر بوس	ہری پورہ	1938	453

15- نیتاجی سبھاش چندر بوس	تری پوری	1939	491
16- مولانا ابوالکلام آزاد	رام گڑھ	1940	497
17- آچاریہ جے۔بی۔کرپلانی	میرٹھ	1946	529

مسیح الملک حکیم اجمل خاں

احمد آباد ——————— 1921ء

بہنو اور بھائیو! ہندستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ہم ایسے حالات کے ماتحت یہاں جمع ہوئے ہیں جب ہمارے باقاعدہ طور پر منتخبہ صدر ہم میں موجود نہیں۔ اس اقدام کا سہرا ہندستان میں برطانوی حکومت کے سب سے آخری فیصلہ کے سر ہے۔ یہ بات انتہائی طور پر رنج دہ معلوم ہوتی ہے کہ مسٹر سی۔ آر داس اس اجلاس کی کارروائی کی رہنمائی کے لیے ہم میں موجود نہیں ہیں۔ جب قوم نے اپنے بس میں زیادہ سے زیادہ اعزاز کا شرف آپ کو بخش کر خود اس بات کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ اس کی نگاہوں میں اسے کیا درجہ حاصل ہے تو اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس عظیم المرتبہ محب وطن کی قومی خدمات کو ایک ایک کر کے شمار کیا جائے اور اس اہم حیثیت کا ذکر دہرایا جائے جو ہمارے ملک کی مجلسی اور قومی زندگی میں آپ کو حاصل ہے۔ ہمیں آپ کی عدم موجودگی کا انتہائی افسوس ہے۔ لیکن اس نوع کی غیر حاضری باعث اطمینان بھی ہے۔ جس شخص کو قوم نے اتنے بڑے اعزاز کے قابل سمجھا ہے، اس نے اپنی بے باک اور شان دار قربانی اور ہنسی خوشی مصائب جھیلنے کی روح کے ساتھ اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل ثابت کر دکھایا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ آپ کی اس عظیم الشان قربانی سے ہم اپنے نصب العین کے اور قریب آ گئے ہیں۔ مسٹر سی۔ آر داس کی گرفتاری نے قومی کارکنوں کے دلوں میں ایک بھاری روح اور پختہ

عزم کا جذبہ پھونک دیا ہے۔ یہ اسی جذبہ کا اثر ہے کہ آج تمام ملک قربانیوں کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ آپ نے اسیر فرنگ ہو کر ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ اس اجلاس کی صدارت فرماتے۔

حضرات! مجھے اس نا قابلیت کا احساس ہے کہ میں مسٹر سی۔ آر داس کی جگہ پُر نہیں کرسکتا۔ میں آپ کی اس عنایت کا جو آپ نے مجھے ان کی جگہ صدر منتخب کر کے بخشی ہے، شکر گزار ہوں۔ مجھے بھروسہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اس عزت کے قابل ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔

خواتین وحضرات! میں اس وقت کوئی لمبی تقریر نہیں کروں گا۔ وقت کی تنگی کے علاوہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ لمبی تقریروں کا وقت گزر چکا ہے۔ یہ وقت دوٹوک فیصلہ اور عمل کا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سابقہ اجلاس سے اس وقت تک عدم تعاون کی تحریک کا تجزیہ کرنے کے لیے یہ وقت کافی نہیں ہے۔ میں یہاں مختصر طور پر اس ترقی کا ذکر کروں گا جو ملک کو عدم تعاون اور عدم تشدد کی تحریک کے آغاز سے اب تک حاصل ہو چکی ہے۔

عدم تعاون کی روح تمام ملک پر طاری ہے۔ اس بڑے برّ اعظم کے دور دراز کونوں میں کوئی دل بھی ایسا نہیں جو سوراج حاصل کرنے اور خلافت و پنجاب کی دست درازیوں کی دادرسی کے لیے ہنسی خوشی مصائب جھیلنے کے جذبہ سے لبریز نہ ہو۔ بحر ہند کے اس پار ہماری ہمسایہ اقوام کی طرف سے اس تحریک کو خراج تحسین ادا کیا گیا ہے۔ ہمارے مصری بھائیوں نے بھی اس جنگ کو اپنی جنگ قرار دیا ہے۔ یہ ہم سب ہندستانیوں کے لیے موجب فخر ہے۔ عدم تعاون وعدم تشدد محض ہندستانی تحریک نہیں رہی بلکہ یہ بڑی تیزی سے ایک ایشیائی تحریک بن رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب دنیا والے جھوٹ اور ناانصافیوں کے خلاف اسے عالم گیر ہتھیار کے طور پر اپنا لیں گے۔

تحریک عدم تعاون کی کامیابی سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہمارے کارکن بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کر رہے ہیں۔ اپنے لبوں پر مسکراہٹ کے ساتھ دن بہ دن زیادہ تعداد میں جیلوں کا رخ کر رہے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خوبی کی بات یہ ہے کہ حکومت کے بے پناہ جبر کے باوجود کہیں بھی جواب میں تشدد پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس جبر نے قومی عزم کو اور پختہ کرنے کا کام کیا ہے۔ جمعیۃ العلماء کے فتووں کی ضبطی مقدمات کراچی، قانون، اجلاس باغیانہ، کریمینل اور امنڈمنٹ ایکٹ، ضابطہ فوجداری کی دفعہ 144 ان سب کا صرف ایک نتیجہ نکلا ہے کہ لوگوں میں اپنی قومی جدوجہد کو جاری رکھنے اور اپنے مطالبات پر ڈٹے رہنے کا عزم اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ آج قوم اس بھاری جدوجہد کی اہمیت اور سنجیدگی کا احساس کر رہی ہے، جس میں وہ مصروف ہے اور اس پختہ عزم کا ثبوت دے رہی ہے جو بہادروں کے شایان شان ہے۔

میں یہاں ہزرائل ہائی نس حضور پرنس آف ویلز کے دورۂ ہندستان سے متعلق بھی چند ایک الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ ہمیں ہزرائل ہائی نس سے کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایک دیوالیہ حکومت کو پھر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کا موقع مل جائے۔ جب تک سوراج حاصل نہیں ہو جاتا اور تحریک سوراج وخلافت کے زخم مندمل نہیں ہو جاتے۔ ہمارا دیس آپ کو پرتپاک خوش آمدید کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہزرائل ہائی نس کے استقبال میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ ہمارا فیصلہ تلخی کی روح سے بالکل صاف ہے اور اگر کوئی افسوس ناک واقعات رونما ہوئے تو اس کی تمام ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔

ہمارے بعض ناقدوں کی رائے ہے کہ عدم تعاون کی تحریک ناکام رہی ہے وہ اپنے اس خیال کی حمایت میں حکومت کے تعلیمی اداروں، خطاب یافتہ لوگوں کے مناصب، نئی لیجسلیٹو کونسلوں اور مجلس وکلا کا ذکر کرتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے متعلق

کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا وہ بیان ایک مدلل جواب ہے۔جس میں آپ نے ''عدم تعاون کی تحریک کا سرکاری اداروں پر اثر'' کے موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔وہ لوگ جو لیجسلیٹو کونسلوں یا خطابات چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں،آخر ان کی تعداد کیا ہے؟ ان کا وقار آج ہے کہاں؟ وہ زار شاہی غلاظت سے بھی نیچے گر چکے ہیں۔حکومت انہیں بن بنا کر منڈی میں کھڑا کر سکتی ہے۔لیکن پبلک ان سے بالکل بے پرواہے اور یہ پبلک ہی ہے جو انھیں اس عزت اور اعتماد سے فیض یاب کر سکتی ہے جس کے وہ دعویٰ دار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وکلا نے ہماری اپیل کا اس حد تک جواب نہیں دیا جس کی کہ ان سے توقع تھی۔بایں ہمہ جب ہم نے پنچایتی نظام کو مضبوط کر لیا جس کی جانب ہم نے ابھی تک پوری توجہ نہیں دی۔تو وکلا ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔سرکاری ملازموں کی کیفیت قدرے مختلف ہے۔ اگر آپ پچھلے مہینے کے استعفوں کا سابقہ مہینوں کے استعفوں سے مقابلہ کریں گے تو اس میں مایوسی کے احساس کی کوئی بات نظر نہیں آئے گی۔

بلاشبہ ہمارے چند اعتدال پسند بھائی ایسے ہیں جو اپنے دلوں میں اگرچہ ملک کی سچی ہمدردی رکھتے ہیں۔لیکن ہماری جدوجہد کی صحیح نوعیت کے احساس اور ان مسائل کو ٹھیک طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں،قومی میدان میں اپنے فرائض ادا نہیں کر سکے۔تاہم مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اگر حب الوطنی کی آگ اب بھی ان کے دلوں میں روشن ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی نہ بجھے گی تو وہ بہت جلد اپنی غلطی کا احساس کر لیں گے اور وہ اپنے ان بھائیوں کی جگہ پُر کرتے نظر آئیں گے، جن کے نام قومی اعزاز کے رجسٹر میں درج ہیں۔

میں اپنے اس خطبہ کو ان واقعات کا ذکر کیے بغیر ختم نہیں کر سکتا جو مالابار میں ہر روز رونما ہو رہے ہیں اور جن کی بدولت ہمارے موپلے بھائی مصائب کا شکار بنے ہوئے ہیں۔اس مسئلہ کا ایک پہلو بالکل واضح ہے کہ ان جھگڑوں کو کھڑا کرنے کی

تمام ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ملک میں کوئی ذی ہوش انسان ایسا نہ ہوگا جو اس کی مذمت نہ کرتا ہو۔

ہمیں ان ہندو بھائیوں سے پوری پوری ہمدردی ہے جنہیں جبراً مسلمان بنا لیا گیا ہے۔ یا جو موپلوں کے ہاتھوں دکھ اٹھا چکے ہیں۔ کوئی سچا مسلمان ایسا نہ ہوگا جو اس غیر اسلامی فعل کی زبردست سے زبردست الفاظ میں مذمت نہ کرے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اکے ڈُکے واقعات بے راہ رو افراد کے اقدامات ہیں۔ پھر بھی میں اسلام کے سچے نام کو کسی طرح بھی داغ دار کرنے کو تیار نہیں اور نہایت شدّت سے ان افسوس ناک واقعات کی مذمت کرتا ہوں۔

بہنو اور بھائیو! ہمارا ملک خطرناک انقلابات کے دور سے گزر رہا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی پیغمبر ہی آئے اور یہ پیش گوئی کرے کہ ہمارے قدیم ملک کی شان دار روایات زندہ ہوں گی اور اسے اقوام عالم میں موجب فخر مقام حاصل ہوگا۔
(پرزور تالیاں)

سی۔آر۔داس

1921ء

فخر ہندستان جناب دیش بندھو داس صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس نے گرفتاری کے بعد اپنے خطبۂ صدارت کا مسودہ مہاتما گاندھی کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں:

مجھے دیش بندھو داس کے خطبۂ صدارت کی اشاعت کی تاخیر کے لیے جمہور سے معافی کا خواستگار ہونا چاہیے۔ جب یہ خطبۂ صدارت مجھے ملا تو اس کے حصے بخرے علیٰحدہ علیٰحدہ تھے۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ میں اسے مکمل کر کے جمہور کی خدمت میں پیش کروں۔ ناظرین کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ میں نے ایک فقرہ جس پر جناب داس نے قلم پھیر دیا تھا، خطبۂ صدارت میں شامل کر لیا ہے اور اپنی طرف سے محض ایک جملہ ایزاد کیا ہے تا کہ فقرہ مکمل ہو جائے۔ کہیں کہیں الفاظ میں معمولی سا تغیر کیا ہے ورنہ خطبۂ صدارت تمام و کمال ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ جناب داس نے مسودہ خطبۂ صدارت میں بعض فقرات کاٹ دیے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب داس کا ارادہ تھا کہ سال بھر کے کام پر تبصرہ کریں اور ترک موالات پر بالبسط اظہارِ خیالات

کریں۔لیکن مطبوعہ متن سے آپ کے خیالات کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے۔آپ نے اپنی گرفتاری سے پہلے ملک کے نام جو پرزوراور معرکتہ الآراء پیغام ارسال کیا تھااس سے ہی آپ کے خیالات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔اس خطبۂ صدارت کے مطالعہ سے پہلے ناظرین کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خطبۂ صدارت آپ کی گرفتاری سے پہلے مرتب کیا گیا تھا۔ناظرین کرام دیکھیں گے کہ اس خطبہ کی ترتیب میں کس حزم واحتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ جناب دیش بندھو عدم تشدد کو اپنا حتمی مسلک مانتے ہیں۔ ایسے شخص کو اسیر زنداں کرنے سے حکومت ایک فائدہ اٹھاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت اپنے ہاتھوں غایت درجہ کی بدنامی، ذلت اور رسوائی مول لیتی ہے۔

خطبۂ صدارت:

جناب صدر مجلس استقبالیہ اور انڈین نیشنل کانگریس کے حضرات مندوبین! ہم دفتری حکومت سے لڑتے جھگڑتے نازک مرحلہ پر آپہنچے ہیں۔اب ہمیں چاہئے کہ ہم میں سے ہر ایک متنفس اپنے اپنے دل کو ٹٹولے اور یہ سوال کرے کہ "کیا میں موجودہ قضیہ میں ہندستان کی حمایت پر کمر بستہ ہوں۔"میں نے آپ کی متفقہ آواز پر اسی لیے لبیک کہا ہے کہ میں ہندستان کی خدمت کے لیے مستعد ہوں۔میں آپ کے اس اعتماد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس سے آپ نے مجھے مشرف فرمایا ہے۔لیکن میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میں دنیاوی عقل وخرد کی دولت نہیں رکھتا جو آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔میں ایک ایسے شہر سے آرہا ہوں جہاں سیاسی زندگی کو کچلنے کے لیے حکومت

کے حکام کے غم وغصہ غیظ وغضب کی انتہائی طاقت کا اثر محسوس کیا جا رہا ہے اور یہ سب محض اس لیے کہ لوگوں کو مجبور کر کے شاہزادہ ولی عہد کا خیر مقدم کرایا جائے لیکن کلکتہ میں شاہزادہ ولی عہد کا خیر مقدم کون کرے گا؟ 24 دسمبر کو کلکتہ کی مقید روح شاہزادہ ولی عہد کا استقبال کرے گی۔ میں اس قضیہ کی وجہ سے جو حال ہی میں کلکتہ میں شروع ہوا ہے، پاک اور صاف دل ہو کر آیا ہوں۔ اگر چہ میرے پاس دنیاوی عقل وخرد کی نعمت نہیں ہے جو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں۔ تاہم کم از کم اس قضیہ کی تکمیل کے لیے تصمیم عزم اور لامحدود جوش وسرگرمی کی بے بہا نعمت آپ کے لیے ضرور لایا ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں چاہئے کہ ہم ابتداء ہی میں یہ فیصلہ کرلیں کہ موجودہ قضیہ میں ہمارا رویہ کیا ہوگا؟ ہمارا مقصود کیا ہے؟ ہم کس طرف قدم اٹھانے جا رہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ بہت سے اصحاب مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہم حصول آزادی کے لیے غیروں کی اطاعت وغلامی اور غیروں کی مداخلت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مصروف عمل ہیں۔ بایں ہمہ یہ ضروری ہے کہ ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ لفظ ''آزادی'' سے کیا مراد ہے۔

اوّلاً آزادی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ تمام ضبط ونظام کالعدم ہو جائے۔ مجھے یہ اجازت نہیں ہے کہ میں اپنے ہمسایہ کا بٹوہ چراؤں یا اپنے ہمسایہ کی زمین پر مداخلت بے جا کا مرتکب ہوں۔ یعنی میرے فعل پر ایک قسم کا دباؤ اور ضبط موجود ہے۔ لیکن آزادی اور ایسے ضبط میں جو جمہور کی منظوری اور رائے عام پر منحصر ہو اختلاف نہیں ہوتا۔

ثانیاً آزادی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ انحصار وانقیاد کا خیال تک دل میں موجود نہ ہو جب تک ہم تمدن اور معاشرت کے قائل ہیں، برادری میں رہتے ہیں، انحصار وانقیاد کی موجودگی ضروری ہے۔ ہمیں برادری کی محافظت کی ضرورت ہے۔ آزادی اور اس

قسم کے انقیاد وانحصار میں جو جمہور بہ رضاو رغبت خود برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں کوئی ضروری اختلاف موجودنہیں ہے۔ اگرچہ آزادی وضبط ونظام، آزادی اورانقیادوانحصار میں کوئی ضروری اختلاف نہیں ہے۔ تاہم یہ ضروریادرکھنا چاہیے کہ اس ضبط ونظام اور آزادی میں کوئی اختلاف نہیں ہے جسے جمہور بہ رضاورغبت خود منظور کرتے ہیں اور وہی انحصار وانقیاد آزادی کے مطابق اور حریت کے تابع ہوسکتا ہے جو عوام اپنے تحفظ کے لیے بہ رضاورغبت خود برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

سوال ہوتا ہے کہ پھرآزادی کیا ہے؟ اس اصطلاح کی تعریف ناممکن ہے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں کوئی قوم اپنی شخصیت وہستی کا اندازہ لگاسکے اوراپنی قسمت کے نشوو ارتقاء کی عنان اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ بنی نوع انسان کی تاریخ کے صفحات پرسنسنی پیدا کرنے والی کہانیاں موجود ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں نے اپنی قومیت اور شخصیت وہستی کو مسلم ومستحکم رکھنے کی آزادی حاصل کرنے کے لیے کس کس طرح رنج وتعب برداشت کیا ہے۔

موجودہ تمثیلات پرغور کیجیے۔ فن لینڈ، پولینڈ، آئرلینڈ، مصراور ہندستان کی تاریخ حاضرہ پرنظرڈالیے۔ ان تمام اقوام نے ایک غیر ملکی تہذیب وتربیت کے رواج کی مخالفت ومزاحمت کا عزم مصمم کرلیا ہے۔ ان قوموں کی تاریخ متوازی خطوط پرچل رہی ہے۔ ان ممالک میں اوّل تو فتوحات تہذیب کے خلاف احتجاج ہے دوئم یہ ہے کہ قومی تعلیم عام ہوجائے۔ سوم یہ مطالبہ ہے کہ علیحدہ نظام کوتسلیم کرلیا جائے۔ اورممالک کی قسمت کی باگ اس کے باشندوں کے ہاتھ میں دی جائے اور ممالک غیر کو مداخلت کرنے کی اجازت نہ ہو۔

الغرض ہم آزادی کے خواہاں ہیں۔ اسی کے لیے کمر بستہ ہیں۔ کیوں کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمیں اپنی ہستیوں کے نشوو ارتقاء کا حق حاصل ہے اور ہمیں یہ حق بھی

حاصل ہے کہ ہم مغربی تہذیب وتربیت کی سبق آموزی اور مغربی خیالات کے اثر سے بے نیاز ہوکر اپنے طریقے پر اپنے ملک کی قسمت درست کرلیں۔ لیکن اس جگہ میرے کان میں ہندستان کے شاعر جناب رابندر ناتھ کی آواز آتی ہے اور مجھے روک دیتی ہے۔ یہ آواز کہتی ہے کہ '' مغربی تہذیب ہمارے دروازے پر کھڑی ہے کیا ہم اتنے غیر مہذب ہوجائیں گے کہ مہمان نوازی کے مراسم کو بالائے طاق رکھ کر اسے دھتکار دیں گے۔ کیا ہمیں یہ تسلیم نہیں کرنا چاہئے کہ مشرق ومغرب کی تہذیبوں کے اتحاد میں دنیا کی نجات کا راز مضمر ہے؟'' میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ہندستان کی قومیت کو آرزوئے بقا ہے تو وہ تمام اقوام سے علیٰحدہ رہ کر اپنی آرزو کی تکمیل نہیں کرسکتی۔ لیکن رابندر ناتھ کی تنقید پر مجھے دو باتیں کہنی ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ مہمان کو گھر بلانے یا اس کی خاطر ومدارات کرنے سے پہلے ہمارا اپنا گھر ہونا ضروری ہے۔ دوسرے ہندستانی تہذیب کو یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہے کیا؟ پھر کہیں وہ مغربی تہذیب کو دعوت اجتماع دینے کے قابل ہوسکتی ہے۔ میری رائے میں جب تک آزادی نہ حاصل ہو اجتماع ناممکن ہے۔ اگرچہ حسب سابق غلامانہ تقلید ہوتی ہے۔ ہندستان کی تہذیب وتربیت مفتوح ہوچکی ہے۔ یہ غیر ملک کے اقتدار اور سیاسی فتح وظفر کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ ہندستان کا فرض ہے کہ وہ اس کی مزاحمت ومخالفت کرے۔ پہلے تو ہندستان کی ہر رگ ہستی میں قومی زندگی کا جوش موجود ہونا چاہئے۔ پھر ہم مشرق ومغرب کی تہذیبوں کے اجتماع واتحاد کا ذکر کرسکتے ہیں۔

اس وقت میں اپنے اعتدال پسند احباب کے ایک اور اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میں انھیں یہ کہتے سنتا ہوں کہ '' آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آزادی بذات خود ایک مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ایک مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مقصود تو اپنی ہستی کو پالینا ہے۔ غیروں پر انحصار واعتماد سے نجات حاصل کرنا ہے اور ضبط نفس واقتدار کا

حاصل کرنا ہے۔تو پھر کیا وجہ ہے کہ مملکت برطانیہ کا جز ورہ کرتم اپنی قسمت کے سدھار میں مشغول کیوں نہیں ہوتے۔'' اس اعتراض کے جواب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک ہندستان مملکت برطانیہ میں غلامانہ حیثیت رکھتا ہے، جب تک اسے اختیار کلی حاصل نہیں ہم اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔ دیہات میں تشریف لے جایئے جو ہندستان کا قلب ہندستان کا دل ہیں اور ملاحظہ فرمایئے کہ اوسط درجہ کا ہندستانی کیسی زندگی بسر کررہا ہے۔ دیہات میں بسنے والے توانا ہیں، تندرست ہیں، ہاتھ پاؤں اچھے ہیں۔ان کے دلوں میں خوف وخطر کو دخل نہیں۔وہ اس قسم کے آدمی ہیں کہ ان پر ہر ایک ملک نازوافتخار کرسکتا ہے۔لیکن وہ تنزل جو غلامی کا ناگزیر اور ضروری نتیجہ ہےان کے چہروں سے ہویدا ہے۔ان کی جبین سے اس کے آثار نمایاں ہیں۔ان کی قسمت میں ذات پات کے جھگڑے، معمولی معمولی باتوں پر فسادات اور محض مقدمہ بازی کے لیے ہمیشہ مقدمات میں مصروف رہنا لکھا ہے۔وہ باتیں کہاں ہیں وہ امور کدھر گئے جنھوں نے انھیں دوسروں پر انحصار رکھنے کے بجائے اپنے پر نازاں ہونے اور توکل کا سبق سکھانا تھا؟ وہ زندگی کہاں ہے جو انھیں اپنی روزی کمانے کے قابل بنانے کے باوجود اپنے آبا و اجداد کے خدا کی عبادت کی آزادی عطا کرتی تھی؟ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ جب کوئی قوم غلام بن جاتی ہے اطاعت وانقیاد کے دام میں آجاتی ہے۔ تو تنزل ناگزیر اور ضروری ہے اور یہ تنزل قوم کی ہستی پر حملہ کرتا ہے اور اس جوش کو سلب کرلیتا ہے جس پر قوم کی زندگی کا انحصار ہے۔اس کا اثر دیکھنے کے لیے کسی قوم کی زندگی کے اِس حصہ یا اس حصہ کا ملاحظہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر ایک حصہ کو بہ نظر غائر دیکھنا چاہئے۔

اقتصادی نقطۂ خیال سے برطانوی راج نے ہماری قومی بہبودی پر، ہماری ملّی زندگی پر تباہ کن اثر ڈالا ہے۔ پہلے تو جناب رومیش چندردت نے اور آپ کے بعد

جناب پنڈت مدن موہن مالوی نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچائی ہے کہ ہماری قومی صنعت کاتنے اور بننے کی حرفت کو دیدہ ودانستہ تباہ کرنے کے لیے کیا تجاویز سوچی گئی ہیں۔ وہ کونسا متنفس ہوگا جو اس امر کو تسکین قلب کے ساتھ سن سکتا ہے کہ اس ملک کے کئی کروڑ روپے ہر سال ملک سے باہر جاتے ہیں اور ہندستان کو ذرہ بھر فائدہ نصیب نہیں ہوتا؟ اخلاق کو دیکھو اس کے رو سے تو ہم غلاموں کی ایک قوم بنے جارہے ہیں۔ ہم میں غلاموں کی سی برائیاں آگئی ہیں۔ ہم اپنے مالک کی زبان بولتے ہیں اور ان کی عادات واطوار کی نقل کرتے ہیں۔ ہم ان کی باتوں کی تقلید کرنے کے لیے ہنستے کھیلتے جاتے ہیں اور اپنی باتوں کو دیہات میں تباہ ہوجانے کے لیے چھوڑ رہے ہیں۔ تعلیم وتربیت کی طرف نظر ڈالیے۔ ہم دیدہ ودانستہ غیر ملک کی تہذیب وتربیت کا شکار ہورہے ہیں۔ جب ہم دیدہ ودانستہ اپنے اسلاف کے اطوار کو ترک کرتے ہیں کہ ان کے رواج میں برکت وعزت نہیں۔ بلکہ اپنی سبکی خیال کرتے ہیں۔ تو ہماری ذلت وتنزل کی تکمیل ہوجاتی ہے۔

اب میرے اعتدال پسند احباب فرمائیں کہ جب تک عوام کے خیالات کی پستی کو اوج ورفعت تک نہیں پہنچا جائے گا، آپ کس طرح آزادی حاصل کرنے کی امید کرسکتے ہیں۔ اگر میری تشخیص درست ہے تو ہندستان کی موجودہ مالی، اخلاقی، تعلیمی حالت ہندستان میں غیر ملک کی حکومت کا بلاواسطہ نتیجہ ہے۔ اس سے یہ بدیہی نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ جب تک ہمارے گلے میں طوق غلامی موجود ہے، ہماری اصلاح اور درستی کی کوئی امید نہیں۔ آپ اِدھر اُدھر کے مسائل کے پھیر میں نہ پڑے رہیں جیسا کہ ہم کررہے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں ایسا جوش بھردیں جو آپ کی سیاسی جدوجہد میں آپ کے لیے بہت بڑی امداد ثابت ہو۔ لیکن میری بات پر یقین کیجئے۔ آپ کو اس عارضہ اور اس بیماری اس کے استیصال کے لیے

جدوجہد کرنی چاہئے۔ اس کے ظاہری آثار وعلامات کے لیے مصروف علاج نہیں ہونا چاہئے۔

اس لیے میں برطانی اقتدار کے دوام پر اعتراض کرتا ہوں۔ کیوں کہ جب تک اس اقتدار واثر کا شائبہ تک موجود رہے گا میری رائے میں ہماری قومیت، ہماری انفرادی زندگی، ہماری شخصیت کی تکمیل ناممکن ہے۔ میں نے اس نتیجہ تک پہنچنے میں ہندستان میں برطانی راج کی سیرت وطریق عمل پر مطلقاً نظر نہیں ڈالی۔ یہ راج اچھا ہو یا برا ہو اس سے مطلب نہیں۔ یہ کچھ اچھا ہے کچھ برا بھی ہے۔ لیکن میرے پیش کردہ نتیجہ خیال کی بنیاد تو اس کلیہ پر مبنی ہے کہ غلامی میں ایک ایسی چیز مخفی ومضمر ہوتی ہے جو اس کی تکمیل اور نشوو ارتقا میں آڑے آتی ہے خواہ مملکت کا جز و رہ کر حاصل ہو خواہ مملکت سے قطع تعلق کر کے حاصل ہو۔ ہندستان کو آزادی ضرور حاصل ہونی چاہئے۔ تا کہ ہندستان بھی اپنی شخصیت اور انفرادی زندگی کا اندازہ لگا سکے اور آپ کی آئندہ قسمت کو برطانی قوم کی مدد یا مخالفت کے بغیر درست کر سکے۔

اب میں اس سوال پر آتا ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے طریقے ہیں جو ہمیں دفتری حکومت سے آمادہ نبرد ہونے میں استعمال کرنے ضروری ہیں۔ میں تو صرف تین طریقے ہی جانتا ہوں۔ پہلا طریقہ تو اسلحہ کے ذریعہ سے مدافعت کرنا ہے۔ دوسرا طریقہ دفتری حکومت سے موالات کرنا اور ان کونسلوں میں جانا ہے جو بروئے قانون حکومت ہند قائم کی جا چکی ہیں۔ تیسرا طریقہ پرامن ترک موالات ہے۔ پہلے طریق کار کو تو میں بالکل برطرف کر دیتا ہوں۔ کیوں کہ یہ طریق کار عملی سیاست کے دائرہ سے بالکل باہر ہے۔ اگر ہم اس طریق کار پر کاربند بھی ہو سکتے تو بھی میں اصولاً تشدد کے خلاف ہوں۔ اب ہمارے لیے صرف یہ ہی راستہ رہ گیا کہ ہم موالات اور ترک موالات کے دو طریقوں میں سے ایک منتخب کرلیں۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ موالات کے مسئلہ پر غور کرنے پر مجھے اس حقیقت نفس الامری سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہمارے وہ رہنما جنھوں نے ہندستان کی سیاسی زندگی کے نشو و ارتقا میں حصہ لیا ہے اس مسئلہ پر ہمارے مخالف ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ چند دلائل پر نظر ڈالوں جو قانون حکومت ہند کے بعض حامی ہمارے خلاف پیش کیا کرتے ہیں۔ ان دلائل پر نقد و نظر میں اوّل تو اس بات پر بحث کروں گا کہ اس قانون میں ہندستانی قوم کی آزادی یعنی اپنی انفرادی زندگی کے نشو و ارتقا اور اپنی قسمت کو سدھارنے کا حق تسلیم بھی کیا گیا ہے یا نہیں۔ دوم یہ قانون واضح طور پر یا ضروری تصریحات و تفریحات کے رو سے ہندستان کے باشندوں کو ذمہ دار حکومت کے ابتدائی امور بھی عطا کرتا ہے؟ اور آخر میں یہ بتاؤں گا کہ کونسلوں کو خزانہ ہندستان پر کوئی یوں ہی سا اقتدار بھی حاصل ہے؟

اس قانون کا دیباچہ اس مسئلہ کی کلید ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے " ہرگاہ کہ یہ پارلیمنٹ کی اعلان شدہ حکمت عملی ہے۔" لیکن پارلیمنٹ کی اعلان کردہ حکمت عملی کیا ہے۔ کیا اعلان کردہ حکمت عملی یہ ہے کہ ہندستانیوں کے اس فطری حق کو تسلیم کرلیا جائے گا جو ذمہ دار حکومت کے لیے اسے حاصل ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کیا پارلیمنٹ کی اعلان کردہ حکمت عملی یہ ہے کہ ہندستان کا یہ فطری حق تسلیم کرلیا جائے کہ اس جمہوری اقوام میں جسے مملکت برطانیہ کہتے ہیں۔ ہندستان کو آزاد اور برابر کا حصہ دار تسلیم کیا جائے گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ اعلان کردہ حکمت عملی نہیں ہے۔ لیکن ہندستان کے حقوق کی ان مراعات کو ملاحظہ فرمایئے جو ارباب کے خاطر عاطر میں موجود ہیں اور جن کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی نظام حکومت کے ہر ایک شعبہ میں ہندستانیوں کے روز افزوں تعلقات کے لیے کوشش کی جائے گی اور حکومت کے خود اختیاری شعبہ جات کو بتدریج ترقی دی جائے گی تاکہ برطانی ہند کو مملکت برطانیہ...... نمایاں رہ کر ذمہ دار

حکومت حاصل ہو جائے۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ قانون حکومت ہند کے دیباچہ میں کوئی ایسی بات موجود بھی ہے جو برطانوی پارلیمنٹ کو مجبور کردے اور کسی زمانے میں بھی ہندستان کو مملکت برطانیہ کا آزاد اور برابر کا حصہ دار بنادے۔ میرے خیال میں تو کوئی بھی ایسی بات موجود نہیں ہے۔ ''برطانوی ہند میں ذمہ دار حکومت کا بتدریج حصول یہ مبہم الفاظ ہیں۔ کسی زمانہ میں بھی کسی مدبر برطانیہ کی فراست پر ان الفاظ کا اثر نہیں پڑے گا۔

اب دوسرے فقرے کو حذف کردیجئے اور تیسرے فقرے کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس تیسرے فقرے میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں۔ ہر بار پالیمنٹ ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ اب آگے قدم بڑھانے کا موقع آگیا ہے یا نہیں اور پیش قدمی کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کیوں کہ پارلیمنٹ ہی تو ہندستان کی مختلف اقوام کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ دار ہے۔'' ذرا لفظ'' اقوام'' کو ملاحظہ فرمائیے۔ قوم نہیں کہا گیا۔ پارلیمنٹ یہ فرماتی ہے کہ ہندستان ایک نہیں ہے بلکہ بہت سے ہندستان موجود ہیں۔ میں تو یہ ذلت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، جو دیباچہ کے تیسرے حصہ میں ہندستان کے لیے مختص کی گئی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان الفاظ کے خلاف احتجاج کرنا میرا فرض ہے۔ ہم اس امر کے لیے بالکل آمادہ وتیار ہیں کہ ہندستانی قوم (اقوام نہیں) کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ داری اپنے سر لیں اور میں اس بات سے بالکل انکار کرتا ہوں کہ کوئی غیر ملکی پارلیمنٹ ان ذمہ داریوں کی تکمیل کر سکے گی جو کسی محکوم قوم کے لیے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ میں اس اصول پر اظہار ناراضی کرتا ہوں کہ ہر موقع پر ذمہ دار حکومت کے میدان میں آگے قدم بڑھانے کے موقع اور طریقے کا فیصلہ کرنا پارلیمنٹ پر منحصر ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس قانون سازی کا مقصد حقیقی جو دیباچہ کے تیسرے فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ ہندستان پر برطانوی پارلیمنٹ کے اقتدار

کو دوام حاصل ہو۔ میں اس بات کو ایک لمحہ کے لیے منظور نہیں کر سکتا۔ چوتھے فقرہ میں ایک کھلی دھمکی موجود ہے۔ اس فقرہ میں لکھا ہے کہ ''ہر گاہ ایسے امور پر پارلیمنٹ کے فعل کی رہنمائی ان لوگوں کی موالات وتعاون پر منحصر ہے جنہیں خدمات کے لیے مواقع ملیں گے اور یہ دیکھا جائے گا کہ ان کی ذمہ داری کے احساس پر کس قدر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔'' بہ دیگر الفاظ اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہم نیک کردار لڑکے ہیں اور ہم برطانوی پارلیمنٹ کو اس امر کا اطمینان دلا دیں کہ ہم میں ذمہ داری کا احساس موجود ہے۔ اس وقت برطانوی پارلیمنٹ غور کرے گی کہ ہمیں اصلاحات کی مزید قسط دی جائے یا نہ دی جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس سے یہ مراد ہے کہ ہم ہمیشہ شیر خوار رہیں گے اور ہماری تولیت کا بار برطانوی پارلیمنٹ کے کاندھوں پر رہے گا۔

خواتین اور حضرات ! میں اپنے سیاسی مخالفین کی رائے کا ادب واحترام کرتا ہوں۔ لیکن میں اس بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کر سکتا جس پر قانون اصلاحات کی تعمیر ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں خودداری کو قائم رکھنا چاہئے۔ اپنی عزت ووقعت کی محافظت کرنی چاہئے۔ ہم ترقی کرتے کرتے کسی مقام تک کیوں نہ پہنچ جائیں۔ ہمیں کانگریس کے اجلاس عام میں بہ اقرار صالح اعلان کر دینا چاہئے کہ ہندستان کو اپنی انفرادی زندگی کے نشو وارتقا اور اپنی آئندہ قسمت کے سدھار کا حق حاصل ہے۔ برطانی پارلیمنٹ کے سابقہ فیصلے یا آئندہ فیصلے مزاحم نہیں ہو سکتے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ جو طاقت کسی طرح ہندستانی قومیت کی تکمیل میں آڑے آتی ہے وہ ہندستان کی دشمن ہے اور اس کی مدافعت اور اس کا مقابلہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ میں انگلستان سے تعاون وموالات کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کے لیے صرف ایک یہی شرط ہے کہ وہ ہندستان کے فطری حق کو تسلیم کر لے۔ قانون حکومت ہند کو اٹھایئے، اس کی ورق گردانی کیجئے، آپ کو کسی جگہ بھی نظر نہیں آئے گا کہ ہمارے

حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور میں تو خواہ کچھ ہو جائے ہندستان پر برطانی اقتدار کے دوام کو تقویت دینے والوں کی حمایت نہیں کرسکتا۔ لیکن میرے اعتدال پسند احباب کہتے ہیں کہ اگرچہ ہندستانی قوم کی آزادی اس معنی میں تو تسلیم نہیں کی گئی جو میں سمجھتا ہوں۔ تاہم اگر ہم اصلاحات کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں، تو پارلیمنٹ کے اختیار میں ہی نہیں رہے گا کہ وہ ہماری آزادی کو روک سکے۔ میں اپنے احباب کی دانش مندی پر شک نہیں کرتا۔ نہ ہی یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ محبِ وطن نہیں ہیں۔ لیکن میری رائے میں یہ سوال ہی بالکل خلاف موقع ہے۔ میری حالت تو یہ ہے کہ میں تفصیلات کے مسئلہ میں حکومت انگلشیہ سے مصالحت کرنے اور بڑی بڑی قربانیاں کر دکھانے کو کیوں نہ تیار ہوں۔ میں اس مسئلہ پر جسے میں بنیادی مسئلہ اور اصول اولیٰ خیال کرتا ہوں، کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرسکتا۔ آزادی تو میرا فطری حق ہے اور میں اس حق کے تسلیم کیے جانے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میں بالاقساط یا حصے بخرے کرکے اس حق کو تسلیم کرانا نہیں چاہتا۔ بلکہ میں تو اس بات کا مطالبہ کرتا ہوں کہ اس حق کو بالکلیہ اور تمام وکمال منظور کرلیا جائے۔ مجھے اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ فتح ہماری ہوگی۔ لیکن فرض کیجئے کہ ہم ناکام بھی رہیں تو بھی کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہمارے قومی وقار اور ہماری قومی منزلت کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے گا۔ ہم جس طرح ہوگا اس ذلت کو سر سے اتار دیں گے جس پر قانون حکومت ہند کی بنیاد ہے۔ مجھے تو انڈین نیشنل کانگریس اور ان وزراء کے درمیان جو قانونی اصلاحات کی تکمیل میں مصروف ہیں، صرف بنیادی اور اصولی اختلاف نظر آتا ہے۔ کیوں کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنا مطمح نظر یہ بنا رکھا ہے کہ وہ اس چیز کو جو ہندستانی قوم کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتی غلط اور کذب قرار دے کر مسترد کر دے۔ لیکن وزراء حکومت نے ان محکموں پر نگاہیں لگا رکھی ہیں جس کے وہ ذمہ دار ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان محکموں کی کامیابی پر

حصول آزادی کا انحصار ہے۔

اب میں اس مسئلہ پر بحث کروں گا کہ اس قانون سے ہندستان میں ذمہ دار حکومت کا آغاز بھی ہوجاتا ہے یا نہیں۔ کیا کونسلوں کو خزانہ پر تھوڑا بہت اقتدار بھی حاصل ہے؟ ان دونوں مسائل پر ایک دم غور کیا جاسکتا ہے۔ بنگال کے اعتدال پسند حضرات کا خیال ہے کہ حکومت بنگال کے سات ارکان میں سے پانچ ارکان ہندستانی ہیں۔ لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے۔ میرے خیال میں میرا یہ قول صداقت پر مبنی ہے کہ صوبوں میں محفوظ کردہ محکموں کے رو سے گورنر بہ اجلاس کونسل حکمرانی کرتے ہیں اور منتقل شدہ محکموں کے لیے گورنر اور وزراءمل کر حکومت کرتے ہیں۔

اس قانون میں کوئی ایسی شرط یا کوئی ایسا قاعدہ موجود نہیں جس کے رو سے گورنر صاحب، ان کی کونسل اور ان کے وزراء ایک جگہ بیٹھ کر مشترکہ طور پر کوئی فیصلہ کرسکیں۔ البتہ ٹیکس عائد کرنے، قرض لینے اور جمہور کے روپے کو صرف کرنے کی تجاویز گھڑنے کے لیے سب ایک جگہ بیٹھ کر کام کرسکتے ہیں۔ محفوظ شدہ محکمہ جات تو اہم محکمے اور موضوعات ہیں، جو سیاسی آزادی کی جدوجہد میں ہندستانی قومیت کے لیے ازبس ضروری ہیں اور یہی وہ محکمے ہیں جن میں وزراء کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میں یہ کہنے میں سراسر حق بجانب ہوں کہ یہ وزراء اس جنگ کو جو ہمارے اور حکومت کے درمیان جاری ہے بیٹھے دیکھا کرتے ہیں اور ایک لفظ منہ سے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ وہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے کہ تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں ملک میں پراشتداد حکمت عملی پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حکومت کا جزو نہیں ہیں۔ جب مقامی حکومت اس موضوع پر غور کرے گی کہ مہاتما گاندھی جی کو گرفتار کیا جائے یا آزاد رہنے دیا جائے تو ان سے مشورہ تک نہیں لیا جائے گا۔ اگر محفوظ شدہ مضامین کے ضمن میں وزراء کی حالت کے متعلق میرا خیال درست ہے تو

میں اپنے اعتدال پسند احباب کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اُس وقت سخت غلط فہمی میں ہوتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ حکومت کے ارکان میں سے اکثر اصحاب ہندستانی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محفوظ شدہ مضامین کے ضمن میں ہندستانی عنصر اقلیت میں ہے اور اگر گورنر اور کونسل کے انگریز ارکان اس کی کسی حکمت عملی کے خلاف ہو جائیں تو وہ حکومت کی حکمت عملی پر ذرا سا اثر بھی نہیں ڈال سکتے۔

اب میں وزراء کی قدر و منزلت اور منتقل شدہ مضامین کے سلسلہ میں وزراء اور کونسلوں کے تعلقات پر بحث کروں گا۔ اوّلاً تو میں یہ کہوں گا کہ یہ فرض کرنا ہی غلطی ہے کہ کوئی محکمہ وزراء کے نام منتقل کیا گیا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بعض محکمے منتقل کیے گئے ہیں لیکن میری رائے ہے کہ ان کے ساتھ وہ مشکلات اور پیچیدگیاں بھی منتقل ہوئی ہیں جو دفتری حکومت کے سو سالہ راج سے پیدا ہو گئی ہیں اور وزراء کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہوں۔ میں اپنا مطلب صاف طور پر پیش کرتا ہوں کہ یہ دونوں محکمے وزراء کے حوالے کر دیے گئے ہیں بشرطیکہ اسے اس محکمہ پر مکمل اقتدار حاصل ہو، ملک کو ایک مستقل اور دوامی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت حالت کیا ہے؟ وزیر کو ان افسروں پر کوئی بااثر اقتدار حاصل نہیں ہے جو ان محکموں کی روح رواں ہے اور اپنے افسروں کے انتخاب میں کوئی دخل نہیں ہے۔ ہندستان میں دفتری حکومت کی تاریخ میں ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب کبھی جمہور نے شور مچایا ہے اور کسی چیز کو اپنی ہستی کے لیے اشد ضروری بتایا ہے حکومت نے شور و پکار سن کر اس نظام پر زر کثیر خرچ کر دیا اور لوگوں کی شکایات رفع کرنے کے بجائے اعلیٰ اعلیٰ تنخواہ دار افسر مقرر کر دیے ہیں۔ بڑے قیمتی مکانات بنوا دیے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کوئی محکمہ وزیروں کے حوالے کیا گیا ہے یا نہیں۔ ایک معیار یہ ہے کہ کیا وزیر حفظان صحت کو بروئے قانون یہ منزلت حاصل ہے کہ وہ یہ رویہ اختیار کر سکے اور کہہ سکے کہ میں اس تمام نظام کو جواب تک اس محکمہ میں

رائج رہا ہے ایک نئے قالب میں ڈھالوں گا۔ میں انڈین میڈیکل سروس منسوخ کر دوں گا اور مقامی طور پر ایسا انتظام کروں گا کہ کنویں صاف کرنے اور دریا پھوٹ پڑنے پر تدابیر اختیار کی جاسکیں۔ میں جمہور کی ضروریات پر صرف کرنے کے لیے بہت سارا روپیہ حاصل کروں گا، لیکن ایسا کہاں ہوسکتا ہے۔ قانون حکومت ہند تو اس روپیہ کی اجازت نہیں دیتا اور اس پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صیغہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ ایک کونسل میں مباحثہ کے دوران میں ہندستان کے وزراء میں سے ایک نے نہایت تلخ آواز میں اپنی حالت کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے یہ شکایت کی تھی کہ محکمہ طب یا حفظان صحت کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر دیے جائیں۔ جواب ملتا ہے کہ ''ہمارے پاس ڈاکٹر نہیں ہیں''۔ اگر اپنی ذمہ داری پر کسی علاقہ میں جہاں وبا پھوٹ پڑی ہو ڈاکٹر بھیج دیتا ہوں تو محکمہ طب کے ارباب حل وعقد کہتے ہیں کہ ''ہم آپ کے ڈاکٹروں کو تسلیم نہیں کرتے۔ انھیں اپنی گرہ سے تنخواہیں دیجیے۔'' جب میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ یہ وزیر صاحب محکمہ طب وحفظ صحت کے ذمہ دار وزیر ہیں تو آپ ان منتقل شدہ صیغوں کی مکمل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے، جو بروئے قانون حکومت ہند منتقل ہوئے ہیں۔ ایک تو کہہ چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ اسی طرح ایک اور وزیر یہ کہہ بیٹھے کہ ''سونا چاندی تو میرے پاس ہے نہیں۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ تو میں نے آپ کو دے ڈالا یعنی ہمدردی کا اظہار کر دیا۔'' اس وزیر نے کہا ہے کہ وہ صرف ہمدردی کر سکتا ہے۔ کیوں کہ خزانہ کی کنجی رکن مالیات کے ہاتھ میں ہے۔

اس بحث وتمحیص سے میں ایک اہم ترین مسئلہ پر آپہنچا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کونسل کو خزانہ پر اقتدار حاصل ہے؟ اعتدال پسند تو کہتے ہیں کہ ہاں ضرور حاصل ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ نہیں ہرگز اقتدار حاصل نہیں ہے۔ میں اپنے دعویٰ کی حمایت میں اس قانون کا حوالہ دوں گا۔ لیکن میں اپنی طرف سے ایک گواہ پیش کرتا ہوں جس کی عزت

ووقار قدر ومنزلت میں ذرّہ برابر شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی کونسل کے اجلاس میں میزانیہ پر بحث وتمحیص کے دوران میں ایک وزیر نے کہا تھا۔" اس جگہ دو غریب آدمیوں کو وزیر بنا دیا گیا ہے۔ نظر تو یہ آتا ہے کہ انھیں وہ تمام اختیارات دیے گئے ہیں جو دارالعوام میں وزراء کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کا جواب دیں، جن کے لیے دارالعوام میں وزیر جواب دہ ہوتا ہے۔ یہاں تو وزیر اپنی زندگی اس رقم کے عطیہ کے حصول سے شروع کرتا ہے جو ان حضرات کے ہاتھوں سے نکلتا ہے جو تمام نظام حکومت کے ذمہ دار ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اعتدال پسند حضرات حق بجانب ہیں یا وزیر زیر بحث صداقت پر ہے۔" یہ ممکن ہے کہ دونوں غلطی پر ہوں لیکن دونوں درست نہیں ہو سکتے۔

قانون حکومت ہند کی رُو سے جو قواعد مرتب کیے گئے ہیں انھیں پیش نظر رکھتے ہوئے منتقل شدہ اور محفوظ کردہ شعبوں کے اخراجات کی تجاویز ارکان مجلس منتظمہ اور وزراء کے باہمی اتفاق پر مبنی ہے۔ اگر یہ اصحاب محفوظ کردہ ومنتقل شدہ صیغوں پر اخراجات کے لیے آپس میں متفق نہیں ہوئے تو گورنر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ آمدنی اور صوبہ کے بقایا مالی کا تعین کردے۔ آمدنی کا کچھ حصہ اور بقایا مالی اس طرح تعین کردیں کہ ہر موضع کے لیے علٰحدہ علٰحدہ رقم مقرر ہو جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تقسیم میں کیا تناسب ہوگا؟ اعتدال پسند حضرات تو ناز وافتخار سے کہا کرتے ہیں کہ حکومت کے ارکان کا حصہ غالب ہندستانی ہے تو ہر ایک کو یہ توقع ہو سکتی ہے کہ مسئلہ تقسیم وتناسب کا فیصلہ حصہ غالب کی رائے کے موافق ہوگا۔ لیکن یہ بات نہیں ہے کیوں کہ تمام لائحہ عمل کی بنیاد وزراء کی بداعتمادی پر مبنی ہے اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر ارکان اور وزراء آپس میں کسی بات پر متفق نہیں ہو سکے تو اس مسئلہ کا فیصلہ گورنر صاحب کرتے ہیں جو اپنی قوت تمیز واستدراک کے مطابق اس کا فیصلہ کیا

کرتے ہیں جس کا تقرر گورنر صاحب کی منظوری سے گورنر جنرل کیا کرتے ہیں۔

یہ وہ منزلت ہے جو قانون حکومت ہند کی رُو سے مرتب کردہ لائحہ عمل نے وزراء حکومت کو عطا کی ہے۔ لیکن اب ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ کونسلوں کی وقعت کیا ہے؟ کیا کونسلوں کے ارکان کو یہ طاقت حاصل ہے کہ یہ کہہ سکیں کہ "ہم چاہتے ہیں کہ سرمایہ کو ہمارے مشورہ کے مطابق تقسیم کیا جائے اور حکومت کی پیش کردہ تجویز کو پس پشت ڈال دیا جائے۔" کیا کونسلوں کے ارکان کہہ سکتے ہیں؟ ہم حکومت سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس قدر روپیہ موسمی بخار کی روک تھام پر خرچ کیا جائے اور اس قدر ابتدائی تعلیم کے لیے؟ اس میں شک نہیں کہ قانون حکومت ہند کی رُو سے کونسلوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ مطالبہ کو منظور نہ کریں یا رقم مطلوبہ میں تخفیف خرچ کی کسی رقم کی منظوری سے قطعی انکار کردیں۔ یا کسی حصہ کی تخفیف کی منظوری دے دیں۔ لیکن اس تمام منظوری، انکار یا تخفیف کے لیے ایک شرط موجود ہے۔ یعنی بروئے قانون مقامی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ منظوری نہ ملنے یا محولہ رقم کی تخفیف کے باوجود اس مطالبہ کے لیے اس طرح عمل پیرا ہو گویا کہ اس کی منظوری دی جاچکی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مطالبہ کا تعلق محفوظ شدہ صیغہ کے ساتھ ہو اور گورنر صاحب تصدیق کردیں کہ اس مطالبہ میں جس خرچ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس صیغہ کی ذمہ داری کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ اعتدال پسند حضرات کے نقطۂ خیال سے یہ وہ پُر اثر اقتدار ہے جو کونسلوں کو خزانہ پر حاصل ہے۔ کونسلوں کو یہ کہنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے کہ ملک کی آمدنی کو محفوظ شدہ یا منتقل شدہ صیغوں کے لیے علی الترتیب کس طرح تقسیم و متعین کیا جائے۔ اسے محفوظ شدہ صیغوں کے لیے متعین کردہ آمدنی پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ کونسلیں صرف اتنا کرسکتی ہیں کہ وزراء سے یہ کہہ دیں کہ "ہم ارکان کونسل آپ کے مطالبہ کے مطابق تمام رقم منظور نہیں کرسکتے یا خرچ کے کسی جزو کو حذف کردیتے ہیں یا اس میں تخفیف

کر دیتے ہیں۔'' کونسلوں کو منتقل شدہ صیغوں کے حق میں جو اقتدار حاصل ہے اسے خزانہ پر پر اثر اقتدار کہنا مضحکہ انگیز ہے۔

انتظامی معاملات میں وزیر کی حالت ایسی ہی زبوں ہے۔ قانون میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ منتقل شدہ صیغوں کے لیے گورنر صاحب وزراء کے مشورہ کو شمع راہِ ہدایت بنادیں گے بشرطیکہ انھیں وزراء کی رائے سے اظہارِ اختلاف کرنے کی کافی وجوہ نظر نہ آئیں۔ اگر ایسی حالت رونما ہو جائے تو وہ وزراء کے مشورہ کے خلاف عمل کر سکتے ہیں۔ اگر حفظانِ صحت کے ذمہ دار وزیر اور اس محکمہ کے کسی افسر کے درمیان حکمت عملی کے مسئلہ پر اختلاف ہو جائے تو گورنر صاحب کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ وزیر حکومت کے خلاف محکمہ کے افسر کی حمایت کریں۔ منتقل شدہ صیغوں کے لیے قانون سازی کے مسئلہ میں زبانی طور پر تو کونسل کو کچھ اختیار حاصل ہے لیکن عمل بتا رہا ہے کہ اس موضوع پر محکمۂ مال کا فیصلہ ناطق ہوگا اور محکمۂ مال کا ذمہ دار مجلس منتظمہ کا ایک رکن ہوتا ہے۔ کیوں کہ کوئی قانون میرے وہم وگمان میں نہیں آ سکتا جس میں روپیہ کا خرچ مضمر نہ ہو۔ محکمۂ مال کا فرض ہے کہ نئے خرچ کے لائحہ عمل پر جس کے لیے میزانیہ میں گنجائش کی تجویز پیش کی گئی ہے غور کرے اور اپنی رائے پیش کرے۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ وزیر محکمۂ مال کا رکن نہیں ہوتا۔

تمام لائحہ عمل کے لیے یہ دریافت کرنا جائز ودرست ہے کہ کیا اس لائحہ عمل سے ان ابتدائی حقوق کا تحفظ ہو جاتا ہے جو کسی مہذب حکومت کے سایۂ عاطفت میں ہر ایک متنفس کو حاصل ہوئے ہیں۔ کیا اس قانون کی رُو سے جمہور کی مرضی کے بغیر پر اشتداد قوانین کا بنانا ناممکن ہے؟ کیا اس قانون کی رُو سے جمہور کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ان پر اشتداد قوانین کو مسترد کر دیں جو کتاب الآئین کی ذلت کا موجب ہو رہے ہیں؟ کیا اس قانون کی رو سے یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ اب مظالم

پنجاب کا اعادہ نہ ہو سکے گا؟ اگر میں یہ کہہ دوں کہ ان تمام امور کے لیے ہماری حالت بالکل وہی ہے جو قانونی اصلاحات سے پہلے تھی اور اس حالت میں سرمو فرق نہیں آیا تو میں بالکل حق بجانب ہوں گا۔

الغرض یہ وہ لائحۂ عمل ہے جس کی تعمیل و تکمیل میں وزرائے حکومت مصروف ہیں اور ہمارے اعتدال پسند احباب نے ہمیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا ہے کہ اس لائحہ عمل میں سوراج کا آغاز موجود ہے۔ چوں کہ میں غیر ضروری اختلاف وتصادم کا خاتمہ کرنے کا بہت متمنی ہوں اس لیے میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ آپ قانون حکومت ہند کو حکومت سے موالات وتعاون کی بنیاد قرار دے کر اسے منظور کرلیں۔ میں بے عزتی سے صلح نہیں خریدوں گا۔ جب تک قانون حکومت ہند کا دیباچہ موجود ہے اور اپنے امور کے انتظام وانصرام، اپنی انفرادی زندگی کی اصلاح، اپنی قسمت کے نشوو ارتقاء کے حق، ہمارے فطری حق کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ صلح کی شرائط پر خواہ کبھی ہی کیوں نہ ہو غور کرنے سے ضرور انکار کر دینا چاہیے۔

لہٰذا جنگ کرنے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے جو ہمیں نظر آرہا ہے اور وہ ترک موالات ہے۔ یہ وہ نظام عمل ہے جو ہم کانگریس کے دو اجلاس ماسبق میں منظور کر چکے ہیں۔ ہم ترکِ موالات کے اصول کے معتقد ہیں۔ آپ مجھ سے یہ توقع نہ کریں گے کہ میں اس کے حسن وقبح پر بحث کروں گا۔ لیکن چند احباب ہیں جو اس طرزِ عمل پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کے شکوک رفع کر سکیں تو ہمیں چاہیے کہ شکوک رفع کر دیں۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ترک موالات اصول نفی ہے، اصول یاس ہے وہ اس اصول کے دائرہ اثر کی تنگی اس کی نارسی پر حیران ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے سیاسی واقعات کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں اور ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ اس قوم کی زیست کی کیا امید کی جاسکتی ہے جو علیحدگی کی زندگی بسر کرنے کا

عزم مصمم کر چکی ہے۔

میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ معترضین حضرات کے ان سوالات کا جواب دوں اور ان کا جواب دیتے ہوئے مجھے یہ پوچھنا چاہئے کہ ترک موالات ہے کیا؟ اس سوال کا جواب دینا بہت آسان ہو جائے گا بشرطیکہ میں ایک لحہ کے لیے اس امر پر غور کرلوں کہ "ترک موالات کیا کچھ نہیں ہے" کم از کم یہ ضروری ہے کہ ہم اپنا مکمل اندازہ تو لگالیں۔ کیوں کہ من حیث القوم اپنا اندازہ لگانے پر ہم انسانیت کی خدمت کی امید کر سکتے ہیں۔

آیئے! ہم اس مسئلہ پر ذرا غور کریں۔ ہمارا فلسفہ تسلیم کرتا ہے کہ تمام اختلافات کے پردہ میں ایک اشد ضروری اتحاد موجود ہے اور ان ہی اختلافات میں اس بدترین حقیقت کی "لیلا" مضمر ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں انسانی جدوجہد اور سعی کا مقصد واحد یہ ہے کہ ان نامتناہی اختلافات کو اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ کردے کہ بدترین حقیقت کا ثبوت مل جائے۔ خدا کی "لیلا" کا تقاضا ہے کہ ہر ایک ظہور کے نشوو ارتقا میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو۔ روئے زمین پر، اس کرۂ ارض پر ہر ایک قوم اس ظہور کی نمائندہ ہے۔ جس طرح باغوں میں مختلف اقسام اور مختلف رنگ کے پھول ہوتے ہیں اور ان کی ہر ایک بات علیٰحدہ ہوتی ہے اسی طرح تمام اقوام اپنے قوانین کی متابعت اور اپنی آئندہ قسمت کے سدھار میں مصروف رہیں۔ تاکہ تمام اقوام بالآخر انسانیت کی تربیت وزندگی میں حصہ لے سکیں۔

یہی قومیت کے اصول کا لب لباب ہے جس کے لیے انسانوں نے اپنی جانیں قربان کردی ہیں۔ قومیت اس کا نام نہیں ہے کہ ہم تمام دیگر اقوام سے قطعی غیر متعلق وعلیحدہ ہو کر اپنی انفرادی حقیقت کا پرزور اعلان کریں بلکہ قومیت، تکمیل نفس، تصمیم عزم اور اصلاح روح کی زبردست خواہش کو اصلاح بنی نوع انسان کا جزو لاینفک

تصور کرنے کا نام ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر نہ انسانیت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ نہ بنی نوع اپنے عزائم کو استوار کر سکتے ہیں اور نہ نفس انسانی کی اصلاح ہی ممکن ہے۔ اس لیے ترک موالات کی تحریک انگریزوں سے محض اس بنا پر موالات کرنے سے انکار واعراض کا سبق نہیں دیتی کہ وہ انگریز ہیں۔ لیکن اس کی یہ تعلیم ضرور ہے کہ کسی ایسی قوت یا کسی ایسے نظام سے ہرگز موالات نہ کی جائے جو قوم ہند کی انفرادی نشو وارتقاء میں کسی صورت سے بھی مزاحم ہوتا ہو یا قوم کی راہ تکمیل نفس میں حائل ہو۔ اسی طرح تحریک ترک موالات مغربی تعلیم وتربیت کو محض اس بنا پر ٹھکرا نہیں رہی کہ یہ مغربی ہے ۔ لیکن اس کا منشاء یہ ضرور ہے کہ دلی رضامندی حاصل کرنے کے لیے سردست مغربی تعلیم وتربیت کو ضرور نامنظور کر دینا چاہیے۔ ''قومی تعلیم'' کا شور بلند کرنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ بیرونی تعلیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جا رہی ہے۔ یہ تو اس طریقۂ عمل کے خلاف صدائے احتجاج ہے کہ ہندستان پر زبردستی بیرون ملک کی تعلیم وتربیت کیوں عائد کی جاتی ہے۔ غلامی کا برداشت کرنا سخت مشکل ہے۔ چاہے یہ غلامی سیاسی ہو یا تعلیمی ۔ تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ سیاسی غلامی کے بعد تعلیم وتربیت کی محکومی کا دور شروع ہوتا ہے۔ قومی تعلیم کی خواہش ظاہر کر کے ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ قید کی تربیت سے ایک سلسلہ قائم ہو جائے اور قدیم تعلیم وتربیت کو ہم اپنے قلوب میں جاگزیں کر سکیں۔ جس اصول کی ہم تعلیم دیتے ہیں وہ کبھی اس روشنی کو نظر انداز نہیں کرتا جو بیرون ملک سے آسکے۔ البتہ ہم ان لوگوں سے جو ہماری بات سننے کی پروا کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں'' پہلے اس چراغ کو روشن کرو جو تمہارے مکان میں غفلت وسہل انگاری کا شکار ہو رہا ہے۔ زمانہ سلف پر نظر ڈالو اور اپنی موجودہ حالت زمانہ سلف کی روشنی میں دیکھو۔ اس کے بعد ہمت وجرأت سے تمام دنیا کا مقابلہ کرو اور جو روشنی باہر سے آسکے اسے قبول کر لو۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترکِ موالات کی تعریف کیا ہے؟ میری رائے میں ترک موالات کی تعریف مسٹر ''اسٹوکس'' کے فصیح و بلیغ الفاظ کے اعادے ہی سے خوب ہوسکتی ہے۔ مسٹر اسٹوکس فرماتے ہیں'' ترک موالات قابل تلافی گناہ یا برائی میں حصہ لینے سے انکار کردینے کا نام ہے۔ یہ اس انکار کا نام ہے جو بے انصافی میں کوئی حصہ لینے سے کیا جائے۔ یہ اس انکار کا نام ہے جو قابل تلافی مظالم کو تسلیم کرنے سے کیا جائے۔ یا جو ان حالات کے سامنے گردن تسلیم خم کرنے سے کیا جائے جو اصول صداقت کے مخالف یا منافی ہیں''۔ لہٰذا ترک موالات ان لوگوں کے ساتھ معاملات رکھنے سے انکار کردینے کا نام ہے، جو ذاتی مفاد یا ضروریات بنا کر مظالم کے ارتکاب یا اعادہ پر اصرار کریں۔

اس پر یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ ترک موالات کا تمام اصول ایک اصولِ نفی یا یاس پر قائم ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بظاہر یہ ایک اصولِ نفی ہے لیکن بہ باطن اس کا تعلق اصول اثبات سے ہے۔ ہم انہدام کرتے ہیں۔ لیکن اس انہدام کی غرض تعمیر ہوتی ہے۔ ہم مٹاتے ہیں لیکن اس تباہی کا مقصود عمارت ہوتی ہے۔ ہم انکار کرتے ہیں لیکن اس سے ہمارا مطلب منظوری ہوتا ہے۔ انسانی کوششوں کی تمام تاریخ اسی ایک جملہ کے اندر تمام ہوجاتی ہے۔ اگر محکومی گناہ ہے تو ہم ان تمام آلات سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہیں جو ہماری محکومی کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ یہ ایک نفی ہے لیکن اس سے اثبات کا پتہ چلتا ہے کہ ہم نے ہر نقصان برداشت کرکے آزادی حاصل کرنے کا عزم بالجزم کرلیا ہے۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ اصول ترک معالات ایک یاس انگیز اصول ہے۔ برخلاف اس کے یہ امید اعتماد اور ذریعہ حصول پر غیر محدود اعتقاد سے لبریز ہے۔ قربانیاں پیش کرنے والے انسانوں کے چہروں پر اس وقت جب کہ وہ جیل خانے لے جائے جارہے ہوں محض ایک نظر ڈالنے سے یہ یقین

ہو جائے گا کہ آزادی ہماری ہوگئی۔ یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ شوکت علی اور محمد علی (بہادر اور ذی اثر) زندگی بھر تکالیف میں بسر کرتے رہے۔ یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ لالہ لاجپت رائے کرۂ ارضی کا ایک بہادر فرزند دفتری حکومت کے حکم کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا کر جیل میں جوان کا منتظر تھا۔ بہادری و جرأت سے چلا گیا۔ یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ موتی لال (انسانوں کے شہزادے) نے اپنی دولت پر لات مار کر جو اس کی لونڈی تھی اس حکم کی مخالفت کی جو اسے غلام بناتا تھا اور ایسی کسی تکلیف سے انکار نہ کیا جو قوت کا گھمنڈ ایجاد کر سکتی تھی۔ وقت مجھ کو اجازت نہیں دیتا کہ میں ان تمام حضرات کا نام پیش کروں جن کا نام شہدا کی فہرست میں درج ہو چکا ہے۔ لیکن میں ان طلبا کو فراموش نہیں کر سکتا جو مادر وطن کی امید و شان ہیں۔ مجھے سیاسی زندگی کے تلاطم کو مرکز سیاست میں غور سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور میں اس حیرت انگیز ہمت و جرأت اور ناقابل تسخیر اعتقاد کی شہادت دیتا ہوں جس کا طلبا نے ثبوت دیا ہے۔ ہمارے طلبا ہی تحریک میں جوش پیدا کر رہے ہیں اور ان ہی کے سر پر کامیابی کا سہرا ہے۔ میدان سیاست کے یہی علم بردار ہیں۔ یہ راہ عمل کے مقدس رہنما ہیں۔ اگر تکالیف برداشت کرنا ان کی قسمت میں تھا تو فتح مندی بھی ان ہی کا حصہ ہونی چاہئے۔

پس یہ فلسفیانہ اصول ہے جس پر تحریک ترک موالات کی بنیاد قائم ہے یعنی اُس قوت و طاقت کی مخالفت کرنا جو ایک قوم کی حیثیت سے نشو و ارتقا اور تکمیل نفس سے باز رکھے اور اسی کے ساتھ اس کے محبوب پر بھی نظر رکھنا کہ ہم اس قوت و طاقت سے نفرت نہ کریں بلکہ محض اس کی برائیوں کو برائیاں سمجھیں اور اس حکومت کا غصہ ہم پر تکالیف کا جو نزلہ گرائے اسے برداشت کرنے سے انکار نہ کریں۔ حضرات! میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ نصب العین بہت بلند ہے۔ لیکن میری قطعی رائے یہ ہے کہ فوراً سوراج قائم کرنے کے لیے بھی ایک ذریعہ ہمارے پاس ہے۔ اس حقیقت کو

سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل وفراست کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر ہم سب لوگ اس آلہ حکومت سے جو ہماری نشو وارتقاء کو مسدود کرنے کے لیے کام کررہی ہے اپنی امداد کا ہاتھ ہٹالیں تو ضرور اس آلہ حکومت کی حرکت بذات خود بند ہوجائے گی۔ لیکن ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی اس آلہ حکومت کی حرکت بند ہوئی تو ہم بغاوت وانتشار کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ اس اعتراض کا جواب نہایت آسان ہے۔ ترک موالات کی تحریک اس وقت تک کامیابی کی امید نہیں رکھ سکتی جب تک ہماری قوتیں باقاعدہ طریقہ پر منظم نہ ہوجائیں اور اس تحریک کے قواعد وضوابط کو تمام قوم بخوبی ذہن نشین نہ کرلے۔ اگر یہ اصول بخوبی ذہن نشین نہ ہوئے تو یہ سوال پیدا ہی نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت ہمارا کامیابی کے دروازہ تک پہنچنا غیر ممکن ہوگا۔ لیکن اگر یہ اصول بخوبی ذہن نشین ہوگئے تو تحریک کی اندرونی قوت فساد وبدامنی کا سد باب کرے گی۔ لیکن میں آپ سے یہ امر پوشیدہ نہیں کرسکتا کہ ہماری جدوجہد کے دوران میں بمبئی میں فسادات رونما ہوئے۔ ہمیں فسادات کی ذمہ داری لینی چاہئے اور نہایت صفائی کے ساتھ یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ جس حد تک تشدد، زیادتی اور جبر ہوا ہے اس حد تک ہمیں ناکامیاب کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے اعتقادات کو ترک کردیں۔ بلکہ اس کا علاج محض یہ ہے کہ ہم ان معتقدات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کریں۔ ہر عظیم الشان تحریک کی اشاعت کے ساتھ فساد وخونریزی کا ضرور تعلق رہا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائی مذہب کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کیا یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ چونکہ نئے خیالات کی تبلیغ واشاعت میں فساد وبدامنی کا اندیشہ ہے کیوں کہ نئے خیالات کا قدیم اصول ومسلمہ فلسفۂ حیات سے تصادم ہوتا ہے اس لیے مبلغین مسیحیت اپنی تحریک روک لیں اور اس روشنی کو فروغ دینے کی کوشش نہ کریں جسے وہ محسوس کرتے ہیں؟ اس قسم کے استدلال

ایک لمحہ کی بھی توجہ کے قابل نہیں ۔اگر آپ چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اصول کو ابھی لوگوں نے ذہن نشین نہیں کیا۔اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ فسادات بمبئی کو مدنظر رکھ کر ہمیں اپنے طریقہ کار میں ترمیم کرنی چاہئے۔لیکن ایک تنگ رقبہ میں فسادات کا رونما ہونا ایک واقعہ کی حیثیت سے ہماری تحریک کے اصول وحقائق کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہے۔ہمیں ہمت وجرأت سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اس قسم کے فسادات کو دوبارہ ظہور پذیر ہونے سے روکنا چاہئے لیکن میں آپ کو ہرگز یہ نصیحت نہیں کر سکتا کہ ان فسادات کی بنا پر اپنے ہاتھ روک لیجئے۔ حال کی گرفتاریوں کے زمانے میں ہندستان کا پرامن وساکن رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ قوم نے بمبئی کے واقعہ سے ایک بڑا سبق سیکھا ہے۔ حال کی ہمت برداشت اور غیر معمولی ضبط نفس نے میری رائے میں غیر تشدد آمیز ترک موالات کی کامیابی اور ضرورت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔اگر یہی جذبہ برابر ترقی کرتا رہا اور آخر تک اسی طرح باقی رہا تو کوئی ہماری روز افزوں ترقی کو روک نہیں سکتا۔

خواتین وحضرات! اگر حکومت کی موجودہ جبر واشتداد کی حکمت عملی سے ہم نتیجہ نکالیں تو یہ ظاہر ہوگا کہ ہماری تحریک کی کامیابی نے دفتری حکومت پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وائسرائے ہند موجودہ حکمت عملی کو''جبر واشتداد'' کا خطاب دینے پر اعتراض کرتے ہیں۔لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہ ہوا کہ کیا قانون ترمیم ضابطہ فوجداری اور قانون امتناع مجالس ملک کے مروجہ قانون میں سے ہیں۔اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو یہ ان قوانین سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تحقیقات ودریافت کے واسطے ایک وفد مرتب کیا گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ وفد جس کا صدر ایک ہندستانی تھا اور جس میں چھ ہندستانی ممبر تھے ان قوانین کی منسخ کی استدعا نہ کر سکا۔اس واقعہ نے محض یہ ظاہر کیا کہ ان ممبروں کے احساس ذمہ داری پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔لیکن

تاہم اس واقعہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان قوانین کو جبر واشتداد کے نام سے یاد کیا گیا تھا اور اسی حیثیت سے ان کی تحقیقات ہوئی تھی۔

ظاہر ہے کہ لارڈ ریڈنگ یہ تجویز کرتے وقت سخت غلطی کر رہے ہیں کہ سردست کلکتہ اور دوسرے مقامات پر جو گرفتاریاں ہورہی ہیں وہ قوانین فوجداری کی عام دفعات کے تحت میں ہیں۔ وائسرائے نے یہ اعلان کیا ہے کہ قانون کا مقابلہ کرنے کے لیے باقاعدہ کوششیں کی جارہی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قانون کی پرزور مخالفت کر کے حکومت کو چیلنج دینے اور گرفتار ہونے سے کیا فائدہ مقصود ہے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ جناب وائسرائے کی خدمت میں ایک سوال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر جاپان آسٹریلیا پر اپنا قومی علم بلند کر کے اہل آسٹریلیا کو اس قسم کی حکومت اور اسی قسم کا نظام سلطنت عطا کرے جو ہم کو برطانیہ عظمیٰ کے سایہ میں سردست حاصل ہے۔ ''نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم'' اور اگر اہل آسٹریلیا تمام نقصانات برداشت کرنے کا عزم کر کے اپنی آزادی حاصل کرنا چاہیں تو اس وقت وائسرے صاحب آسٹریلیا کو کیا نصیحت کریں گے؟ اور اگر جاپان آسٹریلیا کی مرضی کے بغیر جبر واشتداد کے قوانین نافذ کردے اور تمام مجالس اور رضا کارانہ جماعتوں کے انعقاد کو جائز قرار دے جن ذرائع کے سوا اَحیاءِ قومی کی اور کوئی صورت اہل آسٹریلیا کی وسیلہ اُمید نہیں بن سکتی اس وقت وائسرائے صاحب اہل آسٹریلیا کو کیا نصیحت کریں گے؟ بشرطیکہ باشندگان آسٹریلیا نے ان قوانین کی مخالفت کا ارادہ کرلیا ہو اور یہ عزم کر چکے ہوں کہ ان قوانین کی رو سے جو احکام صادر کیے جائیں گے ان سب کو وہ نظر انداز کریں گے۔ میں خیال کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ وائسرائے ہند ہندستان کی اس حالت کو سمجھنے سے قاصر ہیں جو اب ہندستان میں پیدا ہوئی ہے اور ان کی پریشانی کی یہی وجہ ہے۔ اسے غلط کہو یا درست بہر حال کانگریس نے ترک

موالات کے نظام عمل کو صرف اپنی مطلب برآری کے لیے منظور کیا ہے۔ کانگریس کی رائے میں ہندستان کے لیے محض یہی ایک جائز سیاسی حربہ موجود ہے۔ یہ کوئی قانون شکنی نہیں ہے اسے غلط کہو یا صحیح لیکن کانگریس نے شاہزادہ ویلز کے مقاطعہ کی تجویز منظور کی ہے۔ یہ کوئی قانون شکنی نہیں ہے۔ کانگریس اپنا کام ان رضا کارانہ جماعتوں کے سوا جنہیں آپ نے قانون ترمیم ضابطہ فوجداری کے ماتحت ناجائز قرار دے دیا ہے اور کن ذرائع سے اپنا کام جاری رکھ سکتی ہے؟ ان رضا کارانہ جماعتوں پر ضرب لگا کر آپ کانگریس کی تمام تبلیغ واشاعت کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور کانگریس کا وجود خلاف قانون نہیں ہے۔ اگر آپ ہمارے قلوب میں حب الوطنی کے اسی قدر جذبات کو تسلیم کرتے ہیں جو آپ کے اندر موجیں مار رہا ہے تو آپ کو اس واقعہ سے پریشانی کیوں ہوتی ہے کہ ہم نے ان قوانین واحکام کی خلاف ورزی کا عزم مصمم کر لیا ہے اور قید خانوں کے لیے مضطرب ہیں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم نے قانون شکنی نہیں کی بلکہ آپ نے قانون شکنی کی ہے۔ آپ نے ان قوانین کو مجروح کیا ہے جن کی رُو سے ہر شہری کو آزادیٔ تقریر و آزادیٔ افعال اس حد تک حاصل ہے جہاں تک کہ وہ ملک کے عام قوانین کی مخالفت نہ کرے۔ آپ نے ان قوانین کو مجروح کیا ہے جن کی رُو سے ہر شہری کو انعقاد مجالس کا اس وقت تک حق حاصل ہے جب تک یہ مجالس ناجائز جلسوں کی صورت اختیار نہ کریں۔ یہ ہر شہری کے حقوق کے عام قوانین ہیں جن کو آپ نے مجروح کیا ہے اور میں جناب کو یاد دلاؤں گا کہ ان ہی ابتدائی حقوق کی حفاظت پر شہریوں کی وفاداری کا مدار ہے۔

لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جماعتیں قوانین کے نفاذ اور امن ونظام کے قیام میں حائل ہوتی ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ملک کے عام قوانین فوجداری موجود ہیں۔ ان سے امن کا علاج ہوسکتا ہے۔ میں نے کلکتہ میں تشدد کی کوئی خبر نہیں سنی مجھے اطمینان

ہے کہ کسی فساد کی اطلاع پولیس کو نہیں ہوئی۔ تشدد کے الزامات کی تحقیقات ہو سکتی ہے اس لیے تشدد کا الزام عائد ہی نہیں کیا گیا۔ ڈرانے اور دھمکانے کے الزامات فوراً عائد کر دیے گئے ہیں۔ حکام اعلیٰ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ڈرانے یا دھمکانے کی کوئی اطلاع پولیس کو پہنچی؟ کیا مقامی حکومت نے تحقیقات کے بعد یہ دریافت کیا کہ عام الزام کے علاوہ جو نہایت آسانی کے ساتھ عاید کیا جا سکتا ہے۔ ڈرانے اور دھمکانے کی عملی مثالیں بھی پیش آئیں جن سے یہ ثابت ہو کہ حامیانِ ترک موالات نے کلکتہ کے وفاداروں کو ڈرایا دھمکایا ہو؟

ایک انگریز اخبار نویس نے ہڑتال پہ رائے زنی کرتے ہوئے کلکتہ کے انگلو انڈین اخبار میں یہ لکھا ہے کہ عامۃ الناس نے اپنی رضا و خوشنودی سے ہڑتال کی تھی۔ 24/ نومبر ماسبق کے ''اخبار کیپٹل'' میں ایک روزنامچہ شائع ہوا ہے جس میں آپ لکھتے ہیں ''لوگوں نے دیدہ و دانستہ اطاعت قبول کی۔ لیکن حقیقت میں آنکھ سے یہ امر پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ لوگ اس نئے ظلم کے دیدہ و دانستہ شکار ہی نہ ہوتے تھے بلکہ وہ سرکار کی شکست پر اظہار مسرت بھی کر رہے تھے۔ اگر معاملات یہی ہیں تو وہ کونسا واقعہ تھا جس کی بنا پر دفعہ 16 قانون ترمیم ضابطہ فوجداری کے اعلان کی ضرورت پیش آئی۔ کیا 17/ نومبر کو کلکتہ کی حالت انگلستان کی اس حالت سے ابتر تھی جب ایک عظیم الشان مقاطعہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کابینۂ انگلستان میں اس قسم کے مقاطعہ و پہرہ کو روکنے کی کوئی قوت ہے؟

حضرات! اس قانون ترمیم ضوابط فوجداری کے نفاذ کا منشا یہ نہیں ہے کہ حامیان ترک موالات کے ڈرانے دھمکانے سے ملک نجات پا جائے بلکہ اس سے کانگریس اور ترک موالات کی تمام تحریکات کا گلا گھونٹنا منظور ہے۔ اس قسم کی دھمکیوں کا آپ کو جواب دینا ہے۔ اس قانون کے نفاذ سے حکومت ایک اور مطلب حاصل کرنا چاہتی

ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈرانے دھمکانے اور تشدد کا بازار گرم کرنے سے کلکتہ میں شہزادہ کا خیر مقدم کامیاب بنایا جا سکے۔ میں آپ کی جانب سے شہزادہ ویلز کی خدمت میں نیک نیتی کے جذبات کا ہدیہ پیش کروں گا۔ انگلستان کے شہزادہ سے ہمیں کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی حکومت کے سفیر بن کر آ رہے ہیں جس سے ہم مقاطعہ کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس لیے ہم ان کا خیر مقدم نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ سر دست ہم کسی قسم کی خوشی میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم قوم کی بقا کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔ ہم اس لیے مصروف جنگ ہیں کہ ہمیں آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور اپنے نقطۂ نظر سے اپنے معاملات طے کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔ انسانوں کے یہ ابتدائی حقوق ہیں۔ قوم کی جانب سے اس حکومت کے سفیر کا خیر مقدم ریا و نمود کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جس نے ہمیں ہمارے ابتدائی حقوق دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے قوم کی جانب سے خیر مقدم سے انکار کرنا نہ تو شہزادہ ویلز کی اور نہ انگلستان کے شاہی خاندان کی کوئی توہین منظور ہے۔ اس سے محض ہمارے عزم بالجزم کا پتہ چلتا ہے کہ ہم ہرگز دفتری حکومت سے معاملات کرنے پر رضامند نہیں ہیں۔

سی۔آر۔داس

گیا——————1922ء

بہنواور بھائیو!

آج جس طرح میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں اپنے آپ کو بے پناہ رنج وغم میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ میں جذبات سے اتنا مغلوب ہوں کہ میرے لیے یہ ظاہر کرنا بڑا مشکل کام ہے کہ ہم سب کے ذہنوں میں کیابات سب سے زیادہ غالب ہے۔ مہاتما گاندھی نوکر شاہی حکومت سے نا قابل فراموش جنگ لڑ کر گرفتار ہو چکے ہیں۔ آپ کو جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سال ہم ان کی رہنمائی سے محروم ہیں۔لیکن دشمن کے قلعہ میں جس مضبوطی سے کھڑا ہونے کا آپ نے ثبوت دیا ہے وہ ہمارے دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کا ایک سامان رہے گا۔ اسی طرح کی دردناک مگر پروقار اور رفیع الشان کہانی سننے کے لیے ہمیں دو ہزار سال پیچھے کا رخ کرنا پڑے گا۔ جب یسوع ناصری ایک اجنبی ٹریبونل کے سامنے ''لوگوں کے گمراہ کی حیثیت میں'' مقدمہ کے لیے پیش ہوئے۔

اور یسوع گورنر کے سامنے کھڑا تھا۔ گورنر نے اس سے استفسار کیا:

کیا تم یہودیوں کے بادشاہ ہو۔؟

یسوع مسیح نے اسے کہا۔تم کہتے ہو۔

اور جب بڑے بڑے پادریوں اور اہم شخصیتوں نے اس کی ذات پر الزامات

لگائے تو اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

پھر پائلٹ نے اسے کہا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے خلاف کن کن باتوں کی گواہی دی جارہی ہے؟

اور اس نے ایک لفظ بھی جواب میں منھ سے نہ نکالا۔ یہاں تک کہ گورنر بھی انگشت بہ دنداں تھا۔

مہاتما گاندھی نے اس سے مختلف راہ اختیار کی۔ آپ نے تسلیم کیا کہ آپ قصوروار ہیں اور آپ نے پبلک پراسیکیوٹر کو مخاطب کر کے کہا" میرا قصور اس سے بہت زیادہ ہے جو آپ نے میرے نام منسوب کیا ہے۔ میں نے نوکر شاہی حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر کے قانون الٰہی کی تعمیل کی ہے۔" اگر میں اس سے کوئی اندازہ قائم کروں تو یہ کہوں گا کہ جس جج نے آپ کا مقدمہ سنا اور جس نے آپ کو قید کی سزا دی وہ حیرت کے ان ہی احساسات سے لبریز تھا جس کا مشاہدہ پائلٹ نے کیا تھا۔

مہاتما گاندھی فیصلے کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں فرد اکبر تھے اور ملک کی طرف سے آپ کا آخری Stand بھی بلاشبہ نہایت بڑا تھا۔ بلاشبہ آپ دنیا کی ان بڑی شخصیتوں میں ایک ہیں جو کبھی دنیا میں پیدا ہوئیں۔ دنیا کو آپ کی ضرورت ہے اور اگر اہمیت کے مالک افراد، یعنی کھمبے کے ساتھ زندہ باندھ کر جلا دینے والے حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت کے کاتبین اور یہودیوں نے آپ کا تمسخر اڑایا ہے تو وہ اب اور ہمیشہ اس قوم کے طفیل یاد کیے جائیں گے جسے آپ کی بدولت مسلسل کامرانیوں کا سہرا نصیب ہوا۔

حضرات! یہ نہایت نازک وقت ہے اور ضروری بات یہ ہے کہ اس حقیقی مسئلہ کی طرف فوری طور پر توجہ مبذول کی جائے۔ جس نے لوگوں کو نوکر شاہی حکومت اور عوام سے جدا کر رکھا ہے۔ جبر کے اس دور میں جس کا آغاز پچھلے سال انہیں دنوں ہوا۔ یہ

ہی مسئلہ ہماری خاص توجہ کا محتاج تھا۔ جبر کی اس پالیسی کی ان اعتدال پسند رہنماؤں کی طرف سے حمایت کی گئی جواب ایگزیکٹو حکومت میں کام کر رہے ہیں۔ میں ان لوگوں پر جنھوں نے حکومت کی حمایت کی، بددیانتی کا یا حب الوطنی کے فقدان کا الزام نہیں لگاتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ قانون ودستور کی پالیسی ان کی مشعل راہ تھی۔ یہ قانون ودستور کا نظریہ ہی تھا جس نے مجھے اس بات کی ترغیب دی کہ میں اس کو کھول کر بیان کروں۔ اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ''قانون ودستور'' دنیا بھر کی دفتری حکومتوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔

دفتری حکومت اور اس کے معذرت خواہوں کی طرف سے اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ مستقل حکومت ہر ایک فرد کی اولین ضرورت ہے اور یہ کہ رعایا کو آئینی طریقوں کے علاوہ کسی ذریعہ سے اپنی شکایات پیش کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ آئینی طریقوں کا میں یہ مطلب لیتا ہوں کہ کوئی ایسا طریقہ جس کی اجازت آئین دیتا ہو۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سرگرمی سے قانون ملک کو نافذ کرنے میں مدد نہیں دیتے تو ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی تعمیل کرو۔ عدم مزاحمت کم سے کم بات ہے جس کی حکومت آپ سے توقع رکھتی ہے۔ دفتری سرکار کا مجملاً یہی فلسفہ ہے۔ یعنی حکومت کا فرض ہے۔ قانون ودستور کا قیام۔ اور لوگوں کا کام ہے اس دستور کی خاموش تعمیل۔ لیکن کیا ولیم فاتح سے لے کر جیمز دوئم تک ہر انگریز بادشاہ کا یہی سیاسی فلسفہ نہ تھا۔ اور کیا (Bairbors, (Roman offs Hohanzolluns کا یہی سیاسی فلسفہ نہ تھا۔ اس کے باوجود آزادی آگئی ہے۔ یہ کہاں سے آئی ہے؟ یہ ان ہی قوانین کی خلاف ورزی سے نافذ ہوئی ہے۔ جنھیں امن وامان کے نام پر جاری کیا جاتا تھا۔ ایسے مقامات پر جہاں حکومت مطلق العنان ہو اور لوگوں کے ابتدائی حقوق کو تسلیم نہ کیا جائے قانون ودستور کی باتیں کرنا لاحاصل ہیں۔

انگلستان سے یہ عقیدہ ہندستان پہنچا ہے۔ چنانچہ میں اس عقیدہ کی سچائی کا جائزہ لینے کے لیے انگریزی تواریخ کی مثالیں پیش کروں گا۔ وہ تاریخ بتاتی ہے کہ انگلستان کے اکثر مستبد حکمران جو لوگوں پر مطلق العنان حکومت کرتے رہے۔ یہ ہی کہتے تھے کہ وہ لوگوں کی بھلائی اور دستور و قانون کی حفاظت میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ چارلس اول کی رقت انگیز تقریر جو اس نے پھانسی چڑھنے سے پیشتر کی۔ اس عقیدہ کا لب لباب ہے۔ اس نے کہا:

> ''میں ہر انسان کی طرح سچے دل سے ان کی آزادی کا خواہاں ہوں لیکن مجھے تم کو یہ بتا دینا چاہئے کہ ان کی آزادی ایسی حکومت اور قوانین کے نفاذ میں مضمر ہے جن کے ذریعہ ان کی جان و مال کی حفاظت کی جا سکے۔ اس کے لیے ان کا حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لینا ضروری نہیں۔ بادشاہ اور رعایا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔''

دستور اور قانون کے فلسفہ پر اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی نہ ڈالی جا سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ انگریز بادشاہ اس لحاظ سے آئینی طور پر کام کرتے رہے کہ ان کی حرکات دستور و قانون کے بالکل مطابق تھیں اور سابقہ روایات بھی ان کی شاہد تھیں۔ رعایا ہمیشہ اس بات پر بضد رہی کہ اسے اپنے بنیادی حقوق پر زور دینے کا حق حاصل ہے اور وہ انہیں بزور یا بغاوتوں کے ذریعہ بادشاہ سے حاصل کر سکتی ہے۔ 15/ جون 1215ء کو جب بادشاہ جان کو مگنا چارٹر پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا تو قانون اور دستور کے اصول کی بنیادیں ہل گئیں۔ چارٹر کی دفعہ 61 ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس نے رعایا کو بادشاہ کے خلاف ایسی حالت میں بغاوت کی آزادی تفویض کر دی جب وہ چارٹر کی دفعات پر گریز کرتے تھے۔ انگلش آئینی

تاریخ کا مشہور مصنف رقم طراز ہے کہ بغاوت کرنے کا حق آج برطانوی آئین کی ویسے ہی بنیاد ہے جیسے کہ 1215ء میں تھا۔ لیکن اگر چہ دستور وقانون کے اصول کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں بایں ہمہ وہ کلیتاً فنا نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ عبوری دور میں تاج نہ صرف بلا واسطہ ٹیکسوں سے روپیہ فراہم کرنے کے حق پر زور دیتا رہا بلکہ خصوصی اختیارات سے فراہم کرنے پر بھی، اور اکثر حالتوں میں بادشاہ نہ صرف نافذ قوانین کو توڑ کر یا ان سے پہلوتہی سے آئین ساز مجلس کے اختیارات پر چھاپا مارتا، بلکہ بعض اوقات خسروانہ اعلانات سے بھی یہ کام نکال لیتا۔ ہلام رقم طراز ہے۔ بادشاہ اس بات کا دعویٰ کرتا کہ اسے ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جن کا برقرار قانون کی روح تقاضا کرتی ہو، نہ صرف خود آئین مرتب کرنے کا حق حاصل ہے بلکہ وہ اپنی اس وسیع مقتدر طاقت کو بھی استعمال میں لاسکتا ہے جو اسے ان مراعات سے بھی بڑھ چڑھ کر حقوق تفویض کرتی ہے جو اسے قانونی طور پر حاصل ہیں۔ یہ حق بادشاہ کا خسروانہ اور مطلق العنان طاقت کا حق ہے اور جب کبھی کونسل محسوس کرے کہ پبلک کو خطرہ لاحق ہے تو اسے ''پبلک کے تحفظ'' کی خاطر استعمال کرتا ہے۔

Stuarts بادشاہوں کے دور تک قانون کی عدالتیں ان طاقتوں کو تسلیم کرتی تھیں جن کے مالک ہونے کا تاج کو دعویٰ تھا۔ ایڈم کے الفاظ میں ''قانون لوگوں کے قانونی قتل کے لیے ہتھیار کا کام دینے لگا۔'' یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ قانون ودستور کا عمل ہی تھا جس نے تاج کی طاقت کو مضبوط بنانے میں مدد دی۔ چونکہ شاہی خزانہ کی عدالتیں بار بار فیصلے صادر کرتیں کہ ٹیکس لگانے کی طاقت تاج کو حاصل ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ تاج اس طاقت کو ہمیشہ مفاد عامہ میں استعمال کرے گا۔ ایک ایڈم لکھتا ہے Stuarts نے اپنی ہر حرکت کے لیے کوئی نہ کوئی قانونی استحقاق ڈھونڈ لیا اور من جملہ تاریخ بادشاہوں کا ساتھ دیتی رہی۔

لیکن دار العوام نے اس دستور و قانون کے دعویٰ کو کس طرح نبھایا۔ انھوں نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر یکے عدم تعاونیوں کا رویہ اختیار کیا۔ پارلیمنٹ میں انھوں نے ہر بار اس بات سے انکار کیا کہ جب تک ان کی شکایات دور نہیں کی جاتیں وہ محصولات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ بادشاہ نے اپنی مرضی سے ٹیکس وصول کرنے شروع کیے اور عدالتوں نے اس کی حمایت کی چنانچہ پارلیمنٹ نے یہ ریزولیشن پاس کیا کہ جو لوگ انھیں ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ انھیں انگلستان کی آزادی کے دشمنوں اور غداروں کے زمرہ میں شمار کیا جائے گا۔ اب کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی کہ انقلاب پاؤں پھیلا رہا ہے اور چارلس نے 17 رجون 1626ء کو مسودہ حقوق عامہ پر اپنے دستخط کر دیے۔ مسودہ حقوق عامہ عدم تعاونیوں کی فتح تھی۔ چونکہ یہ ان کے سرکاری نظم ونسق میں حصہ لینے سے انکار کا نتیجہ تھا کہ دار العوام نے بادشاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کے حقوق کو تسلیم کرے۔ اس کے بعد 1629ء اور 1640ء کے درمیان جو واقعات رونما ہوئے انھوں نے صحیح معنوں میں انگلستان کی تاریخ مرتب کر دی۔

مسودہ حقوق کے باوجود بادشاہ محصول اکٹھے کرتا رہا۔ اور ایلیٹ اور اس کے رفقا کے خلاف مقدمات دائر کر دیئے گئے۔ انھوں نے پیروی سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ بادشاہ کی مطلق العنان طاقت کے لیے مہلک نکلا۔ بادشاہ نے قوم پر محصول جہاز رانی عائد کیا۔ متعدد مقامات کے پولیس افسران نے اعلان کر دیا کہ کارندے پارلیمنٹ کے حکم کے بغیر محصول اکٹھا کرنے کے مختار نہیں۔ لوگوں کے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کی بنا پر ان کے ڈھور ڈنگروں کی نیلامی بولی گئی۔ مگر انھیں خریدنے والا کوئی نہ ملا۔ بادشاہ نے اس مسئلہ پر عدالت خزانہ کی رائے معلوم کی کہ جب تمام سلطنت کی بھلائی کا سوال درپیش ہو اور تمام سلطنت خطرہ میں ہو (یہاں اس طرف خاص دھیان دیں

کہ کس طرح گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ہو بہو وہی الفاظ درج ہیں) تو کیا بادشاہ اپنی سلطنت کی تمام رعایا کو اس بات کا حکم نہیں دے سکتا کہ وہ بادشاہ کے لیے ضروری جہاز، سامان حرب اور ان کے جہاز ران مہیا کرے؟ (پھر فارمولا ملاحظہ ہو) انکار اور سرکشی کی صورت میں قانون کے ذریعہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا؟ اور آیا ایسی حالت میں بادشاہ اس خطرہ اور اسے دور کرنے کے مناسب اقدامات اٹھانے کا واحد جج نہیں؟ ججوں نے اثبات میں جواب دیا اور اپنے اس شان دار مقدمہ میں جو ہمپڈن ان کے سامنے لایا تھا۔ یہی فیصلہ صادر کیا۔

میں صرف ایک نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسٹورٹوں اور پارلیمنٹ میں طویل اور تلخ جنگ کے دوران میں اسٹورٹ قانون ودستور پر عمل کرنے کی حمایت کرتے رہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ قانون اور دستور دونوں نے ان کی پشت پناہی کی۔ خانہ جنگی کے موقع پر جس سوال پر پارٹیاں قائم ہوئیں، یہ تھا کہ کیا تاج امن وامان قائم رکھنے کے ماتحت رعایا کی خاموش وفاداری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یا کیا رعایا مزاحمت کی کسی طاقت کی حق دار ہے۔ خواہ اس مزاحمت کا نتیجہ طوائف الملوکی یا قانون شکنی کی صورت میں برآمد ہو۔ پارلیمنٹ کے حامئین لوگوں کے وقار اور طاقت، پارلیمنٹ کی آزادی واختیار انفرادی آزادی، حق مزاحمت، بادشاہ کو تخت سے دستبردار اور معزول کرنے کے حق کے طرف دار تھے یا مختصراً یہ کہ وہ ریاست کی جابرانہ طاقتوں کے خلاف ''انسان'' کے طرف دار تھے۔

تاج کے حامئین بادشاہ کے غیر منفک حق کے طرف دار تھے۔ یعنی ایسا حق جو رعایا کی خاموش وفاداری اور دستور وقانون کے عمل سے لوگوں کی عدم مزاحمت کو حاصل کر سکے۔ المختصر وہ انفرادی آزادی کے خلاف ریاستی تشدد اور جبری تعاون کے حامی تھے۔

اس جھگڑا کا فیصلہ پارلیمنٹ کے حق میں ہوا۔ لیکن ہر اس جنگ کی طرح جو ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے۔ پارلیمنٹ کی فتح بھی عارضی تھی۔ اگرچہ انفرادی آزادی کے نکتہ نظر سے خانہ جنگی کا نتیجہ مہلک ثابت ہوا اور اس کے لیے ابھی ایک اور انقلاب کی ضرورت تھی۔ بہ ایں ہمہ انفرادی آزادی کو پختہ بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیے اب اس چیز کے علم نے کہ رعایا بڑے اکھڑ پن سے اپنے بادشاہ پر سوار ہو گئی تھی۔ غیر متشدد انقلاب کے لیے زمین تیار کر دی اور پرانی رسومات اور تکریمات کی زنجیروں سے خلاصی دلانے کے عمل کو تیز کر دیا۔

1688ء کے غیر متشدد انقلاب نے انگلستان کو ایسے قانون کی حکمرانی بخش دی جو دستور قانون کے نفاذ کی اصل اساس ہے۔ اس انقلاب نے اس کام کو تکمیل کا سہرا نصیب کیا۔ جسے لمبی پارلیمنٹ نے شروع کیا تھا اور جو چارلس اول کی پھانسی سے ادھورا رہ گیا تھا۔ لیکن 1688ء کا انقلاب کیسے رونما ہوا؟ اس اختیار کی مزاحمت اور اس اصول کی شدت سے پیروی کرنے سے جو کہ رعایا کا بنیادی حق ہے۔ یعنی لوگوں کا یہ حق کہ وہ امتیازی حقوق کی مالک مطلق العنان اور جابرانہ حکومت کی مخالفت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

جس اصول کا 1688ء کا انقلاب علم بردار تھا۔ ڈاکٹر شاشرول کے شاندار مقدمہ میں اسے فتح کا سہرا نصیب ہوا۔ اپنے اصولات کی تبلیغ میں وہ حسب ذیل محسوسات کا اظہار کرتا ہے:

> ''ہماری حکومت کے بچاؤ کا دارومدار لوگوں کے اس عقیدہ پر ہے کہ وہ مقتدر طاقت کے ساتھ مکمل اور غیر مشروط وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں اور کسی بنا پر بھی حکومت کے مقابلہ کو جائز نہیں سمجھتے۔''

یہ خاموش وفاداری اور غیر مزاحمانہ جذبہ کا عقیدہ ہے۔ یعنی ایسے قانون و دستور کا عقیدہ ہے جس کا ہر دفتریت پسند علم بردار ہے۔ وہ ہمارا ہندستانی بھائی ہو یا کوئی اجنبی دیس کا باشندہ اور یہی وہ عقیدہ ہے جسے حقوق حکومت اور فرائض رعایا کا آخری لفظ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ذرا غور فرمائیں 1610ء میں انگلستان میں انھوں نے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا۔ دار العوام نے ڈاکٹر شاشرول کو باقاعدہ طور پر مورد الزام قرار دیا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ اس نے انفرادی آزادی کا گلا گھونٹا ہے۔ دار الخواص نے اسے مجرم قرار دیا۔ مقدمہ کے دوران میں کی گئی تقریریں قابل نوٹ ہیں۔ میں ان میں سے چند فقرات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سر جیکل نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا:

''چونکہ قانون ہی خسروانہ اختیار اور لوگوں کی غلامی کا واحد ذریعہ ہے چناں چہ قانون اپنا وجود اور طاقت لوگوں کی مرضی سے حاصل کرتا ہے اور اسے عوام الناس کی مرضی کے بغیر کسی اور بنیاد پر قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگوں کی وفاداری سے محروم ہو جاتا ہے۔ عام پسند کی تحریک بادشاہ اور عوام کو اس کی تعمیل کا سبق دیتی ہے۔ مائی لارڈز! چوں کہ انقلاب کے دوران میں تمام قوم نے غیر محدود وعدم مزاحمت کے نظریہ کی عملاً مذمت کی۔ اس لیے پارلیمنٹ کے بعد کے پاس کردہ متناقض قوانین کے بارے میں جس میں انھوں نے اپنے نظریہ کے ترک کا اظہار کیا۔ میں یہ کہوں گا کہ یہ کبھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قوانین ایسی مستبد طاقت کے قیام کی خاطر عمل میں لائے گئے ہوں جو خود ان کا ہی قصہ پاک کر دے اور حکومت کے ایسے آئین کو الٹ کر رکھ دے جس کی حمایت میں انھوں نے آواز بلند کی تھی۔''

''مسٹر والپول'' دریا کو اس طرح کوزہ میں بند کرتے ہیں:

> ''غیر مشروط وغیر محدود خاموش وفاداری کے نظریہ کو جنم
> دینے کا اولین مقصد مستبد اور مطلق العنان حکومت کی حمایت تھی
> اور کسی ایسی حکومت نے اس کی کبھی حمایت اور دل جمعی نہ کی جو
> اس سے فائدہ اٹھانے کے منصوبے نہ رکھتی تھی۔''

قانون ودستور کے نظریہ کے خلاف اس سے پختہ دلیل نہیں دی جاسکتی۔ آپ کا نظریہ واضح طور پر یہ ہے کہ قانون ودستور ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ استبدادیت اپنے پاؤں مضبوط کرتی ہے تو یہ سراسر مبنی بر فریب ہے۔ میں یہاں ایک اور حوالہ پیش کرتا ہوں۔ میجر جرنل سٹین سہوپ اپنی تقریر میں فرماتے ہیں:

> ''مطلق غیر مزاحمت کے نظریہ کے متعلق دلائل سے ثابت
> کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ قوانین فطرت، قوانین عقل
> اور ہر ملک اور ہر عہد کے رواجات کے سراسر منافی ہے اور غالباً
> دنیا کا ہر ایک فرد تمام ممالک، تمام کلیساؤں اور تمام ریاستوں
> کے متعلق یہ کہے گا کہ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ظلم وجبر کی
> طاقتیں ان کے مذہبی اور شہری حقوق پر چھاپے مار رہی ہیں
> تو انھوں نے خود کیا رویہ اختیار کیا۔''

یہ انگلستان میں تحریک آزادی کی تاریخ ہے۔ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہاں لوگوں نے قانون ودستور کو چپ چاپ تسلیم کر کے اپنے بنیادی حقوق تسلیم نہیں کرائے۔ اوپر میں بیان کردہ حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس وقت تک قانون نہیں بن سکتی جب تک اس کی بنیادیں لوگوں کی رضامندی پر قائم نہ کی جائیں۔ ثانیاً یہ کہ جہاں یہ رضامندی موجود نہ ہو لوگ ایسے قانون کی تعمیل پر مجبور نہیں۔ ثالثاً یہ

کہ جہاں یہ قوانین نہ صرف لوگوں کی رضامندی پر قائم کیے گئے ہوں بلکہ ان بنیادی حقوق کو کچلنے پر محمول ہوں۔ رعایا کو بغاوت باطاقت کے ذریعہ انھیں معزول کرانے کا حق حاصل ہے۔ چہارم یہ کہ قانون اور دستور استبدادیت کا آلہ کار رہے ہیں اور آخری طور پر یہ کہ جب تک قانون کا حقیقی راج قائم نہیں ہوجاتا، نہ تو قانون قائم ہوسکتا ہے اور نہ ہی دستور۔

میں نے اس مسئلہ پر اس لیے کھول کر روشنی ڈالی ہے کہ یہ نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اور کئی اعتدال پسند ایسے ہیں جواب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ امن وامان کے قیام میں حکومت کی مدد کرنا رعایا کا فرض ہے۔ آج ہر ہندستانی کی انفرادی آزادی کا دارومدار بڑی حدتک وسیع اختیارات کے مالک ارباب حل وعقد کی مطلق العنان طاقتوں پر ہے۔ جہاں ایسی طاقتوں کا بول بالا ہو قانون کا راج فوت ہوجاتا ہے۔ آپ کو اگر اس بات کا اندازہ لگانا ہو کہ سنجیدہ مزاج فاضل انسانوں پر قانون اور دستور کا یہ نظریہ کس حدتک اثر رکھتا ہے تو اس کمیٹی کی رپورٹ کا مطالعہ فرمائیں جو متشددانہ قوانین پر رائے دینے کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ آپ کو یہ رپورٹ محبِ وطن کی نظر سے خالی اور سیاست داں کے تدبر سے عاری معلوم ہوگی۔ البتہ آپ کو "قانون ودستور" کے الفاظ پر جن کی خوب اشاعت کی جاتی ہے اور جن کا جی بھر کر غلط مفہوم لیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ زور دیا ہوا معلوم ہوگا۔ ریگولیشن 3 آف 1818 میں ترامیم لانے اور اسے قانونی کتابوں میں موجود رکھنے کا مدعا کیا ہے۔ اس لیے کہ ہندستان کی سرحدات کی حفاظت اور ہندستانی ریاستوں کے بارے میں ہندستان سرکار کو اپنے فرائض نبھانے کے لیے ایگزیکٹو کے پاس ایک قانون کی ذات میں ایسی طاقتیں ضرور موجود ہونی چاہئیں جن سے ایسے افراد کی حرکات اور سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کی جاسکیں۔ جو قانون فوجداری ضابطہ کی کسی دفعہ کی زد میں نہ آتے ہوں۔ لیکن انھیں کسی نہ کسی تعزیر میں رکھنا ضروری ہو۔

ہندستانی ضابطہ فوجداری کے ترمیمی ایکٹ 1908 اور 1911 Prevention of Saditious Meeting Act 1911 کو قانونی کتابوں میں برقرار رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ فاضل انسان اپنے ذہن میں اس بات کا خیال نہیں لا سکتے کہ یہ دفعات اور قوانین جن کے ذریعہ ایگزیکٹو کو نہایت وسیع اور غیر محدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حالات پیدا کر دیتے ہیں جس کا مقابلہ کرنا اور ان قانون سوز قانونوں کی خلاف ورزی کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ یہ قوانین بذاتہٖ قانون اور دستور کی ضد ہیں اور جہاں آپ قانونوں کی حکمرانی کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھ دیں، آپ فوراً چکمہ کاٹ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ۔ ''پرامن شہری ہونے کی حیثیت میں یہ آپ کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کریں۔''

ہم اپنی قومی تاریخ کے پچھلے چند سالوں میں اس قانون و دستور کا خوب مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ہمارے مسئلہ پر آخری بات چیت اس ضابطہ فوجداری کے ترمیمی ایکٹ کے ایگزیکٹو حکم سے لگائی گئی جس کی رو سے کانگریسی رضا کاروں کے جائز کام کو ناجائز اور مجرمانہ قرار دیا گیا۔ ہمارے اعتدال پسند دوستوں نے اس کی اس بنا پر حمایت کی کہ پرامن رعایا کا یہ فرض ہے کہ وہ قانون و دستور کے قیام میں سرکار کی معاونت کرے۔ میں پیشتر ازیں عرض کر چکا ہوں کہ یہ عقیدہ انگلستان سے ہندستان چل کر آیا ہے۔ لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آیا جو دلائل آج دفتری حکومت اور اس کے حواری پیش کر رہے ہیں ان میں ان دلائل سے کچھ فرق ہے جنھیں Stuarts بادشاہ نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔ جب Stuarts نے ایسے لوگوں کو جو دربار شاہی کی نظروں میں کھٹکتے تھے، جیلوں میں بند کرنے کے امتیازی اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے تو اس کے لیے انھوں نے یہ بہانہ تلاش کیا کہ قوم کی حفاظت کے لیے یہ پالیسی ضروری تھی۔ اس طاقت کا انگلستان میں مقابلہ کیا گیا اس لیے نہیں کہ

اسے قوم کی حفاظت میں کبھی استعمال نہ کیا گیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ ایسی طاقت کا وجود انفرادی آزادی کے وجود کے سراسر منافی تھا۔ جب Stuarts بادشاہوں نے شاہی اعلانات کے ذریعہ قانون نافذ کرنے پر عمل شروع کیا اور قوانین میں ردوبدل اور تنسیخ بذات خود کرنے لگے تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ پبلک امن میں ایسا کرنا ضروری ہے۔ انگریز پبلک نے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس لیے نہیں کہ ایسے قانون پبلک امن کے لیے ضروری نہ تھے، بلکہ اس لیے کہ ایسا حق قوم کے اس حق کے ساتھ کہ اسے اپنے لیے قانون بنانے کا خود حق حاصل ہے موجود نہیں رہ سکتا تھا۔ کیا ہندستان میں گورنر جنرل کا یہ اختیار کہ برٹش ہندستان کے مفاد میں پبلک امن وحفاظت کے لیے آپ خود قانون نافذ کرسکتے ہیں۔Stuarts بادشاہوں کے اختیارات خصوصی سے کوئی مختلف شے ہے۔ دراصل ان اختیارات میں جن کے سٹارٹس دعوی دار تھے۔ ہندستان میں گورنر جنرل اور صوبہ جاتی گورنروں کے اختیارات میں قوی مشابہت موجود ہے۔ جب سٹارٹس نے اس بات کا دعوئ کیا کہ انھیں بذات خود اپنی مرضی سے محاصل بڑھانے کا حق حاصل ہے تو انھوں نے اس کے جواز میں یہ کہا کہ جب تمام سلطنت کی بھلائی اور حفاظت مقصود ہو اور تمام سلطنت خطرہ میں ہو تو ایسا کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ انگلستان میں اس حق کی اس لیے مخالفت نہ کی گئی کہ ایسے اختیارات کے ذریعہ اکٹھے کیے گئے محاصل کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ایسا حق لوگوں کے اس حق کے سراسر خلاف تھا کہ لوگوں کو ایسے ٹیکس ادا کرنے کے لیے ان کے نمائندوں کو ہی ایسے ٹیکس لگانے کا حق حاصل ہے۔ کیا گورنر جنرل کا یہ حق کہ بجٹ میں کوئی دفعہ کسی خاص حد کے اخراجات کی کفیل نہ ہوسکے، تو گورنر جنرل بذات خود اپنے اختیارات خصوصی سے وہ کمی پوری کرسکتے ہیں۔ سٹارٹس بادشاہوں کے اس حق سے مختلف ہے؟ ہم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم قانون کے راج میں زندگی نہیں گزار رہے

اور انگلستان کی تاریخ نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ایسی حالت میں کہ جب ایگز یکٹو وسیع اختیارات کی مالک ہو، قانون ودستور کی باتیں کرنا فضول ہے۔ انگلستان کے جواں مردوں نے بڑی بہادری سے قانون ودستور کی حیلہ سازیوں کا مقابلہ کیا۔ اگر ہندستان میں بھی ایسے مردموجود ہیں تو ہندستان بھی دفتری سرکار کی حیلہ سازیوں کا جرأت سے مقابلہ کرے گا۔

میں نے انگلستان کی تاریخ سے اس لیے تفصیل کے ساتھ حوالہ جات پیش کیے ہیں کہ اس تاریخ کے پیش کردہ حقائق بہت سے لوگوں کو اپیل کرتے ہیں جو عام تحریکوں سے گھبرا کر قانون اور دستور کو آوازے دینے لگتے ہیں اور جن کا یہ خیال ہے کہ ہندستانی قوم کی نشوونما اس تاریخ کی لائنوں پر ہونی چاہئے۔ میں قانون ودستور کے ڈھکوسلہ کی مخالفت کرتا ہوں کہ یہ ہر فرد اور ہر قوم کا غیر منفک حق ہے کہ وہ سچائی پر کھڑی ہو اور قانون سوز قانونوں کی سختی سے مزاحمت کرے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ایک قانون رائج تھا۔ جس کی رو سے لوگوں کو یوم السبت پر کھانے کی اجازت نہ تھی مگر پادری اس دن کی بے حرمتی کرسکتے تھے۔ اب سنئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس دن کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا۔ انجیل میں رقم طراز ہے:

”اس روز حضرت یسوع گندم کی فصل سے گزرے اور آپ کے پیروکار بھوکے تھے۔ انھوں نے گندم کے خوشے اتار کر کھانا شروع کیے مگر جب یہ تماشا یہودیوں نے دیکھا وہ آپ کے پاس آکر بولے دیکھئے آپ کے پیروکار ایسی حرکت کررہے ہیں جو یوم السبت پر جائز نہیں۔

لیکن آپ نے انھیں جواب دیا۔ کیا آپ نے یہ نہیں پڑھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور آپ کے ہمراہیوں نے جب وہ بھوکے تھے۔ کیا کیا۔

آپ کس طرح خدا کے گھر میں داخل ہوئے اور وہاں آپ نے ایسی روٹی کھائی

جو نہ تو آپ کے لیے کھانا جائز تھی اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے جو آپ کے ساتھ تھے۔ البتہ صرف پادری ہی وہ روٹی کھا سکتے تھے۔

یا کیا تم نے قانون میں یہ نہیں پڑھا کہ یوم السبت کو عبادت گاہ میں پادریوں نے کس طرح سبت کی بے حرمتی کی اور پھر بھی بے گناہ رہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ قانون اور دستور انسان کے لیے ہیں اور انسان قانون اور دستور کے لیے نہیں۔ قومیت کو فروغ دینا ایک مقدس فریضہ ہے اور جو چیز اس فریضہ کے راستہ میں مزاحم ہوتی ہے وہ ایک ایسا روڑا ہے جسے قوم کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے راستہ سے ہٹا دینا چاہیے۔ چنانچہ اگر آپ کوئی ایسا عقیدہ وضع کرتے ہیں جس کا مقصد اس فریضہ سے دور لے جانا ہو تو ایسا عقیدہ کیوں موجود رہے۔ اگر آپ کی قانون و دستور تک اتنی رسائی ہے کہ آپ قانون کا راج قائم کر سکتے ہیں تو آپ کا قانون اور دستور پر امن شہریوں کی نظروں میں جائے عزت رکھنے کا مستحق ہے۔ لیکن جوں ہی یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کو وہاں دخل حاصل نہیں۔ تو پھر آپ کو اسے قائم رکھنے کی بجائے تباہ و برباد کرنا چاہیے، اور آپ کے لیے اس کی عزت کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔ کیوں کہ اعلیٰ قانون یعنی قانون فطرت یا قانون الٰہی ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم ان کا مقابلہ کریں۔ جب میں دستور و قانون کے مقدس نام میں کسی ایسی چیز کو پیش ہوا دیکھتا ہوں جس کا دانستہ طور پر مقصد قوم کی ترقی، فروغ اور استکمال نفس کو روکنا ہو تو مجھے اس اعلان میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ ایسا قانون و دستور انسانیت پر حملہ اور خدا کی توہین ہے۔

لیکن اگرچہ ہمارے اعتدال پسند دوست اس قانون و دستور کے نعرہ سے راہ گم کر بیٹھتے ہیں میں اس نعرہ کو سن کر خوشی محسوس کرتا ہوں۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ دفتری حکومت خطرہ میں ہے اور یہ کہ دفتری حکومت نے اس کا احساس کر لیا ہے۔ یہ بات کافی وزن رکھتی ہے کہ یہاں یوں ہی فضول سا سوال کھڑا کر دیا گیا ہے مگر مجھے اس

حقیقت کے اعتراف سے کہ فضول سا سوال کھڑا ہو گیا ہے قوت اور امید حاصل ہوتی ہے۔ میں اپنے ہم وطن بھائیوں کو صبر کی اپیل کرتا ہوں۔ آزادی کی منزلیں خود بخود طے ہوتی معلوم ہوتی ہیں جب قانون و دستور کے خطرہ کا بگل بجنے لگتا ہے۔ دنیا بھر میں دفتریت پرستوں کی یہ ہی تاریخ رہی ہے۔

اس دوران میں ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے نصب العین پر سختی سے قائم رہیں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم بھاری انقلابات کے پاس کھڑے ہیں۔ عالم گیر طاقتیں ہر جگہ اپنا کام کر رہی ہیں اور آزادی کی لڑائی ابھی جیتنا ہے۔

ہمارا نصب العین کیا ہے؟ سب سے اوّل نیشنلزم۔ تو نیشنلزم کیا ہے؟ یہ میری رائے میں ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ قوم کی ہستی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس عمل سے دوسری اقوام کی ترقی و فروغ اور استکمال نفس کو بھی قوی مدد پہنچتی ہے۔ اختلاف ایسی ہی حقیقت ہے جس طرح اتفاق۔ اور اس خیال کے پیش نظر کہ تمام اقوام عالم کو ایک لڑی میں پرویا جا سکے۔ یہ ضروری ہے کہ ہر قوم خود اپنے راستہ پر چل کر اپنے استکمال نفس اور خود ترجمانی کے اصول کو تکمیل کا سہرا پہنا لے۔ قومیت کے جس نظریہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اسے اس نظریہ قومیت میں نہ الجھائیں جس کا آج یورپ میں دور دورہ ہے۔ یورپ کی قومیت پروری جارحانہ نوعیت کی ہے۔ وہ خود غرضانہ، بیوپاری اور نفع ونقصان کی قومیت پسندی ہے۔ فرانس کا نفع جرمنی کا نقصان اور جرمنی کا فائدہ فرانس کا گھاٹا ہے۔ چنانچہ جرمن قومیت پروری فرانسی قوم کی نفرت پر پرورش پاتی ہے، اور فرانسی قوم پسندی جرمن قوم کی نفرت پر۔ تم نے ابھی تک اس بات کا احساس نہیں کیا کہ تم انسانیت کو مجروح کیے بغیر جرمنی کو مجروح نہیں کر سکتے۔ یہ ہے تصور یورپی قومیت کا جس کے متعلق میں آج آپ سے گفتگو کر رہا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسے قوم پرورانہ تصور سے ایک قوم شدید قسم کے رشتہ وحدت میں منسلک ہو جاتی ہے۔ لیکن کوئی

قوم اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ جب تک وہ اپنی ہستی کو انسانیت کے ساتھ منسلک نہ کردے۔ تو قومیت پروری کے تمام مسئلہ کا لب لباب یہ ہے کہ ہم انسانیت کے ان سرچشموں کو تلاش کریں۔ اگر آپ ان کا رخ معلوم کرلیں اور اس کا رشتہ ماضی کے سلسلہ میں جوڑ دیں تو سمجھ لیں کہ آپ نے اپنی ترجمانی کے عمل کو شروع کر دیا۔ اور قومیت پروری کی ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔

میں ہندستانی تاریخ کے اوراق میں ایک بات نہایت واضح دیکھتا ہوں۔ اس وسیع ملک پر ایک تحریک کے بعد دوسری تحریک کا حملہ ہوا۔ بظاہر ان سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے منافرت کے بیج بو دیے ہیں۔ مگر دراصل انھوں نے ہندستان کی قوتوں کو بیدار کیا اور لوگوں کی زندگی کو ایک بڑی قوم میں پرو دیا۔ آرین اور غیر آرین آپس میں اس لیے ملے کہ ان سے ایک قوم جنم لے۔ برہمن ازم نے اپنے بھاری کلچر کے ساتھ ہندستان کو متحد کر دیا اور اس نے اپنے آپ کو ایک عظیم اتحاد پرور طاقت ثابت کیا۔ بدھ ازم نے برہمن ازم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسی مقصد کی خدمت کی اور مگدھ سے ٹیکسلا تک ایک وسیع سلطنت کا سنگ بنیاد قائم کیا۔ جس نے نہ صرف ہندستانی اتحاد کو وسیع کیا۔ بلکہ ہندستان کی حدود سے اور سمندروں سے پرے ایک وسیع ہندستان قائم کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ مقدس مقام جہاں آج ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔ ایشیا کے کروڑ ہا لوگوں کی زیارت گاہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد مسلمان وارد ہوئے جن کی نسل جداگانہ تھی۔ مگر وہ ایسے تمدن کے مالک تھے کہ جو ان سب کی مشترکہ میراث تھی۔ عارضی طور پر یہ ہی معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی طاقت ہیں جو قومیت کے تصور کو پریشان کر دیں گے۔ لیکن مسلمانوں نے ہندستان میں ڈیرے ڈال دیے اور انھوں نے ہندستان کی رگوں میں نیا خون اور نئی قوت بھر دی۔ انھوں نے انتہائی تدبر سے ہندستانی دیہات کو بالکل ہاتھ نہ لگایا۔ حقیقت میں ہندستانی دیہات اصل

ہندستان تھا۔

ہندستان کے لیے اس نئے نظریہ کی ضرورت تھی۔ ان کا مقصد اپنے آپ کو تکمیل دینا اور ہندستانی تاریخ کی قسمت کا سامنا کرنا تھا۔ اس کے بعد انگریز اپنے اجنبی تمدن اور اجنبی طریقوں کے ساتھ تشریف لائے۔ انھوں نے ہندستانی نیشنلزم کے تصور کو بڑا دھکا لگایا۔ لیکن اس نقصان نے ہندستان کو متحد کر دیا ہے اور ہندستانی تاریخ کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ ہندستانی عظیم قومیت راہ راست پر ہے۔ یہ ہمالیہ سے پار اپنے ہاتھ دراز کر رہا ہے۔ جارحانہ طور پر نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی ہستی کا اعتراف کرانا چاہتا ہے اور اسے دنیا کی خدمات سرانجام دینا مقصود ہے۔ میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ نظریہ قومیت اور عالمگیر امن میں کوئی تضاد موجود نہیں۔ قومیت پروری ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ عالمگیر امن پیدا ہوگا۔ یہ کمال یورپ کی جارحانہ قومیت پروری کو حاصل ہے کہ وہ عالمگیر امن کے راستہ میں حائل ہے۔ لیکن جوں ہی کہ دنیا نے اس بات کا احساس کر لیا کہ ایک قوم خود اپنی ذات کو نقصان پہنچائے بغیر کسی دوسری قوم کو نقصان نہیں پہنچا سکتی، انسانیت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ قومیت کا حقیقی راز اس میں مضمر ہے کہ ہر قوم کے لیے اپنے آپ کو ترقی اور تکمیل دینا ضروری ہے۔ تا کہ انسانیت بذاتہ ترقی اور تکمیل پا سکے۔ مجھے یقین ہے کہ قومیت کی یہ سچائی زندہ رہے گی۔ اگر چہ اس وقت اقوام عالم حقیقی مسئلہ کو نظر انداز کر کے باہم دست وگریباں ہیں، اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو خود غرضی اور خود حفاظتی کا یہ خلقی جذبہ ہے۔ جو حتمی طور پر اس مسئلہ کو حل کرے گا۔ میری مراد آج کی تنگ اور غلط خود غرضی سے نہیں بلکہ ایسی خود غرضی ہے جسے تمام دنیا کے ذہن پرور روح نے اپنا رکھا ہے۔ یعنی ایسی خود غرضی جو تمام اقوام عالم کو یہ احساس دلائے گی کہ اپنے ہمسایوں کو نیچے دبانے کی مساعی میں ان کی اپنی تباہی اور بربادی مضمر ہے۔

چنانچہ ہمیں قومیت پروری کی روح کو اجاگر کرنا ہے۔ ہندستانی قوم کی حقیقی ترقی سوراج کی منزل سے وابستہ ہے۔ عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ سوراج کیا ہے۔ سوراج کی محدود تعریف مشکل ہے اور اسے کسی خاص نظام حکومت کے ساتھ نہیں الجھایا جاسکتا۔ سوراج اور سوراجیہ میں زمین وآسمان کا فرق موجود ہے۔ سوراج ایک قومی ذہن کا فطری اظہار ہے۔ اس کا مکمل مفہوم قوم کی تمام تاریخ کو اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے۔ بایں ہمہ یہ حقیقت ہے کہ سوراج کا آغاز قوم کی ترقی اور فروغ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ میں کہہ چکا ہوں کہ سوراج قومی ذہن کا فطری اظہار ہے۔ چنانچہ ایک اور زاویۂ نگاہ سے قومیت کا مسئلہ وہی ہے جو سوراج کا۔ اس لیے ہندستان کے تمام مسائل کا حل آج سوراج کا حصول ہے۔

اب میں طریقہ ٔ کار کی طرف دھیان دیتا ہوں۔ میں اس بات کو پھر دہراتا ہوں کہ یہ بات کسی شک وشبہ کی گنجائش کے بغیر ثابت ہو چکی ہے کہ عدم تشدد اور عدم تعاون ہی ایک ایسا طریقہ ٔ کار ہے جس کی ہمیں ایسے نظام کار کو حاصل کرنے کے لیے پیروی کرنی چاہئے جو دراصل سوراج کی بنیاد ہے۔ یہاں عدم تعاون کے فلسفہ پر لے دے کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں آپ کے سامنے مختلف نظریات رکھ دیتا ہوں۔ جن کی روشنی میں اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ قومی نکتہ نظر سے عدم تعاون کا مطلب یہ ہے کہ قوم اپنی قوت پر تمام توجہات مرکوز کرے اور اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو سکے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے عدم تعاون کے طریقہ کا مطلب اپنی ذات کو پاک اور مصفّٰی کرنا اور ایسے کاموں سے باز رکھنا ہے جن سے قومی ترقی اور انسانیت کو نقصان پہنچے۔ روحانی زاویۂ نظر سے سوراج کا مفہوم وہ علیٰحدگی ہے جو سادھنا کی زبان میں ''پروہت گھر'' کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ یعنی ایسی طاقتوں سے قطع تعلق کر لینا جو ہماری فطرت کے خلاف ہوں۔ یہ علیٰحدگی اور اتراک ایسے ہیں جو ہماری

پنہاں گہرائیوں سے قوم کی روح کو اپنی شان کمال تک باہر لانے کے لیے ضروری ہیں۔ میں اس نکتہ کی اور وضاحت نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ مسلمہ بات ہے کہ جس زاویہ نظر سے بھی عدم تشدد اور عدم تعاون کا مشاہدہ کریں۔ یہ ہمیں سوراج کی راہ پر گامزن ہونے کا سچا لائحہ عمل معلوم ہوگا۔

بایں ہمہ عدم تشدد کے لائحہ عمل پر بعض حلقوں سے شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ میں اس حقیقت کے اعتراف سے انکار نہیں کرسکتا کہ ملک کے اندر اور باہر کچھ لوگ ایسے موجود ہیں، جن کے نزدیک عدم تشدد ایک خالی خولی بات ہے۔ جسے عمل کی شکل دینا ممکن نہیں، اور ان کی نظروں میں سوراج حاصل کرنے کا واحد ذریعہ طاقت اور تشدد کا استعمال ہے۔ میں لمحہ بھر بھی ان لوگوں کی ہمت، قربانی اور حب الوطنی پر شک نہیں کرتا۔ جو لوگ اس عقیدے کے قائل ہیں، مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے بعض اپنے اس عزیز نصب العین کی خاطر مصائب اٹھا چکے ہیں۔ لیکن کیا مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے گی کہ اصولی پہلو کے قطع نظر تاریخ بار بار ان انقلابات کے بے کار ہونے کے ثبوت فراہم کرچکی ہے۔ جو طاقت اور تشدد کے نتیجہ تھے۔ میں اپنے آپ کو ان لوگوں میں شمار کرتا ہوں جو اصولی طور پر عدم تشدد کے حامی ہیں۔ لیکن آؤ ہم اس کی وقتی ضرورت کے سوال پر بھی غور کرلیں۔ کیا تشددانہ ذرائع سے سوراج حاصل کرنا ممکن ہے؟ اس کا جواب جو تاریخ دیتی ہے وہ نفی میں ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے انقلابات کا مطالعہ کیجئے۔

فرانسیسی انقلاب

فرانسیسی انقلاب کی تاریخ اولیں طور پر ایک ایسی جدوجہد ہے جس میں ایک طرف تو تاج اور امراء تھے اور دوسری جانب اسمبلی کے نمائندے اور ان کے ساتھ مسلح پیرس، دونوں نے تشدد سے کام لیا۔ اول الذکر نے بندوق سے اور مؤخر الذکر نے

برچھے سے۔ برچھے کو فتح نصیب ہوئی۔ کیوں کہ بندوق غیر یقینی ہاتھوں میں تھی۔ اور پھر جیسا کہ تشدد کے انقلابات میں ہوتا ہے۔ پاپولر پارٹی دو حصوں میں منقسم ہوگئی (Jacobins اور Girandins) گائرنڈنسوں نے صوبجات کو مسلح بغاوت کے لیے ابھارا۔ جیکوبنس نے پیرس کو تیار کیا۔ پیرس چوں کہ قریب اور مضبوط تھا۔ اس لیے گائرنڈنس شکست کھا گئے اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ طاقت جیکوبنس کے ہاتھ لگی۔ لیکن ابھی چند مہینے نہ ہوئے تھے کہ وہ خود باہم دست وگریباں ہوگئے۔ سوال صرف یہ تھا کہ فرانس پر کون سا گروہ راج کرے۔ فرانس طاقت ور سے طاقت ور کے سامنے گھٹنے ٹیکتا رہا۔ اور آخر نیپولین کی مطلق العنانیت کی دہلیز پر اس نے سر جھکا دیا۔ جو لوئیس چودہویں کی مطلق العنانیت سے بری نہ تھی تو کم از کم ایسی ضرور تھی۔ اب آزادی کی سنیے۔ نپولین اور ''کمیٹی آف پبلک امن'' کے ماتحت بھی لوگ آزادی سے محروم تھے، اور لوئیس پندرہویں اور چودہویں کے ماتحت بھی لوگوں کی کیا حالت تھی؟ محنت کشوں کے لیے انقلاب سے قبل یا انقلاب کے بعد کہیں آرام نہ تھا۔ روزانہ روٹی کی ایک خوراک ڈیڑھ اونس تک گر چکی تھی۔ کارلائل نہایت غمناک انداز میں رقم طراز ہے:

> ''اے مرد محنت کش! ان جدوجہد اور بہادری کے چھ سالوں سے تجھے کچھ نصیب نہیں ہوا۔ شفق کی سنہری شام میں تو مچھلی اور پانی پر گزراوقات کرتا ہے۔ اگر انسان کے انسان کے ساتھ تعلقات کا نتیجہ قحط سالی اور آنسوؤں کی ندی ہونا تھا اور آنسو بھی ایسے کہ جو خون کے آنسو ہوں۔ تو طلوع سحر کی مدہم روشنی سے منور زمین اتنی کیوں حسین تھی۔ شاہی قلعوں کی تباہی، برنسوکس کی بربادی، ارض وجہنم کی طاقتوں اور علاقوں کا مقابلہ کن کن چیزوں

کی تو نے جرأت کی اور کس کس کو تو نے برداشت کیا— یہ سالونز کی جمہوریت کے لیے تھا؟ جاگیردارانہ قسم کی امارت اس طرح ہٹ گئی جیسے کسی طوفان کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔ اور اب قدرتی عمل سے ہم سرمایہ کی امارت کو دیکھتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس سے آج تک یورپی سماج گزر رہے ہیں۔ کھلے طور پر یہ بدترین قسم کی امارت ہے۔ اس قدر بدترین جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

آج بھی فرانس سوراج کی طرف دشوار گزار راہ سے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر بڑھ رہا ہے۔

انقلابات انگلستان

انگلستان کی تاریخ بھی اسی سچائی کا ثبوت دیتی ہے۔ 1215ء کے جاگیرداروں کے انقلابات کا مطلب بادشاہ سے اختیارات چھیننا تھا۔ یوں کہیے کہ اختیارات چھین ہی لیے گئے۔ اس کے بعد طاقت امراء کے ہاتھ لگی اور امراء کی اس فتح سے جمہوریت کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ چنانچہ چارٹر اعظم ایک تاریخ دان کے لفظوں میں آزادی کا چارٹر نہ تھا۔ بلکہ آزادیوں کا چارٹر تھا۔ چارلس اوّل کے عہد انقلاب نے ایک ڈکٹیٹر کو جنم دیا جس نے آزادی کو کچل کر رکھ دیا۔ جس کام کا آغاز لمبی پارلیمنٹ نے کیا وہ ان انقلابات کی بدولت ادھورا رہا۔ جو چارلس اوّل کو پھانسی دیے جانے کے بعد رونما ہوئے۔ اس کام کو تکمیل کا سہرا پہنانے کے لیے اب ایک غیر خونی انقلاب کی ضرورت تھی۔ میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ وہ کام اب بھی مکمل ہے۔ مسلسل طبقاتی جنگ اور بالواضح اقتصادی ناانصافیاں اس آزادی کی مظہر نہیں جس کا انگلستان اپنے لیے دعویٰ دار تھا۔ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ کسی قوم نے تشدد کے ذریعہ آزادی حاصل نہیں

کی۔ طاقت کا استعمال ان لوگوں کو اخلاقی طور پر گرا دیتا ہے جو اسے استعمال کرتے ہیں، اور جب ایک بار وہ طاقت ان کے ہاتھ لگتی ہے پھر اس کو ترک کرنا انتہائی طور پر مشکل ہو جاتا ہے اور ان کے لیے طاقت اپنے پاس بحال رکھنے میں اپنے پیش روؤں کے کام کو چلانا آسان رہتا ہے۔ عدم تشدد اپنے وجود میں وہ زوال پذیر عناصر نہیں رکھتا جو تشدد کا لازمی جز ہیں۔

اٹلی اور روس میں انقلابات

اٹلی اور روس کے انقلابات اسی اصول کو واضح کرتے ہیں۔ اٹلی کے انقلابات جنھیں میزنی نے گرمایا اور گیری بالڈی اور کائیور نے عمل کا جامہ پہنایا۔ سوراج پیدا نہ کر سکے۔ اٹلی کی آزادی ابھی پرورش پا رہی ہے اور اٹلی کے مرد اور عورتیں ایک اور انقلاب کی طرف نگاہیں لگائے بیٹھے ہیں۔ اگر یہ انقلاب تشدد کے ساتھ رونما ہوا تو پھر اپنا مقصد کھو بیٹھے گا۔ البتہ اس سے آزادی اور عدم تشدد کی آخری فتح کا راستہ صاف ہو جائے گا۔

روس کا تازہ انقلاب خاص دل چسپی کا موجب ہے۔ اس نے جو شکل اس وقت اختیار کی ہے وہ نتیجہ ہے روسی لوگوں پر مارکسی اصولوں کے منطبق کرنے کا۔ تشدد پھر نا کام رہے گا۔ اگر میں نے حالات کا صحیح طور پر مطالعہ کیا ہے تو میں اس امید کا اظہار کر سکتا ہوں کہ وہاں ابھی ایک اور انقلاب بپا ہوگا۔ روس کی روح اپنے آپ کو کارل مارکس کے سوشلزم سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرے گی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ایک آزادانہ تحریک ہوگی یا اس میں موجودہ تحریک آزادی حاصل کرنے کے جراثیم موجود ہوں گے۔

میں انقلابات میں یقین رکھتا ہوں۔ لیکن میں پھر یہ بات ہراتا ہوں کہ تشدد سے آزادی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ عدم تشدد کا انقلاب آہستہ آہستہ رونما ہوتا ہے۔ مگر

یقینی ہوتا ہے۔ بہ تدریج قوم کی روح بیدار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ قوم سوراج کی منزل کی طرف بڑھے چلی جاتی ہے۔ ہندستان میں سوراج حاصل کرنے کا واحد طریقہ عدم تعاون اور عدم تشدد ہے۔ جو لوگ اس طریقہ کو ناقابل عمل سمجھتے ہیں وہ اکالی تحریک کی مثال پر غور کریں۔ میں نے امرت سر میں مجروحین کے زخم دیکھے اور ان کے منہ سے سنا کہ ان میں سے ہر ایک نے باجود اتنے اشتعال کے تشدد کا مقابلہ تشدد سے کرنے سے انکار کر دیا۔ تو میں نے اپنے دل میں کہا۔ ''یہ ہے عدم تشدد کی فتح۔''

عدم تشدد ایک خالی خولی خواب نہیں۔ مہاتما جی نے یوں ہی اعلان نہیں کیا ''اپنی تلوار نیام میں ڈال لو۔'' سچائی کے خواہاں اس آواز کو سنیں جس طرح آج سے دو ہزار سال قبل اس سے طاقت ور آواز کو سنا گیا تھا۔

مہاتما جی کے طریقہ حصول آزادی کا طریقہ جبر سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم کامیابی یا ناکامی کا جائزہ لیں۔ جہاں تک جبر کا تعلق ہے اس سوال کا جواب دینا آسان ہے۔ میرے ذہن میں اس بات کے متعلق مطلق کوئی شبہ موجود نہیں کہ قوم نے اس جبر پر فتح حاصل کی ہے۔ جس کا آغاز اس لیے کیا گیا اور جسے مسلسل اس لیے جاری رکھا گیا کہ تحریک کی روح مر جائے۔

جو بات اکثر لوگوں کو پریشان کیے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہم اپنے عدم تعاون وعدم تشدد کے کام میں کامیاب رہے ہیں؟ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ محسوس ہوتا ہے کہ اس سوال پر بہت اُلجھاؤ پیدا ہو گئے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ کوئی تحریک یا تو بالکل ناکام ہوتی ہے یا بالکل کامیاب۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تحریکات (میری مراد خالص تحریکوں سے ہے) نہ تو کلیتاً ناکام ہوتی ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر کامیاب۔ ہر سچی تحریک ایک نصب العین کی پیروی میں شروع ہوتی ہے اور نصب العین ہمیشہ کامیابی سے اونچا ہوتا ہے۔ فرانسیسی تحریک کو لیجیے۔ کیا یہ کامیاب رہی؟ کیا یہ ناکام

رہی؟اس کا ایک مطلق فیصلہ دینا ایک افسوس ناک تاریخی غلطی ہوگی۔کیا ہندستان میں عدم تعاون کی تحریک کامیاب رہی۔جب ہم اس بھاری خواہش کا مطالعہ کرتے ہیں جو سوراج کے لیے ملک کے طول وعرض میں اس تحریک نے پیدا کردی۔تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تحریک از بس کامیاب رہی۔جب ہم اس بیداری کے عملی نتائج پر غور کرتے ہیں تو یہ ہمیں بھاری کامیابی معلوم دیتی ہے۔اس کامیابی کا اندازہ کانگریس کے ممبران کی عظیم الشان بھرتی، بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ اور اس روپیہ سے لگائیں جو قوم نے چندہ میں کانگریس کو ادا کیا۔میں ذرا آگے بڑھتا ہوں۔میری یہ رائے ہے کہ ملک بھر میں تعلیمی اداروں، سرکاری عدالتوں اور نئی کونسلوں کے وقار کو جو دھکا لگا ہے وہ ہی کوئی معمولی کامیابی نہیں۔اگر وہ آج تک موجود ہیں تو یہ خود ہمارے ہم وطن بھائیوں کا قصور ہے۔ملک ان اداروں کا قصہ پاک کرنے کی قوی خواہش کا اظہار کرچکا ہے۔

باایں ہمہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایک زاویہ نگاہ سے جب ہم اپنی کامیابی کو باقاعدہ ترازو میں تولتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بہت کام ہوا، اور بہت زیادہ ابھی کرنا درکار ہے۔ابھی کرنے کو بہت کام باقی ہے۔عدم تشدد کو اور مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔عدم تعاون کو پختہ کرنا ہے اور عدم تعاون کے حلقہ کو اور وسیع کرنا ہے ہمیں اپنے پاؤں پر مضبوطی اور معقولیت کے ساتھ ڈٹ جانا چاہئے۔قربانی کی روح کو اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، اور ہمیں پہلے کی نسبت زیادہ سرگرمی سے تخریب وتعمیر کے کام میں سرگرم ہوجانا چاہئے۔میں اپنے نکتہ چینوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں مجھے انکار نہیں۔ہم کئی باتوں میں ناکام رہے ہیں۔لیکن کیا آپ ہماری ان پہلوؤں میں کامیابی کو بھی تسلیم نہ کریں گے جہاں ہمیں فتح نصیب ہوئی ہے۔

اعتدال پسندوں نے ہماری مذمت کی ہے کہ ہم ملک کے نوجوانوں کو خراب کررہے ہیں۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہم بیٹوں کو والدین کے خلاف، شاگردوں کو استادوں کے خلاف اور رعایا کو حکومت کے خلاف سرکشی اور حکم عدولی کا سبق پڑھارہے ہیں۔ ہم اس الزام کا اقبال کرتے ہیں اور ہم اپنی روحانی تحریک کو اپنے دلائل کی حمایت میں پیش کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی لوگوں کو خراب کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ مگر جو جواب آپ نے اس کا دیا وہ پرجوش بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

''یہ نہ سمجھو میں دنیا میں امن کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں امن نہیں تلوار لے کر آیا ہوں۔

کیوں کہ میں انسان کو اپنے باپ کے خلاف اور بیٹی کو اپنی ماں کے خلاف اور بہو کو اپنی ساس کے خلاف کرنے آیا ہوں۔''

یہ کہا گیا ہے کہ زبان سے محبت کا نام لے کر ہم نفرت پھیلا رہے ہیں۔ ایسی واہیات تہمت شاید ہی کہیں لگائی گئی ہو۔ ممکن ہے ہم محبت نہ کرسکے ہوں۔ ہوسکتا ہے ہم نے اپنے چند رفقاء کو نفرت سے چھوڑ دیا ہو۔ لیکن اس سے تو ہماری کمزوری اور غیر پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔ ہمیں ہمارے نصب العین سے دیکھیں اس کا اندازہ ہماری کامیابی سے نہ لگائیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے میں ریاکاری کے الزام سے برأت کا اعلان کرتا ہوں۔ ان لوگوں کی خدمت میں جو ہماری خامیاں نکالنے پر تلے ہوئے ہیں میں نہایت عجز سے یہ عرض کرتا ہوں۔ ''میرے دوستو! اگر ہم کمزور ہیں تو آؤ ہمارے ساتھ مل کر ہمیں مضبوط بناؤ۔ اگر راہ نما ناکارے ہیں تو آؤ خود رہنمائی کرو وہ ایک طرف ہوجائیں گے۔ اگر آپ کا نصب العین پر ہی یقین نہیں تو اس نصب العین کی روشنی میں ہمیں کوسنے سے کیا فائدہ ہے'' ہمیں کسی ایسے ناقد کی ضرورت نہیں

جو ہمیں یہ بتائے کہ ہم اپنے نصب العین میں کہاں تک ناکام رہے ہیں۔ میں نے جس طرف نگاہ اٹھائی۔ مجھے کمزوری کی شہادت ملی۔ لیکن اپنی انسانی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود میں یہ کہنے کو اپنے آپ میں کافی قوت محسوس کرتا ہوں کہ کامیابی یقیناً ہمارے دیس کے قدم چومے گی۔ اور دفتری حکومت جانتی ہے کہ ہماری کامیابی یقینی ہے۔

اگرچہ عدم تعاون اور عدم تشدد کے طریقے یقینی اور بہترین ہیں۔ مگر ہم کو اس بات پر ابھی غور کرنا ہے کہ ان کو موجودہ حالات کے مطابق استعمال کرنے کا کونسا بہترین طریقہ ہے۔ میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں رکھتا جو یہ کہتے ہیں کہ قوم کی روح اس قدر مردہ ہے کہ عدم تشدد اور عدم تعاون کی اب زیادہ عرصہ گنجائش نہیں۔ میں نے اس مسئلہ پر نہایت متانت سے غور کیا ہے۔ میں اس بات کو بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مایوسی یا شکوک کے جذبات کو جگہ دینے کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں۔ آج لوگوں کا ظاہری لباس قدرے فریب دہ ہے۔ وہ کچھ تھکے معلوم دیتے ہیں۔ لیکن اس خاموشی کی تہ میں قوم کی رگوں میں اب بھی پہلے سا جوش موجود ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم قوم کی طاقت کو مستحکم بنائیں۔ ہمیں ایسے طریقۂ کار کی جستجو کرنا چاہئے جس سے ہم قوم کے قویٰ کو متحرک کر سکیں، اور سوراج کی طرف اپنی رفتار کو تیز کر سکیں۔ اب میں آپ کے سامنے ایک ایک کر کے وہ تمام مدیں رکھوں گا جو میری نظر میں انڈین نیشنل کانگریس کو تمام قوم کے لیے تجویز کرنی چاہئیں۔

کانگریس کو اس سال اپنے کام کا آغاز اس طرح کرنا چاہئے کہ وہ سوراج حکومت کے ماتحت مختلف اقوام کے حقوق کا اعلان کرے۔ جہاں تک ہندو اور مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ہمیں معاہدہ لکھنؤ کی پورے زور سے تصدیق کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرنے کا اعلان ہونا چاہئے اور

ہر ایک قوم کو دوسری قوم کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی کے لیے ضرور تیار ہونا چاہئے۔ میں اپنے بیان کو واضح کرنے کے لیے یہاں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ہر پکا مسلمان مسجد کے سامنے باجے کی مذمت کرتا ہے اور ہر پکا ہندو گائے کشی کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ کیا ہندو اور مسلمان آپس میں ایسے سمجھوتے تک نہیں پہنچ سکتے کہ ہندو مسجدوں کے سامنے باجہ نہ بجائیں گے، اور مسلمان گائے کشی سے پرہیز کریں گے۔ اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہر قوم کو بے شمار قربانیوں کی مثال پیش کرنا چاہئے۔ تاکہ سوراج کے راستہ پر ہم سب شانہ بشانہ چل سکیں۔ اب سکھ، عیسائی اور پارسیوں کے متعلق عرض ہے کہ چوں کہ مسلمان اور ہندو اس ملک میں بھاری اکثریت کے مالک ہیں اس لیے انھیں سوراج حکومت میں ان اقلیتوں کو ان کی تعدادی نسبت سے زیادہ مراعات تفویض کرنی چاہئیں۔ میری رائے میں کانگریس کو تمام قوموں میں ایک معاہدہ عمل میں لانا چاہئے۔ جس کی رُو سے ہر اقلیت کے حقوق واضح طور پر تسلیم کرلیے جائیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ان اقوام کے شکوک وشبہات جو آج ان کے دل میں موجود ہیں رفع ہو جائیں گے، اور انھیں ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہ رہے گا۔ مجھے اس بات پر زور دینے کی خاص ضرورت نہیں کہ میں عیسائیوں کے زمرہ میں نہ صرف خالص ہندستانیوں کو شمار کرتا ہوں۔ بلکہ ان اینگلو انڈین اور دیگر سب لوگوں کو ان میں شامل سمجھتا ہوں جنھوں نے ہندستان کو اپنا گھر بنالیا ہے۔ اس معاہدہ کی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں ہمیشہ ضرورت تھی۔ لیکن جس کام سے ہم آج دوچار ہو رہے ہیں اس کی روشنی میں اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

میری یہ رائے بھی ہے کہ علٰیحدگی کی پالیسی جس پر ہم پچھلے دو سالوں سے عمل پیرا ہو رہے ہیں۔ اب قطعاً ترک کردی جائے۔ ہر ملک میں لوگوں کی ایک تعداد ایسی موجود ہوتی ہے جو آزادی کے بے غرض پیروکار ہوتے ہیں، اور جن کی یہ دلی خواہش

ہوتی ہے کہ ہر ملک آزاد ہو۔ ہم ان کی ہمدردیاں اور تعاون حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرے خیال میں امریکہ اور ہر یورپی ملک میں کانگریس کی ایجنسیاں قائم کرنا چاہئیں۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دنیا کی تحریکات سے باخبر رہیں اور دنیا بھر میں ان لوگوں کے ساتھ رشتہ خط و کتابت قائم کریں جو آزادی کے بہی خواہ ہیں۔

اس سے بھی اہم کام ہندستان کا ایشیائی فیڈریشن میں حصہ لینا ہے جو معرض وجود میں آرہی ہے۔ مجھے اس کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ پان اسلامک تحریک جس کا سنگ بنیاد تنگ بنیادوں پر رکھا گیا تھا اب وسعت اختیار کر رہی ہے۔ اور اب وہ بڑی پان ایشیائی تحریک کے لیے جگہ خالی کر رہی ہے۔ یہ ایشیا کی مظلوم اقوام کی انجمن ہے۔ کیا ہندستان اس سے باہر رہے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں اپنی آزادی خود حاصل کرنی چاہئے مگر ہندستان اور باقی ایشیا کے درمیان نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہندستان اور دنیا بھر کے آزادی خواہ لوگوں کے درمیان ایسا رشتہ محبت اور احساسات ہمدردی اور تعاون عالم گیر امن کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ میری نظروں میں عالم گیر امن کا مطلب تمام اقوام عالم کی آزادی ہے۔ اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ کرۂ ارض پر کوئی قوم اس وقت تک آزاد نہیں ہو جاتی جب تک دوسری اقوام غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوں۔ اس سے قبل جس پالیسی پر ہم عمل پیرا ہو چکے ہیں وہ ایک مرکز پہ تمام توجہات مرکوز کرنے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ اور میں نے خلوص دلی سے اس پالیسی کو اپنائے رکھا۔ ایک سال کے عرصہ میں سوراج حاصل کر لینے کی امید نے اس پالیسی کو لازمی بنا دیا۔ آج اسی کام کے لیے ہمیں اور زیادہ وسعت اور ہمدردیوں کی ضرورت ہے۔

آج ہم بھاری انقلابات کے پاس کھڑے ہیں اور دنیا کی طاقتیں ہمارے سر پر ہیں۔ کمال پاشا کی فتح نے ایشیائی رشتہ منقطع کر دیا ہے اور وہ آج غفلت سے بالکل

بیدار ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہر یورپی ملک میں لوگوں کی حقیقی آزادی کے لیے طوفانوں نے غلام نسلوں پر حیرت انگیز اثر پیدا کیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر جو محض خیالی باتیں تھیں، اب عملی سیاسیات کے دائرہ میں آچکی ہیں۔ ہندستانی قوم نے اپنی راہ پالی ہے۔ جس وقت سے ہم آج گزر رہے ہیں ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے مطالبات پر از سرِ نو غور کر کے انھیں دوبارہ وضع کر لیں۔ پنجاب کی زیادتیوں کے متعلق ہمیں اپنے مطالبات کو پھر وضع کرنا چاہئے۔ کیوں کہ ان سے ہماری کئی ایک باتیں مانی جا چکی ہیں۔ خلافت کے متعلق بھی ہمیں اپنے مطالبہ پر پھر غور کرنا چاہئے۔ کیوں کہ ان میں سے اکثر پر عمل ہو چکا ہے اور میرا خیال ہے کہ لائسنز کمیشن کے کام ختم کرنے سے پیشتر باقی امورات بھی طے ہو جائیں گے۔ اب سوراج کے مطالبہ کے متعلق بھی میری رائے ہے کہ اب اس کو ہمیں سیاسی شکل میں پیش کرنا چاہئے۔ کانگریس کو ایک بالکل واضح اسکیم مرتب کرنی چاہئے جس میں یہ بتایا جائے کہ اس نظامِ حکومت سے ہمارا کیا مدّعا ہے۔ جسے ہم سوراج کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے ہیں۔ اب تک ہم نے ایسے نظامِ حکومت کی کوئی تشریح نہیں کی۔ ہم نے دانستہ طور پر ایسا نہ کیا اور ہم سوراج کے نفسیاتی پہلوؤں پر زور دیتے رہے۔ لیکن آج حالات بدل چکے ہیں۔ اب آزادی کے جذبہ نے ہمیں بے قرار کر رکھا ہے۔ چنانچہ یہ کانگریس کا فرض ہے کہ وہ نظامِ حکومت کی ایک واضح اسکیم ملک کے سامنے رکھے۔ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ سوراج نا قابلِ تعریف ہے اور اسے کسی خاص نظامِ حکومت میں نہیں الجھایا جا سکتا۔ بایں ہمہ قومی ذہن کو واضح کرنا چاہئے۔ اپنی ترجمانی کرنی چاہئے اور اگر چہ سوراج کے ظاہری احاطہ میں کسی قوم کی تمام حیات تاریخ سمٹ جاتی ہے، پھر بھی اس مطالبہ کی صحیح تشکیل کو اب زیادہ عرصہ کے لیے التوا میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

اس خطبہ میں وضاحت کے ساتھ کسی نظامِ حکومت پر روشنی ڈالنا آسان نہیں۔

البتہ میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دینا چاہتا۔ کہ میری نظروں میں کون سا نظام حکومت درست ہے۔ کوئی ایسا نظام حکومت جسے خود لوگوں نے وضع نہ کیا ہو اور وہ خود اسے چلانے والے نہ ہوں، سوراج کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ پارلیمنٹری حکومت لوگوں کی حکومت نہیں۔ ہم میں سے اکثر اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ متوسط طبقہ کو لوگوں کے لیے سوراج کی لڑائی جیتنا چاہئے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ طبقاتی تحریک کو سوراج کی تحریک میں بدل دینے کے امکانات موجود ہیں۔ آج اگر برطانوی پارلیمنٹ صوبجاتی خودمختاری اس صورت میں تفویض کرتی ہے کہ ذمہ داری مرکز پر رہتی ہے تو میں اس کے خلاف احتجاج کروں گا۔ کیوں کہ اس سے طاقت متوسط طبقہ کے ہاتھ میں مرکوز ہو جائے گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ پھر متوسط طبقہ طاقت سے دست بردار ہو جائے گا۔ اگر سفید دفتر شاہی حکومت کی جگہ جو آج ہندستان کے سر پر سوار ہے ہندستانی دفتری سرکار قائم ہو جاتی ہے تو اس سے ہندستان کو کیا فائدہ حاصل ہوا۔ دفتریت بہرکیف دفتریت ہے۔ اور میرا یہ یقین ہے کہ سوراج کا تخیل ہی دفتریت کے وجود کی ضد ہے۔ میرا تخیل سوراج کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اگر لوگ اس کے حصول میں حصہ نہیں لیتے۔ اس کے ماسوا جو بھی کوشش کی گئی اس کا نتیجہ ناگزیر طور پر ایسی حکومت کا قیام ہوگا جسے یورپی سوشلسٹ بورژوا حکومت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انگلستان، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک میں متوسط طبقہ نے آزادی کی جنگ لڑی۔ نتیجہ یہ ہے کہ طاقت اب بھی انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دفعہ طاقت پر قبضہ جما کر وہ اس سے دست کش ہونے کو تیار نہیں۔ آج اگر تمام یورپ آزادی کی جنگ میں مصروف ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوام یورپ متوسط طبقہ کے ہاتھ سے طاقت چھیننے کے لیے اپنی طاقت اکٹھی کر رہی ہیں۔ میں یورپی تاریخ کے اس باب کو دوہرانا پسند نہیں کرتا۔ اب یہ ہندستان کا کام ہے کہ وہ دنیا کے لیے شمع ہدایت کا کام دے۔ عدم

تشدد کے ذریعہ سوراج اور لوگوں کے ہاتھوں سوراج۔

میرے نزدیک دیہاتی زندگی تنظیم اور چھوٹے چھوٹے مراکز کی عملی خود مختاری صوبجات اور مرکز کے اختیارات سے زیادہ اہم ہے، اور اگر دونوں میں سے ایک کو چننے کو کہا گیا تو میں چھوٹے چھوٹے مراکز کی عملی خود مختاری کو ترجیح دوں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیہات کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ وہ باہمی امداد و تعاون سے برقرار رہیں گے۔ اس وقت یہ ضروری ہے کہ طاقت ہندستانی اور صوبجاتی حکومتوں کو سونپ دی جائے۔ لیکن یہ تخیل ہمیشہ کے لیے تسلیم کر لیا جائے کہ مرکزی حکومت کا باقاعدہ عمل صوبجاتی اور مرکزی معاملات میں صرف مشورہ دینا ہو۔ البتہ مرکز کے پاس ایسے تحفظات اور کنٹرول کے اختیارات موجود ہونے چاہئیں جنھیں وہ بوقت ضرورت استعمال کر سکے۔

یورپ کا نہایت ترقی یافتہ تخیل چھوٹی انفرادیت سے جس پر کہ یورپی کلچر اور ادارے قائم ہیں۔ ہندستان کے قدیم دیہاتی نظام کی طرف رخ پھیر رہا ہے۔ اس تخیل کا یہ کہنا ہے کہ بیلٹ بکس کی موجودہ جمہوریت ناکام ہو چکی ہے۔ لیکن حقیقی جمہوریت کا ابھی تجربہ نہیں کیا گیا۔ موجودہ یورپی تخیل کی حقیقی جمہوریت کیا ہے؟

حقیقی جمہوریت کا سنگ بنیاد چھوٹے چھوٹے مراکز پر قائم ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بتدریج مرکز کے اختیارات کم ہوتے جائیں۔ جس کا حقیقی مقصد مرکز کے اختیار کا برقرار رہنا ہوتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے مرکز بہ تدریج ایک وحدانیت کے رشتہ میں منسلک ہو جائیں۔ ہم ایک انسانی ریاست کو قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ہم کل پرزوں کی مشین نہیں پیدا کرنا چاہتے۔ ہم ان اداروں اور تنظیموں کے خواہاں ہیں جو قوت عمل رکھتے ہوں۔ ہمیں مائل بہ مرکز ریاست کے جمود پسند استحکام کی ضرورت نہیں۔

یورپ کے تخیل نے ہیگل کی ذات میں اظہار کے جامے پہنے۔ جس کے نزدیک انسانی اداروں کا تعلق غیر متحرک سطحی پن سے نہیں بلکہ ذہن اور مقاصد سے ہے۔ چناں چہ وہ قوت عمل کے مالک اور ترقی پذیر ہیں۔

موجودہ یورپی تخیل نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ایک فرد سے لے کر ریاست تک یہ قدرتی اور حقیقی ترقی کا ایک مسلسل عمل ہے۔ سوراج ایک نسبتی تصور ہے۔ فرد اپنی ذات کا بادشاہ ہے۔ جہاں تک وہ اپنی گوناگوں فطرت کو ترقی دے سکتا ہے اور اس پر قابو پانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ سوراج حاصل کر لیتا ہے۔ فرد سے ہم ایسے ہمسایہ پن تک پہنچتے ہیں جو مرکوز ریاست کی حقیقی بنیاد ہے، اور پھر ہمیں عالم گیر ریاست کا حقیقی تصور پیش کرتی ہے۔ یہ ہمسایہ پن ان لوگوں کے جسمانی قرب سے جو ہمسایہ علاقوں میں رہتے ہیں کچھ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ ہمسایہ پن بیداری پیدا کرنے کا متقضی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سوال یہ ہے کہ " ہمسایہ پن سے پیدا شدہ طاقت کس طرح ہماری سالم شہری اور قومی زندگی کا جز بن سکتی ہے۔"؟ یہ ہے وہ سوال جسے اب جمہوریت حل کرنے کی جستجو میں ہے۔

تجویز کردہ عمل مشترکہ خواہش کی پیداوار ہے۔ آج کی جمہوریت برتری کے عمل سے مشترکہ خواہش پیدا کرنے پر قائم ہے۔ اس کا اصل مطلب ہے خواہشات کی جنگ جس میں ہر بات کا فیصلہ تعداد کی اکثریت سے ہوتا ہے۔ اب جمہوریت اس برتری کے عمل کا سامنا کرتی ہے، اور ایسے ذرائع اور طریقوں کی ایجاد پر زور دیتی ہے جن کے ذریعہ ہمسایہ وجودوں کی مختلف خواہشات ایک مشترکہ عمل کی صورت اختیار کر سکیں۔ یہ عمل برتری کا عمل نہیں۔ سالمیت کا عمل ہے اور اس طرح ہمسائیگی کی پیدا کردہ بیداری اس مشترکہ ہمسایہ وجود کی مشترکہ خواہش کا اظہار کرے گی۔ متعدد ہمسایہ مراکز کی مشترکہ خواہش اسی طرح سالمیّت کے عمل سے کوئی حقیقت جمعیت

اقوام جنم لے سکے گی، اور عالم گیر ریاست کا تصور عمل کا جامہ پہن سکے گا۔

یہ تمام فلسفہ فرد کے نشو ونما پر قائم ہے۔ تصور یہ ہے کہ فرد کے قوئی کو آزاد کیا جائے۔ معمولی تصورات ریاست کا انفرادیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یعنی ایسے فرد کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جو محسوس طور پر اس زندگی کا ذمہ دار ہو جس سے وہ اپنا سانس لیتا ہے اور جس کے لیے وہ اپنا سب کچھ وقف کر دیتا ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے نمائندہ حکومت، پارٹی تنظیم، اکثریت کی حکمرانی اور اس کے سب لوازمات بے جان چیزیں ہیں۔ ان کی جگہ مشترکہ خواہش، مشترکہ مفادات اور مشترکہ تصورات پیدا کرنے کے لیے ناطرفدار گروہوں کی تنظیم کر لینی چاہئے۔ اس کا مدعا ہے فرد کی ہستی کی حقیقی ترقی اور فروغ۔ کوئی ایسی حکومت نہ تو کامیاب ہوگی اور نہ ہی صحیح معنوں میں ذمہ دار حکومت بن سکے گی جو فرد پر قائم نہ ہوگی۔ نئی ریاست کی بیدار مغز مصنفہ (Upto The Present Moment) میں لکھتی ہیں:

> ''ہم نے فرد کو نہیں دیکھا۔ ہم اسے (Anglo Senon History) کی جدوجہد میں تلاش کر چکے ہیں۔ ہم نے اسے نمائندگی کے طریقے سے ڈھونڈا مگر ناکام رہے۔ ہم نے اس کی تلاش ہر مرد وعورت کو حق رائے دے کر کی۔ مگر ہم اسے نہ پا سکے۔ اب بالواسطہ حکومت فرد کی جستجو میں ہے۔'' ایک اور مقام پر یہی مصنفہ رقم طراز ہے:
>
> ''چنانچہ گروپ، تنظیمیں ہمیں تعداد کے غلبہ سے چھٹکارا دلاتی ہیں اور جمہوریت زمان ومکان پر کمال حاصل کرتی ہے۔ ہم اسے روحانی طاقت سمجھے بغیر سمجھ نہیں سکتے۔ اکثریت کی حکمرانی کا تعداد پر دارومدار ہے۔ جمہوریت اس پختہ اصول پر

قائم ہے کہ جمہوریت اکائیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی روابط کا
ایک پیچ در پیچ سلسلہ ہے۔ جمہوریت پر پولنگ اسٹیشنوں پر عمل
نہیں ہوتا۔ اس کا مدعا ایک معقول مشترکہ خواہش کو بروئے
کار لانا ہے جس کے حضور میں فرد اپنی پیچیدہ زندگی کا سب کچھ
قربان کردے اور جس کے لیے ہر فرد واحد ایک نکتہ پر اپنی
ترجمانی کرے۔ اس طرح جمہوریت کی روح پیدا ہوگی۔
جمہوریت کی ٹیکنیک گروپ تنظیم ہے۔"

اس فلسفہ کی نظروں میں فرد کی ذات کے نشو ونما کے بغیر کوئی زندہ ریاست ممکن نہیں۔ ریاست بذاتہ بے حرکت اکائی نہیں اور نہ ہی یہ مطلق العنانہ پیداوار ہے۔ "یہ ایک عمل ہے۔ یعنی اپنے مختلف مراحل کے اظہار کے لیے نفس کا مسلسل تغیر وتبدل اور اس تغیر وتبدل میں سب کا اور ہر ایک کا لچک دار ہونا۔ اس لیے کہ ظاہری تبدیلی مسلسل نشو ونما کی رفیق ہے۔" یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب یہ سمجھ لیا جائے کہ افراد گروہ اور قوم اجتماع ضدین نہیں۔ ان سب کا ایک محسوس کل میں سما جانے کا مطلب افراد کی خواہشات کا تمام قوم کی متحدہ اور مشترکہ خواہش میں جذب ہو جانا ہے۔

یورپی تصورات کے عام میلان نے جمہوریت کے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا۔ لیکن مسائل حاضرہ جنہوں نے یورپ کو مضطرب کر رکھا ہے کوئی اور حل پیش کرتے بھی معلوم نہیں دیتے۔ مجھے بہت کم شبہ ہے کہ یہ تخیل جو بہت سے عملی سیاست دانوں کو ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ بہت جلد حقیقی تخیل کے طور پر قبول کر لیا جائے گا۔ میں پھر اسی مصنف کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ "علمی سیاسیات میں بہت کم چیزیں عملی ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں تمام ترقی پسند تحریکیں روحانی بنیادوں کے فقدان کی بنا پر تباہ ہو چکی ہیں۔ اور یہ امر فرحت بخش ہے کہ اس مصنف نے اس بات پر روشنی

ڈالی ہے۔ ان لوگوں کو جو گروپ ہمسایہ پن کو حکومت خود اختیاری کی صحیح بنیادیں تسلیم کرنے سے منکر ہیں۔ آپ خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیا ہماری روزانہ زندگی نجس ہے؟ اور ہم اس سے جس قدر اوپر اٹھتے ہیں، مقدس زندگی تک رسائی ہوتی ہے۔ تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ پالٹیکس ویسی ہے جیسی ان کی تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن آج کے انسانوں کا یہ عقیدہ نہیں۔ ہم اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ الوہیت ہمیشہ سے انسانیت کی شکل میں عملی شکل اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ ہم انسانیت اور تمام افراد کی روزانہ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔''

لہٰذا اس نظریۂ زندگی اور اس نظریہ میں جو میں اپنے ہم وطنوں کے سامنے پچھلے 15 سالوں سے رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کافی مطابقت موجود ہے۔ کیوں کہ تمام سچائیوں کی سچائی یہ ہے کہ خدا کی ظاہری لیلا تاریخ میں اپنا چہرہ دکھاتی ہے۔ فرد، سماج، قوم، انسانیت اس ہی لیلا کی مختلف شکلیں ہیں، اور ایسا نظام حکومت جو عملی طور پر سچا اور حقیقی طور پر عملی ہو۔ کسی اور فلسفۂ زندگی پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کا احساس وقت کا اولین تقاضہ ہے۔ یہ ہندستانی تصور کی روح ہے اور یہی وہ تخیل ہے جس طرف یورپ کا حالیہ خیال بتدریج مگر یقینی طور پر رخ پھیر رہا ہے۔

چنانچہ ایسا نظام حکومت قائم کرتے وقت ان امور کا خاص خیال رکھا جائے۔

1- ہندستان کے قدیم دیہی نظام پر مقامی نظام کا قیام۔

2- ان دیہی مراکز کی ہیئت سالمہ سے بڑے بڑے گروہوں کا فروغ۔

3- مرکوز ریاست اسی فروغ کا نتیجہ ہو۔

4- دیہی مراکز اور بڑے گروہ عملی طور پر خود مختار ہوں۔

5- کنٹرول کی طاقت مرکز کے پاس رہے۔ لیکن اس طاقت کا استعمال نہایت ہی خاص خاص موقعوں پر ہو۔ اور اس غرض کے لیے مناسب تحفظات رکھ دیے

جائیں۔ تاکہ مقامی مراکز کی عملی خودمختاری اور مرکزی حکومت کا حقیقی مرکوز ریاست میں فروغ پانا ممکن رہے۔ایسی مرکزی سرکار کا عام کام فقط ناصحانہ ہو۔

نظام حکومت سے متعلق جو کچھ میں نے کہا ہے اسے عملی شکل دینے کے لیے ضروری ہے کہ ان مقامی مراکز کو قائم کرنے کا کام فی الفور شروع کردیا جائے۔ موجودہ سب ڈویژنوں یا ان سے بھی چھوٹے چھوٹے مراکز کو چھوٹے مراکز کے طور پر لیا جاسکتا ہے اور پھر ان سے بڑے مراکز آسانی سے ڈھالے جاسکتے ہیں۔ جب ایک بار ہم مقامی علاقے یعنی ہمسایہ گروہ بنالیں،تو پھر ہمیں مشترکہ طور پر سوچنے کی عادت ڈالنی چاہئے،اور تمام مقامی معاملات کو انھیں سے حل کرانا چاہئے۔مجھے کوئی وجہ معلوم نہیں دیتی کہ کیوں ہم آج ہی ان مقامی مراکز کے ذریعہ حکومت کا آغاز نہ کردیں؟ انھیں اپنے اختیار کے لیے لوگوں کے رضا کارانہ تعاون پر بھروسہ کرنا چاہئے اور رضا کارانہ تعاون اس جبریہ تعاون سے بہ درجہا بہتر ہے جس پر آج ہندستان میں دفتری حکومت کی بنیادیں قائم ہیں۔ یہ مناسب مقام نہیں کہ میں اس اسکیم کا جو میرے ذہن میں ہے مکمل خاکہ پیش کروں۔لیکن میری رائے میں یہ لازمی طور پر ضروری ہے کہ ہم ایک کمیٹی کا انعقاد عمل میں لائیں۔جسے نہ صرف مذکورہ بالا لائنوں پر اسکیم وضع کرنے کا اختیار ہو۔ بلکہ وہ ایسے ذرائع کی سفارش بھی کرے جن سے فوراً اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

اب میں دوسری حد کی طرف دھیان پھیرتا ہوں۔یہ کونسل بائیکاٹ کے متعلق ہے بدقسمتی سے یہ مسئلہ تبدیلی یا غیر تبدیلی کا ایک جز بن چکا ہے۔میرے نزدیک یہ تمام جھگڑا غلط بنیادوں پر کھڑا کیا گیا ہے۔سوال یہ نہیں کہ آیا پروگرام میں کوئی تبدیلی لائی جائے بلکہ سوال یہ ہے کہ اس وقت اس تحریک کی کامیابی کی خاطر جسے اتنا عزیز سمجھتے ہیں اپنی سرگرمیوں کا رخ ایک اور طرف پھیرنے کی ضرورت ہے۔میں اس بات کی

کھول کر وضاحت کیے دیتا ہوں کہ میرا مدعا کیا ہے۔ باردولی ریزولیوشن کو لیجیے کالجوں اور اسکولوں کے بائیکاٹ کے بارے میں باردولی ریزولیشن ہماری سرگرمی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ جس کا کسی طرح بھی یہ مطلب نہیں کہ بائیکاٹ چھوڑ دیا جائے۔ سوراج سال کے دوران میں یہ خیال تھا کہ طلبا کو سرکاری درس گاہوں سے اٹھایا جائے۔ اور اگر قومی اسکول معرض وجود میں لائے گئے۔ تو وہ طلبا کی کمزوری کے لیے محض ایک رعایت تھی۔ مہاتما گاندھی کے الفاظ میں پیش نظر خیال سیاسی تھا۔ تعلیمی نہ تھا۔ بااین ہمہ باروودلی ریزولیوشن کے ماتحت کالجوں اور سکولوں کا قیام ہی قومی تعلیم کی سب سے بڑی سرگرمی تھی۔ اب پیش نظر خیال تعلیمی تھا اور اگر اب بھی کانگریس کی یہ خواہش تھی کہ طلبا کو سرکاری درس گاہوں سے اٹھالیا جائے تو اس کے سامنے تعلیمی مقاصد تھے۔ یوں سرکاری درس گاہوں کا ہر بائیکاٹ بدستور موجود رہا۔ لیکن ہماری سرگرمیوں کا رخ ضرور بدل گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر انقلاب میں ایسی تبدیلیاں ضرور رونما ہوتی ہیں۔ کیوں کہ انھیں تبدیلیوں سے نصب العین کی بہترین خدمت سرانجام دی جاسکتی ہے۔

اب ایک اور زاویہ سے ہمیں یہ بات سامنے رکھنی چاہیے کہ تحقیقاتی کمیٹی کے تمام ممبران کی مشترکہ رائے میں بڑے وسیع پیمانے پر سول نافرمانی ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کے لیے تیار نہیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں ان پابندیوں کے حق میں نہیں ہوں جو سول نافرمانی کے کسی طریقہ کے عملی اطلاق پر لگائی گئی ہیں، اور میری رائے یہ ہے کہ کانگریس کو یہ پابندیاں دور کر دینی چاہئیں۔ میں ابھی تک یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ چند لوگوں کو چند خاص قوانین کی تعزیروں سے کیوں آزاد کر دیا جائے۔ یہ ضروری امر ہے کہ ان میں 80 فی صدی کھدر پوش ہوں۔ میں عام عوامی سول نافرمانی کے حق میں نہیں۔ میرے

خیال میں یہ بات بالکل ناقابل عمل ہے۔ لیکن چند ایسے قوانین کی خلاف ورزی جو کھلے طور پر غیر قانونی ہیں۔ جو "دستور و قانون" کی پیداوار ہیں۔ جو انسانیت پر ظلم اور خدا کی توہین ہیں۔ ایسے قوانین کی خلاف ورزی عملی سیاسیات کے احاطہ سے باہر نہیں، اور میری رائے میں ان قوانین کی خلاف ورزی میں ہر ممکن کوشش عمل میں لانی چاہئے۔ سچائی کو بنیاد ٹھہرا کر ہی ہم سوراج کے مقصد کو کامیاب کر سکتے ہیں۔ ایسے قوانین کی تابعیت کا مطلب سچائی سے دور ہٹ جانا ہے۔ ایسی قوم کی ترقی کی کس طرح امید کی جا سکتی ہے جو قانون سوز قوانین کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے سچے مقصد سے بے خبر ہو چکی ہو اور جو ایسے ریگولیشنوں کے خلاف سرکشی نہ کرے۔ جو اس کی قومی نشو ونما کی راہ میں رکاوٹ اور ان کے قومی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔

میری یہ رائے ہے کہ کونسل بائیکاٹ کے سوال کو جس نے ملک کو اس قدر پریشان کر رکھا ہے ان حقائق کی روشنی میں طے کرنا چاہئے جن کا میں اب ذکر کرنے لگا ہوں۔ ایسی سول نافرمانی میں جن کا میں ذکر کر چکا ہوں اور اس مقصد کے لیے کونسلوں میں داخل ہونے کے مقصد میں کوئی فرق نہیں۔ میں کونسل بائیکاٹ کے خلاف نہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اصلاح یافتہ کونسلوں کا نظام اس دو عملی کے ساتھ ہندستانی قوم کی طبیعت کے سراسر خلاف ہے۔ یہ تو انگریزوں کی کوشش ہے کہ ہندستان پر انگریزی طریقوں کو ٹھونسا جائے۔ ہندستان نے بلا تامل اس اجنبی نظام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے لیے یہ کم و بیش کا سوال نہیں۔ میں ہمیشہ حقیقی سوراج کے لیے بہت کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اس سوال کو بھی کبھی خاص اہمیت نہیں دی کہ سوراج کتنے سالوں میں حاصل ہوگا۔ قوموں کی تاریخی زندگی میں چند سال کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن میری یہ رائے ہے کہ ہندستان ایسے نظام کو سوراج کی بنیاد کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتا۔ چناں چہ ان کونسلوں کو یا تو ختم کیا جائے یا

ان میں تبدیلیاں لائی جائیں۔ اب تک ہم باہر سے کونسلوں کا بائیکاٹ کردیتے تھے۔ ہم ایسا کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ کونسلوں کا وقار گر چکا ہے اور ملک جانتا ہے کہ جو لوگ ان کونسلوں کو رونق بخشتے ہیں، ہندستان کے حقیقی نمائندے نہیں۔ لیکن اگرچہ ہم بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ یہ کونسلیں اب بھی بدستور موجود ہیں۔ یہ ہر ہندستانی کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اندر سے ان کونسلوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔ اصلاح پذیر کونسلیں ایک پردہ ہے، جو دفتری حکومت نے اپنے چہرہ پر ڈال رکھا ہے۔ میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس پردہ کو اس کے چہرہ سے ہٹادوں۔ میرے ذہن میں بائیکاٹ کا تخیل قطع تعلق سے بہت زیادہ اہمیت کا مالک ہے۔ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کا یہ مطلب ہے کہ ایسے اقدامات اٹھائے جائیں جن سے ہمارا ملک بدیسی مال سے پاک ہوجائے۔ اصلاح یافتہ کونسلوں کے بائیکاٹ کا مطلب ہے کہ ایسے اقدامات ضرور اٹھائے جائیں کہ یہ کونسلیں سوراج کے راستہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ ان کونسلوں کو کامیاب طور پر بائیکاٹ کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انھیں یا تو اس طرح مناسب طور پر ڈھال لیا جائے کہ وہ سوراج حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ یا انھیں ختم کردیا جائے۔ یہ ہی وہ طریقہ ہے جو میں کونسل بائیکاٹ کے لیے مناسب سمجھتا ہوں۔

ملک بھر میں اس بات پر خوب لے دے ہورہی ہے کہ کونسل بائیکاٹ کے جس طریقہ کی میں نے حمایت کی ہے۔ آیا وہ اصولی طور پر عدم تشدد اور عدم تعاون پر پورا اترتا ہے۔ میں بڑی شدّت سے اس بات پر زور دیتا ہوں کہ یہ کانگریس کے قبول کردہ اصول عدم تشدد اور عدم تعاون کے ہرگز منافی نہیں۔ میں منطقیانہ یا فلسفیانہ پہلوؤں پر بحث نہیں کررہا۔ میرے سامنے صرف وہ اصول ہے جسے کانگریس نے اپنایا ہے اور جس کو اس نے عدم تعاون کا نام دیا ہے۔ اوّلاً تو میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت تک ہم

نے دفتری حکومت سے عدم تعاون نہیں کیا۔ ہم تو محض اس ملک کے لوگوں کو عدم تعاون کے لیے تیار کررہے تھے۔ میں اس نکتہ نگاہ کی حمایت میں ناگ پور ریزولیشن کو پیش کرتا ہوں۔ میں یہاں صرف متعلقہ اقتباس کو پیش کررہا ہوں:

''جہاں اس کانگریس کی رائے میں ہندستان کی برقرار حکومت ملک کا اعتماد کھوچکی ہے۔ اور جہاں ملک کے لوگ سوراج قائم کرنے پر پختہ ارادہ سے قائم ہیں......اب یہ کانگریس......اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ عدم تشدد، عدم تعاون کی مکمل اسکیم یا اس کے ایک جز کی جس میں موجودہ سرکار کے ساتھ رضا کارانہ اپنے تعلقات منقطع کرلینے سے لے کر ٹیکسوں کی عدم ادائگی تک کی مدیں شامل ہیں عمل کا جامہ پہنایا جائے اس اسکیم پر عمل پیرا ہونے کے وقت کے متعلق انڈین نیشنل کانگریس یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی فیصلہ کرے، اور یہ کہ اس دوران میں ملک کو اس کے لیے تیار کرنے کے لیے مناسب اقدامات اٹھائے جائیں۔''

اس کے بعد نیشنل اقدامات کا آغاز ہوتا ہے۔ مثلاً قومی تعلیم، قانونی عدالتوں کا بائیکاٹ اور بدیسی مال وغیرہ کا بائیکاٹ۔ چناں چہ یہ واضح امر ہے کہ کانگریس نے ابھی عدم تعاون کے اطلاق کی ترجمانی نہیں کی۔ بلکہ صرف چند اقدامات کی سفارش کی ہے۔ تا کہ کسی ایک یا دوسرے وقت جس کا فیصلہ کانگریس خود کرے گی۔ ہندستانی قوم عدم تعاون کرسکے۔ آؤ! اب ہم اس اصول کے کیریکٹر کا جائزلیں۔ میں اس پر منطقیانہ خیال یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور نہیں کروں گا۔ میں تو محض اس سرگرمی اور کام سے جو کانگریس سرانجام دے چکی ہے۔ اس اصول کو پرکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں جب اس کام کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہ بات میرے زیر نظر ہوتی ہے کہ اس وقت کانگریس

دوہرے کام میں مشغول تھی۔ کانگریس کے ہر فرمان کے دو پہلو تھے۔ اوّلاً تعمیری اور ثانیاً تخریبی وکلا اور قانونی عدالتوں کے بائیکاٹ کا مطلب موجودہ قانونی اداروں کی تباہی ہے اور پنچایتوں کے قیام کا مطلب ایسی ایجنسیاں قائم کرنا ہے جن کے ذریعہ انصاف کیا جاسکے۔ اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ کا مطلب محکمہ تعلیم کی بربادی ہے۔ اور قومی اسکولوں اور کالجوں کے قیام کا مطلب ہندستان کے نوجوانوں کے لیے تعلیمی اداروں کو قائم کرنا ہے۔ بدیسی مال کے بائیکاٹ اور جلانے کا مطلب ملک میں موجودہ بدیسی مال کی تباہی اور مستقبل میں بدیسی مال کی ہندستان میں درآمد کو روکنا ہے۔ لیکن اس کے برعکس چرخے اور تکلے کا مطلب ملک کو دیسی مال فراہم کرنے میں تعمیری سرگرمی ہے۔ اگر اس اصول کو بنیاد ٹھہرا کر غور کیا جائے تو ان کونسلوں کو ایسے اداروں میں تبدیل کردیتے ہیں جو سوراج کی راہ دکھا سکے، اور انھیں کلیتاً برباد کرنے میں کیا فرق ہے۔ جس طرح میں ان کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا چاہتا ہوں تو اس سے یہ دونوں تعمیری اور تخریبی مقاصد پورے ہوجاتے ہیں۔

اس بات کی طرف بھی توجہ منعطف کرنے کو کہا گیا ہے۔ کہ اس سے تحریک کے اخلاق اور روحانیت پر خراب اثر پڑتا ہے۔ عدم تعاون کے اخلاقی پہلو سے قطع نظر جہاں تک تحریک کے اخلاق کا تعلق ہے کہ کونسلوں کو تباہ کرنے کے لیے کونسلوں میں جانا ناجائز اور غیر دیانت دارانہ فعل ہے۔ اس بات کی حمایت میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اصلاح پذیر کونسلوں کا تعلق بالکل دفتری سرکار سے ہے، اور یہ کہ ہمیں دوسرے لوگوں کی جائداد میں اسے تباہ کرنے کی غرض سے داخل نہیں ہونا چاہیے۔ میری رائے میں یہ خیال غلط بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اصلاحات بالکل ناکافی ہیں اور میں لمحہ بھر کے لیے بھی یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ ریفارم ایکٹ برطانوی پارلیمنٹ کا پیش کردہ تحفہ ہے۔

مہاتما گاندھی کے الفاظ میں عام شورش کو ختم کرنے کے لیے رعایت کے طور پر نافذ کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو متناقض طاقتوں کا نتیجہ ہے۔ وہ اوّلاً تو لوگوں کا جذبۂ آزادی ہے۔ ثانیاً دفتری حکومت کی لوگوں کے جذبہ کو دبانے کی خواہش۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس نے نہ تو کلیتاً پاپولر طریقہ کو اپنایا ہے اور نہ ہی کلیتاً دفتر شاہی طریقہ کو۔ ہندستان کے لوگ ان اصلاحات کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ دفتری حکومت بھی انھیں پسند نہیں کرتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دو متناقض طاقتوں کی پیداوار ہیں جو بالکل مختلف سمت ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔ چنانچہ ان اصلاحات نے نہایت رنج دہ صورت اختیار کرلی ہے لیکن جہاں تک مسلمہ حقوق کا تعلق ہے ان کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ وہ ہمارے حقوق ہیں۔ ہماری اپنی جائداد ہے اور ان حقوق کو استعمال کرنے میں جو لوگوں نے برطانوی حکومت سے لڑ جھگڑ کر حاصل کیے ہیں۔ کوئی غیر اصولی ناجائز یا غیر دیانت دارانہ بات نہیں۔ اگر ان طاقتوں کی تکمیل ہے کہ جنھوں نے ان اصلاحات کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، اس بات کا تقاضا کرتی ہو کہ یا تو کونسلوں میں اصلاح لائی جائے یا ان کا قصہ تمام کردیا جائے۔ اگر جدوجہد آزادی ہی ایک نہ ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہو تو اس کے خلاف بداخلاقی کا کیا الزام لگایا جاسکتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ہم نے چوری چھپ کر کونسلوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہوتا اور ہمارا مقصد صاف طور پر تعاون ہوتا لیکن دل میں ہمارے یہ ہوتا کہ ہم نے ان کونسلوں کو ختم کرنا ہے تو یقیناً ہمارا یہ فعل بددیانتی پر مبنی ہوتا۔ ہمیں بھروسہ رکھنا چاہئے کہ یورپی ڈپلومیسی کو انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی راہ نمائی میں بالکل تمام کردیا ہے۔ اب ہم ہر کام برسرعام ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں۔

پھر بھی چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا عدم تعاون کے اعتبار سے معیوب ہے

کیوں کہ اس میں تخریب کا خیال مضمر ہے۔ یہ محبان وطن جن کے لیے میرا دل احترام کے جذبات سے معمور ہے۔ عدم تعاون سے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس کا کام تو محض ہماری قومی زندگی کو تعمیر کرنا ہے۔ یہاں وہ نوکر شاہی حکومت کو بالکل فراموش کر جاتے ہیں۔ شاید یہ نہایت مخلص تخیل ہو اور یہ عدم تعاون کا حقیقی مقصد بھی ہو سکتا ہے لیکن اس عدم تعاون کی کانگریس نے پیروی کی ہے وہ اس قدر مدلل نہیں۔ اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ عدم تعاون کو میرے پروگرام کے امتحان کے طور پر پیش کرنا ہے تو آپ سمجھ لیں یہ وہی اصول ہے جسے کانگریس نے اپنایا اور اس کی پیروی کی۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس اصول میں تعمیر و تخریب دونوں چیزیں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح ہم دفتریت میں چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور ہمارے دائیں اور بائیں دفتر شاہی ہی دفتر شاہی ہے۔ ایسے میں تخریب کے بغیر تعمیر ناممکن ہے، اور یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ جب ہم تخریب کرتے ہیں تو مقصد ہمارا ہمیشہ تعمیر ہوتا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ کونسلوں میں داخل ہونا ہی اصول عدم تعاون کے انحراف کے مرادف ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ دلیل میری سمجھ سے باہر ہے۔ فرض کرو کہ کانگریس نے مسلح بغاوت کا اعلان کیا ہوتا۔ تو کیا پھر یہ دلیل دی جا سکتی تھی کہ دفتری حکومت کے قلعہ میں داخل ہونا عدم تعاون کے اصول کے مطابق ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ غیر استقامت پذیری کے الزام کا دارومدار داخلہ پر ہونا چاہئے۔ ایک حملہ آور فوج دشمن کے ساتھ تعاون نہیں کرتی جب وہ اس کے علاقہ سے گزر رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا تعاون اور عدم تعاون کا دارومدار اس نصب العین پر ہے جس کے ماتحت داخلہ یا غیر داخلہ کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ چناں چہ اگر ہم اس دلیل کا تجزیہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب کبھی ''کونسلوں میں داخلہ'' کے الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ''تعاون'' کا لفظ یاد آ جاتا ہے، اور پھر محض داخلہ کے خیال کو ہی اس کے خلاف قرار

دے دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہمارے وقتوں کے معروف غلط دلائل ہیں۔ حکومت کے ساتھ تعاون کے لیے کونسلوں میں داخل ہونا اور حکومت کے ساتھ عدم تعاون کے لیے کونسلوں میں نہ جانا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ اوّل الذکر بلاشبہ عدم تعاون کے تخیل کا اعتراف ہے۔ مگر مؤخر الذکر کے متعلق یہ کہنا درست نہیں۔

آؤ! ذرا اپنی تحریک کے روحانی پہلو سے مخالفت پر بھی غور کریں۔ روحانیت کے سوال کو کسی مذہب کے احکامات میں نہ الجھایئے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ کسی مذہب کی کتابوں میں کونسلوں میں داخلہ یا انھیں ختم کرنے کے متعلق کیا لکھا ہے۔ میں نے بعض مسلمان دوستوں سے سنا ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کچھ مرقوم نہیں۔ کچھ مسلمان دوست کہتے ہیں کہ اس بنیاد پر فیصلہ کرنا قدرے مشکل امر ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ خلافت کا فرض ہے کہ وہ علماء سے فتویٰ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔ میں یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ اگر علماء اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اسلامی شریعت کی رُو سے موجودہ حالات میں کونسلوں میں داخل ہونا گناہ ہے، تو کانگرس بلا تامل ان کا فیصلہ تسلیم کرلے گی۔ کیوں کہ اس ملک میں سوراج حاصل کرنے کا کوئی کام ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعاون کے بغیر طے نہیں پا سکتا۔ لیکن میں اس روحانیت کا ذکر کررہا ہوں جو کسی خاص دین یا کسی خاص عقیدہ کی تابعیت پر مجبور نہیں۔ اس روحانی نکتہ نظر سے اگر ہم اندازہ لگائیں۔ تو اگر ہم سوراج کے راستہ سے رکاوٹیں دور کرنے کی مساعی عمل میں لاتے ہیں تو یہ معیوب بات کیوں کر ہوسکتی ہے؟ ہم نے بلا سوچے سمجھے بدیسی کپڑے کو جلا دیا اور تحریک کی روحانی حس کو کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں روحانیت اور کام کے آغاز کے متعلق صحیح تصور باندھ لینا چاہئے۔ کسی اعتقادی یا نظریاتی احکام اور اخلاق کے سوال کے قطع نظر روحانیت کی بنیاد لازمی طور پر آزادی اور سوراج کا حصول ہونا چاہئے۔

اپنی رہائی کے فوراً بعد میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ہماری تمام قومی سرگرمیوں کا دارومدار سچائی پر ہونا چاہئے۔ اس کے بعد سے استفسارات کی بھرمار ہونے لگی ہے کہ آخر سچائی کیا ہے؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چوں کہ میں سچائی کی تعریف نہیں کرسکتا، اس لیے ایک مبہم سے لفظ کی آڑ میں مطلب پورا کررہا ہوں۔ میں پھر اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ہماری قومی سرگرمیوں کا دارومدار سچائی پر ہونا چاہئے۔ میں پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ میں سیاست پر اعتقاد نہیں رکھتا اور نہ ہی اس بات پر ایمان ہے کہ اپنی قومی زندگی کو جو میری نظروں میں ایک مکمل ہیئت اجتماعی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مخصوص حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ میں پھر یہ کہتا ہوں کہ جس طرح آپ زندگی کی تعریف نہیں کرسکتے، بعینہٖ اسی طرح سچائی کی تعریف کرنا بھی مشکل ہے۔ سچائی کی پرکھ مدلل تعریف نہیں۔ سچائی کی پرکھ یہ ہے کہ وہ اپنے مکمل اثر کے ساتھ اپنا خود احساس کرالیتی ہے۔ جب آپ سچائی کا احساس کرتے ہیں تو آپ کو خود ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ سچائی کیا ہے۔ خدا کی تعریف نہیں کی جاسکتی اسی طرح سچائی کی تعریف بھی نہیں کی جاسکتی۔ کیوں کہ سچائی خدا کا مظہر ہے۔ آج سے دو ہزار سال قبل ایک ستم ظریف جج نے خدا کے فرزند سے یہ ہی استفسار کیا۔ اس نے منہ سے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو قربان کردیا اور سچائی آشکارا ہوگئی۔ جب میں روحانیت کا ذکر کرتا ہوں تو میرا مدعا یہی سچائی ہوتا ہے۔ میں تاریخ کو خدا کا مظہر گردانتا ہوں۔ میں انسان کی انفرادی شخصیت، قومیت اور انسانیت ہر ایک کو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہوئے انسان کے لیے خدا کا مظہر ہیں۔ ہمیں ہر طرح کی برائی اور بد اخلاقی کے خلاف لڑائی لڑنا ہے۔ خدا کے فرزند نے دنیا کو صرف امن ہی نہیں دیا بلکہ تلوار بھی دی۔ یہ موت برائی اور بد اخلاقی کا امن نہ تھا۔ بلکہ سچائی کی ''فیصلہ کن تلوار'' تھی۔ ہاں تو ہم صرف اسی طریقہ سے آزادی حاصل کرسکتے ہیں۔

سوراج کے راستہ میں کسی قوم یا فرد کی کیسی رکاوٹیں موجود کیوں نہ ہوں ان رکاوٹوں کو فرد اور قوم نے ہی دور کیا ہے۔ یہی فرض اقوام عالم کا ہے۔ اگر وہ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ انسانیت بحیثیت مجموعی ترقی کرے۔ میرے نزدیک تحریک کی روحانیت بھی یہی ہے۔ آزادی کے راستہ میں جو رکاوٹیں بھی موجود ہیں۔ میں انھیں چوری چھپ کرنہیں بلکہ کھلے بندوں ہٹانے کو تیار ہوں۔ میں یہ کام خدا کی تکریم میں سرانجام دوں گا۔ چنانچہ اس نکتہ نظر سے اس مقصد کے لیے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ کونسلوں میں داخل ہونا سچائی کے نصب العین کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ہر چیز کا مطالعہ اسی معیار سے کرنا چاہیے۔

مجلس تحقیقات سول نافرمانی کے ان ممبران نے جو داخلہ کونسل کے حق میں ہیں۔ فی الحال اس مسئلہ پر یوں غور کیا ہے کہ اس وقت ملک کے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ کانگریس کے ممبران امیدوار کے طور پر کھڑے ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر حلف لینے یا اکثریت بنانے کے مسائل پر بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ حلف کے متعلق میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی مذہب کے احکامات کے قطع نظر جن پر بحث کرنا میرا مقصود نہیں۔ یہ سوال کوئی بڑا دشوار نہیں۔ حلف آئینی نوعیت کا ہے۔ بادشاہ آئین کا ترجمان ہے۔ انگلستان میں اسی حلف کے نیچے کئی اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ تو آئین کیا ہے؟ یہ حلف لینے والے لوگوں کو اوّلاً تو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ ان طاقتوں کو جو ریفارم ایکٹ میں موجود نہیں۔ استعمال میں نہ لائیں گے۔ ثانیاً نہایت وفاداری سے اپنے فرائض سرانجام دیں گے۔ جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے میری رائے میں اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خلاف شور مچایا جائے۔ مؤخر الذکر کے جان بوجھ کر یہ معنی بتائے جا رہے ہیں کہ حلف لینے والا ممبر دفتری حکومت کے فرائض وفاداری سے سرانجام دینے پر مجبور ہے۔ اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کرنا

چاہتا ہوں کہ ان معانی کی حمایت میں کوئی آئینی دلیل موجود نہیں۔ میں اس کا یہ مطلب لیتا ہوں کہ ممبر کو اپنے رائے دہندگان کے فرائض وفاداری سے سرانجام دینے چاہئیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس صورت میں حلف لینے میں کیا مشکل موجود ہے۔ اس کے بعد کوئی ایسا سوال نہیں اٹھتا۔

اور بھی کئی سوالات کیے گئے ہیں جن میں چند ایک یہ ہیں کہ آیا اکثریت بنانا ممکن ہے۔ اگر اکثریت حاصل ہوگئی تو پھر ہم کیا کریں گے۔ میرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ ملک کی موجودہ صورت حالات میں عدم تعاونی اکثریت حاصل کرلیں گے۔ میں حق رائے دہندگی کی مشکل سے واقف ہوں۔ میں ان رولز سے بھی آگاہ ہوں۔ جو ہم میں سے اکثر کو کونسلوں میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ لیکن ان تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے میرا یہ یقین ہے کہ ہم کو اکثریت حاصل ہوگی۔ تاہم اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا فیصلہ 1923ء کی کانگریس میں ہوگا۔ جہاں فیصلہ مفروضات کی بجائے ٹھوس حقائق پر کیا جائے گا۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے کہ اگر ہمیں اکثریت حاصل ہوگئی تو ہم کیا کریں گے۔ اس کا جواب صاف ہے۔ ہم اپنے کام کے آغاز سے پیشتر اس بات کا خلوص سے اعلان کریں گے کہ ہمیں اپنے موروثی حق کو قائم رکھنے کا حق ہے، اور ہم ایسے آئین کے لیے باقاعدہ اعلان کریں گے کہ جو ان حقوق کو تسلیم کرے گا، اور ایک ایسے مخصوص نظام حکومت کو قائم کریں گے جو ہمارے دعاوی پر عمل پیرا ہوگا۔ اگر ہمارے مطالبات مان لیے گئے تو جنگ ختم ہوجائے گی۔ لیکن جیسا کہ میں اکثر کہہ چکا ہوں کہ اگر ہمارے اس مطالبہ کو مان لیا گیا کہ ہمیں اپنے نظام حکومت کو چننے کا حق حاصل ہے جو ہم خود اپنے لیے منتخب کریں۔ تو میرے لیے یہ امر کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ تمام طاقت ہمیں آج دی جاتی ہے یا پانچ یا بیس سالوں میں۔ اگر ہمارے مطالبہ کو تسلیم نہ کیا گیا تو

ہم دفتری حکومت کے ساتھ تعاون نہ کریں گے اور کونسل میں اس کے ہر ایک اقدام کی مخالفت کریں گے۔ ہم تمام بجٹ کو نامنظور کردیں گے۔ ہم ہر ممکن موقع پر تحریک التوا پیش کریں گے اور جو بھی بل پیش ہوگا اس کو ناکام کردیں گے۔ دراصل ہم اپنا کام اس طرح کریں گے کہ جب تک ہمارے مطالبات نہ مان لیے جائیں ہم کوئی کام ہونے ہی نہ دیں گے۔ میں گورنروں کے ان اختیارات خصوصی سے اچھی طرح باخبر ہوں جو وہ ریفارم ایکٹ کی رُو سے استعمال کرسکتے ہیں۔ لیکن ہر بات میں ان اختیارات خصوصی کے بل بوتے پر حکومت کو چلالینا ممکن نہیں۔ وہ وقت بہت جلد آجائے گا کہ جب یا تو دفتری حکومت کو جھکنا پڑے گا۔ یا ریفارم ایکٹ کو منسوخ کرنا ہوگا۔ ہر حالت میں فتح ہماری ہے اور جو بھی راہ دفتری حکومت نے اختیار کی، ہم اپنے نصب العین کے قریب آجائیں گے۔

ایک اور سوال عموماً پوچھا جاتا ہے۔ یہ کہ فرض کرو ہم ان اصلاح پذیر کونسلوں کا قصہ تمام کردیتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد — ؟ کیا یہی سوال کانگریس کے ہر اس اقدام سے متعلق نہیں اٹھایا جاسکتا جو کانگریس نے اداروں کی تخریب اور تباہی کے متعلق اختیار کیا۔ اگر ہم تعلیمی اداروں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہوتے، تو کیا کوئی یہ نہ پوچھ سکتا تھا کہ اب اس کے بعد کیا — ؟ اگر ہم قانونی اداروں کو ختم کردیتے تو کیا کوئی یہ نہ پوچھ سکتا۔ کہ پھر اس کے بعد کیا — ؟ حقیقت یہ ہے کہ تباہی سے ہم سوراج نہیں پاسکتے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تخریب کے بغیر کوئی تغیر ممکن نہیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ تعمیر اور تخریب دونوں کے لیے جاری تمام سرگرمیاں، اکٹھی ہوکر سوراج لاسکیں گی۔ اگر ہم ان نئی کونسلوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو آپ محسوس کریں گے کہ تمام قوم میں زندگی کی روح بیدار ہوگئی ہے۔ انھیں ہماری راہ میں اور رکاوٹیں پیدا کرنے دیں۔ ہم ان کو بھی اور زیادہ زور کے ساتھ دور کردیں گے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ دفتری حکومت عدم تعاونیوں کو بھی کونسلوں میں داخل نہ ہونے دے گی۔ وہ رولز میں ایسی تبدیلی لے آئے گی جس سے وہ روک دیئے جائیں۔ میرے خیال میں عدم تعاون کے مقصد کو اس سے زیادہ کہیں اور تقویت نہیں پہنچ سکتی اگر کوئی ایسا رول بن جاتا ہے میں اسے خوش آمدید کہوں گا اور پھر اپنی سرگرمیوں کا رخ اور طرف پھیر دوں گا۔ ہندستان کی ننھی سی قوم کو اپنے نشو ونما کے لیے مسلسل جدو جہد کی ضرورت ہے۔ ہمیں بھولنا نہ چاہئے کہ ایک بھاری غیر متشدد انقلاب بپا ہو رہا ہے اور ہم ضروریات وقت کے مطابق اپنی سرگرمیوں کا رخ پھیر سکتے ہیں۔ آج کونسلیں کھلی ہیں۔ ہم ان پر حملہ کر سکتے ہیں۔ کل جب وہ بند ہو جائیں گی، ہم ضرورت کے مطابق اور راستہ ڈھونڈ لیں گے۔ جب بارش برستی ہے تو ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم اپنی چھتریوں کا رخ اس طرف کر دیتے ہیں جدھر سے بارش آ رہی ہو۔ تو اسی طرح جب قومی زندگی کی تکمیل کسی اور طرف رخ پھیرنے کی متقاضی ہوگی۔ ہم اپنی سرگرمیوں کا رخ اسی طرف کر دیں گے۔

پچھلے دو سالوں سے کونسلوں کے کام نے عدم تعاونیوں کے لیے ضروری بنا دیا ہے کہ وہ کونسلوں میں داخل ہوں۔ ان نئی کونسلوں سے دفتری حکومت کو اور طاقت نصیب ہوئی ہے۔ اور جو لوگ کونسلوں میں داخل ہوئے ہیں انھوں نے عام طور پر دفتری حکومت کے مقصد کو تقویت پہنچائی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ٹیکسوں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ 14-1913ء کی جنگ کے بعد کے سالوں میں سرکار ہند کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ اس سال حکومت کے کلی اخراجات 79 کروڑ 37 لاکھ تھے۔ 20-1919 میں وہ 138 کروڑ ہو گئے اور نئی اصلاحات کے پہلے سال یعنی 21-1920 میں وہ 149 کروڑ تک جا پہنچے۔ اس سال کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ اخراجات اور بھی زیادہ ہوں گے۔ ان بڑھتے ہوئے مصارف کا مقابلہ کرنے

کے لیے 17-1916ء و 18-1917 و 20-1919ء و 22-1921 اور 23-1922ء میں مزید ٹیکس لگائے گئے۔ ہمیں آنے والے سال میں اور ٹیکسوں کے لیے تیار ہو جانا چاہئے۔ ٹیکسوں میں مسلسل اضافہ کے باوجود پچھلے نو سالوں میں سات سال گھاٹے کے تھے۔

فوجی مصارف میں اضافہ موجودہ فنانشل حالت کا ذمہ دار ہے۔ 14-1913 میں اس محکمہ کے اخراجات قریباً قریباً 1/2-31 کروڑ تھے۔ 20-1919ء میں جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ 1/2-87 کروڑ تک جا پہنچے۔ اور 21-1920ء میں 1/2-88 کروڑ ہو گئے۔ (Sir visva Suosaya) کے کہنے کے مطابق ''سول نظم ونسق کے اخراجات بھی بڑھتے معلوم ہوتے ہیں۔'' ریفارم اسکیم کے مطابق انڈین سول سروس، انڈین ایجوکیشنل سروس، انڈین میڈیکل سروس اور دوسری سروسوں کی تنخواہیں خود بخود بڑھ گئی ہیں، اور اس اضافہ کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے ماتحت عملہ کی تنخواہیں بھی جو زیادہ تر ہندستانیوں پر مشتمل ہیں بڑھا دی گئی ہیں۔

متعدد صوبجات کی فنانشل حالت بھی اچھی نہیں۔ ریفارم اسکیم کے فنانشل انتظامات کے ماتحت تمام صوبجات کو قریباً 11 کروڑ روپیہ سالانہ کا بجٹ ملا۔ اس کے علاوہ صوبجات کے پاس 21-1920ء تک 21 کروڑ 68 لاکھ روپیہ پہلے ہی موجود تھا۔ لیکن پچھلے دو سالوں میں صوبوں کے مصارف میں اس درجہ اضافہ ہوا ہے کہ وہ صوبجات بھی جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ کافی رقم بچا لیں گے، دیوالیہ ہوتے معلوم دیتے ہیں۔ ریفارم اسکیم کے پہلے سال صوبجات نے بمشکل اپنے مصارف پورے کیے اور جو کچھ کمی تھی اسے سابقہ بقایا سے پورا کر لیا۔ لیکن اس سال اکثر صوبوں میں فنانشل صورت حالات بدترین ہوتی گئی ہے۔ برما کے بجٹ میں 1 کروڑ 90 لاکھ کا خسارہ دکھایا گیا ہے، اور پنجاب میں ایک کروڑ 30 لاکھ، بہار و اڑیسہ میں 51 لاکھ،

مدراس میں 41 لاکھ، یو پی میں 27 لاکھ، سی۔ پی میں 37 لاکھ کا خسارہ ہوا ہے۔ مدراس حکومت کے بجٹ کی کمی بہت زیادہ ہوتی۔ اگر اس نے نئے محاصل سے 1/2-77 لاکھ روپیہ مزید نہ اکٹھا کرلیا ہوتا۔ بنگال کے بجٹ میں اضافہ دکھایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مرکز کو اپنا حصہ ادا نہیں کیا، اور نئے محصولات سے ایک کروڑ 40 لاکھ کی رقم جمع کرلی ہے۔ لیکن میرا خیال نہیں کہ یہ رقم پوری ہو سکے۔ اس لیے آئندہ اور محصولات کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ آسام نئے محصولات عائد کرنے کے باوجود 1/2-14 لاکھ کے خسارے میں ہے۔ پنجاب، بہار، اڑیسہ، سی۔ پی اور آسام میں نئے محصولات کی تجاویز زیرِ غور ہیں۔ یو پی میں گورنمنٹ کی طرف سے پیش کردہ تجاویز کو اسمبلی نے رد کردیا ہے۔

میں اپنے ہم وطن بھائیوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ان نئی کونسلوں کو اپنی راہ بد اختیار کرنے کا موقع نہ دیں۔ اب اور ٹیکس بڑھیں گے اور مجھے ایک اور خطرہ لاحق ہے۔ میں اپنے پورے زور کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر ہم اسی طرح دینے کی پالیسی پر عمل پیرا رہے تو ہم ان لوگوں سے رابطۂ اتحاد کھو بیٹھیں گے جو آج ہمارے ساتھ ہیں۔ اگر دفتری حکومت لوگوں کے مطالبات نہیں مانتی تو آؤ! ہم ان کونسلوں کا قصہ ہی تمام کردیں۔ اگر اور نئے ٹیکس لگائے گئے جیسا کہ آثار سے ظاہر ہے کہ ضرور لگائے جائیں گے، تو اس کی ذمہ داری دفتر شاہی سرکار پر ہوگی۔ پھر ہم سب مل کر حکومت کا مقابلہ کریں گے۔

میری یہ رائے بھی ہے کہ کانگریس کو مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم کا کام شروع کرنا چاہئے۔ مزدوروں کے متعلق تو ناگ پور کانگریس کا ریزولیشن بھی موجود ہے مگر مقامِ افسوس ہے کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ کچھ عدم تعاونیوں کے دل میں یہ خوف موجود ہے۔ کہ اگر کانگریس نے مزدوروں کو اپنے مفاد میں استعمال کیا۔ تو کانگریس

کے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ میں پھر تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس دلیل کو نہیں سمجھ سکا ''استعمال کرنا'' اس کا مفہوم بہت برا ہے اور دلیل کا مدعا یہ ہے کہ مزدور اور کسان اس جدوجہد میں ہمارے ساتھ نہیں۔ میں اس مفہوم کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ آج ہندستان میں نام نہاد تعلیم یافتہ اور متوسط طبقہ کی نسبت مزدور اور کسان سوراج کے لیے زیادہ بےقرار ہیں۔ اگر ہم نوعمر لڑکوں اور کالجوں کے طلبا کو استعمال کر رہے ہیں، اگر ہم ہندستان کی عورتوں کو استعمال کر رہے ہیں، اگر ہم تمام متوسط طبقات کو بلالحاظ مذہب وملت اور پیشوں کے استعمال کر رہے ہیں تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ مزدوروں اور کسانوں کو کیوں نہ استعمال کیا جائے؟ میرا خیال ہے کہنے والوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ کانگریس کمیٹیوں کے ممبر بن سکتے ہیں۔ مگر انہیں علیحدہ مزدور یا کسان انجمنیں نہ قائم کرنی چاہئیں۔ لیکن مزدوروں کے اپنے جداگانہ مفادات ہیں اور بعض اجنبی آجروں کے ہاتھوں انہیں کئی مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ یہی حالت کسانوں کی ہے۔ ان پر عموماً ایسے لوگ جبر کرتے ہیں جو ہندستان میں دفتری حکومت کے علم بردار ہیں۔ کیا اس خاص مفاد کی خدمت قومی مفاد کے منافی ہے؟ غریبوں کے لیے روٹی تلاش کرنا اور ایسے طبقہ کے لیے انصاف کی جستجو کرنا جو کسی خاص کاروبار یا پیشہ میں منہمک ہیں۔ تو یہ کام سوراج کے کام سے کیوں کر مختلف ہے۔ ہر بات جس سے قومی مقاصد کو تقویت پہنچتی ہو۔ ہر چیز جو ہندستانی عوام الناس کی مدد کرتی ہو۔ وہ یقیناً سوراج کے لیے ایسے ہی اہم ہے جس طرح کوئی اور بات۔ جس پر اس وقت کانگریس عمل پیرا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ کانگریس کو بلا تاخیر مزدوروں اور کسانوں کو منظم کرنے کے لیے ایک مضبوط کمیٹی مقرر کرنی چاہئے۔ ہم پہلے ہی کافی دیر کر چکے ہیں۔ اگر کانگریس نے اپنے فرض کی طرف توجہ نہ دی تو آپ کو ضرور امید رکھنی چاہئے کہ کسانوں اور مزدوروں کی ملک میں ایسی تنظیمیں بن جائیں گی جن کا آپ سے کوئی

تعلق نہ ہوگا۔ وہ سوراج سے پرے ہوں گی اور پرامن انقلاب میں طبقاتی مناقشات اور خصوصی مفادات کو ہوا دیں گی۔ اگر کانگریس اس ناپسندیدہ مقصد سے اپنی جان بچانا چاہتی ہے۔ تو آؤ! ہم مزدوروں اور کسانوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور ان کو ان کے اپنے خصوصی مفادات کو سامنے رکھ کر اس طرح منظم کریں کہ وہ بلند تخیل بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ جو ان کے مفادات خصوصی کی تسکین کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہاں ہمیں پھر کسانوں اور مزدوروں کے خود غرضانہ مفادات کو پورا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ خود غرضانہ مفادات کے پورا ہونے سے ہی قوم کی زندگی میں مناسب اور موزوں اضافہ ہوسکتا ہے۔

اب میں اس کام کی طرف اپنی توجہ منعطف کرتا ہوں، جسے پہلے ہی کانگریس کر رہی ہے۔ مجھے فوراً کہہ دینا چاہئے کہ ایسے کام سے دست کش نہ ہوا جائے جس پر کانگریس عمل کر رہی ہے۔ کام کا رخ بدلنے کو میں نے ضرور کہا ہے۔ اس سے میرا مدعا اس کام سے دست کش ہونا نہیں بلکہ اس کام میں اور اضافہ کرنا ہے۔

میری یہ پختہ رائے ہے کہ کالجوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ بدستور جاری رکھا جائے۔ میں مجلس تحقیقات سول نافرمانی سے اختلاف رکھتا ہوں کہ ایسے اداروں سے بچوں کو اٹھانے کے پروگرام کو ترک کر دیا جائے۔ میرے نزدیک یہ مسئلہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ نوجوانوں پر قوم کی قسمت کا دارومدار ہوتا ہے اور ایسی قوم کے لیے ترقی کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ جو راضی خوشی اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے لیے بھیجتی ہے۔ جہاں انھیں غلامی اور اجنبی کلچر کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ میں اس مسئلہ پر اور لے دے نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اتنی بار اظہار کر چکا ہوں کہ اب روشنی ڈالنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ میں تحقیقاتی کمیٹی کی اس سفارش سے ضرور اتفاق رکھتا ہوں کہ قومی اسکول اور کالج جاری

کیے جائیں۔

وکلا اور عدالتوں کے بائیکاٹ سے متعلق مجھے کمیٹی کی سفارشات سے اتفاق ہے۔ اس ضمن میں کئی سوالات پوچھے گئے ہیں۔ یہ کہ ڈیفنس کا حق ہونا چاہئے یا نہیں۔ اور ان موقعوں پر ڈیفنس کن مقاصد کے لیے کیا جائے؟ میں رسمی باتوں کے حق میں نہیں۔ اور میں ایسے رولز وضع کرنا ناممکن سمجھتا ہوں جو خاص حالات میں پیدا ہونے والے واقعات پر حاوی ہوسکیں۔ میں صرف اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہر حالت میں عدالتوں کے بائیکاٹ کو سامنے رکھا جائے۔

ہندو مسلم اتحاد، چھوت چھات اور ایسے تمام مسائل پر میں تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات سے متفق ہوں بایں ہمہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندستانی قوم کے تمام حصوں کا حقیقی اتحاد مناسب باہمی تعاون پر ہی قائم ہوسکتا ہے اور اس بات پر کہ قوم کا ہر ایک حصہ دوسرے حصہ کے حقوق تسلیم کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ مختلف حصوں مختلف اقوام میں معاہدہ عمل میں آنا چاہئے اگر ہم اچھوتوں کے ساتھ احساس برتری رکھتے ہوئے برتاؤ کریں گے تو ملک کو اس سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ ہمیں ان کو اپنے اس کام میں جو آج ہمارے سامنے ہے مصروف کرنا چاہئے اور ہمیں ان کے شانہ بہ شانہ اور دوش بہ دوش کام کرنا چاہئے۔

اب میں کھدر کی طرف توجہ پھیرتا ہوں۔ میری نظروں میں یہ سوال اس وقت سب سے اہم سوال ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں کاروباری بنیادوں پر کھدر تیار کرنے کے خلاف ہوں۔ جب میں نے 31/مارچ 1921ء کو بیزواڈا کانگریس میں مہاتما گاندھی کے ریزولیشن کی تائید کی تو میں نے کہا تھا:

> ''چرخہ کے متعلق ہماری اپیل کا یہ مطلب نہ تھا کہ بدیسی سرمایہ دارانہ پیداوار کا مقابلہ شروع کردیا جائے۔ ہمارا مقصد

لوگوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی اقتصادی زندگی کو خود وضع کریں اور اپنے اور اپنے تمام خاندان کے فالتو وقت کو اپنی ضروریات کی مزید آرٹھک اشیاء کو بنانے پر وقف کرنا چاہئے تا کہ ان کی اپنی حالت بہتر ہو۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اس ملک کے لوگوں کو خود کفیل بنایا جائے ۔ یہ کام کچھ مشکل ہے ۔ مگر ضروری ہے اور ہمیں اپنے پورے زور کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے ۔ وسیع پیانہ پر فیکٹریاں چلانے کی نسبت یہ بدر جہا بہتر ہے کہ لوگ خود کفیل ہو جائیں۔ ایسی فیکٹریاں تنگ نظری کا ثبوت ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ اگر چہ وہ موجودہ ضرورت کو پورا کر دیں گی۔ لیکن وہ ایک ایسی خرابی پیدا کر دیں گی جس کو درست کرنا ناممکن ہو جائے گا ۔ میں فطرتاً ہندستان میں ایک مانچسٹر پیدا کرنے کے خلاف ہوں جس کا ہمیں پہلے ہی کافی تجربہ ہو چکا ہے ۔ اگر ممکن ہو تو آؤ! ہم اس کے امکان کو رفع کر دیں۔"

یہ عموماً کہا جاتا ہے کہ صرف کھدر ہی ہمیں سوراج دلا سکتا ہے ۔ میں اپنے ہم وطنوں سے پوچھتا ہوں کہ کھدر ہی کس طرح ہمیں سوراج دلا سکتا ہے؟ یہ بیان صرف ایک پہلو سے درست ہو سکتا ہے ۔ ہمیں کھدر کو سوراج کی نشانی یا نمونہ سمجھنا چاہئے ۔ چونکہ کھدر ہمیں ہماری قومی زندگی کے بیشتر حصہ کو خود کفیل بنا دیتا ہے ۔ چنانچہ اس سے امید کی جاتی ہے کہ اس کا فیضان ہماری قومی زندگی کو آزاد بنا دے گا۔ نمونہ کا یہی مطلب ہے ۔ میرا خیال یہ ہے کہ نمونہ کی ایسی تقلید اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہر ممکن رخ سے ہم عدم تعاونی سرگرمیوں کا آغاز کر دیں۔ صرف اسی طریقہ سے سوراج

جلد حاصل ہو سکے گا۔

ابھی مجھے آپ کو امید اور یقین کا پیغام دینا باقی ہے۔ آزادی کی طرف کوئی شاہراہ نہیں جاتی۔ بلکہ اس کا راستہ تاریک اور دشوار گزار ہے۔ لیکن آپ کی ہمت بے پناہ ہے اور آپ کا عزم پختہ ہے اور اس راستہ میں اگر چہ ناکامیاں بھی ہوں گی۔ مگر وہ آپ کی بیرونی حکومت کی غلامی سے چھٹکارے کی جدو جہد کو اور بھی تیز کر دیں گی۔ ہمیں اپنے کسی کارنمایاں کو فتح نہ سمجھ لینا چاہئے۔ کارنمایاں محض دکھاوا ہے اور دکھاوے عموماً فریب دہ ہوتے ہیں۔ میں یہاں صرف اسی بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ اگر چہ ہماری تحریک نے ٹھوس طور پر کسی کارنمایاں کا ثبوت نہیں دیا۔ مگر فتح ہماری یقینی ہے۔ اس فتح کا اعلان دفتری حکومت اپنے ان پیہم اقدامات سے کر چکی ہے۔ جو تحریک کی ترقی اور نشوونما کو روکنے کے لیے اٹھائے گئے اور اٹھائے جا رہے ہیں۔ حکومت نے جبری قوانین کو واپس لینے سے انکار کر دیا ہے اور ایگزیکٹو حکومت اپنے اختیارات خصوصی کو نہایت بے دریغی سے استعمال کر رہی ہے اور ہمارے محبوب رہنما کو جس نے اپنے آپ کو دفتری حکومت کے غصہ کی بھینٹ پر قربانی کے لیے پیش کیا۔ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن اگر چہ تحریک کی فتح یقینی ہے۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ اس کا دارومدار بالکل آپ پر اور اس بات پر ہے کہ آپ ان طاقتوں کا جو آپ کے مدِ مقابل کھڑی ہیں، کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ عیسائیت کو فتح کا سہرا اس وقت نصیب ہوا جب یسوع ناصری نے اپنے آپ کو یہودیوں کی بے پناہ پیروی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ جن طاقتوں سے آپ دوچار ہیں وہ صرف جدید دفتریت کی طاقتیں نہیں۔ بلکہ ان یہودیوں کی طاقتیں ہیں۔ جن کا نصب العین یہ ہے کہ دفتری حکومت کا جھنڈا پورے وقار اور شان سے بلند رہے۔ اب سچائی اور انصاف کے مفاد میں قربان ہونا آپ پر موقوف ہے۔ تا کہ آپ کی اولاد کی اولاد بھی ان قربانیوں کے پھل سے بہرہ ور

ہو۔ خدا کرے کہ آپ روحانی لڑائی لڑیں۔ تا کہ جب فتح آپ کے قدم چومے تو آپ اخلاقی معیار سے نیچے نہ گر جائیں اور طاقت اپنے ہی ہاتھ میں رکھنے کی خواہش آپ پر غالب نہ آجائے۔ لیکن اگر آپ لڑائی روحانی طور پر لڑیں گے تو آپ کے ہتھیار بھی ایک روحانی سپاہی کے ہونے چاہئیں۔ غصہ آپ کے لیے نہیں۔ نفرت آپ کے لیے نہیں اور نہ ہی معمولی معمولی باتیں، کمینہ پن اور جھوٹ آپ کو زیب دیتے ہیں۔ آپ کے لیے تو طلوع سحر کی امید ہے اور آپ کے لیے وہ گیت ہے جو تیتان نے قید اور زنجیروں میں محبوس گایا تھا تیتان اگرچہ محبوس تھا مگر یونانی افسانہ میں اسے Champion of man کے خطاب سے پکارا گیا ہے۔

ان مصائب کو برداشت کرنا جنہیں امید لامتناہی سمجھتی ہے۔ اس طاقت کا مقابلہ کرنا جو حاضر ناظر معلوم دیتی ہے۔

پیار کرنا اور برداشت کرنا اور اس وقت تک پرامید رہنا کہ جب امید اپنے کھنڈروں سے ان چیزوں کو پیدا کردے جو مقصود ہوں۔ تبدیلی نہ آنے پائے اور قدم ڈگمگا نہ جائیں۔

ہاں تیتان خود ایسا ہی ہوگا۔

مولانا محمد علی جوہر

کوکاناڈا ——————— 26/دسمبر 1923ء

حضرات!

انڈین نیشنل کانگریس کے ہر صدر نشین کے لیے ایک دستور چلا آتا ہے کہ وہ ارکان کانگریس کی اس عزت افزائی پر شکریہ ادا کرے جو ملک وقوم کی جانب سے انتہائی عزت ہو سکتی ہے۔ یہ بھی دستور ہے کہ ہر جدید صدر اپنی نااہلی اور اپنے پیش رؤں کے مقابلہ میں اپنی کم مائگی کا اظہار کرے۔ اس میں قطعی شبہ نہیں کہ ان حضرات کے خلقی انکسار نے ان کے اس اظہار میں وہ خلوص پیدا کر دیا ہے جو کسی طرح تکلف وتصنع پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اگر میں اپنے متعلق بھی اسی قسم کا اظہار کروں تو اس کا باعث اصلی میرا خلقی انکسار نہ ہوگا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دو سال ہوئے کہ جب میری گرفتاری سے کچھ ہی قبل بعض صوبوں نے صدارت کانگریس کے لیے میرا نام پیش کر کے میری عزت افزائی فرمائی تھی، تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی اور مجھے موقعہ حاصل تھا کہ اپنا نام واپس لے کر اپنی حیرت کا کچھ تو اظہار کر دیتا۔ چنانچہ میں نے یہی کیا لیکن اس مرتبہ یہ موقع نکل چکا تھا اور معاملہ میرے اختیار سے بالکل باہر تھا۔ کیوں کہ جب میں قید فرنگ سے آزاد ہوا تو معاً اس کے بعد ہی آپ کی مجلس استقبالیہ کی جانب سے مجھے یہ تار پہنچا کہ چند روز میں مجلس کا ایک جلسہ صوبہ کانگریس کمیٹیوں کے انتخاب پر اپنی منظوری کی

مہر ثبت کرنے کے لیے منعقد ہونے والا ہے۔ یقین فرمایئے کہ وہ اسباب جو دہلی میں اجلاس خاص کے داعی و محرک ہوئے اور ان سے بھی زیادہ خود دوران اجلاس میں پیش آنے والے واقعات اگر مجھ پر ان باتوں کا انکشاف نہ کر دیتے جن کے ہوتے ہوئے میرا اپنے نام کو واپس لینا خدمت قوم سے اعراض کرنے کے مرادف ہے، تو میں اس وقت باوجود تاخیر ہونے کے اپنا نام واپس ہی لے لیتا۔ کیوں کہ آپ کو یاد ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگریس سے میرا تعلق حال ہی کا ہے۔ یہ 1919ء کا واقعہ ہے کہ میں کانگریس میں پہلی مرتبہ ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور اس وقت بھی میری شرکت معمولی ضابطے کے مطابق نہ تھی۔ آپ میں اکثر حضرات کو یاد ہوگا کہ ہم دونوں بھائی اسی وقت بیتول جیل سے جنگ کے آخری چار سال کی مدتِ نظر بندی اور اخیر میں قید جھیلنے کے بعد آزاد ہو کر آئے تھے۔ رہائی کے بعد ہم سیدھے کانگریس پہنچے۔ جس کا اجلاس شہادت گاہِ امرت سر میں ہو رہا تھا اور چونکہ ہم باضابطہ ڈیلی گیٹ منتخب نہیں ہو سکے تھے۔ لہٰذا مہمان نواز امرت سر نے فوراً ہمیں اپنا بنا لیا۔ دوسرے سال ناگ پور میں جو اجلاس منعقد ہوا، صرف وہی ایسا تھا جس میں ہم دونوں بھائی باقاعدہ منتخب ہو کر ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک کانگریس ہوئے۔ اب تک اس کرسی صدارت کو وہی بزرگ زینت دیتے رہے ہیں جو کانگریس کی خدمت میں عمریں صرف اور بال سفید کر چکے تھے۔ تو ایسی صورت میں کیا ایک ایسے شخص کا جو کانگریسی ہونے کے اعتبار سے ابھی کل کا بچہ ہے۔ آپ کے اس غیر معمولی اعزاز کے لیے شکریہ ادا کرنا محض رسمی قرار دیا جا سکتا ہے۔

صرف ایک خیال جس کی بنا پر آپ کی یہ عنایت حق بجانب ہو سکتی ہے یہ ہے کہ کانگریس سے میرا تعلق اگر چہ جدید ہے۔ لیکن ایک ایسی محترم ہستی سے نسبت حاصل ہے جس کا شمار باوجود جدید ترین کانگریسی ہونے کے عظیم ترین کانگریسیوں میں ہے

اور بجا ہے۔ اور جسے آج ہر شخص کی نگاہیں اس پنڈال میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہیں۔ جب سے میں نے بحیثیت ڈیلی گیٹ 1919ء میں کانگریس کی شرکت کی اسی کی واحد شخصیت سب پر غالب دیکھی۔ لیکن سب سے زیادہ آج کے دن ہمیں اپنے سردار مہاتما گاندھی کی ضرورت محسوس ہورہی ہے اور اگر خدا کی مرضی یہی ہے کہ اس کی جگہ پر اس کا ادنیٰ تبع جس کی عقیدت ومحبت ادنیٰ نہیں۔ تصفیہ مسائل میں آپ کا ہاتھ بٹائے تو یقین فرمایئے کہ میں اپنا دل انھیں جذبات سے لبریز پاتا ہوں جو اس عرب شاعر کے دل میں موجود تھے۔ جس کا مقولہ ہے:

كَبَّرَ نِيْ مَوْتُ الْكُبَرَاءِ (بزرگوں کی موت نے ہم کو بزرگ بنادیا)

باوجود اس کے کہ اس شخص کو جو مہاتما گاندھی کی اسیری کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ یہ امید تھی کہ بزعم خود انھیں زندہ دفن کر کے وہ اس روح کو فنا کردے گا جسے مہاتما نے قوم میں پیدا کیا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ روح آج بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح خود مہاتما زندہ ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی اعانت اور آپ کی عنایت کی بجا توقع کر کے میں آج اسی روح کو باقی رکھنے کی آپ کو دعوت دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میں بالکل ہی اس جلیل القدر منصب کے جس کے لیے آپ کی کرم فرما نظر انتخاب نے مجھے موزوں سمجھا نااہل ثابت نہ ہوں گا۔

حضرات! جو شخص آپ کی رہنمائی کرسکتا ہے وہ وہی ہے جو آپ کی رہنمائی امرت سر میں، کلکتہ میں، ناگ پور میں اور احمد آباد میں کر چکا ہے۔ باوجودیکہ کانگریس کے اجلاس میں ہر جگہ کانگریس کا اپنا منتخب شدہ صدر موجود ہوتا تھا ہمارا سپہ سالار آج دشمن کے ہاتھ میں اسیر جنگ ہے اور اس کی عدم موجودگی سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کو کوئی بھر نہیں سکتا۔ رہا میرا معاملہ تو میری حیثیت آپ ہی جیسے ایک سپاہی سے زیادہ نہیں۔ جسے آپ کی عنایت نے صف سے باہر نکال لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی

یہ عنایت نہ صرف اس اجلاس کے مباحث ہی میں بلکہ پورے سال بھر مبذول رہے گی۔ جس میں آپ کے قانون کی رو سے بہ حیثیت صدر آپ کا ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے۔

ایک امر میں آپ کو بھی حق ہے کہ میرے متعلق اطمینان حاصل کر لیں اور میں اس کے متعلق بلا تامل آپ کو اطمینان دلانے کو موجود ہوں۔ میں عمر بھر لڑ نبٹتا رہا ہوں اور لڑ نبٹنا بھی کیسا جو اپنے پورے کس بل کے ساتھ بھڑ بھڑ کر لڑتا رہے لیکن صدر منتخب کر کے آپ نے مجھے میری طبعی آزادی سے محروم کر دیا ہے، اور اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم صرف اس آزادی کو واپس ہی لینے کے لیے میں بڑی خوشی سے اس موقع کے اعزاز صدارت سے دست بردار ہو گیا ہوتا۔ لیکن اس حیثیت میں آپ نے مجھے ثالث بالخیر بنا دیا ہے اور مجھ جیسے جنگ جو تک کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر جنگ سے بہتر کوئی چیز ہے تو وہ صلح ہی ہے وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۔ لہٰذا میں بھی صلح واتفاق کے قیام میں مدد دینے کی خاطر جنگ جوئی سے دست بردار ہوتا ہوں اور اس کا مجھے مطلق افسوس نہیں۔ بہ حیثیت صدر جہاں تک میرے دائرۂ امکان میں ہے مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے نہ کہ حکومت کی اور آپ کی جیسی سیاسی جماعتوں کے ضوابط کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے اس اجلاس کا افتتاح ایک خطبہ سے کرنا ہے۔ لیکن اس فرض کو یقیناً میں آپ کے ایک خادم کی حیثیت سے انجام دے رہا ہوں۔ نہ کہ ایک حاکم کی حیثیت سے۔ مختلف مسائل کے فیصلے کرنے میں جو آپ کے تصفیہ کے لیے پیش ہوں گے۔ میں آپ کو مدد دینے کے لیے حاضر ہوں اور جس حد تک کہ آپ کے ایک رفیق کار اور ہمدرد کے اختیار میں ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میں آپ کی ایسی مدد کر سکوں گا جس سے آپ صائب اور صحیح نتائج ہی مترتب کر سکیں اور ایسے نتائج وقت کو خراب، مزاج کو تلخ اور قوت کو ضائع کیے بغیر مترتب ہوں۔ لیکن یہ فیصلے آپ ہی کے ہوں گے

نہ کہ میرے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ صحیح معنی میں ہم سب کے متفقہ فیصلے ہوں گے۔ میں نے اوپر کہیں مہاتما جی کی ہمہ گیر شخصیت کا ذکر کیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مہاتما کے اثر کو زائل کرنا ان خال خال افراد کے لیے بھی جنھوں نے اس اثر کو زائل کرنا چاہا، کس قدر دشوار تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی نے نہ تو کبھی کسی سے کہا اور نہ چاہا کہ کوئی اپنی قوت فیصلہ ان کے تابع کر دے اور میں نے یہ سنا ہے کہ اپنی گرفتاری سے کچھ ہی روز پیش تر مہاتما جی نے بہ کمال تاسف یہ محسوس کیا کہ ان کے متبعین اور مداحین میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے اگرچہ بہ رضاؤ رغبت اور بہ کمال خلوص ان کے ساتھ کامل اتفاق رائے کا اظہار کیا تھا۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ محض مہاتما کی شخصیت کا اتباع قبول کر رہے ہیں۔ اور اپنے اذعان ویقین کی قوت کے بھروسہ پر مہاتما کی تدبیر کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔

میرے لیے یہ کہنا بھی داخل گستاخی ہے کہ میرا اتنا اثر نہیں جتنا اثر بلا شک وشبہ ملک کے قلوب پر مہاتما جی کا تھا اور میں چاہتا ہوں کہ ہر رائے خواہ وہ کسی طرف دی جائے۔ رائے دہندہ کے ذاتی اور بعد غور کامل فیصلہ کا نتیجہ ہو اور اس رائے کی پوری ذمہ داری انفرادی طور پر رائے دہندہ پر عائد ہوتی ہو۔ اپنے متعلق میں کہتا ہوں کہ اگر میں کسی اہم معاملہ میں اپنی رائے محض اس خوف سے ظاہر نہ کروں کہ شاید وہ آپ کی نظر میں قابل قبول نہ ہوگی۔ تو میں یقیناً ادائے خدمت میں قاصر رہوں گا اور پھر میرا یہ فعل حقیقی جمہوریت کے مطابق بھی نہ ہوگا۔ لیکن اگر صرف صدر کی خوشنودی کے لیے کانگریس کے ڈیلی گیٹوں کو آزادی نہ دی گئی۔ یا بعض کی دل جوئی کے لیے اکثر کو خاموش کر دیا گیا تو یہ جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کے ساتھ محض مذاق وتمسخر ہے۔

بہر کیف ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ملک نے چھ ہزار ڈیلی گیٹوں کو اس لیے نہیں منتخب کیا ہے اور ہم سب کے سب ملک کے ہر گوشہ سے چل کر اس

طرح کوکینیڈا نہیں آئے ہیں۔ جیسے رائے شماری کے جلسوں میں آتے ہیں کہ صرف اپنے ووٹ دے دیں، اور اپنے انفرادی فیصلے جو روانگی سفر سے قبل سوچ چکے تھے پیش کردیں۔ بھلا ہم اپنی ذات کے لیے اور نیز دوسروں کے لیے کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اگر بقول ایران کے خیمہ دوز شاعر کے اسی دروازے سے باہر آگئے جس سے داخل ہوئے تھے۔ اگر ہم اپنے سفر کو بے سود اور اپنی محنتوں کو رائیگاں نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی اپنی رایوں کو خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اپنے دوسرے ڈیلی گیٹ بھائیوں کی رایوں سے مقابلہ و موازنہ کر کے اور ان سے اثر لے کر یہاں اچھی طرح جانچ پڑتال کرلیں اور اس میں کوئی شرم نہیں۔ بلکہ بسا اوقات یہ ہمارے لیے قابل تعریف ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے سے زیادہ تجربہ کار اور قابل لوگوں کے فیصلے اور کثرت آراء کے مجموعی وزن سے متاثر ہوکر اپنی رائے میں تبدیلی کریں۔ اگرچہ وہ افراد بحیثیت افراد ہم سے بہتر نہ ہوں اور گو ہمیں اپنی رائے کے عدم صحت کا اس وقت بھی پورا یقین نہ ہو۔ میں دوسروں کے معتقدات کی عزت کرنے میں کسی سے کم نہیں۔ لیکن معتقدات ہر موقع پر ضمیر کے معاملات نہیں ہوا کرتے اور میرے اس خیال کی تائید میں تاریخ کے ایک بڑے پختہ ضمیر مدبر یعنی کرامویل کی مثال موجود ہے۔ جو اپنے رفقاء سے یہ کہا کرتا تھا۔ "یاد رکھو تم سے بھی غلطی کا امکان ہے۔"

ہر ڈیلی گیٹ کو حق حاصل ہے کہ پوری آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرے اور ایسا اظہار رائے جتنے مسائل پر چاہے کرے۔ اسے یہ بھی حق ہے کہ خود جتنی تجویزیں چاہے پیش کرے اور دوسروں کی تجویزوں کی جیسی چاہے ترمیمیں کرے اور جتنی مرتبہ چاہے رائیں شمار کرائے۔ لیکن ان حقوق کے استعمال میں اگر دوسروں کی رائے وسہولت اور مصیبت زدہ و درماندہ قوم کے بہترین مفاد کا کما حقہ خیال نہ کیا گیا تو کوئی کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے بڑے سردار مہاتما گاندھی اکثر افسوس کیا کرتے تھے کہ

ہمارے مجامع میں جو قومی جوش کا اظہار ہوتا ہے ان میں ضبط نفس اور پابندی ضابطہ مفقود ہے۔ اور حقیقتاً یہ ہمارے بھائیوں کی طبعی امن پسندی اور نیک مزاجی ہی ہے جو بسا اوقات ناخوش گوار واقعات سے ہمارے مجامع کو بچاتی رہی ہے۔

ضبط نفس اور پابندی ضابطہ کی تعلیم اراکین کانگریس جیسے رہنمایان ملک ہی دے سکتے ہیں اور خود حضرات ڈیلی گیٹ کا ضبط نفس اور پابندی ضابطہ عوام کے ضبط نفس اور پابندی ضابطہ کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جس امر کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ گو ہم اپنے خیالات کو زوردار سے زوردار الفاظ میں ظاہر کریں۔ لیکن ان کے اظہار کے وقت ایسی فریق بندی سے بچتے رہیں۔ جس کی بنیاد ذاتی خصومت پر ہو، اور جس کا انجام بدزبانی وطعن وتشنیع پر ہو۔ ہمارے سردار اپنے عدم تشدد کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ پس جس عدم تشدد کا ہم اس قدر بلند آہنگی سے دعویٰ کرتے ہیں اگر ہم اس کے برکات سے اپنے بہترین دوستوں ہی کو محروم رکھیں، تو یہ امر اس شخص کے ساتھ ہماری عقیدت ووفاداری کی ایک عجیب وغریب تشریح وتفسیر ہوگی جو خیالات والفاظ تک میں دشمن پر تشدد جائز نہیں رکھتا۔

میں کسی صورت میں بھی عام جوش وسرگرمی کو سکون وسکوت یا بے توجہی وبے پروائی سے بدلنے کو تیار نہیں۔ ہمیں ضبط ونظم کی ضرورت ہے نہ کہ موت کی۔ قومی مشین کے چلنے کے لیے ضرورت کے مطابق اسٹیم کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اسے قابو میں رکھنا بھی شرط ہے۔ اسی کے لگ بھگ سمجھوتے اور اپنے شرکاء کار کے لیے اپنی جماعتوں میں گنجائش نکالنے کے اصول یہی ہیں۔ ہماری ساری جنگ ہی اصول کی جنگ ہے اور اصول کو تو ہم امن تک کی خاطر نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن ترک اصول سے محترز رہنے کے بعد قوم کی موجودہ حالت کے تقاضے سے ہم ہر قربانی کرنے پر مجبور ہیں۔ تاکہ ہم ان لوگوں کو بھی اپنا رفیق سفر بنا سکیں۔ جو ہماری ہی طرح قوم پرست

تو ہیں۔لیکن ہر معاملہ میں ہماری رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ہماری سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے سردار نے سیاسیات کو روحانیات کے قالب میں بدل دیا ہے اور ہم اب ایسی سیاست پر ہرگز قانع نہیں رہ سکتے۔ جو اخلاقیات سے بے تعلق ہو۔سیاسی امور میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں بہترین چیز کے حصول میں کامیابی نہیں ہوتی اور بہ مجبوری اس سے کم تر درجہ کی چیز ہی پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی خود نام ہے دوسرے نمبر کی چیزوں کے ایک نامتناہی سلسلے کا۔اگر ہم بجائے بہترین شے حاصل کرنے کے اس سے اتری ہوئی کوئی چیز قبول کرنے سے قوم کی کثیر جماعتوں کو اپنے ساتھ فتح وکامرانی کی شاہراہ پر چلاسکیں تو ہمیں اس اتری ہوئی چیز کے قبول کرنے سے کوئی شے بھی مانع نہیں ہونی چاہئے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو جماعتی فتح حاصل کرنے کا خیال تک دل میں نہ لانا چاہئے۔دراں حالانکہ ہمیں غلامی کے مقابلہ میں آزادی کی اور پوری قوم پر مظالم کے مقابلے میں عدل وانصاف کی فتح عظیم حاصل کرنی ہے۔میرے دوستو! مجھے معاف کیجئے کہ میں نے پند ونصائح کا دفتر کھول دیا۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا آپ کی اور اپنی دونوں کی حالت کے اعتبار سے میرا ایسا کرنا ضروری تھا۔حالا آمدم برسر مطلب!

میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ میرا تعلق کانگریس سے بہت قلیل عرصے کا ہے لیکن میرا یہ اعتراف محض شخصی ہی نہیں بلکہ مسلمانان ہند کی پوری سیاسی تاریخ پر محتوی ہے۔ اور اگر میں اس کا ایک مختصر سا خاکہ آپ کے روبرو پیش کروں تو یہ محض اس مسئلے کی توضیح کے خیال سے ہوگا۔جو آج ہمارے تمام مسائل سے زیادہ اہم اور محتاج وضاحت ہے۔ 1885ء میں جب بعض ہندستانی ارباب حل وعقد نے اپنے انگریز ہمدردوں کی اعانت سے انڈین نیشنل کانگریس کی بناء ڈالی تو مسلمانان ہند بہ استثناء معدودے چند

اس تحریک کی شرکت سے محترز رہے۔ اول تو مغربی تعلیم کی کمی کے باعث وہ ایسی تحریک میں شرکت وشمول کے اہل ہی نہ تھے۔ جو خالصتاً مغربی طرز پر تعلیم یافتہ جماعتوں کی پیدا کردہ تھی۔ اس کے علاوہ ان کے اس وقت کے مزاج سیاسی نے انھیں ایسا عنصر بنا دیا تھا جس کی موجودگی کسی سیاسی تحریک کے لیے خطرناک ہونی ممکن تھی۔ وہ ہندستان کی حکومت تو کھو چکے تھے۔ لیکن اس حکومت کی بوان کے دماغوں میں باقی اور اس کی روایات ان کے دلوں میں ہنوز محفوظ تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ طرز جدید کی تعلیم سے انھیں جو تنفر پہلے ہی سے تھا اس میں اور بھی شدت ہوگئی۔ جنگ پلاسی اور واقعہ 1857ء کی درمیانی مدت صد سالہ میں آہستہ اور غیر محسوس تدریج کے ساتھ ہندستان کی عنان حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ لیکن مسلمان اس نئے حکم رانوں کو تہذیب وتمدن میں اپنے سے فروتر ہی سمجھتے رہے۔ نفرت وناراضی کے یہ دل بادل ایک صدی تک جمع ہوتے رہے۔ تا آں کہ 1857ء میں یہ طوفان ٹوٹ پڑا۔ اس کی ابتداء کلکتہ کے قریب دیسی فوج میں ایک معمولی فساد کی حیثیت سے ہوئی۔ لیکن دہلی اور نیز میرے اپنے صوبے میں جہاں انگریزوں کے رہنے نہ رہنے کا سوال درپیش تھا۔ مختلف تکالیف وشکایات نے پیدا ہوکر سیاسیات کو مذہبی رنگ دے دیا تھا۔ اگرچہ بہت سے مسلمانوں نے خطرات عظیمہ کا مقابلہ کر کے انگریزوں کی ایسے وقت میں مدد کی جب کوئی شخص مشکل سے ان کی کامیابی کی پیشین گوئی کر سکتا تھا۔ تاہم اس کی پاداش میں سب سے زیادہ مصائب ان مقامات کے مسلمان امراہی کو برداشت کرنے پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مظالم ومصائب سے بھی زیادہ بہ لحاظ اپنے مستقل نتائج کے واقعہ 1857ء بلا مبالغہ انقلاب فرانس کے اس معاشرتی زلزلے سے تشبیہ دیا جاسکتا ہے۔ جس کے بعد فرانس کے قدیم طبقہ امراء میں سے بہت سے عالیھا سافلھا ہوگئے۔ مسلمان امراء میں سے جو

بچے کھچے رہ گئے تھے۔ وہ اپنے اثر سے بالکل اور اپنے مقبوضات کے زائد حصے سے محروم ہو چکے تھے اور انھیں اسلامی حکومت کے واپس آنے کی قطعی کوئی امید نہ رہی تھی۔ تاہم مسلمانوں کی ایک پوری نسل ہندستان کے ان نئے حکمرانوں کی تہذیب وتمدن سے جسے وہ اب بھی حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ یکسر بے تعلق رہی مسلمان ان یونیورسٹیوں کی تعلیم سے جو اسی سال کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں قائم ہوئیں۔ جس میں 57ء نے اسلامی ہند کے سیاسی مرکزوں کو تہ و بالا کر ڈالا تھا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے۔ مسلمانوں کے اس طرز عمل کا (جو اپنے گھروں میں منہ پھیلائے بیٹھے تھے۔) بدیہی نتیجہ تھا کہ جب تقریباً 30 سال بعد ہندستانیوں کی ایک نئی نسل نے جو انگریزوں سے استفادہ علم کر چکی تھی۔ مغربی طرز پر ایک سیاسی تحریک شروع کی۔ تو اس وقت ہندستانی مسلمان اس قسم کی تعلیم نہ ہونے کے باعث اس تحریک میں کوئی حصہ لینے کے قطعاً ناقابل ہوئے۔ تاہم کانگریس نے جو اپنے آپ کو ''ہندستانی'' اور ''قومی'' کے نام سے موسوم کرتی تھی، مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت کو محسوس کیا۔ کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنے اس نام کو حق بجانب ثابت نہیں کر سکتی تھی۔

چنانچہ شروع ہی سے مسلمانوں کو ڈیلی گیٹ بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن عین اس موقع پر سر سید احمد خاں نے جو مسلمانان ہند میں تعلیم مغربی کے محرک اعظم ہیں سیاسی میدان میں قدم رکھا اور دو تاریخی تقریروں کے ذریعہ سے جن میں سے ایک 28 ردسمبر 1887ء کو لکھنؤ میں اور دوسری 16 رمارچ 1888ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ انھوں نے سیاسی جدوجہد کی ان کارروائیوں کو بھی یک قلم روک دیا۔ جو مسلمانوں کی طرف سے تحریک کانگریس کی تائید میں ظاہر ہونی شروع ہوئی تھیں۔ ان تقریروں پر اعتراض کرنا کچھ مشکل نہیں کیوں کہ ان میں بہت سے ایسے منطقی مغالطے ہیں جن کی تائید آج کوئی بھی سیاسی، دماغ رکھنے والا مسلمان نہیں کر سکتا۔ لیکن میں ان لوگوں میں

نہیں ہوں جو سید احمد خاں کو محض اس بنا پر ہندو مسلم اتحاد کا مخالف سمجھوں کہ ان تقریروں میں بعض نامناسب فقرے ان کی زبان سے ادا ہوگئے تھے جو ان جیسے جنگ جو مناظر کی خصوصیات میں سے تھے۔

اگرچہ سرکاری ملازمت سے سبک دوشی کے بعد سید احمد خاں کی پبلک زندگی اپنی قوم کی ترقی کے مساعی ہی میں صرف ہوئی۔ تاہم وہ ویسے ہی اچھے ہندستانی رہے جیسے مسلمان تھے۔ ان کی بہت سی تقریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے سرگرم محبت وطن تھے اور ان کا سینہ اتحاد ہند کے جذبہ محبت سے لبریز تھا۔ جو لوگ ان سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں سے ان کی کیسی گہری دوستی تھی۔ جو اس تعصب کی موجودگی میں قطعی ناممکن تھی جس کا بعض وقت ان پر الزام لگایا جاتا ہے۔

یہ الزام بھی کسی طرح صحیح نہیں کہ وہ ہر زمانے کے لیے مسلمانوں کے سیاسیات میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ اپنی ان دو تقریروں میں جن کا میں نے ذکر کیا۔ انھوں نے جو کچھ دلائل بھی پیش کیے ہوں ان سے قطع نظر کر کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے وہ صرف دو ہی دلیلیں پیش کرتے تھے۔ جن کی بنا پر بظاہر خود سید احمد خاں کو بھی یقین تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی شرکت کانگریس میں قطعی نامناسب تھی۔ وہ اس امر کا اچھی طرح اندازہ کرتے تھے کہ ان کے زمانے کے مسلمانوں کی طبیعت و مزاج کو اس سے زیادہ کوئی شغل و فعل نہ تھا کہ وہ اپنے برطانوی غاصبین حکومت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں۔ اور وہ یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ یہ فعل جیسا آسان تھا ویسا ہی آخر کار کانگریس جیسی امن پسند سیاسی تحریک کی بقا و ترقی کے لیے بہت ہی خطرناک ثابت ہوگا۔ یہ پہلی دلیل تھی جس نے سید احمد خاں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی قوم کو سیاسیات میں خاص حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ دوسری دلیل بھی کچھ کم مضبوط نہ تھی۔ ان کی

رائے یہ تھی کہ مسلمان اگر اپنی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اشاعت تعلیم میں کوشش کرنی چاہئے اور مغربی تعلیم کے حصول کے لیے مسلمانوں کو راضی کر لینا آسان نہ تھا خواہ اپنی اس درس گاہ میں ہی کیوں نہ ہو جس میں بہ خلاف سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے مذہبی تعلیم بھی دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ آسان تر تھا کہ قابل نفرت حکومت کافرہ کی تخریبی نکتہ چینی کے مزے لیتے رہیں۔ بہ مقابلہ اس کے کہ ماہرین تعلیم کے خشک و بے مزہ تعمیری پروگرام سے دل چسپی لیں۔ لہٰذا سید احمد خاں نے اپنی تمام تر توجہ اس پر صرف کر دی کہ مسلمانوں کے مسائل کو سیاسی راستے کی طرف رخ کرنے سے روکیں جو زیادہ دل کش لیکن ساتھ ہی اس کے کم سود مند تھا۔

پچھلی نسل کے اعمال و افعال پر نظر ڈالتے ہوئے آج جب کہ وقوع واقعہ کے بعد عقل مند بننا زیادہ آسان ہے۔ سید احمد خاں کا یہ طرز عمل میری رائے میں نہایت دانش مندی پر مبنی تھا۔ اور اگر چہ میرا جی چاہتا ہے کہ بعض باتیں جو ان کی زبان سے نکل گئیں کاش کہ وہ نہ کہتے۔ تاہم میں اس اعتراف پر مجبور ہوں کہ مسلمانوں کا یا بہ حیثیت مجموعی ہندستان کا کوئی خیر طلب مسلمانان ہند کی رہنمائی کے لیے بجز اس کے اور کوئی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

لہٰذا یہ بھی پیش نظر رہے کہ جس شخص نے مسلمانوں کا مفاد اسی میں سمجھا کہ وہ نظریہ حالات موجودہ کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ وہ شخص مسلمانوں کے حصہ غالب کا محبوب نہ تھا۔ سید احمد خاں چونکہ تعلیمات قرآنی کی تفسیر عقل انسانی کے مطابق کرتے تھے اور ان عام پسند وہمیات کے شدت سے مخالف تھے جو راسخ العقیدہ مسلمانوں میں مسلمات مذہبی سمجھی جاتی تھیں، اور نیز ان رسوم و روایات کی بیخ کنی میں مصروف رہے جو "ٹھیٹ اسلام" کی نظر میں تو مستند نہ تھیں مگر جنھیں مرور ایام نے مذہبی شان دے

رکھی تھی۔ اسی لیے انھیں ملحد و کافر قرار دیا گیا۔ لکھوکھا مسلمان انھیں سخت سست کہتے بلکہ سب وشتم کرتے اور مدت دراز تک اس کالج کو جو انھوں نے علی گڑھ میں قائم کیا تھا ہوا سمجھتے رہے۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود الزام کفر و الحاد اور باوجود شدت سب وشتم سیاسی پالیسی میں ساری قوم کی قوم نے بے چوں و چرا اسی شخص کی پیروی کی۔ ظاہر ہے کہ کسی منطقی مغالطے یا سیاسی سبز باغ میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی۔ اور میرا یقین واثق ہے کہ سید احمد خاں کو اس میں محض اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ ان کی سیاسی رائے صائب تھی۔

لہٰذا تقریباً 20 سال تک نہ مسلمانوں نے سیاسیات میں حصہ لیا اور نہ ان کے پاس کوئی قابل ذکر سیاسی انجمن تھی۔ اہم مواقع پر جب سید احمد خاں اور ان کے سرکاری معاونین دیکھتے تھے کہ کانگریس کے کسی خاص مطالبہ کے منظور ہو جانے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا تو وہ اور ان کے دوست جن میں سے اکثر کالج کے ٹرسٹی ہوتے تھے اس انجمن کا جلسہ کر لیتے تھے۔ جس کا نام ''انجمن حفاظت مسلمین'' یا اسی قسم کا کوئی دوسرا نام ہوتا تھا اور جس کی تجاویز ''پانیر'' اور سید احمد خاں کے خاص ہفتہ وار اخبار میں شائع ہو جاتی تھیں۔ بس یہی کام تھا جو اس زمانے میں مسلمان میدان سیاست میں کیا کرتے تھے۔

میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ سید احمد خاں کو اچھی طرح علم تھا کہ ان کی یہ پالیسی ان کے سرکاری دوستوں کو بہت پسند تھی، اور اگر وہ کسی ایسی دوسری پالیسی کے اختیار کرنے کا ارادہ کرتے جو ان کے سرکاری معاونین کو پسند نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ معاونین ان کے کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں رکاوٹیں پیدا کرنی شروع کر دیتے۔ مگر ان کے افتاد مزاج کا عمیق مطالعہ مجھے اس امر کے اعلان پر مائل بلکہ مجبور کرتا ہے کہ تملق اور چاپلوسی جس کا ان کے سیاسی معترضین ان پر الزام رکھتے

ہیں، ان کی فطرت سے کوسوں دور تھی۔ یہی نہیں بلکہ تھوڑی سی زمانہ سازی بھی جس کی جھلک ان کی پالیسی میں نظر آتی ہے ان کی آزاد طبیعت کو بہت ناگوار تھی۔ 1907ء میں جب کہ مسلم لیگ کے قیام کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اور مسلمانوں میں سیاسیات کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ جس کا میں ابھی ذکر کروں گا۔ کالج کے طلبا نے اسٹرائک کر دی اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھیں کے انگریز پرنسپل اور پروفیسروں نے ان کے خلاف پولیس کو مدد دی جو خواہ مخواہ لڑکوں سے جھگڑ بیٹھی تھی۔

اسی زمانہ میں سید احمد خاں کی برسی کی تاریخ آ گئی جو ہر سال منائی جاتی تھی اس موقع کے لیے میں نے ایک نظم لکھی جس میں بانیٔ کالج سے خطاب تھا اور اس میں لڑکوں کے اس کھلے ہوئے جذبہ خودداری اور غیروں کی حقارت آمیز زیادتیوں کے مقابلہ میں ہر قسم کی قربانیوں پر آمادگی تذکرہ کرنے کے بعد میں نے یہ شعر کہا تھا۔

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

اس امر کی شہادت کے لیے کہ صرف میں ہی تنہا سید احمد خاں کی فطرت اور ان کی پالیسی کو اس طور پر سمجھنے والا نہیں ہوں حسب ذیل گفتگو کافی ہو گی:

ایک دفعہ میرے بھائی سے جو اس زمانے میں سرکاری ملازم تھے۔ ایک انگریز نے پوچھا کہ تمہاری رائے میں آج کل ہندستان کا سب سے بڑا باغی کون ہے اور ان کے جواب کی تصحیح کرتے ہوئے اس تجربہ کار افسر نے کہا کہ وہ باغی وفاداروں کا وفادار سید احمد خاں ہے۔ جب میرے بھائی نے اس تعجب خیز فیصلہ کی مخالفت کی تو اس نے کہا۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے مسلمان نوجوان جو علی گڑھ کالج میں ویسی ہی تعلیم پا رہے ہیں جیسی ہمارے نوجوان ہیرو مانچسٹر میں اور جو ویسی ہی زندگی بھی بسر کرتے ہیں، اور جوان کو انھیں کے کھیلوں میں شکست دینے کا مادہ رکھتے ہیں اس بات

پر قانع ہوں گے کہ انگریزوں کو جب وہ بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہوکر آئیں اپنے سارے اختیارات دے دیں اور خود منہ دیکھتے رہیں؟ نہیں مسٹر شوکت علی! انگریزوں کی مدت حکومت پوری ہوچکی اور اس اعتبار سے وہی وفا شعار سید احمد خاں آج حکومت کے سب سے بڑے باغی ہیں۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کی طرح اس انگریز افسر نے بھی غیر ملکی حکومت کے زیر اثر مدارس میں حصول تعلیم کے ان اثرات کو محسوس نہیں کیا۔ جو نوجوانان ہند کے دماغ کو مفلوج کر دیتے ہیں اور صرف انھیں بے چینیوں اور ناراضیوں کو پیش نظر رکھتا تھا جو اس کا لازمی نتیجہ ہیں۔ مگر حضرات! میں کس منہ سے یہ دعویٰ کروں کہ علی گڑھ کا یہ بڑا باغی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگیا۔ جب کہ علی گڑھ میں ایک ایسی مسلم یونیورسٹی جو گورنمنٹ کی سند، اعانت اور نگرانی، امراء کی عطا کردہ سرمایہ کی فراوانی اور اساتذہ وطلبہ کی کثرت کے اعتبار سے تو کامیاب ہے۔ لیکن مقاصد عالیہ سے محروم اور قومی توقعات کے جذبات سے یکسر معریٰ۔ اور جس کے دوش بدوش ایک دوسری یونیورسٹی بھی ہے جو بجز مقاصد عظیمہ اور مطامح عالیہ کے ہر اعتبار سے مفلس و نادار ہے، اور جس میں تین سال قبل میرا قدیم کالج تبدیل ہوتا معلوم ہوتا تھا، لیکن میرا یقین واثق ہے کہ گو سید احمد خاں کی نظر میں ہندستان کا ایسا کوئی قریبی مستقبل نہ رہا ہو، جس میں ان کے مدرسہ کے طلبہ بجز سرکار کی وفادار رعایا کے اور کچھ ہوسکے، ان کا مطمح نظر ہمیشہ کالج سے ایسے نوجوان پیدا کرنا تھا جو راسخ الاعتقاد مسلمان اور محب وطن ہندستانی ہوں۔

کلکتہ، بمبئی، مدراس میں یونیورسیٹیاں قائم ہونے کے تقریباً تیس برس بعد جب کہ ایک نئی نسل پیدا ہوگئی تب کانگریس کی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا کہ واقعہ 57ء کو گزرے ابھی بیس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ ٹھیک اسی حصہ ملک میں جہاں اس آگ کے شعلے سب سے زیادہ بھڑک چکے تھے سید احمد خاں مسلمانوں کے

لیے ایک اینگلو اورینٹل کالج کے قیام میں کامیاب ہوئے۔ کالج کے قیام کے تقریباً تیس ہی سال کے بعد گویا کسی قانون فطرت کے ماتحت مسلمانوں کی بھی ایک سیاسی انجمن قائم ہوئی۔ مسلمانوں نے چونکہ اب تک سرکاری یونیورسٹیوں سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ اس لیے اس سیاسی بیداری میں بھی ان کا کوئی حصہ نہ تھا جو ایک طرح سے اس تعلیم ہی کا نتیجہ تھی، اور یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ 1906ء کے آخر میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے ذمہ دار سید احمد خاں کے کالج ہی کے سپوت تھے۔

اب مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ چند ماہ قبل مسلمانوں کا ایک وفد لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے پاس اس غرض سے شملہ جا چکا تھا کہ مجوزہ مارلے منٹو اسکیم کے متعلق اپنے مطالبات پیش کرے۔ اگر زمانہ جنگ کے برطانوی اخبار نویسوں کے فیشن کی تقلید کی جائے جو ہر بات کے متعلق بعد میں یہ کہا کرتے تھے کہ اب اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں، تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں کہ یہ وفد حسب الحکم شملہ گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ گورنمنٹ اس وقت تعلیم یافتہ ہندستانیوں کے مطالبات رد نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا اس کا ارادہ تھا کہ حسب عادت ایک لقمہ دے کر کچھ دن کے لیے ان کی دہاں دوزی کر دے۔ اس وقت تک مسلمانوں کی مثال اس آئرش قیدی کی سی تھی جس نے جج کے اس سوال پر کہ اس کا کوئی وکیل بھی ہے جو اس کی طرف سے پیروی کرے، صاف صاف کہہ دیا کہ ''نہیں، میں نے وکیل تو نہیں کیا مگر جیوری میں میرے دوست ہیں''۔ لیکن اب جیوری میں جو مسلمانوں کے دوست تھے انھوں نے آہستہ سے ان کے کان میں کہہ دیا کہ مجرم کو اور لوگوں کی طرح باقاعدہ مشیر قانونی کی ضرورت ہے۔ خیر الہام یا القاء جہاں سے بھی ہوا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس مرتبہ مسلمانوں کا دعویٰ حق طلبی خوب زور سے پیش ہوا۔ مشترکہ حلقہ جات انتخاب میں بلاشبہ مسلمانوں کو کافی حق نمائندگی حاصل نہ

ہوسکا۔ اوران حضرات کو جنھوں نے جداگانہ حلقہ انتخاب کے قیام پر جس کے مسلمان خواہش مند تھے افسوس اور ناراضی کا اظہار کیا۔ یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے تھا کہ حق انتخاب جداگانہ مسلمانوں اوران کے کثیر التعداد ہندو بھائیوں میں جدائی کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ تھا۔

لیکن اس وقت مسلمانوں کے سرکاری معاونوں کو یہ کیا معلوم تھا کہ اگر چہ بظاہر یہ الٹی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر یہی جداگانہ انتخابی حلقے ہندو مسلم اتحاد کو اور قریب کرر ہے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندستانیوں کو حقیقی حق رائے دہی (خواہ وہ کتنا ہی محدود ہو) مل رہا تھا۔ اور اگر ہندو مسلمان ایک دوسرے سے ایسے ہی منقسم رہتے جیسے کہ ابتدائے حکومت برطانیہ سے تھے تو مشترکہ حلقے ایک نیا میدان جنگ بن جاتے اور اس طرح ان دونوں قوموں کے اختلافات اور بڑھ جاتے۔ ہرایک امیدوار انتخاب اپنی قوم سے ووٹوں کے لیے درخواست کرتا اور اپنا حق مقابل قوم کے خلاف اپنے بغض کی شدت دکھا کر کرتا اوراس کے لیے وہ قومی مفاد کی پاسداری یا اسی طرح کے اور بہت سے حیلے تراشتا۔

خود یہی حالت کیا تھوڑی بری تھی۔ مگر ایسے انتخاب کے نتائج اور بھی خراب ہوتے جس میں دونوں قوموں کا برابر کا مقابلہ نہ تھا۔ اس لیے کہ جو قوم اپنا نمائندہ بھیجنے سے قاصر رہتی اس کے دل میں کامیاب شخص اوراس کی قوم کی طرف سے کینہ اور زیادہ گہرا ہوجاتا۔ اس حالت میں کہ دونوں قومیں اس طرح برسرپیکار تھیں کسی سیاسی اصول کا انتخاب کے زمانہ میں پیش نظر رہنا بالکل محال تھا۔ لہٰذا جداگانہ حلقوں کے قیام نے اس باہمی جھگڑے کو فرو کرنے میں بہت مدد دی۔ اگر چہ میں اس امر سے بے خبر نہیں ہوں کہ جداگانہ حلقے ہونے کی حالت میں چونکہ دونوں قوموں کا نفاق بدستور رہنے کی حالت میں بھی انھیں لوگوں کے منتخب ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ جو جزبم قوم

کے مقابلے میں بہت زیادہ کینہ وری کا ثبوت دیں۔

مسلمانوں کی من حیث القوم نمائندگی کے متعلق سارے مباحث میں میں نے جی کھول کر حصہ لیا۔ لیکن جوں ہی کہ مسلمانوں کا حق تسلیم کرلیا گیا اور اس کا عملی ثبوت 1910ء کے انتخاب سے مل گیا، میں نے ارادہ کرلیا کہ دارالحکومت ہند سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالوں، اور مقصد یہ تھا کہ اس سے مسلمانوں کو ہندستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لینے میں مدد مل سکے۔ مجھے بہت فکر اس بات کی تھی کہ مسلمان اس کو سمجھ لیں کہ فوری ضروریات کے پورا کرنے میں آپس کی کش مکش ناگزیر ہے۔ لیکن ہندستان کے مستقبل کو نگاہوں کے سامنے رکھنا ہی نہایت اہم ہے۔ جس کے لیے قومی وملکی مفاد کی خاطر سارے جھگڑوں کو پس پشت ڈال کر ہم سب کو مل جانا پڑے گا۔

مجھے ایک زمانہ سے یقین تھا کہ ایسے ملک میں جہاں کروڑوں آدمیوں کی آبادی ہے اور ان میں سے ہر ایک مذہب کا از حد شیدا ہے۔ مگر ہر مذہب قومیت اور تمدن کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ اور دوسرا تیسرے سے جدا۔ ہمارے لیے قدرت نے ایک اہم مسئلہ اور زبردست سوال کے حل کرنے کا بہت اچھا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔ یعنی مسئلہ اتفاق مذاہب۔ 1904ء میں جب کہ مجھے آکسفورڈ سے ہندستان واپس آئے ہوئے صرف دو ہی سال ہوئے تھے۔ میں نے احمد آباد میں مجوزہ ''مسلم یونیورسٹی'' کے متعلق ایک اڈریس دیتے وقت اس خیال کا دبی زبان سے اظہار بھی کر دیا تھا۔ ''اگر بجائے اس گمراہ کن اتحاد مخالفت'' کے کوئی دوسری قوت ہندستان جیسے وسیع ملک کو متحد کرنے والی پیدا نہ ہوئی تو یہ جغرافی اصطلاح یا تو اسم بامسمی ہی ہو کر رہے گی۔ یا پھر جیسا کہ میرا خیال ہے مذاہب وادیان کا ایک سنگم بن جائے گا۔ ہندستان میں مختلف قومیں اپنی اپنی جگہ پر جو قوتیں رکھتی تھیں۔ اس کا مجھے اندازہ تھا، تاہم میرے ایمان، میری امید، اور میرے حب آزادی نے متحدہ ہندستان

کی مخفی اجتماعی قوت کو اس وقت بھی مجھ پر ظاہر کر دیا تھا۔ نفاق و شقاق اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بجز ایک سنگم بنا لینے کے اتفاق و اتحاد کی کوئی اور صورت ممکن ہی نہ تھی۔ تاہم میں نے اپنے خطبہ مذکورہ میں ظاہر کر دیا تھا کہ اختلاف کی بنیاد نسل یا وطن پر نہیں بلکہ مذہب پر تھی۔ بیس برس سے بھی زیادہ میں ایک ایسی متحدہ جماعت کا خواب دیکھتا چلا آرہا ہوں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ سے زیادہ باعظمت، زیادہ شریفانہ اور اس سے کہیں زیادہ روحانی ہو۔ اور آج بھی جب کہ بہت سے سیاسی پیشین گو ان ایام بد کے دوبارہ پلٹنے کی خبر سنا رہے ہیں، جب کہ ہندو مسلمان آپس میں لڑا بھڑا کرتے تھے میں ہنوز اپنے پرانے خواب یعنی ''اتحاد مذاہب ہند'' کو دیکھ رہا ہوں یہ اسی خواب کو حقیقت سے بدلنے کی کوشش تھی کہ میں نے اپنا ہفتہ وار اخبار ''کامریڈ'' جاری کیا۔ وہ کامریڈ جو رفیق سب کا تھا اور جنبہ دار کسی کا بھی نہیں۔

حضرات! اگر بالکل ہی بے محل نہ خیال کیا جائے۔ تو میں کامریڈ کے پہلے پرچہ کے پہلے مضمون سے کچھ جملے یہاں نقل کر دوں۔

اس وقت سیاسیات ہند کا مطلع باہمی اختلافات سے جیسا کچھ تیرہ و تار ہو رہا تھا اس کے لحاظ سے میری یہ ہمت تو قدرتاً نہ ہو سکی کہ میدان صحافت میں قدم رکھتے ہی میں اپنا یہ خواب عملی کاروبار میں مشغول رہنے والی اور شک اور شبہ کرنے والی دنیا کو سنانے لگوں، تاہم جو لوگ ''خواب'' کے قائل ہیں ان کے سامنے ہمیشہ یہ خواب موجود رہا۔ میں نے یکم جنوری 1911ء کو لکھا تھا:

''ہم اس کو باور نہیں کر سکتے کہ ہندستان متحد ہے۔ اگر ہندستان متحد ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ اس سال کے صدر کانگریس کو اپنے دور دراز وطن سے ہندستان آنے کی تکلیف دی جاتی؟ محض دعوت کا تخیل بھوک کی تکلیف کو دفع نہیں کر سکتا۔ اس سے بھی کم قائل ہم اس تقدس ریائی کے ہیں۔ جس کے نزدیک کسی صیغہ کی کامل اجارہ داری کمال

حب وطن کی مرادف ہے۔'' ان غریب چڑیوں کی طرح جن کو خوشہ انگور کی تصویر نے دھوکا دیا اور آنکھیں دیکھتے دیکھتے سیر ہو گئیں۔ لیکن بھوک کی بے چینی بدستور باقی رہی۔'' ہم میں سے بھی وہ لوگ جو کھرے سونے اور مصنوعی سکوں کی چمک دمک میں فرق نہیں کر سکتے ہیں ان کے کان ایک دن ضرور یہ صدائیں سنتے سنتے تھک جائیں گے۔ لیکن ان کے دل بدستور بے چین رہیں گے۔ لیکن ہم جس شخص سے محبت بھی سب سے زیادہ رکھتے ہیں اور خوف بھی سب سے زیادہ کرتے ہیں اور اعتبار بھی سب سے کم کرتے ہیں وہ منصوبہ باز مصلح قوم ہوتا ہے۔ گیٹے نے بائرن کی نسبت لکھا ہے کہ وہ شاعر تو بہت بڑا ہے۔ لیکن جب غور و فکر سے کام لیتا ہے تو بچہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم بھی اس شخص کو جس کا نصب العین بلند اور اس کی بے صبری اس سے بھی زیادہ شدید ہو بس کچھ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ کتنی ہی کوششیں اس پراگندہ ملک میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے کی گئیں جن میں ایسی بھی تھیں جو بالکل نیک نیتی پر مبنی تھیں اور ایسی بھی جن کی بنیاد فساد پر تھی۔ لیکن سب ناکام ہوئیں۔ یہاں تک کہ ہم کو اس کی بھی ہمت نہیں کہ ایک دوسرے کی غلط کوشش کے مقبرہ پر اپنے جذبات کے ادنیٰ اور بے رنگ پھول بھی نذر کر سکیں۔ ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے کہ ٹوٹے ہوئے شیشہ کے ٹکڑے کو گوند سے جوڑنے کی کوشش کے بعد اپنی ناکامی پر نوحہ خواں ہوں یا اس ٹکڑے کو سرکش و متمرد بتائیں اور دوسرے الفاظ میں ہماری کوشش یہی رہے گی کہ حالات حاضرہ کا مقابلہ ہمت کے ساتھ کرتے رہیں اور واقعات سے چشم پوشی نہ کریں۔ خواہ وہ ہمارے لیے کتنے ہی شاق و ناخوش گوار ہوں۔ یہ تدبیر کی خامی ہے کہ تکلیف دہ واقعات سے آنکھ بند کر لی جائے اور حصول اتحاد کا تو پہلا زینہ یہ ہے کہ ہم ان تعصبات کا صاف صاف احساس کر لیں جو دلوں میں جمے چلے آ رہے ہیں جو راہ اتحاد میں حائل ہوتے رہتے ہیں اور جو نفاق و شقاق کا باعث ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن جب ہم آج کا انتظام سوچ رہے ہوں تو فکر فردا سے بھی غافل نہ ہونا چاہئے۔ یہ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر مسلمان یا ہندو یہ چاہیں کہ انھیں کوئی کامیابی آپس کے اختلاف کے باوجود یا بغیر باہمی اتحادِ عمل کے ممکن ہے تو وہ نہ صرف ناکام ہوں گے بلکہ وہ ناکامی بڑی ہی شرمناک ہوگی۔ لیکن اس راہ میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہے۔ قدیم یا جدید کسی تاریخ میں موجودہ ہندستان کے حالات مخصوص کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ تاریخ کبھی اپنا اعادہ نہیں کرتی۔ پھر بھی تاریخ انسانوں کی تعلیم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور ہمارے لیے بھی بہت سے سبق اس میں موجود ہیں۔ ہندستان کے مسائل تقریباً بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جب یورپ کے مدبرین وخلائق دوست تک باوجود اپنے یہاں کی روزانہ معرکہ آرائیوں کے اور قومی رقابتوں کے انسداد جنگ سے مایوس نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ جنگ کی دیوی کے تخت پر صلح کا جھنڈا نصب کرنے کے خیال میں ہیں، تو کیا ہم ہندستانی قوم سے مایوس ہوجائیں۔ ممکن ہے ہم اپنے میں وہ ولولہ حب وطن و جوش قومیت نہ پیدا کرسکیں جو 4 کروڑ متحد القوم جاپانیوں نے پیدا کرلیا ہے۔ لیکن کینیڈا کی طرح یگانگت بالکل عملاً قابل حصول ہے۔ ممکن ہے کہ ازدواج محبت نہ ہو جس کی بنیاد شعر وفسانہ پر ہوتی ہے۔ لیکن مناکحت رسمی جو یہ پابندی آئین شرفا طے پا جائے، اور اس کا نباہ ہوتا رہے تو وہ بھی کوئی کم درجہ کی چیز نہیں۔ اچھا اب ہم نثر میں صاف صاف کہنا چاہتے ہیں اور امید ہے کہ شعریت کی دیوی اس مفروضہ مناکحت کے خلاف حکم صادر نہ کرے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن یہ ایسا کام ضرور ہے کہ مادر ہند کے فرزندان ودختران سب اس کے لیے قربانی وخدمت پر آمادہ ہوجائیں۔

اے اتفاق! تو ضرور آئے گا۔ آدمیوں کو باہم ملادے گا اور قوموں کو متحد کردے گا۔ لیکن آج ہمارے سامنے نہیں جو تیرے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ تو آئے گا

ضرور لیکن کب؟ ایک عرصہ کی مصیبتوں، تکلیف و انتظار، صبر آزما التجاؤں اور ہمت شکن انکاروں کے بعد۔"

دوستو! تین سال ہوئے کہ ہم کو اس اتحاد کی جس کا خواب میں دیکھ رہا تھا جھلک سے زیادہ دیکھنا نصیب ہو گیا تھا۔ اور اگر آج ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے جیسا کہ کرنا بھی چاہئے کہ اس خواب کی تعبیر ہمارے حسب منشا نہیں ہوئی۔ تو لازم ہے کہ ایک بار پھر ہم تمام حالات کی اچھی طرح تحقیق و تفتیش کریں۔ ناخوشگوار و دشوار واقعات کا سچائی اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کریں۔ چنانچہ یہی میں کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس غرض سے کہ سلسلۂ بیان ٹوٹ نہ جائے۔ میں پھر ان حالات پر عود کرتا ہوں جو میرے آغاز صحافت کے وقت موجود تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی سے خیال کیا تھا، علیحدہ علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب سے ہندو مسلمان دونوں منتخب ہوئے۔ جو متعدد مجالس وضع قانون مشترکہ کی حمایت میں مل جل کر کام کرنے کے مخالف نہ تھے۔ تاہم ملک سے باہمی فرقہ بندیاں قطعی طور پر نہ گئیں۔ مگر اس عرصہ میں ممالک اسلامی پر مغربی اقوام کی دستبرد نے صورت حالات میں ایک خلاف توقع تبدیلی پیدا کی اور اس کا اثر ہندستانی مسلمانوں کے جذبات پر بہت گہرا پڑا۔ اگرچہ آج بھی ایسے غیر مسلم قوم دوستوں کی کمی نہیں جو ہندستان سے باہر اسلامی معاملات کے متعلق مسلمانان ہند کے جذبات کو حسرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ ذرہ بھر بھی غور کریں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انھیں جذبات نے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ اگرچہ مسلمانان ہند کی توجہ کو کسی حد تک اندرونی معاملات سے ہٹا کر اپنی طرف منعطف کر لیا۔ تاہم ایک بڑا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی آنکھوں پر سے اس قدیمی اعتماد اور بھروسہ کے پردے اٹھا دیے جو وہ اپنی غیر ملکی حکومت سے رکھتے تھے، اور اس اعتبار سے وہ ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے میں زیادہ

حصہ نہ لیتے تھے۔

میرا منشا یہ تھا کہ کامریڈ ایک ایسا اخبار ہو جوان جذبات کی ترجمانی کرے جو ہندستان کے مختلف فرقوں کی باہمی تنظیم کی ضرورت کے متعلق میرے دل میں موجود تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس اخبار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو حب وطن سے کماحقہ، حصہ لینے کے لیے تیار کروں، اور اس سے ان کی غیر وطنی ہمدردیوں میں جو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ روح اسلام کا ایک جز ہے ایک ذرہ بھی کمی نہ آئے۔ جب مجھے پہلے پہل میدان صحافت میں قدم رکھنے کا خیال پیدا ہوا تو مجھے یہ خیال نہ تھا کہ میری توجہ کا معمولی سے زیادہ حصہ خود اپنے ملک سے باہر اسلامی سیاسیات میں بٹ جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ مصر کے حالات کچھ زیادہ طمانیت بخش نظر نہ آتے تھے اور نہ ترکی وایران کے جدید نظام دستوری نے ابتدائی اظہار خیر مقدم کے بعد انگلستان کی جانب سے (دول یورپ میں اپنی ایک حکومت سے ہمارا ہمیشہ سابقہ رہا ہے) پوری ہمدردی حاصل کی جو ہماری نظر میں ان شجاعانہ اور ہمت طلب کارناموں کے صلہ میں ان کا حق تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد ہمارے سیاسی مطلع پر اگر دوسری سلطنت تھی تو وہ روس ہی تھی۔ فرانس کی شکست کے بعد اب سے ایک صدی قبل وہ براعظم یورپ میں سب سے زیادہ قابل توجہ طاقت رہی ہے لیکن براعظم ایشیا میں عظیم تر حکومت بننے کی کوشش میں اس نے اپنی وہ حالت خراب کردی۔ ہندستان کے مالکان قسمت کی طرف سے ہر شخص کو یہ سبق پڑھایا جاتا تھا کہ روس کو نوع انسان کا دشمن سمجھیں اور یقین کریں کہ مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا انگلستان کا مقدس فرض ہے۔ لیکن جاپان کی تیز رفتار ترقی اور مشرق اقصیٰ میں جنگ روس میں اس کی عدیم المثال کامیابی نے اگر ایک طرف دوسری مشرقی اقوام کو سر اٹھانے اور امید باندھنے کی ہمت دلائی تو دوسری جانب اس نے روس کی ایسی کایا پلٹ کردی کہ وہ انگلستان کے جانی دشمن سے اس کا

دوست بلکہ حقیقی معنوں میں اتحادی بن گیا۔ اس واقعہ کا اثر فوراً مشرقی سیاسیات پر پڑا۔ اور یہ نہ صرف ایران پر جہاں روس کھلم کھلا ایک زبردست مطلق العنان حکمران عارضی طور پر بن گیا اور جہاں وہ چند ہی روز کے پیامات جنگ کا مینہ برسا دینے والا تھا بلکہ ٹرکی میں بھی جہاں سلاف اور ٹیوٹن دونوں قوموں کی باہمی رقابتیں مزید سرگرمی کے ساتھ ائتلاف و اتحاد کے درمیان جنگ کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ اب ایک بار پھر مشرق قریب سیاسیات یورپ کا طوفان گاہ بنا۔

یہ تمام واقعات ہندستانی مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھے جو بچپن سے انگلستان کو ممالک اسلامی کا دوست اور روس کو دشمن سمجھتے چلے آئے تھے۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے سیاسی اختلافات ان کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لیے کچھ کم نہ تھے۔ وہ جذبات جوان جماعتی اختلافات کی وجہ سے باہم پیدا ہوگئے تھے۔ ایک شدید بین الاقوامی جنگ کی صورت اختیار کرنے لگے۔ اور ایران و ٹرکی نسبتاً بعید نظر آنے لگے۔

لیکن حالات ٹھیک اسی طرح جیسے میں نے امید باندھی تھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ 1911ء ممالک اسلامی کے حق میں ایک نامبارک سال تھا۔ ٹرکی، ایران اور مراکش کی جدید حکومتوں کو سفر اصلاح و ترقی میں باد مخالف کا سامنا کرنا پڑا۔ جس نے چند ہی روز میں باقاعدہ طوفانوں کی صورت اختیار کرلی۔

ہندستان میں بھی یہ سنہ مسلمانوں کے حق میں اندازہ سے بڑھ کر نامبارک ثابت ہوا۔ ختم سال کے قریب بادشاہ صاحب معظم دہلی میں بہ ظاہر اس غرض سے تشریف لائے کہ ایک شاہی دربار میں بہ نفس نفیس اپنی تاج پوشی کا اعلان کریں۔ لیکن اسی موقع پر آپ نے ہندستان کے لیے ایک بدشگون اعلان فرمایا۔

یہ تسلیم تھا کہ " حکومت برطانیہ کی روایات اور سرکاری عادات کے خلاف ایک بالکل نئی رسم تھی۔"

لیکن اس خلاف دستور کارروائی اور اس راز سربستہ کو جو صرف ہندستان سے بلکہ صوبہ دار حکومتی سے بھی مخفی رکھا گیا۔ اس بنا پر حق بجانب ثابت کیا گیا کہ وہ شاہی اعلان ان فیصلوں میں سے جو انگریزی حکومت کے ہندوستان میں قائم ہونے سے لے کر آج تک عمل میں آئے ایک نہایت زبردست فیصلہ تھا۔'' نیز اس بنا پر کہ جو کارروائیاں اس شورش کی روک تھام کے لیے اختیار کی جارہی تھیں جو تلخ اور ناگوار ہونے کے ساتھ'' عام و بے قابو'' بھی ہوتی جارہی تھیں، ان پر بحث ومباحثہ بجائے خود ایک غیر متناہی شورش پیدا کر دیتا۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اس اعلان میں لارڈ کرزن کی کینہ پرورانہ تقسیم بنگال کو منسوخ کر کے مشرقی ومغربی بنگال کو پھر ملا دیا گیا اور بہار واڑیسہ کا ایک نیا صوبہ قائم کیا گیا۔

بالواسطہ بنگال کو یہ سزا ملی کہ پایۂ تخت کلکتہ سے دہلی کو منتقل کر دیا گیا۔ جیسا مین نے اس وقت کامریڈ میں لکھا تھا میں دونوں اسکیموں کے موافق تھا۔'' بشرطیکہ دونوں میں سے ہر ایک کو بجائے خود دوسرے سے الگ کر کے لیا جائے'' اور'' اعلان کے لیے گورنمنٹ ہند کی طرف سے جو وقت، مقام اور طریقہ کار اختیار کیا گیا اس کا کوئی لحاظ نہ ہو۔'' تقسیم جو اس وقت عمل میں آئی 1905ء میں آنی چاہئے تھی، اور پایۂ تخت کی تبدیلی کی ضرورت 1885ء میں تھی۔ لارڈ کرزن اور لارڈ للٹن سے یہ گناہ عجلت میں سرزد ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی توبہ لارڈ کرزن اور لارڈ کریو اپنی فرصت میں کر رہے ہیں۔ لیکن شہنشاہ معظم کے اس اعلان سے صاف ظاہر تھا اور حکومت ہند اور سکریٹری آف اسٹیٹ کی مراسلات سے بھی یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس تمام اسکیم کا جزو اعظم یہ تجویز تھی کہ دہلی ہندستان کا آئندہ پایہ تخت قرار پائے۔ نیز یہ کہ تقسیم بنگالہ میں جو ترمیم کی گئی وہ اس انتقال صدر حکومت کا گویا محض ضمیمہ ہی تھی۔ اور اہل بنگال سے یہ توقع رکھی گئی تھی کہ'' اس تبدیلی'' پر محض اس واسطے رضامند ہو جائیں گے کہ اسکیم

کے دوسرے اجزا محض ان کی دل دہی کے لیے رکھے گئے۔ اور یہ دل دہی کیا تھی؟ یہ کہ دونوں بنگالوں کو متحد کر کے انتقال پایہ تخت پر جو اعتراضات ہونے والے تھے انھیں روک دیا جائے۔ سرکار ہند کے مراسلہ میں نہ مشرقی بنگال کی ابتریوں کا کہیں ذکر تھا نہ آسام کو خواہ مخواہ جزو بنگال بنا دینے کے نا قابل اطمینان نتائج کا۔ نہ پھر قسمت راج شاہی اور ڈھاکہ کے درمیان رسائل آمد و رفت کی دشواریوں کے متعلق۔ حالانکہ ان تمام واقعات کو ایک امر طے شدہ کے غیر طے شدہ بنانے میں بطور اسباب جواز کے پیش کیا جا سکتا تھا۔

اس سے بڑھ کر مراسلہ مذکور میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ 1905ء کی تقسیم سے دو خاص اغراض جو اس کے بانیوں کے پیش نظر تھے پورے ہو چکے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل مراسلہ کے الفاظ میں یہ ہے:

> "اس نے ایک طرف حکومت بنگال کے سر سے بار ہلکا کر دیا
> اور دوسری جانب مشرقی بنگال کی مسلم آبادی کو وہ منافع اور مواقع
> دیے جس سے وہ اس سے پیشتر ایک بڑی حد تک محروم تھے۔"

لیکن بنگال اس امتیاز سے محروم ہو گیا جو اسے اپنی دار الحکومت کے ساتھ ساتھ تمام ہندستان کے پایۂ تخت کی حیثیت سے حاصل تھا اور ان مواقع سے بھی جو اسے پاس پڑوس سے سرکار ہند پر نکتہ چینی کرنے اور ہمیشہ اس پر دباؤ ڈالنے کے حاصل تھے۔ اس وقت تک ہم یورپ کی سیاسیات خارجہ میں "اصول معاوضہ" کے نفرت انگیز مناظر خوب دیکھ چکے تھے۔ جس کی رو سے مراکش فرانس کے اس لیے حوالہ کر دیا گیا تھا کہ مصر میں انگریزوں کو آزادی حاصل رہے اور طرابلس گویا اٹلی کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا اور جرمنی سے بندرگاہ آگادر پر جہاز پنتھر پر مشہور معاملت ہو چکی تھی۔

سرکار ہند نے مراسلہ میں تحریر فرمایا کہ:

''اس تقسیم سے مشرقی بنگال اور آسام کو بے شبہ بہت زیادہ فوائد حاصل تھے اور اس صوبہ کے مسلمان جو آبادی کے غالب حصہ پر مشتمل ہیں وفادار اور مطمئن ہیں۔ لیکن ان دونوں صوبوں میں بنگالیوں کی ناراضگی جو سب سے زیادہ صاحب جائداد، تمام پیشوں پر قابض اور پبلک معاملات پر چھائے ہوئے ہیں جیسی زبردست پہلے تھی اب بھی باقی ہے۔''

میں نے اس موقع پر تحریر کیا کہ:

''اس سے آسان کام اور کیا ہوسکتا ہے کہ وفادار وقناعت پسند پطرس کو دنیوی ساز وسامان کی کچھ اور اشیاء سے سبک دوش اور غیر مطمئن کر دیا جائے اور غیر وفادار پوبوس کو بطور انعام اور معاوضے کے دے کر اسے اور بھی گراں بار کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی پتھر نہیں جسے آگا در بھیجیں، اور سیاسی حکمت عملی کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ پتھر نہیں تو معاوضہ بھی نہیں۔''

میں نے کامریڈ میں جہاں یہ لکھا تھا کہ'' ہمارے خیال میں مسلمانوں کو گورنمنٹ کے اس فیصلہ کو منظور کر لینا چاہئے۔'' تو ساتھ ہی یہ لکھنے پر بھی میں نے اپنے تئیں مجبور پایا کہ وہ اس برتاؤ کے مستحق نہ تھے۔ تقسیم بنگال سے قبل انھوں نے ہر طرح کے مصائب اٹھائے تھے اور دنیا کے ہر ناتواں کی طرح نہایت صبر وسکون سے برداشت کیے تھے۔ انھوں نے تقسیم بنگال کے لیے نہ تو کوئی شور وشغب برپا کیا تھا اور نہ کوئی جدوجہد کی تھی۔ بایں ہمہ تقسیم بنگال ان کے حق میں حق بہ حق دار رسید اور نعمت غیر مترقبہ دونوں ثابت ہوئی تھیں۔ ان کی حالت کی ترقی کے ساتھ ان کی امیدیں اور توقعات بھی روبہ ترقی ہو رہی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نو دولت کی طرح ان سیاسی نو دولتوں نے بھی اپنی امیدوں کا پیمانہ بہت بلند کر لیا اور بعض اوقات مور کی طرح

چم خم دکھانے لگے۔ لیکن بھنگ کا نشہ کتنی دیر تک رہ سکتا ہے۔ چند ہی روز میں ردعمل شروع ہوا اور اس قیامت کے ساتھ کہ انھیں ہلا دیا۔ یہ آزاد شدہ غلام پھر دوبارہ قید غلامی میں آئے اور آہ لذت انتقام سے کون دست بردار ہوسکتا ہے ان کے آقایان قدیم بالکل قابل معافی ہوتے۔ اگر دوبارہ اپنے ان غلاموں کو قابو میں پاکر مشق تازیانہ ذرا اور زور کے ساتھ کرتے۔ مشرقی بنگال کے مسلمانوں سے ان کے حاکموں کی طرف سے جنگ میں خود ان کے ہمسایوں کے خلاف کام لیا گیا تھا۔ اور اب جب کہ ان حکمرانوں کے لیے جنگ کا جاری رکھنا آسان نہ تھا تو انھوں نے اپنی صلح تو آسانی اور جلدی سے کرلی اور مسلمانوں کو ان لوگوں کے رحم پر چھوڑ دیا جن کے خلاف ان کو جنگ کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ تاریخ میں بے وفائی و غداری کی اس سے ذلیل تر مثال کا ملنا دشوار ہے۔ ''جس میں وفاداری کا بدلہ نئے حاصل کردہ حقوق کی محرومی سے ملا ہو اور ''قناعت پسندی'' کی سزا ایک بدترین جرم سمجھ کر دی گئی ہو۔ میرے خیال میں اس واقعہ کا ذکر کر دینا شاید مناسب نہ ہوگا۔ اعلان دربار کے بعد ہی جب میں سرچارلس سے جو اس صوبہ کے حکمراں تھے جس کی حکومت اب گھورے پر ڈال دی گئی تھی، ملاقات کو گیا تو وہاں لارڈ سنہا اور سرنیوڈ متر بھی ملے جنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس اعلان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ بنگال کے ہندوؤں کے لیے تو یہ اعلان داد سند کی ایک باہمی معاملت تھی اور یہ ''پکے وفادار'' بہاریوں کے لیے صرف ''سند'' اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے لیے یہ محض ''داد'' سے زیادہ نہیں اور اپنی وفاداری و قناعت پسندی کا بدلہ انھیں یہ ملا کہ ذلت و خواری کا بڑا طوق ان کے نصیب میں آیا۔'' اس کے بعد میں دل ہی دل میں یہ دعا کرتا ہوا وہاں سے چلا آیا کہ خدا نہ کرے کہ وہ اس بوجھ کی تکلیف سے گھبرا اٹھیں۔ اس سے ذرا قبل خود عین دربار میں مجھے یاد ہے کہ جس وقت میں جلدی جلدی اعلان پڑھنے میں

مصروف تھا۔ میرے پرانے دوست سر چارلس کلیو لینڈ افسر اعلیٰ محکمہ سی، آئی، ڈی نے مجھے مخاطب کیا اتفاق سے ایڈیٹروں میں سب سے پہلے مجھے ہی اس افسر کے ہاتھ سے جو اعلان کی کاپیاں تقسیم کر رہا تھا، ایک کاپی ملی تھی۔ سر چارلس نے مجھ سے مذاقاً دریافت کیا کہ اس اعلان میں ہمارے تمہارے لیے بھی کچھ ہے؟ اس پر میں نے اپنی ناگواری بمشکل ضبط کر کے یہ جواب دیا کہ ''میرے لیے تو کچھ نہیں، ہاں آپ کے لیے بہت کچھ کام ہے''! آج کون کہہ سکتا ہے کہ میری یہ پیشین گوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی؟

دوستو! میں نے اس معاملہ میں صرف اس غرض سے اس قدر طوالت کی کہ میرے خیال میں اعلان دربار مسلمانوں کی سیاسی ترقی کا امتیازی نشان رہا ہے۔ اس سے زیادہ اور کوئی شے مسلمانوں میں یہ یقین نہیں پیدا کر سکتی تھی کہ ان کا دوسری قوموں کے مقابل میں غیر ملکی حکومت پر اعتماد کرنا ان کے لیے ہمیشہ اس قسم کی بدعہدی کے خطرات رکھتا ہے۔ اب انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس قسم کی امداد پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیۓ۔ خواہ امداد اندرون ملک ہو یا بیرون ملک اور اس وجہ سے وہ یہ بھی سوچنے لگے کہ شاید اپنی اغراض کی اس سے بہت کم قربانی کرنے پر وہ دائمی امن بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے ہمسایہ قوموں اور ہم وطنوں کی دوستی بھی۔

مسلم لیگ جو کبھی بھی ہندوؤں یا کانگریس کے خلاف نہیں رہی ہے۔ تقسیم بنگال کے زمانہ ایجی ٹیشن میں پیدا ہوئی اور اس نے قدرتاً اپنے نصب العین میں جماعتی مفاد کے تحفظ اور حکومت کی وفاداری پر زور دیا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ ہمسایہ اقوام کے سے اتحاد و اتفاق بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ دہلی دربار میں جو اعلانات ہوئے اس کے ایک سال بعد لیگ کی کونسل نے لیگ کے نصب العین مین تبدیلی کی سفارش کی اور اس نئے نصب العین کی رو سے سفارش کی گئی کہ اب اس کا مطمح نظر ''ہندستان

میں حالات کے لحاظ سے حکومت خوداختیاری کا حصول'' قرار دیا جائے۔ اس تبدیلی پر بحث کرتے ہوئے جسے آخرکار مارچ کے سالانہ اجلاس میں لیگ نے منظور کرلیا۔ میں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ان کا سیاسی نصب العین ''اس مکان کے مانند ہے جو نصف راستہ پر واقع ہو۔ اور جہاں سے ان کی منزل مقصود اچھی طرح نظر آتی ہو۔'' اور میں سمجھتا ہوں کہ ہماری حالت موجودہ کا صحیح اندازہ کرنے میں مدد دینے کے لیے ذیل کی عبارت اس تاریخ کے کامریڈ سے نقل کردوں جس پر مجھے امید ہے کہ میرے تمام قوم پرست دوست خواہ مسلمان ہوں یا ہندو، غور فرمائیں گے۔ '' لیکن حکومت خود اختیاری کے حصول کا انحصار نہ تو حکومت اور ذمہ دار ارباب حکومت کی اصلاح پر ہے اور نہ حاکم ومحکوم کے تعلقات پر۔ حکومت خوداختیاری احساس خودشناسی کا لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے اور ہندستان میں اب تک بحیثیت مجموعی یہ احساس پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ آج مختلف فرقوں اور طبقوں میں باہم اگر مخالف اغراض ومقاصد کی بنا پر جوکش مکش اور نفسا نفسی رہتی ہے۔ ان میں ایک دفعہ یہ خیال پیدا ہوجانے دیجیے کہ ہندستان جس طرح ''جسم'' کے اعتبار سے متحد ہے ''روح'' کے اعتبار سے بھی متحد ہوسکتا ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ اس اتحاد کو اس طرح محسوس ہونے دیجیے جس طرح ایک جسم اپنے اعضاء کی مختلف شکل وصورت اور اپنی عقل وروح کے مختلف ادراکات وتصورات کے باوجود اپنے آپ کو ایک ہی فرد محسوس کرتا ہے تو پھر روئے زمین کے پردے پر کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسے حصول حکومت خوداختیاری میں مانع ومزاحم ہوسکے۔ لیکن جس طرح ہم اپنے ابنائے ملک کو سیاسی نصب العین کے انتخاب کے متعلق متنبہ کرچکے ہیں۔ اسی طرح انھیں متنبہ کرتے ہیں کہ وہ مختلف فرقوں کو ایک قوم میں متحد کرنے میں بندر کی سی نقالی نہ کریں۔ ہندستان میں سیاسی اتحاد ان چھوٹے چھوٹے فرقوں کو بالکل مٹا کر جو اتحاد کی آخری منزل میں متصادم نظر آئیں قائم نہیں ہوسکتا بلکہ ان کی قوت کو تسلیم کرنے

اور ان کے وجود کو لابد مان لینے ہی سے ہوسکتا ہے۔ اگر ہندستان میں کوئی سوسائٹی قائم ہو جس کا کام مختلف فرقوں کو ایک قوم میں متحد کرنا ہو تو اس کا طغریٰ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا جو امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ نے تجویز کیا ہے۔ یعنی وحدت کثرت۔"

بیرونی معاملات کے لحاظ سے 1922ء کا آغاز 1911ء سے قطعی مختلف توقعات کے ساتھ ہوا۔ آخیر تک مسلمانان ہند کو یہ امید تھی کہ حالات از خود درست ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور اس سال کا اختتام اس کے آغاز سے کہیں بدتر ہوا۔ 1911ء کے آخر میں مسلمانان ہند اٹلی کی طرابلس میں اس شرمناک غارت گری سے کمال درجہ متاثر ہوئے جس نے یورپ کے بین الاقوامی اخلاق کا بری طرح پردہ فاش کیا۔ اگر ضرورت تھی کہ اس اخلاق کا اس سے زیادہ پردہ فاش کیا جائے تو وہ ایران میں اس کے طرز عمل اور برطانیہ کی تسلیم ریائی سے پوری ہوگئی۔

ان دونوں واقعات میں یورپی تعدی میں بہیمیت کی نہایت ہی قبیح شان تھی۔ کون ہے جو نخلستان طرابلس کا قتل عام بھول جائے اور کون ہے جو اس جگر دوز سانحہ کو فراموش کردے کہ سال نو کے آغاز پر شہداء کربلا کا ماتم تو ہو ہی رہا تھا۔ روسیوں نے بہتوں کے ساتھ شمالی ایران کے سب سے بڑے مجتہد ثقۃ الاسلام کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ جن کے علم و فضل، تقدس اور مسالمت کی عام طور پر عظمت کی جاتی تھی۔ ان باتوں نے مسلمانوں کے قلوب کو جو دکھ اور صدمہ پہنچایا۔ اس میں اگر کچھ اور اضافہ ہوسکتا تھا تو وہ اٹلی کے ایروپلین کے ذریعہ سے کعبۃ اللہ شریف پر حملہ کرنے کی دھمکی اور مشہد مقدس پر روسیوں کی گولہ باری نے کردیا۔

مسٹر شسٹر جب ایران سے نکالے جانے کے بعد لندن گئے تو وہاں کی انجمن ایرانی نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا اور بالکل سچ کہا:

"خود مجھے جو کچھ پیش آیا اس کا مجھے مطلق غم نہیں لیکن میں

منافق ہوں گا۔ اگر مسلمانوں کے غم وغصہ پر ہمدردی کا اظہار نہ
کروں جنھوں نے یہ تلخ تجربہ حاصل کیا ہے کہ بین الاقوامی
سیاست میں احکام عشرہ کا نفاذ واطلاق نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اس میں
شبہ ہو تو اسے چاہئے کہ پچھلے سال کے واقعات پر نظر ڈالے۔''

ان تلخ تجربوں کے بعد 1912ء میں ان سے زیادہ تلخ تجربے پیش آنے والے تھے جو آ کر رہے۔ یعنی اسی سال کے موسم خزاں میں جنگ بلقان چھڑ گئی۔ جس کے دوران میں ایک دفعہ تو یہاں تک اندیشہ ہو چلا تھا کہ ترک جو پانچ سو برس تک یورپ میں حکومت کر چکے تھے وہاں سے نکال باہر نہ کر دیئے جائیں۔

انگلستان نے ترکی، ایران اور مراکش کے دشمنوں کے ساتھ جو روش اختیار کی تھی اس سے مسلمانان ہند کی ہمدردی انگلستان کے ساتھ 1911ء ہی سے کم ہونے لگی تھی اور اس کا اثر ان کے اور یہاں کے انگریز حکام پر بہت پڑا۔ باوجود یہ کہ ہندستان کے انگریزی حکام کو انگلستان کی برسراقتدار ریڈیکل جماعت سے نفرت تھی۔ پھر بھی وہ ہندستانیوں کی روش پر متحیر تھے کہ وہ اس جرأت اور صاف گوئی سے جو محکوم قوم سے از بس بعید ہے۔ حکومت انگریزی پر برابر نکتہ چینی کر رہے تھے۔

''کامریڈ'' کا مقدمہ جس میں پہلی مرتبہ اہل ہند کو اس قانون مطابع کی طاقت نقصان رسانی کا حال معلوم ہوا، جواب شکر ہے کہ منسوخ ہو گیا ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات کو یاد ہوگا کہ اس رسالے کی ضبطی کے متعلق تھا جو ترکوں کی طرف سے وصول ہوا تھا۔ اس رسالے میں ترکوں نے انگلستان سے صرف یہی درخواست کی تھی کہ وہ بلقانی حلیفوں کے خلاف انھیں محض مسیحی ہمدردی کی بنا پر مدد نہ دیں اور اس ضمن میں انھوں نے مقدونیہ کے مظالم بیان کیے تھے۔ یہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ کان پور کی مسجد کے ایک حصے کے انہدام کے بعد کے مہلک طرز عمل نے مسلمانوں کے جذبات

کو اور بھی برہم کر دیا۔ انھیں حالات کے باعث میں مسلم لیگ کے اس زمانہ کے سکریٹری کو ساتھ لے کر انگلستان گیا۔ تاکہ خود برطانوی حکومت سے استغاثہ کروں اور توجہ دلاؤں کہ ہندستان اور نیز ممالک غیر میں اپنی اس پالیسی کو بدل دے جو کسی کے لیے بھی سودمند نظر نہیں آتی، اور جو یقیناً مسلمانوں کو مایوسی کی حد تک پہنچا دے گی۔ اس میں ہمیں کسی قدر کامیابی ہوئی۔ لیکن سال کے اندر ہی ایسے اہم و عظیم واقعات پیش آئے جنھوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جنگ کے آغاز سے قبل مسلمانان ہند کا ایک دوستانہ وفد لارڈ ہارڈنگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جو نہایت امید افزا تپاک سے وفد کے ساتھ پیش آئے۔ مگر جنگ عظیم اور ان واقعات نے جن کی بنا پر ٹرکی نے انگلستان کے فریق کے خلاف لڑائی میں شرکت کی ہمارے سارے توقعات پر پانی پھیر دیا۔

جرمنی سے جب لڑائی چھڑی تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے 12/اگست 1914ء کے کامریڈ میں ہندستان کے تعلیم یافتہ اور ذمہ دار گروہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ جس کی خودداری چاپلوسی کا خفیف شائبہ بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اس تاریخ کے کامریڈ میں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے:

"اب بھی بعض ایسے سنجیدہ لوگ خود ہندوستانیوں میں موجود ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی سرکاری خدمات کی تشہیر نہیں کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی اثر لوگوں پر رکھتے ہیں اسے وہ گورنمنٹ کی دشواریوں کے کم کرنے میں استعمال کریں گے نہ کہ بڑھانے میں۔ ان کی سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ وہ ہندستان کے موجودہ منزل ارتقاء میں اس کا تعلق برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ قائم رہنا لازمی وضروری خیال کرتے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ یہ خودغرضی کا خیال پست جذبہ بجائے خود جی حضوریوں کے زبانی وفاداری سے کہیں زیادہ حالات مخالف کے مقابلہ میں مضبوط اور بہتر ثابت ہوگا۔"

برطانیہ عظمیٰ نے ٹرکی، ایران، مراکش کے معاملات میں مسلمانانِ ہند کے جذبات کا احترام کیا یا نہیں۔ وزرائے انگلستان کے وعدے ترکوں کے ساتھ ان کی گذشتہ جنگ کے نازک ترین موقع پر انصاف یا معقولیت پر مبنی تھے یا نہیں؟ بلوسیز اور ہرزیگونیہ کے علاقہ میں اسٹریا کے اور طرابلس کے علاقے میں اٹلی کی معاہدہ شکنی پر انگریزوں کا جو طرزِ عمل رہا، اسے ان کے اس اعلان سے کچھ بھی مطابقت ہے جو انھوں نے حال میں عہد ناموں کے احترام کے بارے میں فرمایا؟ طرابلس اور بلقان میں شیرخوار بچوں، بے ناصر و یار عورتوں اور صاحب فراش ضعیفوں کو جس طرح ذبح کیا گیا۔ اس پر انگلستان کے ضمیر کو کچھ حرکت ہوئی؟ گوری نو آبادیوں کا برتاؤ اپنی ہی جیسی محکوم کالی رعایا کے ساتھ نیک رہا ہے یا بد؟

سرکار انگلستان نے ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے ان کرنلوں پر کوئی دباؤ ڈالا یا اب تک اپنی نا قابل تحسین بے بسی کا عذر پیش کرتی رہی ہے؟ ہندستانیوں کا جو حقوق و فرائض کے مساوی طور پر لحاظ کیے جانے اور اپنے ملک کی حکومت میں معقول حصہ دیے جانے کا مطالبہ چلا آتا ہے۔ اس مطالبہ کو انگریزی دفتر شاہی نے اب تک بہ رضا و رغبت سنا ہے یا بغض و عداوت کے کانوں سے؟ تقسیم بنگال کی تنسیخ میں مسلمانوں کو ان کی وفاداری کا صلہ ملا یا ان کے جمود کو ذاتی سمجھ لیا گیا؟

ان کی عبادت گاہوں اور ان کے مقابر کا احترام ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا یا بعض وقت اسے رعب حکومت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا؟ ہم کہتے ہیں کہ ان سب سے قطع نظر کر کے یا زیادہ صحیح طور پر ان سب سے موازنہ کر کے ہم نے اس خیال کو سب پر مقدم پایا ہے کہ ہمارے لیے ہماری اپنی قومی و جماعتی ارتقاء کی موجودہ منزل میں انگلستان کے زیر تربیت رہنا لازمی ہے اور یہ دیکھ کر انگلستان نے ہمارے ساتھ جو برائیاں کی ہیں ان سے کہیں بھاری پلہ اس کے احسانات کا ہے۔ ہم بہ صدق نیت اور

بہ طیب خاطر اس کے وفادار رہیں گے۔ عام اس سے کہ وہ جرمنی کی بحری قوت کو توڑ کر یورپ کا مطلق العنان حکمران ہو جائے یا بحر شالی میں اس کے عظیم الشان بیڑہ کا آخری جہاز بھی غرق ہو جائے اور اس کا آخری سپاہی لندن میں کام آجائے۔

اگر انگلستان کو ہماری ضرورت نہ بھی ہو تو بھی ہمیں تو اس کی ضرورت باقی ہے۔ ہم چوں کہ سیاسی مکائد کے نہیں بلکہ سیاسی خلوص کے قائل ہیں۔ اس لیے زمانہ امن میں ہم نے انگلستان کے بڑے سے بڑے حکام سے نبرد آزمائی کی ہے لیکن زمانہ جنگ میں خانگی مناقشات میں ہتھیاروں کی جھنکار اور صدائے مخالفت بند ہو جانی چاہئے اور اگر ہم دوسروں میں اس جنگ کے لیے وہ جوش و سرگرمی پیدا کر سکیں جسے ہم خود بھی محسوس نہیں کر رہے ہیں تو بھی ہم گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ جہاں تک ہمارا اور ہمارے حلقۂ اثر کا تعلق ہے وہ مطمئن رہ سکتی ہے صوبہ کی سرکاروں اور ان سے بھی بڑی سرکاروں یعنی خداوندان اضلاع تو الگ رہے اور اگر خانگی شورش کے رفع کرنے کی ضرورت ہوگی تو ادنیٰ سے ادنیٰ اور چھوٹے سے چھوٹا پولیس کا پیادہ اپنے اشارہ پر ہمیں حاضر و آمادہ پائے گا۔ ہم اس سے بڑھ کر کوئی دعویٰ نہیں کرتے اور اس سے گھٹ کر کوئی توقع نہیں دلاتے یہی ہمارا مسلک اب تک رہا ہے۔ اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

حضرات! مجھ کو خوف ہے کہ شاید ''کامریڈ'' کے ان لمبے لمبے اقتباسات سے آپ پریشان ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اس مقصد کا خیال کرتے ہوئے جو میرے پیش نظر ہے امید کہ آپ معاف کریں گے۔ اس طویل بیان سے غرض یہ ہے کہ دنیا دیکھ لے کہ ہندستانی مسلمانوں کے خیالات اس گورنمنٹ کے متعلق اب سے کچھ پہلے تک کس قدر مختلف تھے۔ اور ہم نے ناانصافی، بے اعتنائی اور قساوت قلبی کے متواتر طرز عمل کو برداشت کرتے ہوئے کیسے صبر و سکون کا اظہار کیا۔

گورنمنٹ کے ایما پر اور اسی کے ذریعہ میں نے اپنے اور اپنے محترم دوست ڈاکٹر

انصاری کی طرف سے طلعت پاشا مرحوم ومغفور کو اس مضمون کا تار دیا تھا کہ لڑائی میں شریک ہونے سے قبل ترکی کو اچھی طرح غور کر لینا چاہئے اور جب کہ ان عاقبت اندیشانہ دھمکیوں سے جیسی کہ مثلاً لندن ٹائمس دے رہا تھا۔ ترکی کو لڑائی میں شریک ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ میں نے ٹائمس کے ایک مضمون کے جواب میں ''ترکوں کا چارہ کار'' کے عنوان سے کامریڈ میں ایک طویل مضمون شائع کیا جو بہت زیادہ مقبول ہوا اور ولایتی اخباروں نے بہت پسند کر کے اس کے حصہ کثیر کو اپنے صفحات میں نقل بھی کیا۔ اس مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ مسلمانان ہند اپنی غیر ملکی حکومت کو مدد دینے کے لیے کس حد تک مستعد ہیں۔

میں یہاں صرف وہی حصہ نقل کروں گا جو خاتمہ بحث ہے جس پر میں مفصل دلائل بیان کرنے کے بعد پہنچا تھا اور جسے میں نے مسلمانوں کے سامنے بدیں غرض پیش کیا تھا کہ وہ اس کو اپنی قومی پالیسی قرار دیں۔ میں نے لکھا:

''ان سب لوگوں نے جو حقیقی وفادار ہیں کام کے ساتھ عمرانی بحث ومباحثہ کے باب کا خاتمہ کر دیا اور اب اسے پھر نظر بھر کر بھی نہ دیکھیں گے۔ جو کچھ ہماری شکایات ہوں جو اصلاحات ہم چاہتے ہوں، ہر چیز وقت مناسب کے لیے ملتوی رہے۔ اگر گورنمنٹ بھی ہمیں وہ سب کچھ دے دے جو ہمیں محبوب ومطلوب ہیں۔ مثلاً اگر ہمیں مسلم یونیورسٹی ہماری ہی شرائط پر دے دی جائے۔ یا قانون مطابع کی منسوخی کا اعلان کیا جائے۔ یا حکومت خود اختیاری تک ہمیں دے دی جائے تو ہم گورنمنٹ سے باادب کہیں گے کہ یہ وقت اس کا نہیں ہے اور ہم بالفعل ان عطیات کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں گے۔ مراعات صلح کے زمانہ میں مانگی اور دی جاتی ہیں۔ ہم روسی پولینڈ کی رعایا نہیں۔ ہم رشوت نہیں چاہتے۔''

اس جیسے خاتمہ بحث نے اخبار مارننگ پوسٹ کے نامہ نگار ساکن کلکتہ کو بھی مطمئن

کر دیا۔ پھر بھی اسی مضمون کی اشاعت کی وجہ سے کامریڈ کی ضمانت ضبط کی گئی اور بالآخر مجھے وہ پرچہ بند کرنا پڑا۔ انھیں حالات کی بنا پر انگلستان کے ایک مؤقر ہفتہ وار رسالہ ''نیو اسٹیٹسمین'' نے گورنمنٹ ہند پر اپنے ایک مقالہ میں جس کا مضمون ''ہندستان میں وفاداری کی ترغیب'' تھا بہت بری طرح اعتراضات کیے۔ اور جب ترکی سے حقیقتاً جنگ چھڑ گئی تو دہلی میں ریوٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کے ایک نمائندے نے میرے خیالات معلوم کرنے کے لیے مجھ سے گفتگو کی اور اس کے بعد مجھے مطلع کیا کہ وائسرائے نے قبل اشاعت ان تمام باتوں کو بہ نظر امتحان دیکھا جو مجھ سے دوران گفتگو میں ہوئیں۔ اس سے پیشتر مضمون میں یہ پیش گوئی کر چکا تھا کہ اگر ترکوں سے جنگ شروع ہوگئی تو بھی ہندستانی مسلمان اپنی وفاداری پر قائم رہیں گے۔ اور جب کہ جنگ چھڑ گئی تو میں نے مکرر کہا کہ وفاداری اب بھی قائم رہے۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی روح خدا کے تفویض کریں اور ملک میں قیام امن کے لیے اپنی خدمات گورنمنٹ کے سپرد کریں۔ میں نے اس وقت انھیں ایسے بچوں سے تشبیہ دی تھی جن کے والدین آپس میں لڑ رہے تھے۔ میں نے لکھا تھا کہ '' چاہے ماں برسر حق ہو چاہے باپ ہر حالت میں رنج وکلفت بچوں کے نصیب ہوگی۔''

ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے سے گفتگو اور نیز اپنے اس مضمون سے جو کامریڈ بند ہونے سے قبل نکل چکا تھا۔ میں نے اس امر کو اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ مسلمانان ہند ان وعدوں پر جو مذہب اور مقامات مقدسہ کے متعلق انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے کیے ہیں پوری طرح اعتماد رکھتے ہیں۔ میں نے صاف طور پر اس امر کی تصریح کردی تھی کہ جزیرۃ العرب پر حملہ نہ کیا جائے نہ مقامات مقدسہ کی اس حفاظت کو خطرے میں ڈالا جائے جو کامل آزاد اسلامی طاقت کے ذریعہ سے کی جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ تھی کہ غیر مسلم حکومت مسلمانوں سے چاہتی ہے کہ وفاداری حکومت

کے مقابلہ میں احکام مذہب کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو امور مندرجہ بالا ہی اقل امور تھے جن کے مسلمان مستحق تھے۔ گفتگو اس بیان پر ختم ہوئی کہ مسلمانوں سے حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے کی توقع کرنی چاہئے۔ یعنی'' کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو'' لیکن جس ممتاز نامہ نگار نے مجھ سے یہ ملاقات کی تھی اسی سے مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ اخباری تاروں کے سنسر نے جو یقیناً ایک عیسائی تھے۔ حضرت مسیح کے قول کو باقی تار دیتے وقت بڑی احتیاط سے خارج کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ رس حاکم نے جو کلیسا کے اقتدار حکومت سے آزاد رہنے کا قائل نہ تھا۔ خوب تاڑ لیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو یہ یاد دہانی کی گئی کہ'' قیصر کو دو جو چیز قیصر کی ہے'' تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو اس سے ملے ہوئے اس قول کی بھی یاد آ جائے کہ'' اللہ کو دو جو چیز اللہ کی ہے''

چند ہی روز گزرنے پائے تھے کہ یہ اندیشہ واقعہ بن گیا۔ ہمارے ساتھ جو غداری کی گئی وہ ابھی کل کی بات ہے۔ اس لیے اس کی تاریخ کے یہاں مفصل اعادہ کی ضرورت نہیں۔ دورانِ جنگ میں مسلمانوں سے ان کے احکام شرعی کے علی الرغم یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ خلیفہ اور مجاہدین اسلام کے مقابلہ میں گورنمنٹ کی حمایت کریں۔ جزیرۃ العرب جس میں شام، فلسطین اور عراق عرب شامل ہیں اور جس کو غیر مسلموں کے اثر و اقتدار سے ہمیشہ آزاد رکھنا مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے اسی جزیرۃ العرب پر انگریزوں اور اتحادیوں کی طرف سے مسلمانوں کے رسولؐ برحق کی مشہور و معروف آخری وصیت کو پس پشت ڈال کر حملہ کر کے قبضہ کر لیا گیا اور اب تک یہ ان کے زیر سیادت ہے۔

مسلمانوں کے مقامات مقدسہ سے مراد صرف چند عمارتیں نہیں ہیں۔ بلکہ مقامات مقدسہ سے وہ تمام علاقے مراد ہیں جن میں تینوں حرم مکہ، مدینہ اور بیت المقدس شامل ہیں۔ یہ مقامات مقدسہ خلیفۃ الرسول اور امیر المؤمنین سے چھین لیے گئے ہیں کہ وہی ان کا واحد حقیقی اور جائز محافظ اور خادم ہے۔ لیکن آج تک اسے اس کی اجازت نہیں

کہ ان مقامات پر قابض ہو سکے یا انھیں حملوں سے محفوظ رکھ سکے یا کسی طرح ان کی خدمت کر سکے۔

خلیفہ کی سلطنت پارہ پارہ کر دی گئی۔ غیر مسلموں کو اس کی فرماں فرمائی سپرد کر دی گئی، اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی دنیا طاقت اس حد تک کمزور ہوگئی کہ غیر مسلم قوتوں کے دباؤ کی وجہ سے مسلمانوں کا مذہبی اور روحانی اقتدار بھی معرض خطر میں آ گیا۔ ان تمام حالات پر اصرار آخر وقت تک تمام اتحادیوں کی جانب سے ہوتا رہا اور سب سے زیادہ سرکار برطانیہ کی طرف سے۔ پھر یہ بھی ہم سب کو معلوم ہے یونان التوائے جنگ کے بعد بھی صلح و جنگ کے تمام بین الاقوامی قوانین پس پشت ڈال کر انگلستان کا پٹھو بن کر انگلستان کی عاشیت سوز پالیسی پر عمل درآمد کرتا رہا۔ دوسرے اتحادیوں نے عصمت پاشا کی نوران میں خواہ کتنی ہی مخالفت کی ہو لیکن غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے راستہ میں اس دردناک سرگذشت کے خاتمہ تک انگلستان ہی سب سے زیادہ زور اٹھاتا رہا۔ مسلمان حکومتوں اور آبادیوں کے ساتھ دوسرے طریقوں سے بھی حق تلفیاں برتی گئیں۔ مثلاً یہ کہ وہ مسلمان آبادیاں جس پر غیر مسلموں نے قبضہ یا تسلط غاصبانہ کر لیا۔ حق حکومت خود اختیاری سے محروم رکھی گئیں۔ جس وقت ایک طرف یہ تمام واقعات پے در پے وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ عین اس وقت ''اسلامی ہند کی رائے عامہ کی'' (جس کی آواز صلح کانفرنس تک تو مطلقاً نہیں پہنچنے دی گئی البتہ جو خود اتحادیوں کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ تو ان مسلمانوں کے حلق سے جو سرے سے ہمارے نمائندے ہی نہ تھے) زبان بندی ہندستان میں ان مہیب آلات سے کی گئی جن کے اصطلاحی نام پریس ایکٹ، ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ ریگولیشن نمبر 3 1818 ہیں۔ اور پھر آخر میں عام تعزیری قانون کے علاوہ ہندستان کے بعض مقامات پر مارشل لا کا نفاذ۔

میں ابھی اپنا خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ مسلمان حکومتوں اور آبادیوں کے ساتھ دشمن کے تلخ تجربات مسلمانوں ہی کے اس خیال کے پھیلنے میں معین ہوئے کہ اس غیر مسلم و غیر ملکی حکومت سے اس کی خاطر ہر ممکن قربانی کرنے کے بعد بھی ہمدردی اور معاونت کی توقع رکھنا ایک خام خیال ہے بلکہ اگر مسلمانوں کو کسی کی معاونت درکار ہے تو ہندستان کی دیگر اقوام کے ساتھ اشتراک عمل کا پائیدار اور بااصول معاہدہ کرنا چاہئے۔ مشرقی بنگال کے معاملہ میں بھی جب کہ مسلمانوں کے ساتھ غداری کی گئی۔ یہی راہ عمل ان کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ یہ وقت گویا ہندو مسلم اتحاد کی تجدید کے لیے نہایت موزوں تھا۔

سچے اشتراک عمل اور رفاقت کار کا چاہے وہ تجارت میں ہو یا معاشرت میں یا محبت میں۔ اصول یہ ہے کہ فریقین جو ایک دوسرے کی تجارت، معاملت یا دوستی میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کے باہم زیادہ فرق حالات نہ ہو۔

بعینہ یہی حالت سیاسیات میں ہے۔ امیر و غریب بوڑھے اور نوجوان عالم اور جاہل میں اتحاد عمل اگر چہ شاید ممکن ہے لیکن معمول کے خلاف ضرور ہے۔ اسی بنا پر سید احمد خاں کا خیال صحیح تھا کہ انھوں نے ایک نسل پہلے قوی اور ضعیف کو ایک ساتھ چلانے کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اس بحث کے دوران میں جو منٹو مارلے کے اصلاحات کے متعلق پیدا ہو گئی تھی۔ مسلمانوں میں کسی حد تک خود شاری کا احساس پیدا ہو چلا تھا جو سیاسیات میں ایک ضروری اور اہم صنعت ہے۔ لیکن جنگ طرابلس کے شروع ہونے کے وقت ہی سے مسلمانوں کو گورنمنٹ کی اشتدادی پالیسی کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔ میں مسلمانوں کی تعریف کی غرض سے نہیں بلکہ واقعی کہتا ہوں کہ اس سارے پر فتن زمانے میں مسلمانوں نے ڈبل کوچ کر کے اس فاصلے کو جو ان کے اور ہندستان کے دوسری ترقی یافتہ اقوام میں حائل تھا، ایک بڑی حد تک طے کر لیا۔

نظر بندی کے زمانہ میں ہم دونوں بھائیوں کی رائے سے ہی 1910ء میں مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں منعقد کیا گیا جہاں اس سال کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ مولانا مظہر الحق صاحب بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ کے صدر منتخب کیے گئے۔ مولانا پکے کانگریسی اور مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے باوجود اس امر کے کہ مسلمانوں کی جماعت کا حصہ غالب سید احمد خاں کی تیس سال قبل کی پالیسی سے سرمو تجاوز کرنا نہ چاہتا تھا۔ کانگریس سے اپنا قطع تعلق نہ کیا۔ چنانچہ مولانا مظہر الحق صاحب سے خواہش کی گئی کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی لیڈروں کا ایک جلسہ ہندستان کے مختلف فرقوں کے آئندہ سیاسی تعلقات کو مضبوط اور درست کرنے کی غرض سے منعقد کریں۔ مسٹر جناح کی مؤثر وکالت، صدر نشین لیگ کے زور بیان اور شمشیر بے نیام وطن دوست مسلمان مولانا حسرت موہانی کی جرأت و استقلال کی مجموعی طاقت سے آخر کار وہ مفاہمت ہو ہی گئی جس کا ثمرہ اگلے سال لکھنؤ کے تاریخی میثاق کی شکل میں ملنے والا تھا۔

مسلمانوں کی رضا و ترقی اس قدر تیز تھی کہ ایک ظریف نے جو خود بھی مسلمان ہی تھا کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں کے خطبوں کو پڑھ کر جو رائے دی اس کا مختصر اعادہ خالی از لطف نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس بمبئی کے بنگالی صدر لارڈ سنہا اور ان کے بھاری ہمسایہ اور قانون پیشہ بھائی جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی کے صدر تھے۔ بہ ارادہ سفر بمبئی ایک ہی گاڑی میں سوار ہوئے۔ راستے میں دونوں نے ایک دوسرے کا خطبہ صدارت دیکھنے کے لیے مانگ لیا۔ تاکہ باہم دگر توسیع خیالات کریں۔ لیکن خوبیٔ وقت و اتفاق سے دونوں ایک دوسرے کا خطبہ پڑھ کر واپس کرنا بھول گئے۔ چنانچہ مولانا مظہر الحق نے مسلم اراکین مسلم لیگ کے روبرو وہ گرما گرم اور تیز و تند خطبہ پڑھ دیا جو بنگالیوں ہی کا حصہ تھا۔ اور لارڈ

سنہا نے کانگریس کے ڈیلی گیٹوں کے سامنے وہ نرم اور پر از احتیاط وخرم خطبہ پڑھا جو ہمیشہ کے وفادار مسلمانوں ہی کے شایان شان تھا۔ گورنمنٹ اب سمجھنے لگی تھی کہ بمبئی کی اس مفاہمت باہمی کے ناگزیر نتائج کیا ہوں گے۔ چنانچہ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ اراکین مسلم لیگ جنھوں نے اپنے اجلاس کا آغاز اس بلند آہنگی سے کیا تھا آخر میں مجبور ہوئے کہ اس کا اختتام بند کمرے میں کریں۔ اس کے بعد سے کانگریس و مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر ہونے لگے اور دونوں جماعتیں باہمی اعانت سے کام کرنے لگیں۔ نتیجہ ناگزیر اور پہلے سے معلوم تھا۔ اگر کانگریس کے اجلاس احمد آباد کا صدر بجائے اس کے کہ احمد آباد میں صدارت کی کرسی پر بیٹھا ہو علی پور کے جیل میں بند تھا۔ تو اس سال کے مسلم لیگ کے اجلاس کا صدر بھی احمد آباد میں اپنے خطبۂ صدارت کی بدولت بادشاہ کے خلاف جنگ کرنے کے جرم میں ماخوذ تھا اور جب جیوری کے متفقہ فیصلے نے اسے اس جرم سے بری کر دیا تو بغاوت کے جرم میں سزایاب ہو کر احمد آباد کی جیل میں قید کر دیا گیا۔ یہ مسلم کلاہ تفاخر میں ایک طرۂ امتیازی ہے کہ جب سر جیتندر داس بنگال اور دوسرے مقامات میں سوراجیوں کے گروہ کو فتح وظفر کی منزل پر پہنچا رہے ہیں ان کا مسلمان ہم کار بردا جیل میں مہاتما گاندھی کی رفاقت کا فخر حاصل کر رہا ہے اور باوجود اس کے کہ جیل میں ارتکاب جرائم کے مواقع مسدود ہوئے ہیں اپنی قید کی میعاد بجائے کچھ حصہ جھیل چکنے کے دگنے سے بھی زیادہ بڑھا چکا اور اس طرح سے جیوری کی غلطی کی تصحیح کر چکا۔

لیکن صرف اتنی ہی بات نہ تھی کہ مسلمان بغیر اس کے عمر بھر غیر ملکی حکومت ہی پر بھروسہ کرتے اور ہمسایہ اقوام کی طرف سے شکوک وشبہات دل میں رکھتے رہیں۔ خود اپنے قومی مفاد کے تحفظ کا اہتمام اپنے ہی اوپر لازم سمجھیں۔ بلکہ مسلمانوں پر انسان کا اطلاق صحیح نہ ہوتا اگر وہ ان مظالم پر جو ہند اور اہل ہند پر مجموعاً مسلسل جاری تھے عملاً

احتجاج نہ کرتے۔ انھیں اپنے سیاسی استادوں کا پڑھایا ہوا یہ سبق اب تک یاد تھا کہ سرکار بالآخر شکایت کا دفعیہ کر ہی دیتی ہے۔ اس لیے وہ اب تک اسی پر تکیہ کیے بیٹھے رہے۔ اس انتظار کو ایک مدت گزر چکی۔ لیکن ان مظالم کی تعداد میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا، اور مرہم کی جگہ چرکے اور کچوکے ہی لیتے رہے۔ انتظار کے تلخ تجربہ کے بعد مسلمانوں کی تعداد کانگریس کے ممبروں میں سالانہ بڑھنے لگی اور یہ صورت حال اس حقیقت کی امید افزا دلیل تھی کہ اب ان میں نہ صرف اپنے محدود جماعتی اغراض بلکہ وسیع تر ملکی و وطنی اغراض (جن میں دوسری ہندستانی قومیتوں کے ساتھ خود یہ بھی شریک تھے) کے تحفظ کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ اب ان پر یہ امر پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہو چکا ہے کہ مسلمان ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ دائرۂ ہندستانیت سے خارج ہیں۔ کلکتہ، بمبئی اور دہلی کے اجلاس کانگریس حقیقی معنی میں "کانگریس" کے لقب کے مستحق ہونے لگے۔ لیکن یہ فخر جنرل ڈائر ہی کے حصہ میں آیا کہ جو دیوار سرسید احمد خاں نے تیس سال قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کھڑی کی تھی وہ اب کلیتاً مسمار ہوگئی۔ مسلمانوں نے امرت سر کانگریس 1919ء میں ہندستانی قومیت کے مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے شرکت کی۔ جنرل ڈائر کے سپاہیوں کی گولیوں نے ہندو مسلمان میں تفریق نہ کی اور مشیت الٰہی نے اس خوبصورتی کے ساتھ ترتیب واقعات دی کہ ہمارے دلاور سکھ بھائیوں نے بھی جو مسلمانوں سے بھی زیادہ وفاشعار تھے، اپنے مذہبی مرکز کی مقدس زمین کو ہندو اور مسلمان شہیدوں کے خون کے ساتھ رنگین کیا۔

لیکن جلیاں والا باغ میں جو مصائب برداشت کیے گئے تھے ان کی حیثیت محض انفعالی تھی۔ نہ وہ ازخود پیدا کیے گئے تھے نہ بخوشی برداشت کیے گئے بلکہ حکام کے مارشل لاء (فوجی قانون) کی کارفرمائی سے جو دہشت دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ اس سے تو

ایک وقت میں یہاں تک اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ پنجاب میں اشتراک مظلومیت نے جو احساس اتحاد و اشتراک پیدا کر دیا ہے، کہیں ''معاً'' مردہ ہو کر نہ رہ جائے۔

لیکن یہ رنج و غم صرف پنجاب کے لیے مخصوص نہ تھا۔ متعدد ہندستانی محبان وطن پنجاب گئے۔ لیکن مجھ کو یقین ہے کہ وہ لوگ بھی اس کو اپنی کسر شان نہ خیال کریں گے۔ اگر میں کہوں کہ ان اہم ایام کا سب سے اہم واقعہ مہاتما گاندھی کا ورود پنجاب تھا۔ مہاتما کی سرگذشت آپ لوگوں کو رتی رتی معلوم ہے اور اب تو بفضلہٖ ہندستان سے باہر بھی باخبر حضرات اس سے واقف ہیں۔ اس لیے مجھے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جنوبی افریقہ میں جو تجربے ان کو ہوئے ان سے اس کو یقین ہو گیا کہ ہندستانیوں کے ساتھ بیرون ہند انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ خود اپنے وطن میں ان کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے اور خود ہندستان کی حکومت ان کے ہاتھ میں نہ آئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ خواہ مخواہ برطانوی تعلق کو بالکل ہی خیر باد ہی کہہ دیا جائے۔ آج بھی نہ صرف جن کی رواداری ضرب المثل ہو گئی ہے بلکہ ان کے خدام کا بھی مثل میرے جو ان کی سی رواداری کا ہرگز مدعی نہیں۔ یہ یقین ہے کہ گذشتہ چند سالوں کے تلخ تجربات کے باوجود ہندستان کا بہترین سوراج برطانوی تعلق کے قیام کے ہرگز منافی نہیں بشرطیکہ برطانوی سرکار اور برطانوی قوم اپنے قلوب کی اصلاح کر لیں اور اپنے اعمال گذشتہ کے کفارہ پر آمادہ ہو جائیں۔ چنانچہ مہاتما جی کی واپسی وطن اسی غرض سے ہوئی کہ وہ ہندستان کو اخلاقی و سیاسی غلامی سے نجات دلائیں۔

لیکن جن طریقہ ہائے کار کو وہ پسند فرماتے تھے اور جن کی تبلیغ انھوں نے اپنے پیروؤں کو کی ان پر سیاسیات زدہ مغرب کے نقطۂ خیال سے ''سیاسی'' کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام بڑے ہادیان عالم کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زندگی بجائے خود ایک واحد تنظیم کا نام ہے۔ خواہ فلسفیانہ مطالعہ کی اغراض سے اس کی کتنی ہی تحصیل

اجزاء کی جائے اور سیاسی روحانی حیثیات میں کوئی نسبت تناقض نہیں۔

بہت سے لوگوں نے مہاتما جی کی تعلیمات اور پھر ان کے مجاہدات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات وریاضتوں سے تشبیہ دی ہے۔لیکن لوگوں کا خیال جہاں تک پہنچا ہے۔ یہ تشبیہ حالات اس سے بھی آگے پہنچتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قوم یہود سے تھے اور ان کے معتقدین کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ خاندان داؤد کے مسیح علیہ السلام ہیں۔ جو بنی اسرائیل کو ان کی گم گشتہ آزادی واقتدار واپس دلانے کو مبعوث ہوئے ہیں۔

اس وقت سے بنی اسرائیل انتقام اور تلافی مافات کا خواب برابر دیکھ رہے تھے۔ اور سائرس کی فتح سے ایک بار ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب ان کی تمام امیدیں پوری ہورہی ہیں۔معبد کی دوبارہ تعمیر شروع ہوگئی تھی اور کچھ عرصہ کے وقفہ کے بعد کام پھر جاری ہوگیا۔

بنی اسرائیل کی قسمت میں اب بھی آزادی کا مزہ چکھنا نہ تھا۔لیکن خواہ وہ یونانیوں کے جوئے تلے ہی ہوں یا رومیوں کے بنی اسرائیل نے عروج ثانی کی امید کبھی نہ چھوڑی۔ایشیا میں یونانی اور رومی تمدن کے فاتحانہ اور اکثر ظالمانہ ترویج اس کو پھر وہی خواب دکھلانے لگی۔

ہیرووا عظم جس نے روم سے کسی قدر آزادی بھی حاصل کرلی تھی،اسی سال فوت ہوا جس سال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔اس کے تین بیٹے رومیوں کے اسی طرح اولین سردار تھے جس طرح انگریزی حکومت کے زیرسایہ ہندستان کے راجا ہوتے ہیں۔

(رینان) حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ طفولیت میں ارکیلاس کو اگستس نے تخت سے اتاردیا اور یروشلم کی رہی سہی آزادی بھی جاتی رہی۔

یہودیہ اس وقت سے صوبہ شام کی جو ایک شاہی نائب کے زیر حکومت تھا ایک ریاست کا جزو بن گیا۔ بہت سے رومی حاکم جو خاص امور میں شام کے شاہی نائب کے ماتحت ہوتے تھے اور جس میں سے تاریخ عیسوی میں پانطس پلاطس بہت مشہور ہے، ہمیشہ اس آتش فشاں کے دبانے کی فکر میں رہا کرتے تھے جو ان کے پیروں تلے سلگ رہا تھا۔ اس تمام عرصہ میں بعض موسوی مذہب کے پر جوش لوگوں نے مسلسل بغاوتیں کیں جن سے یروشلم میں بے چینی بڑھتی رہی۔ رومی Eagls کو اور ہیرودیس کی تعمیر کردہ عمارتوں کو تباہ کرنے پر جس میں موسوی قوانین کا ہمیشہ لحاظ نہیں کیا جاتا تھا ان کی نظریں جو دنیا کے تمام تفکرات سے مستغنی تھے ہمیشہ لگی رہتی تھیں۔ اس قسم کی دوسری تحریکوں سے سامریوں میں ہی ایک جوش سا پھیلا ہوا تھا۔ ''Zelotes'' یا ''Sicaric'' جنہوں نے ہر اس شخص کو قتل کرنے کا جو ان کے خیال میں قانون شکنی کرتا، بیڑا اٹھایا تھا اب ظاہر ہونے لگے۔ جس تحریک کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ یہودا گلیلی کی تھی۔ مردم شاری جس پر ٹیکس کی تمام تر بنیاد تھی بہت ہی قابل نفرت سمجھی جاتی تھی۔ پس مردم شاری نے جو سنہ عیسوی کے چھٹے سال ہو رہی تھی اور Gentile نے حکومت کی نفرت کو دوبارہ تازہ کر دیا تھا اور اس سے ایک بڑا جوش پھیلا ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ شمالی صوبوں میں جہاں یہودیوں کے بڑے بڑے کارنامے وقوع پذیر ہوئے ایک انقلاب عظیم برپا تھا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قیامت اب قریب آ گئی ہے۔ اناجیل جس کی مختلف تاویلات ہونے لگی تھیں بڑی بڑی توقعات دلاتی تھیں۔ پرانے عہدنامے (توریت) کی سطر سطر میں وعدہ نظر آتا تھا اور ایک طرح سے آئندہ حکومت کا پروگرام دکھائی دیتا تھا۔ جس میں نیکوں کو امن ملے گا اور خدا کا کام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ (رینان)

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابتدائے بعثت کے وقت دنیا کا اندازہ لگایا تو

انھیں پہلے یہ سوال پیش آیا کہ اصلاح کا طریقہ کونسا اختیار کریں۔ ارکان کلیسا کے خیال کے مطابق تشدد سے اصولی اختلاف کے باعث انھوں نے بنیاد کار اس عقیدہ کو رکھا کہ بدی کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ باالفاظ دیگر انھوں نے تشدد کو "استعانت بالصبر" سے شکست دینی چاہی جیسا کہ حضرت امام حسینؓ نے بعد کو میدان کربلا میں کیا تھا گو تلوار مرتے دم تک ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اگر واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ کہا بھی کہ "میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے۔" تو اس سے ان کا منشا صرف یہ رہا ہوگا کہ وہ شیطان کو جو اس دنیا کا بادشاہ ہے۔" شیطانی حربوں سے شکست نہ دیں گے۔ ان کے احکام وتدابیریں "دنیوی" نہ تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ "دوسری دنیا کے متعلق تھے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ "دنیا سے بےتعلق" تھے۔ سیاسی انقلاب خواہ کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب ابتداء بعثت ہی میں ٹھکرا چکے تھے اور اسی پر آخر تک قائم رہے۔ جس قسم کا انقلاب وہ پیدا کرنا چاہتے تھے وہ ایک اخلاقی انقلاب تھا۔ اگرچہ ان کا حشر بھی "باغیوں" کا ہوا اور پلاطوس کے حکم سے وہ صلیب پر "یہودیوں کے بادشاہ" کے لقب سے لٹکائے گئے۔ جو اگرچہ طنزاً کہا گیا تھا۔ لیکن اس طنز سے رومی حاکم کے سیاسی شبہات کا بھی پتہ چل رہا ہے۔ حضرت مسیح کے نزدیک آزادی کے معنی حق اور تزکیہ نفس تھا۔ رینان میرے خیال کے مطابق اپنے زمانہ کا ایک ایسا فرانسیسی شخص تھا جس کی نظر میں حکومت کے مطالبات سب پر بالا تھے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مذہبی تعلیمات کو محض بندۂ خدا (عبداللہ) کہتے تھے۔ وہ نہ تو سمجھ سکتا تھا اور نہ ان کی داد دے سکتا تھا۔ لیکن میں رینان کے اس خیال سے متفق ہوں کہ بہ حیثیت ایک خشک جمہوریت پسند یا پرجوش محب وطن کے انھوں نے حالات حاضرہ کی رو کو نہیں روکا۔ البتہ یہ اعلان کر کے کہ سیاست ایک حقیر چیز ہے، انھوں نے دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ ملک ہی ہمارا اوّلین وآخری مقصد نہیں اور انسان کا مرتبہ شہری سے مقدم

اور بلند تر ہے۔ جذبہ انتقام جس کی آگ بنی اسرائیل کے دلوں میں سلگ رہی تھی اس کا حق صرف خدا ہی کو سزاوار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کو جو " آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" (العین بالعین والسین بالسین) کا قانون رکھتے تھے یہ تعلیم دی کہ وہ جس کے گال پر ایک طمانچہ مارا جائے اسے چاہئے کہ مارنے والے کی طرف دوسرا گال بھی پھیر دے۔ یہ برتاؤ تو غیر ملکی ظالم فرماں روا کے ساتھ رکھنے کا تھا۔ باقی خود اپنے ہم وطنوں کے لیے جو اپنے ہی کمزوریوں کا شکار بن کر اور یہودیہ کے غیر ملکی حاکموں کے خوف سے، ان کی جانب سے تحصیل وصول وغیرہ کی خدمات ملازمت قبول کر چکے تھے۔ سو ان کے لیے تو حضرت مسیح کا وسیع دامن راحت کشادہ تھا ہی۔ صبر وتحمل کے ذریعہ سے غلبہ حاصل کرنے اور تزکیۂ قلب کے ذریعہ تشدد پر فتح پانے کا خیال ابتدائے انسانیت یعنی ہابیل اور قابیل کے زمانے کا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اصول ان حالات کے ساتھ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھا۔ ایسا چسپاں ہو گیا تھا کہ باوجود اس کے کہ ان کے حالات نبوت ہم تک بہت ہی ناقص حالت میں پہنچے ہیں، تاہم یہ جز واب تک تفصیل کے ساتھ محفوظ چلا آتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر عیسائی اور بہت سے غیر عیسائی بھی ان تعلیمات کو حضرت عیسیٰ کے ساتھ مخصوص سمجھنے لگے ہیں۔

خیر وہ جو کچھ بھی ہو مہاتما گاندھی سے بھی اسے ایسی ہی نسبت مخصوص حاصل ہے۔ لیکن یہ شرف مخصوص ایک عیسائی حکومت ہی کے حصہ میں تھا کہ اس نے ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے مسیح نما شخص کے ساتھ ایک مجرم کا سا برتاؤ کیا اور اس شخص کو جو پبلک زندگی میں " شاہ امن" سے سب سے زیادہ قربت رکھتا ہے۔ ایسے شخص کو امن عامہ کا برہم زن قرار دے کر سزا دی۔ ہندستان کے سیاسی حالات مہاتما جی کے ورود سے پیشتر بالکل ویسے ہی تھے۔ جیسے یہودیہ کے بعثت مسیح سے قبل تھے اور جو نسخہ انھوں

نے ہندستان کے امراض کے لیے انتخاب کیا وہ وہی تھا جو اس سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیہ کے لیے منتخب کیا تھا۔ ''استعانت بالصبر'' کے ذریعہ سے تزکیۂ نفس، حکومت کی ذمہ داریوں کے لیے اخلاقی تیاری اور سوراج سے قبل ضبط نفس مہاتما جی کا عقیدہ یا مسلک جو کچھ کہیے یہی تھا۔ جن لوگوں کو اس مبارک سال میں رہنا نصیب ہوا ہے جو احمد آباد کانگریس کے ساتھ ختم ہوا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مہاتما نے انسانوں کی اتنی بڑی آبادی کے اعمال، جذبات اور حالات میں کس قدر حیرت انگیز اور فوری تغیر پیدا کر دیا تھا۔

قبل اس کے کہ ہندو مسلم سوال کو بالکل ختم کروں میں یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندستان سوراج حاصل کر لینے کی حالت میں ہندستانی مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کے لیے پورا پورا ممد اور مؤید رہے گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ سوراج کے معنیٰ ''سرو راج'' یا ''سب کی حکومت'' کے ہیں۔ اور لفظ ''سوراج''۔ ''سوادھرم'' کے اصول پر دلالت کرتا ہے۔ جس کا صحیح مفہوم صرف مشرقی ممالک ہی پوری طرح ادا کر سکتے ہیں۔ یہ امر لازمی نہیں کہ دلی کے مغلیہ تخت پر کوئی مسلمان بیٹھے۔ ہم سب نے ابھی دیکھا ہے کہ کس طرح ایک عظیم الشان اسلامی حکومت تخت شاہی کا خاتمہ کر کے جمہوریت میں تبدیل ہوگئی۔ ہر ایک زمیندار مسلمان خلفائے راشدین کے تیس سالہ عہد کو اپنے لیے نمونہ بناتا ہے۔ جو باوجود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور امیر المؤمنین ہونے کے جمہور کے خالص اور سچے خدمت گزار تھے۔ اسلام مہذب دنیا کے بڑے حصہ پر پھیلا تھا اور اس کی حکومت تمام معلوم براعظموں تک پھیل گئی تھی۔ لیکن کوئی مسلمان اس آخری عروج کے زمانہ کو اتنا عزیز نہیں رکھتا جتنا کہ اس کو ابتدا کے تیس سال سے گرویدگی ہوتی ہے۔ جب کہ ایک مسلمان ایلچی ایک بازنطینی یا ایران ایلچی سے جو اپنے مطلق العنان حکمرانوں پر ناز کرتے تھے۔ یہ فخر یہ کہتا ہے کہ

مسلمان اپنے حکمرانوں کو خود ہی مقرر کیا کرتے ہیں اور خود ہی معزول کر سکتے ہیں۔
فتح کو بہادر اور خدا ترس ترکوں نے شکست و ناامیدی سے جبر یہ بیکار نہیں لیا ہے۔
اور مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ان تر ددات سے جو جنگ و صلح دونوں کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں فارغ ہو جائیں گے تو وہ خدا کی اعانت سے نہ صرف امیہ اور عباسیہ کی شان و شوکت کو زندہ کریں گے۔ بلکہ وہ خلافت کے ابتدائی تیس سال کی یاد کو تازہ کر دیں گے جس میں نہ کوئی حاکم تھا نہ سلطان، ممالک اسلامی اور خلیفہ کے درمیان تعلقات قائم کرنے کے متعلق میرے اپنے خیالات ہیں۔ لیکن ان کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام میں بھی بعض ایسے امور ہیں جن کا کرنا اور بعض ایسے ہیں جن کا نہ کرنا ہر مسلم کے لیے ضروری ہے۔ ان اوامر اور نواہی کے درمیان ایک صورت مباح کی ہے جس میں بجز ان امور کے جن کو ترویج حاصل ہے ہر شخص کو پورا اختیار حاصل ہے۔ اس کے بعد ایک مسلمان کسی ایسی مخلوق کی اطاعت نہیں کر سکتا جو ان اوامر نواہی کے منافی حکم دیتی ہو۔ خواہ وہ شخص اس کے والدین میں سے ہو یا اس کا آقا یا حاکم ہو خواہ وہ اس کا دوست ہو یا دشمن اور خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اس میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ایک مسلمان اسلامی حکومت کی رعایا میں سے ہے یا غیر اسلامی حکومت کی۔ جس چیز کی اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی امور میں احکام الٰہی کی پابندی کے لیے اسے پوری آزادی حاصل ہو۔ ایک مسلمان حاکم کیا معنی اگر خود خلیفہ اسے خدا کی نافرمانی کا حکم دیتا ہے تو اسے قطعی انکار کر دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جو خدا کے لیے واجب الادا ہے۔ اسے وہ غیر مسلم قیصر کو کیوں کر دے سکتا ہے۔ ایسی صورت میں نہیں سمجھتا کہ سوراج اور ہم مذہب حکومت کے ساتھ مسلمانوں کی مستقل وفاداری کا سوال کیوں اٹھتا ہے؟ اب رہا امیر افغانستان کے ہوتے کا سوال کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کی مدد سے ہندستان پر حملہ کرنے والے ہیں، تو میں یہ کہوں گا کہ یہ خوف اور بزدلی کی علامت ہے۔ جو صرف جرأت

وہمت اور ایک دوسرے پر اعتماد کرنے سے رفع ہو سکتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کا یہ فقرہ سن کر میرا دل بہت خوش ہوا کہ پہلے ہم سوراج حاصل کریں۔ پھر دیکھیں کون آتا ہے۔ ہم یقیناً ہر حملہ آور کے مقابلہ کے لیے تیار رہیں گے اور ایک ایسی قوم کے ہاتھ سے جس نے ڈیڑھ سو برس کی غلامی کے بعد اسے حاصل کیا ہو آزادی کا چھین لینا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ رہا میرا سوال۔ تو اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ جس دن ہندستان کو کسی حملہ آور کے مقابلہ کے لیے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم مجھ سے عاجز سپاہی کی ضرورت ہوگی تو آپ کا یہ رفیق جسے آپ نے آج صف جنگ سے باہر بلالیا ہے۔ پھر خوشی کے ساتھ اپنی صف کی خالی جگہ کو پر کرلے گا۔ یقین جانئے کہ وہ آپ کی رفاقت چھوڑنے کا نہیں۔

میں نے سنا ہے کہ میری 1921ء کی مدراس والی تقریر سرکاری حلقوں میں بہت سخت باغیانہ خیال کی گئی ہے۔ اس تقریر میں بالکل وہی جذبات تھے۔ میرے بھائی اور میں نے اپنے اس خط میں ظاہر کیے تھے جو بیتول جیل سے وائسرائے کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ یہ خط ایسا تھا کہ خود افغانستان میں بھی کچھ مقبولیت کی نظر سے نہ دیکھا جاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ افغانستان کے لوگوں کو یہ سن کر تکلیف ہوتی ہوگی کہ وہ ہندستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کررہے ہیں۔ اگر ہم کو صرف اتنا معلوم ہوتا کہ ہز میجسٹی امیر افغانستان کو خود اپنی حکومت کی تنظیم اور بلا امداد غیرے وہاں کے ذرائع آمدنی کی ترقی دینے میں کس قدر دشواریاں حائل ہوں گی۔ ان کی اور ان کی گورنمنٹ کو مصروف رکھنے کے لیے افغانستان اس قدر کافی ہے کہ وہ اس بیرونی مسئلہ پر کہ کابل کا ٹٹو ہندستان کے ہاتھی کو کیوں کر نگل سکتا ہے؟ مزید غور کرنے کی مہلت ملے۔ افغانستان کے اس مفروضہ حملہ کی صورت میں میں نے جو اپنی حیثیت بتائی ہے اس پر اگر افغانیوں کو تکلیف پہنچتی ہو تو اس صورت میں خود میرے جذبات کیا ہوں گے؟ میں مسلم ہوں اور اس لیے ہندستانی ہونے سے موقوف نہیں ہوا اور فی الحقیقت یہ کسی ہندستانی کے قومی

افتخار کے لیے باعث ذلت ہے کہ اس کے ہم وطن اپنے ملک کو باہری حملہ آور کا خواہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہوشکار خیال کرتے ہوں۔ دوستو! معاف کیجئے اگر میں یہاں پر ایک قصہ بیان کروں جو ہمارے حالات کے بالکل مناسب ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے مجھے اپنے بنیا احباب سے خاص طور پر معذرت بھی چاہنی ہے۔ کیوں کہ خواہ اس قصہ کا مصنف کوئی بھی ہو وہ اس زمانہ سے کہیں پیشتر رہا ہے جب کہ آج ہندستان کے سب سے بہادر لیڈر ایک بنیا اور ان کے خاص رفقا ہیں۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار چار مسافر ایک سڑک پر ملے اور یہ طے کیا کہ ایک ساتھ مل کر سفر کریں گے۔ تا کہ ایک دوسرے کی حفاظت کرسکیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے حملہ آور بھی چار ہیں۔ تو ان میں سے ایک نے جو راجپوت تھا اپنے ایک پٹھان ساتھی کے کان میں کہا کہ ''میں سب سے مضبوط لٹیرے سے نبٹ لوں گا۔'' اس پر پٹھان نے راجپوت کو اطمینان دلایا کہ ''میں دوسرے ڈاکو سے جو اس سے دوسرے نمبر کا ہے لڑوں گا'' اس ہمت افزائی نے تیسرے ساتھی سے جو ادھیڑ سا برہمن تھا یہ کہلوایا کہ ''پھر تیسرے کو میں گرالوں گا۔'' اب چوتھے شخص کی باری آئی جو بنیا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا۔ تو یہ نکلا کہ ''چوتھا مجھے مار لے گا۔'' یہ سن کر برہمن کو اندیشہ ہوا کہ اس حالت میں اسے ایک نہیں بلکہ دو سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ہمت ہاردی۔ اس طرح پٹھان نے بھی ہمت ہاردی کہ اسے تین حملہ آوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔

آخر کار راجپوت بھی مایوس ہو گیا۔ کیوں کہ ظاہر ہے وہ ان چاروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اور یہ انجام صرف اس وجہ سے ہوا کہ چار میں سے ایک مسافر کو اتنا ہی یقین تھا کہ چوتھا رہزن اسے فنا کردے گا جتنا کہ اس کے تین ہمراہیوں کو علیحدہ علیحدہ ہر ڈاکو کو گرالینے کا یقین تھا۔ میرے دوستو! کیا میں آپ سے اب یہ نہیں پوچھ سکتا کہ آیا جنگ میں شریک ہونے سے پہلے شکست کے یقین کو دور کرنے کا ہنوز وقت آیا یا

نہیں؟ جب کہ ہمارا بہادر رہنما بھی ایک بنیاد ہے کیوں نہیں؟ ابھی حال ہی میں دلی کے ایک اخبار نے اپنے خفیہ مخبر کے قابل ذکر انکشاف کو شائع کیا ہے کہ وہ سن رسیدہ اور ایک نوعمر عربوں کا ایک وفد (جو فلسطین سے حکومت ہند کی اجازت سے محض اس غرض سے آیا ہے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی عمارتوں کی مرمت کے لیے جو بیت المقدس میں ہیں، چندہ جمع کرے) عربوں کی ایک حملہ آور فوج کا ہراول ہے جو اپنے ملک کو ان آوارہ گرد یہودیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے جو منتشر ہونے کے بعد پھر ہیول واپس آ رہے ہیں۔ اس خوف و بدظنی اور گھبراہٹ سے آزادی نہیں حاصل ہو سکتی ہے۔ دوستو! اس طرح جو ہمارے پاس ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔

اس وقت مسلمانوں پر دوہرے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ہندستانی ہونے کی حیثیت سے ان کی ذات پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنی نسلوں کے لیے آزادی حاصل کریں۔ ہندستان مسلمانوں کا بھی ویسا ہی ہے۔ جیسے ہندوؤں کا۔ اگر ہندو ان قربانیوں سے جان چرائیں جو آزادی کی جنگ کے لیے لازمی ہیں تب بھی ان کا یہ فرض ہوگا کہ ثابت قدم رہیں اور کہیں کہ باقی ہندستان کی مدد کے بغیر بھی وہ تمام ہندستان کے لیے سوراج حاصل کریں گے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو اس سوراج کو قائم رکھنا چاہئے۔ جب میں نے پیرس، سوئٹزرلینڈ اور روم میں ترکوں سے ملاقات کی تو وہ تعجب سے کہتے تھے کہ وہ ملک جس نے اتنی کثیر التعداد فوج ان کے خلاف لڑنے کو بھیجی تھی وہی ملک یہ وفد بھیجتا ہے۔ تاکہ ہماری شکست کے بعد ہمارے لیے اچھے شرائط کی وکالت کرے۔ میں نے ان کا عقدہ اس بوالعجبی کو واضح کرنے کے بعد حل کر دیا کہ بہت سے مسلمان سپاہی جو کہ نہ تو ترکی تلوار سے ڈرتے تھے نہ جرمن توپ سے خائف تھے اور موت کے گھر میں جن کو خندقیں کہتے ہیں مہینے گزار سکتے تھے وہ پولیس، حوالاتوں اور قید خانوں کی کوٹھریوں سے خائف تھے۔

میرے ترکی دوستوں نے کہا کہ اگر یہ واقعہ ہے تو مجھ کو چاہئے سب سے پہلے جہاز پر ہندستان واپس جاؤں اور ان کی غلامی دور کرنے کے بجائے مجھ کو چاہئے کہ اپنے ہم وطنوں کی غلامی کی زنجیروں کو توڑوں۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ سرزمین ترکی اور آبناؤں پر ہم انگریزوں کو شکست دے دیں گے۔ لیکن تمہارے ہندستان کے ہجوم کو کسی طرح نہیں روک سکیں گے جنھوں نے فلسطین اور عراق عرب میں ہم کو پیس ڈالا۔ جب تم آزاد ہو جاؤ گے تو خلیفہ کے خلاف کوئی مسلمان سپاہی جنگ کی غرض سے نہ آسکے گا اور اس طریقہ سے ترکی اور اسلام دونوں محفوظ رہ سکیں گے۔ یہ تمہارا ذاتی فرض ہے اور نیز ہماری خاطر تمہاری طرف یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ تم پہلے اپنے ملک کی آزادی حاصل کرو۔ انھوں نے یہ بھی کہا۔ کہ ''تم اپنے ہندو اور سکھ اہل وطن کو یہ نہ خیال کرنے دو کہ ان پر صرف انھیں کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ہماری طرف سے کوئی فرض نہیں عائد ہوتا یہ ان کی غلامی برقرار رکھنے کی خاطر ہے کہ انگریزوں نے ہم کو اتنی وزنی زنجیروں سے جکڑ بند کرلیا ہے۔''
دوستو! مجھ کو یہ سن کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ میرے ہندو رفقائے کار مشرقی ممالک سے تعلقات قائم کرنے کا خیال کر رہے ہیں۔ ان کے سیاسی خیالات ہمالیہ کی دیواروں کے پرے پہنچ چکے ہیں۔ اور اردگرد کے سمندروں کو طے کر چکے ہیں میرے اہل وطن نے یہ بھی تسلیم کرلیا ہے کہ ایشیائی اقوام کی آزادی خود ان کی آزادی کی معاون ہے اور اس لیے ''اتحاد مشرق'' کے باضابطہ نظام کا خیال کر رہے ہیں۔

دوستو! مسئلہ ہندو مسلم اتحاد پر مجھ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اگر اس طویل بحث کے بعد بھی کسی ہندو یا مسلمان کو باہمی تعاون اور غیر ملکوں کے ساتھ عدم تعاون کو تسلیم کرنے میں تامل ہو تو میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا اور اپنی شکست کا اقرار کرتا ہوں۔ یہ بات مسلم اور یقینی ہے کہ نہ تو ہندو ہی مسلمانوں کو معدوم کر سکتے ہیں اور

نہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نجات مل سکتی ہے۔ اگر ہندو اس قسم کی تدبیر سوچتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس موقع کو اسی وقت کھو دیا تھا جب کہ محمد بن قاسم نے بارہ سو سال قبل سرزمین سندھ پر اپنا قدم رکھا۔

اس وقت تو مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور اب تو ان کی تعداد سات کروڑ سے بھی زیادہ ہے اور اگر مسلمانوں کو اس قسم کا کوئی خیال ہے تو انھوں نے بھی اپنا موقع ہاتھ سے کھو دیا جب کہ وہ کشمیر سے داس کماری اور کراچی سے چٹا گانگ تک حکمراں تھے۔ اس وقت اگر وہ چاہتے تو ہندوؤں کی نسل فنا کر سکتے تھے۔ فارسی کی کیا خوب مثل ہے۔

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آئد بر کلہ خویش بزن

جب کوئی چارہ کار نہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے چھٹکارا پا سکیں تو اس کی ایسی صورت نکالنی چاہئے کہ ایک دوسرے کی معاونت تسلیم کر لی جائے اور مسلمان ہندوؤں کے دماغ سے سوراج اور بیرونی حملہ کی مدافعت کے متعلق تمام شکوک رفع کر دیں اور ہندو مسلمانوں کے دماغ سے وہ تمام شکوک رفع کر دیں جو وجود میں آ چکے ہیں۔

یہ ایک بڑی تعجب انگیز بات ہوگی کہ جب ہندو تو ''اتحاد مشرق'' کا نظام قائم کرنے کی فکر میں ہوں اور ہندستانی مسلمان ان سے معاونت ترک کریں۔ صرف اس بنا پر کہ ایک اخبار کے نامہ نگار نے مسلمانان سہارن پور کی مظلومیت میں سمرنا کے ہول ناک واقعات کی حقیقت کو پنہاں دیکھا۔ اس سے زیادہ احمقانہ حرکت اور کیا ہو سکتی ہے اور اگر ترکوں کو ہمارے اس مقابلہ کا علم ہو تو وہ ہرگز ہمارے ممنون احسان نہیں ہوں گے۔

میں ان اصحاب سے جو واقعہ سہارن پور کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو ترک موالات سے موالات کی طرف پھر جانے کی معقول وجہ قرار دیتے ہیں۔ چاہے ہندوؤں کا ہی بہت کافی نقصان ہوا ہو، ایک سوال دریافت کروں گا اور وہ سوال یہ ہے کہ آیا اس وقت انگریزی حکومت موجود نہ تھی جب مسلمان ہر قسم کے شدید مظالم کے شکار ہو رہے

تھے۔کیا اس ضلع میں کسی ہندو یا ترک موالاتی مسلمان کے ماتحت انتظام حکومت تھا؟ اور سب سے آخر یہ کہ محکمۂ قضا کا کیا ایک مسلمان حاکم اعلیٰ نہ تھا جو کسی زمانہ میں اپنی قوم کا رہنما خیال کیا جاتا تھا اور اب اس نے اسی قوم سے علیٰحدگی اختیار کر لی ہے اور غیر ملکی حکومت کے ساتھ موالات اس کا شعار ہے۔

یہ تین علیٰحدہ علیٰحدہ سوالات نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سوال ہے۔یعنی اگر نہ تو خود گورنمنٹ اور نہ وہ مسلمان جو اس کے ساتھ موالات کر رہے ہیں۔مسلمانان سہارن پور کو مصیبت سے نجات دلا سکے تو آئندہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنی موجودہ غلامی کو ایک ایسی غلامی سے جس میں میرے ہم وطن حاکم ہوں بجائے اس کے ایک غیر میری قسمت کا مالک ہو بخوشی تبدیل کرنے کے لیے تیار ہوں کیوں کہ اس تبادلے سے میں کم از کم اپنے پچیس کروڑ ہم مذہبوں کو قید غلامی سے بچا سکتا ہوں جن کی غلامی یورپ کی لامتناہی شہنشاہیت کی زندگی کی مرادف ہے۔1916ء کو لکھنؤ میں جب ایک ہندو نے میرے بزرگ بال گنگادھر تلک مہاراج سے اس امر کی شکایت کی کہ وہ مسلمانوں کو ضرورت سے زیادہ حقوق دے رہے ہیں تو انھوں نے ایک راست باز اور دور بین ماہر سیاست کی طرح جواب دیا ”آپ لوگ مسلمانوں کو ضرورت سے کبھی زیادہ نہیں دے سکتے۔“ آج جب کہ میں شکایت سنتا ہوں کہ ہم ہندو مسلم اتحاد کا راگ گانے میں اپنی کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں، حالانکہ ہندو اتحاد پیدا کرنے کی بالکل کوئی خواہش ظاہر نہیں کرتے تو میں یہ کہتا ہوں۔”آپ ہندوؤں کے ساتھ اپنے معاملات میں بہت زیادہ کمزوری نہیں دکھا سکتے۔“یاد رکھو کہ صرف بزدل ہی دوسروں کے سامنے حد سے زیادہ کمزوری ظاہر کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔اسی قدر غور و خوض کے بعد بلا کسی صحیح اور مستقل نتیجہ پر پہنچتے ہوئے جس کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں اس مسئلہ کو ختم کیے دیتا ہوں۔

تعمیری پروگرام

اس پروگرام ہی کی خاطر میں نے اس مصالحت میں حصہ لیا جس کی تکمیل دہلی میں ہوئی تھی۔ کیوں کہ صوبوں کے بڑے حصے نے سارا سال آپس کے تو تو میں میں کی نذر کردیا اور اگر مہاتما گاندھی کی رہائی مترجم خسروانہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ہماری کوششوں کے ذریعہ سے ہونی چاہئے۔ تو لازم ہے کہ وہ کام پھر شروع کیا جائے جس پر مہاتما جی کو بجا طور پر بھروسہ اور اعتقاد ہے۔ میں صحیح اندازہ نہیں کرسکا تھا کہ مہاتما جی کے چلے جانے سے کس حد تک ابتری و بدنظمی واقع ہوئی۔ لیکن اب تک جو کچھ کام ہوا ہے اس کی تفصیل کے متعلق میرے سوالات کے جوابات وصول ہوئے ہیں وہ اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ کسی نہ کسی وجہ سے اب تک کچھ کام نہیں ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے صوبے بھی ہیں۔ مثلاً گجرات! جہاں کا کام میرے دوست ولبھ بھائی پٹیل کی ماتحتی میں رکھا گیا تھا، قابل تعریف ہے۔ بہت کم صوبے ہیں جو تعلیمی کام کا ایسا اچھا نمونہ پیش کریں اور اگر گجرات نہ ہوتا تو دوسرے صوبوں میں جو کھادی تیار ہوئی تھی وہ بہت عرصہ تک ویسی ہی پڑی رہتی اور اس کے بکنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر مہاتما جی کا زمانہ فخریہ زمانہ تھا کہ انھوں نے گجرات کی شکل بدل دی۔ بلکہ انھوں نے کل ہندستان کی شکل بدل دی۔ کسی صوبہ کی حالت اب وہ نہیں ہے جو ان کے اس کام پر اٹھنے کے وقت تھی۔ گجرات ان لوگوں کو حیرت میں ڈالنے کی تیاری کررہا ہے جن کا خیال ہے کہ

اگر مہاتما جی کے بلند معیار کو پیش نظر رکھا جائے تو ملک کا کوئی حصہ سول نافرمانی کے لیے تیار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ نہ پکڑا اور کسی نے گجرات کی تقلید نہ کی۔ اس لیے ہمیں گجرات کی تیاری ہی کو کافی نہ سمجھنا چاہیے۔ کل بیڑے کی رفتار وہی ہوگی جو اس کی سب سے سست کشتی کی رفتار ہوگی۔ افسوس کہ ہمارے بیڑے میں سست رفتار کشتیاں بہت ہیں۔ اگر چہ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک سب کے سب سمندر میں چلنے کے لائق ہیں۔ میں اپنے ان دوستوں کے سامنے جو پروگرام کی تبدیلی نہیں چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ معقول دلائل پیش نہیں کرسکتا جو اجلاس دہلی کے بعد ''ینگ انڈیا'' کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ دلائل وحجت کی بھی ایک حد ہے۔ جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتی۔ جہاں دلائل ترغیب نہیں دے سکتے۔ وہاں تجربہ سے کام لیا جاتا ہے۔ ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم اس منزل پر آگئے ہیں ایک سال کی مسلسل کوششوں اور بے کاری نے لوگوں کو کٹ حجتی اور خود پسندی میں اور پختہ کردیا۔ آج سب کے لیے امتحان کا وقت ہے۔ سوراجیوں کے لیے بھی، مرکزیت کے دلداروں کے لیے بھی، محمد علی کے لیے بھی اور ہم تبدیلی نہ چاہنے والوں کے لیے بھی۔ ہم کو واقعات کے زبردست نظام کے تابع ہونا پڑے گا۔ کلکتہ کانگریس کے زمانہ سے مہاتما جی کو ہر جگہ پوری کامیابی ہوئی اور ہم جو مہاتما جی کے متبع کہلاتے ہیں ہمیشہ اس خطرہ میں رہے کہیں نامناسب غور وفکر اور بے معنی کوششوں میں نہ پھنس جائیں۔ شکست کا ہونا ہر شخص کے لیے مناسب ہے۔'' اگر اس مقولہ میں کچھ صداقت ہے تو شکست کی تکلیف ہی ہم کو اپنی حالت پر غور کرنے اور دوبارہ قوت حاصل کرنے پر آمادہ کرے گی۔

اگر برخلاف اس کے مہاتما جی کی تعلیم ہماری کاہلی کا ذریعہ اور بہ عجلت پیدا ہونے والے واقعات کے نتائج پر غور نہ کرنے کا سبب بن جائے تو ہم اپنے سردار کے صحیح پیرو

کہلائے جانے کے مستحق نہیں۔ ہم اس قابل نہیں کہ ان کے اس پیغام کو جو انھوں نے تمام دنیا کو دیا ہے اس کے امانت دار قرار پائیں۔ بے شک ''واقعیت'' ہی سچی اور یقینی کسوٹی ہے۔ سوراج پارٹی والے، مخالفین کونسل آپ میں اور ہم سب کو اسی واقعیت کی کسوٹی پر جانچا جائے گا۔ دوستو! یہی باعث ہے کہ میں آپ کو کام کرنے کی تبلیغ کرر ہا ہوں۔ لیکن اس وعظ پر عمل کرنا اس قدر آسان نہیں جس قدر اس کی زبانی تبلیغ ہے اور یہی سبب ہے کہ ہمارے یہاں نکتہ چینوں کی تعداد کام کرنے والوں سے زیادہ ہے۔ لیکن کسی کام کا خوبی سے انجام پانا ایسی ولولہ انگیز مسرت ہے جس کا مقابلہ نکتہ چینی کے بے مزہ لطف سے ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ سنسکرت شاعر نے شاعری کی تخلیقی حیثیت کے متعلق لکھا ہے کہ بانجھ عورت کو کیا خبر کہ ولادت کی تکالیف و آرام کیا ہوتے ہیں اور نوزائیدہ بچہ کے دیکھنے اور چھونے سے جو نا قابل بیان مسرت ماں کو ہوتی ہے اس کا تو وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتی۔

بلاشبہ آپ یہ دریافت کریں گے کہ ہمارا کام کیا ہونا چاہئے؟ اور میرا جواب کل غور وخوض کے باوجود یہی ہوگا کہ ہم کو بار دولی پروگرام کے سوائے چارہ نہیں۔ جس کی کافی مذمت ہو چکی ہے۔ اگر ہم اپنے کام کے ہر ہر جز کو اپنے راستہ کی دشواریوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے چھوڑتے چلے جائیں تو ہم کبھی کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بہت سے آدمی آپ سے کہتے ہیں کہ ترک موالات ناکامیاب رہا حالانکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ باہم یا دونوں اس قدر نہ ابھرے کہ اپنے نصب العین تک پہنچ سکتے۔ لیکن باوجود اس کے جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ راستہ آسان ہے۔ اس وقت جب کہ تم اپنی وکالت دوبارہ شروع کرنے کا قصد کرو یا اپنا مقدمہ عدالت میں لے جاؤ، یا اپنے لڑکے کو کسی بہتر اسکول میں بھیجنے کا خیال کرو تو اتنا یاد کرلو کہ ادنیٰ سے ادنیٰ سپاہی کس قدر قربانی کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو کھدر بھی پہننا گوارا نہیں کر سکتے ان

کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ اگر چہ پھر بھی یہ نہیں ہے کہ وہ محب وطن نہ ہو لیکن صرف کاہل اور سست قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ کاہلی دفع کرنی پڑے گی۔

اور اسی کا سب سے بہتر اور کامیاب ذریعہ ہماری مستورات ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص مہاتما جی کے بلند پایہ تخیل سے کنارہ کشی اختیار کرے یا اس میں پورا نہ اترے لیکن ہماری مستورات بہر حال اپنے ملک، اپنے سردار اور اپنی ذات سے دغا نہ کریں گی۔

آدمی جیل خانوں میں جایا کریں یا وہاں سے واپس آیا کریں ہماری عورتوں کو ہر حالت میں کھادی کی تیاری میں مصروف رہنا چاہئے۔ اسی طرح دوسرے شعبوں کی تنظیم بھی ضروری ہے۔ لیکن کھادی کے بعد اہم ترین شعبہ قومی تعلیم کا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ 21ء میں میں نے بیز دادہ میں ایجوکیشنل بورڈ کے قیام پر کیوں زور نہ دیا! بہر کیف اب ایسے مرکزی اور صوبے دار بورڈ فوراً قائم ہو جانے چاہئیں اور ہمیں اپنے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا سنجیدگی کے ساتھ انتظام کرنا چاہئے۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ ہر شعبہ کا ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ذکر کروں۔ اس لیے کہ بارودلی کے پروگرام کو اگر چہ ہم کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے لیکن 1921ء کی تجاویز پر عمل درآمد ہو جانا ضروری ہے۔ چنانچہ ان سب باتوں پر عمل کرتے ہوئے ہمیں خاص خاص اوقات میں خاص شعبوں پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینا ہو گی۔

لیکن اگر ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہے تو ان تمام شعبوں کے متعلق گفتگو کرنا بے فائدہ ہے اور یہی ایک شعبہ ہے جس پر سال بھر تک ہمیں توجہ دینا پڑتی ہے۔ جب ملک جانتا ہے کہ بیز دادہ جیل کی کنجی صرف مہاتما کے پروگرام پر عمل کرنے ہی سے میسر آ سکتی ہے اور بغیر روپے کے کوئی کام نہیں چلتا۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ روپیہ کے معاملہ میں ہماری کوشش رائیگاں جائے۔ البتہ ایسے بڑے بڑے عطیات کے علاوہ

جن کے لیے صرف خاص موقعوں پر درخواست کی جاتی ہے۔ ہمیں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ اگر چہ وہ کسی قدر قلیل ہی کیوں نہ ہو ضرور تلاش کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں غرباء میں اتنی استطاعت پیدا کرنا ہے کہ وہ ماہواری چندوں کے ذریعے سے ہمارے قومی سرمایہ میں حصہ لے سکیں۔ بعض موقعوں پر ہمیں ان کی سہولت کے مطابق ان کی امداد سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اس لیے ہم کو مہاتما گاندھی کے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے جس قدر روپیہ کی ضرورت ہے اسی قدر ایک زبردست نظام کار کی بھی حاجت ہے جس کے ذریعہ سے روپیہ حاصل ہو، اور یہ تنظیم ایسی نہ ہونی چاہئے کہ بغیر تنخواہ دار ملازموں کے ذریعہ سے ہو۔ یہ قابل تعجب ہے کہ ہم نے اب تک اتنے وسیع رقبہ میں جو تقریباً ایک چھوٹا براعظم ہے اپنا قومی کام صرف اتنے تنخواہ دار ملازموں کے ذریعہ سے کیسے کرلیا جو باعتبار تعداد ایک ضلع کے دفتر کے لائق بھی نہیں۔ ہم کو اس وقت ایک عجیب صورت حال سے معاملہ پڑا ہے۔ ایک طرف تو ہم کو لائق، پرجوش اور قطعی قابل اعتماد کام کرنے والے لوگوں کی ضرورت ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ دوسری طرف ہمارے پاس بے کار لوگوں کی پوری فوج موجود ہے مثلاً بعض وکالت پیشہ لوگ جو ترک موالات کے پروگرام کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہیں اور یہ لوگ وہ نہیں ہیں جن کو کام میں نہ لگایا جاسکے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس دہری دشواری کا علاج کریں جو صاف ظاہر ہے اور جس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں۔ ہم خواہ صرف گزراوقات کے لائق ایسا معاوضہ دیں جو کھدر کے دور دورہ کے مطابق ہو۔ لیکن ان زبردست کام کرنے والوں کو جنھوں نے قوم کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں یہ گزرانہ دینا پڑے گا۔ یاد رکھئے کہ جس کام میں شیدائیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہی دوسری نسل میں جا کر دغابازوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور ہر حالت میں ہر شیدائی کو دنیا سے رخصت

ہونے سے قبل کھانے اور پہننے کو ملنا ضروری ہے۔ ہندستان آج یہ تماشہ دیکھ رہا ہے کہ ہمارے حریص زیادہ تنخواہوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی انھیں اس سے بہت زیادہ ملتا ہے جتنا کہ حریص سے حریص پرخور کو ہوس ہو سکتی ہے۔ ہندستانی سول سرونٹ جو اگرچہ شاذ ہی ہندستانی یا سول سرونٹ (خدمت گزار) کہلایا جا سکتا ہے اس قدر تنخواہ پاتا ہے کہ دنیا بھر میں کہیں کسی سرونٹ کو جس کی ایسی ہی حیثیت ہو اس قدر تنخواہ نہیں ملتی ہے۔

یہ خود ہی تو دوسرے محکموں کی تقلید کے لیے اپنی مثال قائم کرتا ہے اور ایک مفلس ترین ملک کا خون چوسے جاتا ہے اور ابھی ترقی پا کر پھر ترقی کے لیے واویلا کرتا ہے۔ اور باوجود اس کے خود ہی ان ہندستانیوں پر خیانت اور خورد برد کا الزام لگاتا ہے جو خدمات قومی میں مصروف ہیں۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ جس وقت اس کے کان میں بھنک پڑ جائے کہ کانگریس میں یہ طے ہوا ہے کہ قومی کام کرنے والوں کو کچھ معاوضہ خدمات دیا جائے گا۔ تو چاہے وہ رقم معاوضہ اتنی حقیر ہو جتنی ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور کو دی جاتی ہے پھر بھی اسے سنتے ہی وہ اور اس کے معاونین اخباروں میں ہندستان کے ان سچے خادموں کو بدنام کرنا شروع کر دیں گے۔ مگر میری رائے میں یہ کانگریس کے لیے ایک اشد ضروری کام ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ حضرات ایک ایسے قابل اور کارگزار محکمے کے ترتیب کا اہتمام کریں گے جو کانگریس کا کام لگاتار سال بھر کرتا رہے۔ ایک باقاعدہ قومی سکریٹریٹ اگر ممکن ہو تو ایسے مقامات میں جیسی دہلی ہے قائم کی جائے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے صوبوں میں دفاتر سکریٹریٹ اور اضلاع میں دفاتر اضلاع قائم کیے جائیں۔ سکریٹریٹ کے دفتر میں کام کو اتنے مختلف صیغوں میں باقاعدہ تقسیم کر دیا جائے جتنوں کی ضرورت ہو۔ جماعت عاملان (ورکنگ کمیٹی) کے ارکان وہ حضرات ہوں جو وسطی مقامات پر یا جہاں موقع کے لحاظ

سے ضرورت ہوا کثر جلسوں میں شریک ہوسکیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے انگلستان کی سالویشن آرمی جب اپنے کسی کام کرنے والے کو نئے مقام پر بھیجتی ہے تو ایک ہفتے کے لیے کھانے اور ٹھہرنے کا خرچ اسے پیشگی دے دیتی ہے۔ اور دوسرے ہفتے وہ اس قدر پیدا کر لیتے ہیں کہ اپنا صرف برداشت کرسکیں۔ اس کے بعد انھیں اتنا پیدا کرنا ہوتا ہے کہ صدر محکمے کو باقاعدہ چندہ بھیجتے رہیں۔ ہمارے جو کام کرنے والے کانگریس کے ممبر بنانے کے لیے دورہ کرتے رہیں ان کے لیے ہمیں اسی طریقے پر کام کرنا ہوگا۔ ایک مرتبہ جب کام چل نکلے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ملک پھر بیدار ہو جائے گا۔ اور 1924ء میں ہم 1921ء سے بھی بڑھ جائیں گے۔

یاد رکھو آج اور 1921ء میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ یہ سچ ہے کہ مہاتما گاندھی جی اس وقت آزاد تھے اور کام کی تنظیم و ترتیب خود کرتے تھے۔ آج گو ان کی یاد ہر چند ستاتی ہے۔ ان کی عدم موجودگی ہی اس کام کے کرنے کے لیے ہم میں دو چند ہمت وقوت پیدا کردے گی۔ اگر مسیحیت سے صلیب اور اسلام سے واقعہ کربلا خارج کردیا جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہم نے اپنی صلیب سے پورا کام نہیں لیا ہے۔ دوستو! اگر ہمیں اپنے سردار سے کچھ بھی محبت ہے تو آؤ آج اس کام کو جسے اب تک نہیں کیا، کرلیں اور اپنی قوم کی مدد سے ملک کو آزاد کرالیں۔ اس بڑے باسٹیل کو (یہ وہ مشہور قلعہ تھا جس میں انقلاب فرانس کے زمانہ میں جمہوری قیدی بند تھے) توڑ ڈالیں۔ جس میں مہاتما گاندھی اور ان کے ہزار ہا پیرو قید ہیں۔

ہمارے سامنے آج ہمارے سکھ بھائیوں کی نظیر موجود ہے جن کی دیوانہ پیش قدمی اور عدم تشدد پر مجھے رشک آتا ہے۔ مہاراجہ نابھ تخت سے معزول کردیے گئے ہیں۔ اور جن الفاظ میں اس غیر ملکی حکومت کا افسر اعلیٰ ان کی معزولی کا اعلان کرتا ہے وہ

نقاب پوش کلمات کفر سے کم نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اپنے اوصاف کی بنا پر معزول کیے گئے۔ میں خود بھی ایک ہندستانی ریاست کا رعایا ہوں اور دیگر ریاستوں کا بھی کافی تجربہ ہے۔ میرے پاس بھی میرے اکثر وہ دوست آیا کرتے تھے جو ہندستانی ریاستوں میں سیاسی اصلاحات کے لیے کوشاں تھے۔ لیکن میں انھیں یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ ہندستانی ریاستیں تو ہماری اپنی ہیں۔ اگر چہ آج وہی ریاستیں قوم پرستوں کے لیے ہندستان سے کہیں زیادہ مہلک ثابت ہوئی ہیں۔

میں کہا کرتا تھا کہ باقی ہندستان کو آزادی حاصل کر لینے دو۔ پھر دیسی ریاستوں میں بہت جلد ایک نمایاں اور متحیر کن تبدیلی دیکھو گے۔ اس اثنا میں ہم کو چاہئے کہ اپنے طرز عمل سے ان ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی طرف سے شبہ میں نہ ڈالیں۔ ان پر یہ ثابت کرنے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھائیں کہ ہم لوگ ان کی مشکلات سے غافل نہیں ہیں۔ غیر ملکی دفتر شاہی حکومت سے ان پر جو مصائب نازل ہو رہی ہیں ہم ان سے بے اعتنائی نہیں برتتے۔ مجھ کو اس کا علم نہیں کہ گورنمنٹ اس قسم کے مواقع ہم کو کب بہم پہنچائے گی لیکن چونکہ ہم کو اس وقت موقع مل رہا ہے۔ ہم کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے کیوں کہ اس طرح یہ مذہبی حقوق کی حفاظت ہوگی۔ مہاراجہ صاحب نابھ کو تھوڑی تکلیف اس لیے برداشت کرنا پڑی کیوں کہ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ ان کی بدیسی دفتر شاہی سے آزادی کی جدوجہد اور اپنے مقدس گوردواروں میں اصلاحات کی کوشش میں نہایت بلند آہنگی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس بناء پر راجہ صاحب کے ہم مذہب مصیبت کا شکار بنائے جارہے ہیں کہ انھوں نے دیسی ریاست کے حکمراں کی حمایت میں کھڑے ہونے کی کیسے جرأت کی۔ کیوں کہ دیسی ریاستوں کو دفتر شاہی حکومت ہمیشہ اپنے ہی ماتحت رکھنا چاہتی ہے۔ جیسا کہ میں پیشتر کہہ

چکا ہوں کہ گورنمنٹ کا شریان گوردوارہ پربندھک کمیٹی اور اکال دلوں کو غیر قانونی جماعتیں قرار دینا نہ صرف ان جماعتوں یا سکھ قوم پر ناجائز حملہ ہے بلکہ یہ تمام قومیت ہند کے خلاف چیلنج ہے۔ ہر فرقہ کے ساتھ جو اپنے کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح کا برتاؤ روا رکھا جائے گا۔ ہمارا یہ عزم مصمم ہے کہ ہم اپنے سکھ بھائیوں کے معین و مددگار بنیں تا کہ ہم پر صرف ہمدردی کا الزام عائد نہ ہو۔

ہمیں غیر محدود ایثار وتحمل اور مصائب برداشت کرنے کے لیے پوری طرح کمر بستہ رہنا چاہیے اور چونکہ تعمیری کام اتنا ابھی نہیں ہوسکا ہے جتنا 1921ء میں ہوا تھا اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ قوم کس حد تک برداشت کے لیے تیار ہے۔ لیکن اگر ہم تعمیری کام آج پوری قوت کے ساتھ شروع کر دیں تو سول نافرمانی ہی خواب سے حقیقت بن جائے گی اور اس کے لیے جو کمیٹی دہلی میں مقرر ہوئی ہے وہ بلا تامل سرگرم کار ہوسکتی ہے۔ لیکن ایثار وقربانی سے گریز ہرگز نہ ہونا چاہیے اور اس گزارش کی ضرورت میں ان حضرات کی خدمت میں خاص طور پر سمجھتا ہوں جو حقوق طبعی کی پاداش میں قید جھیل چکے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ جیل ہوآنے کے بعد وہ اس کام میں ہاتھ ڈالتے اس بنا پر جھجکتے ہیں کہ شاید ہمیں جیل جانا پڑے، تو میں عرض کروں گا کہ وہ ہرگز اس خدمت کے اہل نہیں ان کے لیے جیل کی پہلی سزا یقیناً بے کار ثابت ہوئی، انہیں قومی کام میں نہ ڈالنا چاہیے تھا، اور اگر ہاتھ ڈال ہی چکے تھے تو سزا پاتے ہی انھیں فوراً بدیسی فدایان حکومت سے معافی مانگنی چاہیے تھی۔ میں نے بیجاپور جیل میں کہا تھا۔ ؎

بے گناہی سے بھی بڑھ کر ہے اگر کوئی گناہ ☆ تو سزائے جرم پا کر خجلت تقصیر ہے

میں نے آئندہ کے لیے ایک بڑا مفصل عملی نقشہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگر آپ اسے اپنے مذاق کے لحاظ سے پھیکا یا بے مزہ پائیں تو مجبوری ہے۔ آزادی کا راستہ پھولوں کے فرش سے پٹا ہوا نہیں ہے۔ جلد اور فوری منزل رسی کی صرف ایک ہی

تدبیر ہے اور وہ یہ کہ موت گوارا کرلیں اور شکست گوارا نہ ہو۔ کسی مقصد عالی کے لیے موت ہی ایسی چیز ہے جو پھیکے سے پھیکے کھانے کو بھی چٹپٹا اور ذائقہ دار بنا دیتی ہے۔ اور میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر ہماری ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ کانگریس) کے ارکان اس کی محض رسمی قرارداد نہیں بلکہ واقعتہً دل سے اس کا تہیہ کرلیں کہ موت کے لیے تیاری شروع کردیں گے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ سوراج ایک سال کے اندر ملا چاہتا ہے اور اگر کہیں آل انڈیا کانگریس اس کا عہدہ واثق کرلے تو میں کہتا ہوں کہ سوراج ایک سال نہیں ایک مہینہ کے اندر مل جانے کی چیز ہے۔ اور اگر اے عزیز دوستو اور بھائیو! کہیں ہم تم سب مل کر ملک کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائیں تو سوراج آج ملتا ہے آج۔ لیکن اگر ہم اس کے لیے آمادہ نہیں اور پھر بھی باردولی پروگرام کو ہلکا اور کمزور سمجھتے ہیں تو کوئی حق نہیں کہ عقیدہ کانگریس میں تغیر کا نام تک زبان سے نکالیں۔ دوستو! کام کرنے کا تہیہ کرلو اور اگر ملک کی آزادی کی راہ میں ضرورت پیش آجائے تو جان تک سے دریغ نہ کرو، پھر اگر سال بھر کی مخلصانہ جدوجہد کے بعد بھی گورنمنٹ ہمارے مقید سردار کو رہا نہ کرے کہ وہ آکر اس کی تلافی مافات کا منظر دیکھے اور مستقبل کے لیے سوراج کا چارٹر حاصل کرلے تو پھر بلا تامل وتردد ہمیں خدا کا نام لے کر ''جمہوریہ ہند'' یا آزاد اتحاد مذاہب'' کا علم بلند کردینا چاہئے۔ اس وقت آپ بھی اپنے سابق صدر نشین کو برطانیہ سے رشتہ وابستگی توڑنے میں کسی سے پیچھے نہ پائیں گے۔ 1921ء میں ہم نے گورنمنٹ کو بھی ایک سال کی مہلت دی تھی اور اپنے کو بھی لیکن معاہدہ کی شرائط اپنی طرف سے پورا کرنے میں ہم نے کوتاہی برتی۔ اس لیے ناتمام کام کی قیمت میں سوراج کا مطالبہ نہ کرسکے۔ آؤ! ایک بار پھر ناگ پور کی طرف قدم اٹھائیں، اپنے خالق پر اعتماد کریں اور اس کے حضور میں گڑگڑائیں کہ ہمیں ہمت ودانش، ثبات واستقامت کی توفیق عطا کرے اور اس کام کو پھر از سر نو شروع کریں۔

جس کا نقشہ ہمارا سردار اعظم ہمارے لیے کھینچ گیا ہے۔ اگر ہم اس کے اتباع کی کچھ بھی اہلیت رکھتے ہیں تو ہم اپنی گم شدہ آزادی حاصل کر کے رہیں گے اور اس وقت بہ طور شکرانہ فتح کے وہ قدیم و محبوب نعرہ پھر لگائیں گے۔

اللہ اکبر!

مہاتما گاندھی کی جے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

دہلی ———— 15/دسمبر 1923ء

نمائندگانِ قوم، خواتین اور حضرات!

قومی جدوجہد کے ایسے نازک اور فیصلہ کن وقت میں جیسا کہ آج درپیش ہے آپ حالات کے تقاضے سے مجبور ہوئے کہ سال کے اختتام سے پہلے اس ایوان قومی میں جمع ہوں اور وقت کی مشکلات کے لیے حل اور رہنمائی حاصل کریں۔ اگر میں کہوں یہ وقت کام اور مقصد کی مشکلات کا ایسا اجتماع ہے۔ جس کی اس ایوان کی تاریخ میں کوئی بھی نظیر موجود نہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں یہ ایسی بات ہوگی جو آپ میں سے ہر شخص محسوس کر رہا ہے۔ تین سال ہوئے جب آپ ایک ایسے ہی خاص اجلاس میں بمقام کلکتہ جمع ہوئے تھے تو وہ بھی آپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان دن تھا۔ لیکن اس دن کی عظمت قوموں کے ان دنوں کی مانند تھی جن میں آزادی کی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اور آج کے دن کی اہمیت میں تاریخ کے ان ایام کی جھلک پائی جاتی ہے جن میں قوموں کو جنگ کی فیصلہ کن دشواریوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اس دن آپ جنگ کے آغاز سے فکرمند تھے۔ آج اس کے انجام کے لیے مضطرب ہیں۔ اس وقت آپ کو سفر کی جستجو تھی آج گمرہی کا خطرہ درپیش آگیا ہے۔ اس وقت آپ ساحل پر کشتی کے لیے مضطرب تھے۔ لیکن آج زندۂ جاوید حافظؔ کے لفظوں میں ''کشتی ایک کنارہ سے چل چکی ہے مگر دوسرا کنارہ ابھی دور ہے اور موجیں گھیرا ڈال رہی ہیں۔'' حضرات! جب

میں دیکھتا ہوں کہ ایسے نازک موقع کی صدارت کے لیے آپ کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی تو مجھے آپ کی جانب سے عزت واعتماد کا ایک ایسا عظیم پیام ملتا ہے جس کو میں اپنے استحقاق کا نہیں بلکہ صرف آپ کے فیاضانہ حسن ظن ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی ناچیز خدمات کے ذریعہ آپ کا ایسا اعتماد حاصل کر سکا ہوں تو مجھے یقین کرنا چاہئے کہ یہ میرے وطن وقوم کی جانب سے قبولیت کی ایک بہت ہی بڑی سند ہے۔ میں اس عزت کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ مگر اس ذمہ داری کے لیے جو آپ کے اعتماد کی مقدس امانت ہے، آپ ہی سے ہمرہی واعانت کی التجا کرتا ہوں۔ بلاشبہ آج ہمیں ایک نہایت مشکل وقت، نہایت مشکل کام درپیش ہے۔ لیکن ہمارا یقین متزلزل نہیں ہے۔ گو ہمیں اپنی تدبیروں کی طرف سے شبہات رہے ہوں لیکن ہمیں اپنے مقصد کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ کوششیں حق اور انصاف کے لیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ خدا کی زمین میں اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ کام ہے اور اس کی مرضی یہی ہے کہ ایسا ہو۔ پس یہ تو ضرور ہے کہ ہمیں اپنی درماندگیوں اور کمزوریوں کا اقرار ہو۔ ہم وقت کی آزمائشوں اور راستے کے کھٹکوں کی طرف سے فکر مند ہوں۔ ہمیں مشکلوں اور رکاوٹوں کی سختیوں سے پورا پورا اندیشہ رہے۔ لیکن ہمیں نتیجہ کی طرف سے کبھی ہراساں نہ ہونا چاہئے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ خدا کی جس رحمت نے ابتدا کی بے سروسامانیوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا وہ درمیان کی اس آزمائش میں بھی ہماری دست گیری کرے گی اور بالآخر انجام کی فتح مندی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔

حضرات! میں آج اپنے بحث ونظر کے محدود دائرے سے بے خبر نہیں ہوں۔ خیالات کا ہجوم اور مطالب کی وسعت کتنی ہی میرے لیے ضبط آزما ہو لیکن میں ان حدود کی طرف بڑھنے سے اپنی نگہبانی کروں گا جو آپ کے سالانہ اجلاس کے صدر کے

لیے محفوظ رہنا چاہئیں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ آپ اس کی صدارت کے لیے ایک نہایت بہتر انتخاب کر چکے ہیں۔ میں اس سے آگاہ ہوں کہ یہ ایک انقلابی دور ہے اور من جملہ انقلابات کے ایک انقلاب اس خیال میں بھی ہو چکا ہے جو کبھی اس ایوان کی ادبی روایات میں بمنزلہ رسم وقاعدہ کے تھا۔ اب آپ صدر مجلس سے متمنی نہیں ہیں کہ وہ آپ کے سیاسی لٹریچر میں کوئی ضخیم اضافہ کرے یا اپنی تھکا دینے والی فصاحت سے آپ کے حوصلہ وسماع کا امتحان لے۔ برخلاف اس کے آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد آپ سے کہہ دے کہ کام شروع کیجئے۔ آپ کے جذبات کا یہ تغیر فی الحقیقت اس بنیادی انقلاب کا نتیجہ ہے کہ ہندستان کی قومیت بحث ونظر کا ابتدائی دور طے کر کے عمل کی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے اور اس لیے قدرتی بات ہے کہ آپ کے ذوقِ عمل پر بحث ونظر کی طوالت گراں گزرتی ہے اور اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی بلکہ عمل کی سادگی ہے۔

پس اگر آج میں اس اجلاس کے اصلی مقصد کے سوا اور تمام ضمنی اور نواحی افکار سے چشم پوشی کرلوں اور جو کچھ عرض کروں اس میں سادگی اور اختصار ملحوظ رکھوں۔ تو میں امید کرتا ہوں یہ ایسی بات ہوگی جس میں اپنی خواہش سے زیادہ آپ کی خواہش کی تعمیل کروں گا۔

لیکن اگر میں وقت کے حالات ومسائل پر نظر بھی ڈالتا جب بھی میرے لیے گویائی پر خاموشی ہی کو ترجیح تھی۔ ہمارے لیے اب وقت کی کونسی بات ہے جو نئی ہو سکتی ہے؟ اور جس کا ہم اس لیے ذکر کر سکتے ہیں کہ اس سے ہماری معلومات یا محسوسات کے لیے کوئی نئی صورت حال میں پیدا ہوگئی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب ہندستان کی قومیت کا احساس صرف اس حد تک پہنچا تھا کہ دفتری اقتدار کی ناانصافیوں پر نکتہ چینی کرے۔ پھر نکتہ چینی شکایت میں مبدل ہوئی اور شکایت نے احتجاج اور سوال کی

صورت اختیار کرلی۔ایک مدت تک ہمارا طرز عمل یہ رہا کہ ہرنئ ناانصافی پر ایک نئی چیخ ہمارے منہ سے نکل جاتی تھی۔لیکن اب معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ کام اور فیصلہ کے سوا کسی بات کی بھی گنجائش رہی ہو۔ہم ناانصافی دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہوگئے ہیں۔گویا یہ ہماری روزانہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ ہے۔اب ناانصافیوں کا ذکر نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ اپنے علم ویقین میں شک کرنا ہے۔ہمارے سامنے حقیقت اپنے آخری درجہ یقین تک آچکی ہے اس میں نہ تو مزید اضافہ ہوسکتا ہے نہ کسی نئے پردے کے ہٹنے کا انتظار باقی ہے۔ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے وہ برابر ہوتا رہے گا۔جب تک ہم اسے خود بدل نہ دیں گے۔ہمارا سابقہ افراد اور اوقات سے نہیں ہے جن کی تبدیلی حالات پر مؤثر ہو۔ہمارا سابقہ ایک نظام سے ہے جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی خلقت ہی میں نامنصفانہ ہے۔اور اگر اس وقت تک قائم رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے اندر اس کی ذاتی مضبوطی موجود ہے بلکہ صرف اس لیے کہ ہماری غفلت نے اس کے لیے ستون بہم پہنچادیے ہیں۔ پس جب کہ ناانصافی اس کا عمل نہیں ہے بلکہ خاصہ ہے تو ہمیں نہ متعجب ہونا چاہئے اور نہ شاکی بلکہ صرف یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ قائم نہ رہے۔

البتہ میں حقیقت کہنہ کے ان تازہ اعترافات کا پوری کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم بجالاتا ہوں جو ہمارے ان بھائیوں کی زبانوں پر بھی جاری ہوگئے ہیں جنھیں ہمارے طریق عمل سے مایوسی کی شکایت تھی۔ بلاشبہ نام نہاد اصلاحی کونسلوں کے سہ سالہ تجارب، محصول نمک، پبلک سروس کمیشن اور مختلف محکموں کے ہندستانی بنانے کے معاملات میں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوتی ہے۔کنیا کے فیصلہ میں بھی ہم کوئی نئی ناانصافی نہیں پاتے بلکہ یہ ایک قدیم اور متوقع ناانصافی کا صرف تازہ اعادہ ہے۔اس میں نسلی اور قومی تعصب کا جذبہ ہے اور وہ اب سے پہلے کب نہ تھا؟ اس

میں برطانوی مواعید کی شکست ہے اور گذشتہ پانچ سال کے واقعات کے بعد کم از کم برطانیہ کے "وعدوں" کی شکست میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی ہے۔ اس میں ہندستان کی عزت سے انکار ہے۔ لیکن ہماری معلومات میں کوئی نظیر اس کے عزت واحترام کے اقرار کی بھی موجود نہیں۔ تاہم ان حضرات کے لیے ان معاملات میں ایسے انکشافات ہوئے ہیں جن کی تجربہ کی تکمیل اور حقیقت کے اعتقاد کے لیے ضرورت تھی۔ اب ان میں سے اکثر معترف ہیں کہ "نام نہاد اصلاحات محض دھوکے کی ٹٹی ہیں اور ہندستان کی خودداری کی حفاظت موجودہ حالات میں ناممکن ہے نیز برطانیہ کے ٹوٹے ہوئے وعدوں پر اب کوئی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔" وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بائیکاٹ کے سوا چارۂ کار نہیں ہے۔ اور یہ کہ امپریل نمائش کا ہندستان کو پوری قوت کے ساتھ بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ حضرات! ہم اس موقع پر ہرگز اس بات کی شکایت نہیں کریں گے کہ انھوں نے حقیقت کے اعتراف میں دیر کی۔ ہم یہ بھلادیں گے کہ حقیقت اس تین سال سے پہلے بھی اتنی ہی بے نقاب تھی جس قدر فیصلہ کینیا کے بعد آج نظر آرہی ہے۔ کیوں کہ حقیقت کا اعتراف جلد کیا جائے یا بدیر لیکن بہر حال اعتراف ہے اور اس تحسین کا مستحق ہے جو اعتراف حقیقت کے لیے ہونا چاہئے۔ ہم ان سے صرف یہ کہیں گے کہ آپ کے وطن کو اب بھی آپ کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح تین سال پہلے تھی۔ اگر واقعی ہم سب کا اعتقاد ہے کہ ہندستان کی عزت کی حفاظت کا وقت آگیا تو کیوں نہ ہم اپنے اختلافات کے باوجود بھی اس ایک مقصد میں متحد ہو جائیں کہ ہندستان کی عزت بچائی جائے۔

حضرات! مجھے یقین ہے کہ آج آپ سب سے پہلے جس بات کے متوقع ہوں گے وہ یہ ہے کہ میں آپ کے ایک پر جوش جذبہ تہنیت کی ترجمانی کی عزت حاصل کروں۔ جو آپ کی قومی جدوجہد کی تاریخ سے ایک عجیب مگر پر فخر وابستگی رکھتا ہے اور جس میں

آپ کی تاریخ کی ایک شاندار داستان عمل پنہاں ہے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ مشرق سے دو دور دراز ملکوں کو انصاف اور آزادی کے نام پر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دے کہ ایک کی مصیبت پر دوسرے کی زبان سے آہ نکلے اور ایک کی فتح مندی میں دوسرے کے لیے فتح و مراد ہو۔ یہ مشرق کے دو بعید گوشے جنہیں انصاف اور آزادی کی یگانگت نے اس قدر قریب کر دیا ہے کون ہیں؟ یہ ہندستان ہے جس نے عین اس وقت جب کہ اسے خود اپنی آزادی کا دشوار گزار مرحلہ درپیش تھا۔ خلافت اسلامی اور حکومت ترکی کی آزادی و خود مختاری کو بھی اپنی آزادی کی طرح اپنا قومی مطالبہ قرار دیا۔ اور یہ ترکی ہے اور اس کی جدید قومیت کا ظہور ہے جس کی انقلاب انگیز فتح مندیوں کا دنیا نے ایک زندہ جاوید معجزہ کی صورت میں مشاہدہ کیا ہے اور جس کی فتح مند حب الوطنی کی روح تمام سرزمین مشرق کے لیے زندگی اور عمل کا ایک نیا پیغام لے کر نمودار ہوئی ہے۔

حضرات! ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے جب آپ نے اسی ایوان میں انگورہ کے محبّ الوطنوں کو ان فتوحات پر مبارک باد دی تھی جو ترکی فوجوں نے میدان جنگ میں حاصل کی تھیں۔ فی الحقیقت یہ فتوحات ایک آنے والی فتح عظیم کا پیش خیمہ تھیں۔ یہ جنگ کی فتوحات تھیں لیکن ان میں میدان سیاست کی ذہنی اور معنوی فتوحات کا پیغام مضمر تھا۔ یہ اس بے نقص اور بے داغ فتح کی ابتدائی قسط تھی جس کی تکمیل میں دنیا ایک گری ہوئی عظمت کے سنبھالنے کی جگہ ایک نئی عظمت کی تعمیر دیکھنے والی تھی۔ یہ گویا دنیا کے نام اعلان تھا کہ قوموں کی صفیں ایک نئی فتح مند قوم کے استقبال میں چشم براہ ہو جائیں۔ یہ فتح و ظفر کا ایک بے روک کوچ تھا۔ جس کی راہ میں اگرچہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی طاقتیں اپنے بے پناہ منصوبوں اور اٹل رکاوٹوں کے ساتھ حائل تھیں۔ لیکن وہ اپنے جذبۂ حب الوطنی کے اچمبوں اور ہوش ربائیوں سے تاریخ کے لیے ایک

پیام اعجاز لیے ہوئے بے خوف بڑھتا رہا۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جب کوچ نے منزل پے دم لیا اور تاریخ نے بڑھ کر اپنے دروازے کھول دیے تا کہ ایک نئی فتح مند قوم کا خیر مقدم بجالائے۔ گذشتہ جولائی کی چوبیسویں تاریخ کو جب لوزان میں ترکی صلح نامہ پر دستخط ہوئے تو فی الحقیقت ایک نئی قومی عظمت کی پیدائش کا دن تھا۔ یہ ان تمام فتح مندیوں کی تکمیل تھی جن کی ایک قوم کو زندگی اور عزت کے لیے ضرورت ہوسکتی ہے۔ اس میں فوجی فتح مندی سے زیادہ سیاسی فتح تھی اور دونوں سے بڑھ کر وہ فکری اور معنوی فتح جن کے بغیر جنگ اور سیاست کی فتح مندیاں بھی ہیچ ہیں۔

حضرات! اس فتح عظیم پر ہندستان اپنی گرم جوش اور مخلصانہ مبارک باد پیش کرتے ہوئے جس قدر بھی نازاں ہو کم ہے۔ ہندستان اس واقعہ کی صورت سے زیادہ اس کے معانی کی وسعت کا راز شناس ہے۔ وہ ترکی کی فتح میں نہ صرف اپنے مطالب کی فتح بلکہ تمام سرزمین مشرق کی فتح کا نظارہ کر رہا ہے۔ میں سب سے پہلے حضرت خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں ہندستان کا یہ ہدیہ ارادت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ پھر انگورہ کی قومی مجلس کو اس کے نئے جمہوری دور کی فتح مندیوں پر مبارک باد دیتا ہوں اور بالآخر ہم سب کی نگاہیں بے اختیار موجودہ عہد کی اس عظیم ترین شخصیت کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ جس کا وجود فی الحقیقت ان تمام مبارک بادیوں کا مخاطب ہے۔ میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو ہندستان کی طرف سے مبارک باد دیتا ہوں۔

حضرات! میں نے ہندستان اور ترکی کا ذکر کیا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس مبارک باد کے اصلی مطالبہ سے ابھی عہدہ برآ نہیں ہوا ہوں۔ یہ فی الحقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ کسی سرزمین یا قوم کی نسبت سے محدود کی جائے۔ یہ کش مکش جو پانچ برس سے دنیا کی صلح عام کو ملتوی کر رہی تھی۔ محض قوموں اور حکومتوں کی جنگ نہ

تھی۔ عصمت پاشا ایسے فتح مند مدبر اور لارڈ کرزن کی دھمکیوں میں صرف ٹرکی اور برطانیہ یا مغرب ومشرق ہی کی نمائندگی نہ تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز مضمر تھی۔ یہ دراصل اصولوں کی جنگ تھی اور متقابل عقیدوں کا معرکہ تھا۔ ایک طرف طاقت کا گھمنڈ تھا دوسری طرف حق اور انصاف کی بے سروسامانی تھی۔ طاقت کا دعویٰ تھا کہ کمزور قوتوں کو زندگی کا کوئی حق نہیں۔ انصاف کا عاجزانہ اعلان تھا کہ زندگی کا حق ہر اس قوم کو ہے جو زندہ رہنے کا ارادہ کر لے۔ جیسا کہ قاعدہ ہے۔ عرصہ تک کش مکش جاری رہی بالآخر خدا کی مرضی نے فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ طاقت کے باوجود سروسامان شکست ہوئی اور انصاف نے اپنی ساری بے سروسامانیوں اور مایوسیوں پر بھی فتح پائی۔ پس فی الحقیقت ٹرکی کی فتح اس سے بھی زیادہ تر ہے کہ اسے ایشیا یا مشرق کی فتح سے تعبیر کیا جائے۔ وہ انصاف کی جیت ہے اور انصاف مشرق ومغرب کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے نہ کوئی قومیت، اس کی قومیت اگر ہوسکتی ہے تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے۔ پس مجھے اجازت دیجئے کہ میں عالم انسانیت کی اس فتح پر تمام عالم انسانیت کو مبارک باد دوں۔ میں مغرب اور مشرق کے ہر اس انسان کو مبارک باد دوں جو انصاف اور انسانی آزادی کا احترام کرتا ہے۔

لوزان کے صلح نامہ سے وہ تمام مقاصد بہ استثنائے آزادی عرب حاصل کر لیے گئے جن کا ترکی اور ہندستان نے انصاف اور حق کے نام پر مطالبہ کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر ولسن کی ان فراموش شدہ شرطوں اور برطانیہ کے ان مشہور مگر شکستہ وعدوں کا بھی مفاد موجود ہے۔ جو 1918ء میں کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر ولسن کی بارہویں شرط یہ تھی کہ ٹرکی کی سلطنت محفوظ رکھی جائے گی۔ چنانچہ آج ٹرکی کی سلطنت محفوظ ہے۔ برطانی وزیر اعظم نے کہا تھا کہ ٹرکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کے زرخیز اور شہرہ آفاق علاقوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اب ٹرکی ان علاقوں سے محروم نہیں ہے۔ اس سے

بھی زیادہ یہ کہ اس میں نہ صرف ان ''وعدوں'' کا مفاد ہی موجود ہے بلکہ وہ باتیں بھی موجود ہیں جو ان میں نہ تھیں۔ ان میں ٹرکی کی خودمختارانہ عظمت کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن اسے یہ بھی حاصل ہوگئی ہے۔ ان میں اجنبی امتیازات (کیپی چولیشنز) اور غیر ترکی ڈاک خانوں کے اٹھا دینے کے لیے کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی۔ جو قبل از جنگ بھی عثمانی شہنشاہی کی کامل خودمختاری کی نفی کرتے تھے مگر اب وہ بھی اٹھا دیے گئے ہیں۔ ان میں ہم کہیں اس کا اشارہ نہیں پاتے کہ ٹرکی سے ایک ہارے ہوئے حریف کی طرح نہیں بلکہ ایک مساوی طاقت کی طرح معاملہ کیا جائے گا۔ لیکن اب ٹرکی کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے ان ''وعدوں'' میں دردانیاں کے بین الاقوامی کر دینے کا ذکر موجود پاتے ہیں۔ لیکن صلح نامہ نے وہاں بھی ٹرکی کا اقتدار تسلیم کر لیا ہے۔ بلاشبہ یہ جو کچھ ہوا وعدوں کا مفاد ہے اور انصاف کی تعمیل ہے۔ لیکن واقعات کی تکمیل کے لیے مجھے اتنا اضافہ اور کرنے دیجئے کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوا کہ وعدے پورے کیے گئے اور طاقت کے وعدے بزور شمشیر فتح کر لیے جائیں تو وعدوں سے بھی زیادہ دے دینے میں فیاض ہے۔ وہ فاتح کو سب کچھ دے دیتی ہے لیکن انصاف کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

حضرات! یہ صلح درحقیقت ایک سوال ہے جس کے جواب میں عنقریب تاریخ عبرت کی داستانیں ترتیب دے گی۔ بلاشبہ انصاف پورا ہوا اور حق حق دار کو مل گیا۔ لیکن ان طاقتوں کو کیا ملا جنھوں نے انصاف کی پامالی کے لیے اپنے اٹل اور بے روک سرکشی کی قسمیں کھائی تھیں؟ برطانیہ کو کیا ملا جو کامل چار سال تک اپنے ٹوٹے ہوئے وعدوں کے ٹکڑے روندتی رہی اور ایک ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ جو اس نے انصاف کے لیے کبھی نہیں کیا۔ ظلم و جبر کی تکمیل کے لیے وقف ہوگئی۔ اس نے ٹرکی کو پامال کرنا چاہا مگر وہ اس کے سارے منصوبوں اور فیصلوں کے برخلاف طاقت ور

ہوگئی۔ اس نے انصاف کے آگے جھکنے سے انکار کیا لیکن وہ تلوار کے آگے سر بہ سجود ہوگئی۔ اس نے بار بار قلم سے فیصلے لکھے لیکن تلوار سے سب پارہ پارہ کر دیے گئے۔ اس نے قوموں کے حاکم اور قسمتوں کے مالک کی طرح جب صلح نامے ترتیب دیے تو ہندستان نے حق و انصاف کے نام پر فریاد کی مگر اس نے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال نے تلوار کی نوک سے خود اپنا صلح نامہ لکھ دیا تو وہ ایک مفتوح کی طرح جھکی اور اس کے استقبال سے انکار نہ کرسکی۔ ہمیں مؤرخ کے جواب کا انتظار نہیں ہے۔ کیوں کہ دنیا نے جواب دے دیا ہے۔ فی الحقیقت اس نے ٹرکی کو سب کچھ دے کر خود جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ناکام ناانصافی کا ایک داغ ہے جو پہلے اس کی پشت پر تھا۔ مگر اب اس کی پسند کے مطابق اس کی پیشانی پر نمودار ہوگیا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ حوادث عالم کی جو عظمت ہمیشہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوئی ہے وہ کبھی ان کے تماشائیوں کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم دراصل ایک ایسے عہد انقلاب سے گزر رہے ہیں جو ٹھیک ان وقتوں کے مانند ہے جن میں مؤرخین عالم نے کرۂ ارضی کے بڑے بڑے انقلابات کی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پلٹے کے لیے جھک رہی ہے۔ ان کی ساری باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں۔ اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہے۔ اس کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس کے نقشے حدود اور خطوط بھی مل رہے ہیں۔ کتنی ہی بلندیاں ہیں جو گر گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اُٹھ اٹھ کر بلند ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے جس کے بعد صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل قریب کے دامن میں کیا ہے؟ تاہم جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ایک نئے مشرق کے انقلاب کا منظر تو بالکل ہی صاف ہے جس کے لیے کسی کی کہانت کی ضرورت نہیں۔ مشرق کی وہ

بیداری جو چوتھائی صدی سے صرف بیداری ہی تھی، اب بیداری کے بعد کی منزلیں طے کر رہی ہے اور جنگ عظیم کی پھیلائی ہوئی ہلاکتوں نے زندگی اور حرکت کی ایک نئی روح اس کے لیے مہیا کر دی ہے۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے سحر کار ہاتھوں نے صرف ٹرکی کے تخت خفتہ کو ہی بیدار نہیں کیا بلکہ مشرق کے دروازہ پر دستک دے دی۔ اب اس کی گونج ایک طرف وسط ایشیا کے میدانوں میں پھیل رہی ہے۔ دوسری طرف افریقہ کے صحراؤں اور ساحلوں پر سے گزر کر بحر ہند کی لہروں کو عبور کر چکی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی بازگشت عنقریب مشرق کے ایک ایک گوشے سے بلند نہ ہوگی؟

حضرات! ہندستان مشرق کی عام جدوجہد سے اپنی قدرتی اور جغرافیائی وابستگی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جدوجہد کو اس سے منسلک کرتا ہوا ربط و یگانگت کے وہ تمام جذبات محسوس کر رہا ہے جو ایک سرزمین کی مختلف جماعتوں میں وقت اور مقصد کی یکسانی قدرتی طور پر پیدا کر دیتی ہے۔ پس وہ مشرق کی ہر اس قوم کا خیر مقدم کرتا ہے جو انصاف اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور ہر اس قوم پر افسوس کرتا ہے جو اس راہ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے ہے۔ وہ مصر، شام، فلسطین، عراق، مراکش اور دیگر اقطاع مشرق کے تمام محب الوطنوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہندستان کے کروڑوں دل ان کی کامیابی کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ ان کی آزادی کو بھی اس سے کم محبوب نہیں رکھتے جس قدر خود اپنے وطن عزیز کی آزادی کو۔

علی الخصوص وہ ''جزیرۃ العرب کے استقلال و حفاظت کے لیے اپنے عہد قدیم کو آج پھر تازہ کرتا ہے۔ یہ مطالبات خلافت کی سب سے زیادہ اہم اور غیر مبدل دفعہ تھی۔ جس کا 1920ء میں اس ایوان میں اعلان کیا۔ ہندستان کے لیے یہ مطالبہ صرف اسی لیے اہم نہیں ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مذہبی اعتقاد اس سے وابستہ ہے بلکہ ہندستان خود اپنی آزادی کے لیے بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہندستان،

مصر اور عرب کی جغرافیائی اور طبعی حالت کچھ اس طرح واقعہ ہوئی ہے کہ ان کی سیاسی قسمت ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی ہے اور ان میں ہندستان کا وجود زنجیر کی پہلی کڑی کی طرح اپنے دونوں ہمسایوں کے لیے ہر چیز کی ابتدا ہے۔ یہ ہندستان ہی کی غلامی ہے جس کو دائمی بنا دینے کے لیے ضروری ہوا کہ نہر سویز برطانیہ کے قبضہ سے باہر نہ ہو اور اب عرب کا استقلال بھی صرف ہندستان کی بدقسمتی پر قربان ہو رہا ہے۔ عرب جس کی آزادی ہندستانی فوجوں ہی کے ذریعہ پامال کی گئی۔ اگر برطانی اقتدار کا ایک نیا ایشیائی مرکز بن گیا۔ تو پھر ہندستان کی غلامی کی سرحدیں بحرِ ہند ہی سے شروع نہ ہوں گی بلکہ ایک طرف شام کے ساحلوں پر اس کی دیوار کھڑی ہو جائے گی دوسرے طرف خلیج فارس سے گزر کر موصل اور دیارِ بکر کی حدود سے اس کا آغاز ہوگا۔ ہندستان عرب کے تمام باشندوں کو یقین دلاتا ہے کہ ان کا استقلال اور اجنبی اقتدار سے تحفظ اس کی جدوجہد کا اب بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ 1920ء کے اعلان میں تھا۔ وہ اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھے گا جب تک عربی ممالک کا کوئی ایک گوشہ بھی اجنبی اقتدار سے آلودہ رہے گا۔

حضرات! جب کہ ہم ترکی کو فتح عظیم کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے قسطنطنیہ کے عالی شان ایوانِ خلافت کی طرف دیکھ رہے ہیں تو بے اختیار ہمارا خیال ہندستان کے ایک قید خانہ کی طرف بھی رجوع ہو جاتا ہے۔ جس کی ایک کوٹھری کے اندر ہندستان کی سب سے بڑی شخصیت محبوس ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ترکی سے باہر کوئی انسان اس کا مستحق ہے کہ ترکی کی فتح پر اسے مبارک باد دی جائے تو وہ ہندستان کے قائدِ اعظم مہاتما گاندھی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس مقصد کی حمایت میں اس وقت آواز اٹھائی جب کہ خود ترکی کے اندر قومی دفاع کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی حقیقت شناس نگاہیں تھیں جنھوں نے اوّل نظر ہی میں اس مسئلہ کی ساری وسعتوں

اور گہرائیوں کا اندازہ کرلیا اور تمام ہندستان کو دعوت دی کہ یہ صرف مسلمان ہی کا نہیں بلکہ تمام ملک کا قومی مطالبہ ہے۔ حضرات! ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں مطالبات خلافت کے لیے جو جدوجہد کی وہ فی الحقیقت موجودہ عہد کا ایک خاص اور اہم واقعہ ہے۔ جس کے نتائج پر تاریخ بحث کرے گی۔ شاید یہ ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم اس کے تمام نتائج کا اندازہ کرنا چاہیں تاہم بعض نتائج تو ایسے ہیں جو بلا کسی بحث ونظر کے ہم سب محسوس کررہے ہیں اور جن میں سے ہر نتیجہ اس درجہ عظیم ہے کہ صرف اسی کے لیے یہ جدوجہد ظہور میں آسکتی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جس کے بغیر ہندستان کی آزادی ایک خواب پریشاں سے زیادہ نہیں اسی کی بدولت ان مشکلات پر غالب آ گیا جو عرصہ سے اس کی راہ میں حائل تھیں۔

ہندستان کا تمام مشرق میں وہ بین الاقوامی وقار جس نے مشرق کے جدید بیدار حلقہ میں ایک وقیع جگہ دے دی، اسی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ جدوجہد وقوع میں نہ آتی تو آج ہندستان کی تمام ایشیا اور افریقہ میں کیا حیثیت ہوتی؟ ٹرکی اور عرب کی آزادی اسی کی فوجوں کے ذریعہ پامال کی گئی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ تمام مشرق کی متفقہ نفرت اور حقارت اس کے حصہ میں آتی۔ جہاں کہیں بھی ایک ہندستانی نظر آجاتا انگلیاں اٹھتیں کہ یہ ایک بدبخت ملک کا باشندہ ہے، یہ صرف اپنی بدبختی پر قانع نہیں ہے بلکہ مشرق کی آزاد قوموں کے لیے بھی بدبختی کا ذریعہ ہے۔ لیکن آج حالت بالکل پلٹ چکی ہے۔ آج ہندستان سر اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے دامن پر اس کی بے بسی نے جو دھبہ لگا دیا تھا اس کی مرضی اور اختیار نے اسے دھو دیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تھا کہ بلا اپنی مرضی اور خواہش کے ہزاروں ہندستانی میدان جنگ میں گئے تاکہ ترکوں اور عربوں کی آزادی کے خلاف تلوار اٹھائیں تو یہ بھی ہو چکا ہے کہ خود اپنی مرضی اور

خواہش سے ہزاروں ہندستانی جیل میں گئے تا کہ ترکوں اور عربوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ آج مشرق کے ایک ایک گوشہ سے ہندستان کے لیے عزت واحترام کی صدائیں اٹھ رہی ہیں قسطنطنیہ میں اس کا نام اس طرح لیا جاتا ہے گویا وہ مشرق کی آزادی کا علم بردار ہے۔ قاہرہ کے بازاروں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں کہ "اللہ يَنصُرُكَ يا غاندی" (اے گاندھی خدا تجھے فتح مند کرے) یہ فی الحقیقت آزاد قوموں کی سی عزت ہے جو محکوم ہندستان نے حاصل کر لی ہے اور یہ بلاشبہ اسی تحریک خلافت کا نتیجہ ہے۔

پھر ان دونوں نتائج سے بھی بڑھ کر جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ ہندستان کا وہ حریت طلبانہ ذہنی ارتقاء ہے جو اس جدوجہد کے ذریعہ اس نے حاصل کر لیا۔ کسی قوم کے آزاد ہونے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزادی کا پورا قدر شناس ثابت کر دے۔ جس وقت ہندستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ٹرکی اور عرب کی آزادی محفوظ رہنی چاہئے تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ خود آزادی سے محروم نہیں رہ سکتا۔ محکوم قوموں کی نہ تو کوئی خواہش ہوتی ہے نہ مرضی اگر ہندستان کی ٹرکی کے لیے کوئی مرضی ہے جس کے حصول کے لیے وہ جدوجہد کر سکتا ہے تو پھر وہ اپنی آزادی کے کام سے بھی فارغ ہو گیا۔ کیوں کہ آزادی کا حصول دراصل قوم کی مرضی کے نشو ونما ہی کا نام ہے۔

حضرات! میں آپ سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ گذشتہ چار سال کے اندر مطالبات خلافت کے لیے میں نے جو کچھ سعی کی اس کی نسبت میرا ذاتی احساس ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے بلکہ بحیثیت ہندستانی ہونے کے یہ میرا قومی فرض ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ہندستان کی تحریک خلافت ہندستان کی بڑی سے بڑی خدمت تھی جو تاریخ ہند کی اس عظیم شخصیت یعنی مہاتما گاندھی نے انجام

دی ہے۔

حضرات! میں نے آغاز تقریر میں آپ سے وقت کی مشکلات کا ذکر کیا تھا ہر جماعتی جدوجہد کی کامیابی کے لیے اتحادِ عمل شرط ہے اور تفرقہ خطرہ، اس وقت ہم میں شرط کمزور ہوگئی ہے اور اس لیے ہمیں خطرہ پیش آ گیا ہے۔ لیکن میں سب سے پہلے آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ ان مشکلات کی نوعیت اور مقدار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیجئے اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی ہوتو عجب نہیں ہم ایک دوسرے خطرے سے دوچار ہو جائیں۔ آج ہم ایک ایسے وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہا غفلت ہے اور دوسری مایوسی۔ اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا تو یہ غفلت کی طرف اقدام ہوگا اور اگر کم کر کے دیکھا تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں نہ تو غافل ہونا چاہئے نہ خائف، ہم کو مقابلہ کرنا چاہئے اور غالب آنا چاہئے۔ لیکن یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیں۔ اس راہ میں ہتھیار سے پہلے ترازو کی ضرورت ہے۔

ہمیں چاہئے کہ اس موقع پر دنیا کی اجتماعی زندگی کے وہ قدرتی قوانین یاد کر لیں جو اگر چہ ہماری معلومات میں موجود ہیں لیکن بسا اوقات جذبات کا غلبہ دماغ کی معلوم کی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ہم حرکت اور زندگی کے اس حیرت انگریز کرہ کی ایک ویسی ہی مخلوق ہیں جیسی ان گنت اور نامعلوم مخلوقات اس کی یکساں گردش کے ساتھ ظہور میں آتی رہی ہیں اور آج بھی اس کی آغوش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی کائنات ہستی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کتنا ہے اور کہاں تک ہے۔ لیکن ہم نے جان لیا ہے کہ وہ اپنی ساری باتوں میں کامل طور پر یکساں ہے۔ اگر چہ اس میں زندگی اور حرکت کے بے شمار مظاہر ہیں لیکن ان سب کے لیے ان کے خالق کی مرضی کی طرح

قانونِ حیات بھی ایک ہی ہے۔اس لیے اس میں نہ تو کوئی نئی بات ہوتی ہے نہ اس کی کوئی ایک چیز دوسری چیز سے الگ اور مختلف ہے۔ جو کچھ ایک مرتبہ ہو چکا ہے وہی ہمیشہ ہوتا ہے۔اور جو ایک کے لیے ہوا ہے وہی سب کو پیش آتا ہے۔وہ یکساں ہے۔ ہمہ گیر ہے باہم مشابہ ہے اور اٹل ہے۔ایران کے فلسفی شاعر ''عمر خیام'' کے لفظوں میں ''اس کی زندگی کی کہانی ایک ہی ہے جو ہمیشہ نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں میں دہرائی جارہی ہے۔'' اور فرانس کے مشہور شاعر ''وکٹر ہیوگو'' کے زیادہ مختصر لفظوں میں ''حوادث عالم کی داستان اگرچہ مسلسل ہے مگر محض تکرار ہے۔''

حوادث عالم کی اس کامل یکسانیت اور قوانین حیات کی اس غیر مبدل یگانگت کی جلوہ طرازی پر جس طرح شاعر کے وجدان نے وجد کیا ہے اسی طرح مؤرخ کی نگاہوں نے مطالعہ کیا ہے اور فلسفی نے اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ہمیں چاہئے کہ بحیثیت ایک سیاسی عامل کے اس کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ یہ یکسانیت کا قانون جس طرح افراد و اجسام کے لیے ہے ٹھیک اسی طرح جماعتوں اور عصروں کے لیے بھی ہے۔جس طرح افراد کا جسم ہے، دماغ ہے اور وہ تمام قویٰ اور حواس ہیں جو جسم و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں۔اسی طرح جماعتوں اور عصروں کا بھی جسم ہے، دماغ ہے،نفسیاتی (سائیکولوجیکل) کیفیات ہیں جو ان کے ترکیبی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ضرور ہے کہ ایک طرح کی طبیعت اور ایک طرح کے گرد و پیش میں ایک ہی طرح کے حالات ہمیشہ پیش آئیں اور ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں۔جس طرح افراد کے اعمال و نتائج کا تعلق ان کی شخصیت سے نہیں ہے بلکہ ان کی دماغی و جسمانی حالت میں ہر فرد سے ایک ہی طرح کے افعال کا صدور ہوگا۔اسی طرح جماعتوں کے اعمال واحوال میں بھی جماعتوں کا تشخص و تعین بالکل غیر مؤثر ہے۔حالات و نتائج ایک خاص طرح کی طبیعت اور گرد و پیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کبھی کسی جماعت کی

ویسی ہی طبیعت ہوگی اور ویسا ہی گردوپیش پیش آئے گا۔ضرور ہے کہ وہ ظہور میں آئیں۔قوموں کا آغاز وانجام،عروج وزوال،غفلت وبیداری،آزادی ومحکومیت، فتح مندی وناکامی،سب پر یہی قانون نافذ ہے،اور جو کچھ ایک قوم پر گزرا ہے اور ایک کے لیے ہوا ہے۔بجنسہ وہی ہر قوم پر گزرتا اور ہر قوم کو پیش آتا ہے۔ جماعتی زندگی کا یہی حیرت انگیز توافق ہے جس کو تیرہویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی مؤرخ عبدالرحمٰن بن خلدون نے (جس نے سب سے پہلے فلسفہ تاریخ کے مبادیات واصول مدون کیے ہیں) ان لفظوں میں تعبیر کیا ہے" اگر ہم زمانوں اور ناموں کی قید نکال دیں تو ایک قوم اور ایک زمانہ کی تاریخ بجنسہ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے کام دے سکتی ہے۔ کیوں کہ ناموں اور صورتوں سے تغیر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا" اس حقیقت کو موجودہ زمانہ کے مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر گستاولی بان نے زیادہ جامع وعلمی پیرایہ میں بیان کیا ہے۔" جب ہم جماعتی زندگی کے سائیکولوجی اس طرح مدون کرلیں گے جس طرح ہم نے انفرادی زندگی کی کرلی ہے تو پھر ہمارے لیے ممکن ہو جائے گا کہ ہم ایک قوم اور تمدن کی تاریخ لکھ کر اسے ہر قوم اور تمدن کے لیے استعمال کرسکیں۔ ہزار سالہ تقویم کی طرح وہ ہمیں ہر سال یکساں طور پر کام دے سکے گی۔"

حضرات! آج ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ قومی زندگی کے اس قانون کے قطعی اور اٹل احکام سے غافل نہ ہوں۔صرف یہی بات ہمارے تمام بے جا تعجبوں اور بے جا اندیشوں کو دور کرسکتی ہے۔ہمیں آگاہ رہنا چاہئے کہ آج جو کچھ پیش آرہا ہے وہ نہ تو نیا ہے نہ معمول کے خلاف۔ بلکہ قومی جدوجہد کے اس مرحلہ کی جس سے ہندستان گزر رہا ہے ایک بالکل قدیم معمولی اور ناگزیر حالت ہے۔دراصل ہم وہ کررہے ہیں جو ہمیشہ گزر چکا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں جو ہم سے پہلے لکھا جاچکا ہے۔ہم کچھ نہیں ہیں مگر تاریخ اقوام کا ایک صفحہ ہیں جو اس قانون اجتماع کی یکسانیت کی بے شمار نظیروں پر ایک نئی

نظیر کا اضافہ کرتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ قومیں غفلت کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور جب ان کی دماغی اور فکری حالت کا انقلاب پورا ہو چکا ہے تو ان کی خارجی حالت پر بھی یکے بعد دیگرے تغیرات طاری ہوئے ہیں۔ اگر میں ایک قدیم جرمن حکیم ہرمن کا استعارہ مستعار لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے۔ ذہن ودماغ کے تغیرات میں خواب دیکھتی ہے۔ جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے اور بالآخر جدوجہد کے میدان میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ جدوجہد ایک ایسا سفر ہے جس کی بندھی ہوئی منزلیں ہیں اور ٹھہرائے ہوئے رسم وراہ ہیں۔ جو ضرور ہے کہ ہر قوم کو پیش آئیں اور ضرور ہے کہ ہر کامیاب کا قافلہ ان میں سے گزرے۔ جس طرح اس کی کامیابیاں عظیم ہیں۔ اسی طرح اس کی رکاوٹیں بھی بے شمار ہیں اور جس طرح اس کی فتح مندی اٹل ہے اسی طرح اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہیں۔

اس کی مشکلات داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ اس میں دماغ کے لیے بھی آزمائشیں ہیں اور جسم کے لیے بھی۔ اس میں اندر کے طوفان بھی اٹھتے ہیں اور باہر کے سیلاب بھی بہتے ہیں۔ اس میں جابجا ٹھوکریں بھی ہیں اور قدم قدم پر لغزشیں بھی۔ اس کا سفر کبھی یکساں رفتار میں جاری نہیں رہ سکتا۔ ہمیشہ رک رک کر چلتا ہے اور تھم تھم کر بڑھتا ہے۔ اس میں گر گر کر اٹھنا پڑتا ہے اور ٹھوکر کھا کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابیاں مسلسل نہیں ہیں مگر ضروری ہیں۔ اس کی فتح مندی قدم قدم پر نہیں ہے مگر آخر میں ہے اور اٹل اور یقینی ہے۔

حضرات! خدا کا یہ قانون حیات ہماری تن آسانیوں کی خاطر معطل نہیں ہو سکتا۔ ہم چلے ہیں تو ہمارے لیے بھی اس کی تمام منزلیں چشم براہ ہیں اور ناگزیر ہے کہ ان سب میں سے گزریں۔ اگر ہماری تیز رفتاری رک گئی تو ہمیشہ رکا کرتی ہے ہمیں تیزی

سے پھر روانہ ہو جانا چاہئے۔ اگر ہماری حرکت میں ایک دفعہ وقفہ سا پڑ گیا تو پڑا ہی کرتا ہے ہمیں از سر نو کوچ شروع کر دینا چاہئے۔ اگر ہم ایک خاص مسئلہ میں متفق نہ ہو سکے یا ہمارے اتحاد کے رشتہ میں ایک گرہ پڑ گئی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم کیوں نہ متفق ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک آزمائش ہے جو سب کی طرح ہمیں بھی پیش آگئی ہے اور اس پر اسی طرح غالب آنا چاہیے جس طرح باہمت قومیں غالب آتی ہیں لیکن اس سے زیادہ اس میں نہ کوئی ہراس ہے نہ مایوسی۔ یہ کوئی نرالی بجلی نہیں ہے جو ہمیں پر گری ہو، یہ تو اس راہ کا ایک معمولی حادثہ ہے جو ہماری طرح نہیں معلوم کتنوں کو پیش آچکا ہے اور ہمارے بعد کتنوں کو پیش آئے گا۔

آیئے! ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر دیکھ لیں کہ آج جو مشکلات پیش آئی ہیں جماعتی اعمال کی نفسیات میں ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہنا ضروری نہیں کہ فرد کی طرح قوم کے اعمال کا اصلی سرچشمہ بھی دماغ ہے۔ قوم کے افراد کا دماغی نشوونما جب اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ خالی وقت میں بھی اپنا اثبات کرے تو وہ مناسب حالات کا انتظار کرتا ہے۔ مناسب حالات میں اسے سب سے زیادہ ضرورت کسی ایسے قومی مؤثر کی ہوتی ہے جو فکر و رائے کے تمام انتشار و اختلاف پر غالب آ کر قوم کے بکھرے ہوئے عناصر کے لیے ایک نقطہ اجتماع پیدا کر دے۔ افراد کے دماغ جب جماعت کے ترکیبی دماغ میں منقلب ہو جاتے ہیں تو ان میں عقل و ادراک سے زیادہ جذبات کا عنصر کام کرتا ہے۔ پس یہ مرکز بھی جذبات سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ ادراک سے۔ جب ایسی حالت مہیا ہو جاتی ہے تو عملی جد و جہد ظہور میں آتی ہے۔ بقدر اپنی قوت کے ابھرتی اور مخالف قوتوں سے ٹکراتی ہے۔ پھر یا تو کسی معین حد تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے یا راستہ کے قدرتی قوانین کے ماتحت اسے رک رک جانا پڑتا ہے۔ اس رکاوٹ کی بھی مختلف حالتیں ہیں اور مختلف احکام ہیں لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک رد

عمل Reaction کا قانون اپنا اثر دکھلائے۔ اس وقت اچانک ایک افسردگی اوراضمحلال کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں۔سب سے زیادہ اس کا اثر خیالات کی جمعیت پر پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویاایک بندھن میں بہت سے بکھرے ہوئے اوراق بندھے ہوئے تھے یا تو اس کی گرہ ڈھیلی پڑگئی ہے یا کھل گئی ہے۔اب اختلافات شروع ہوتے ہیں، انتشار کی ہوائیں چلنےلگتی ہیں اور قومی جدوجہد کو ایک سخت آزمائش پیش آجاتی ہے۔ چوں کہ جماعت کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی طبعی ہے۔اس لیےعلم وادراک اس میں بہت کم تبدیلی کرسکتا ہے۔ افراد کتنے ہی ہوش منداور دنیا کے پچھلے تجربوں سے باخبر ہوں۔لیکن اپنے جذبات کو ان حالات ونتائج سے نہیں روک سکتے تاہم اگر جدوجہد کا دماغ اور پھیپھڑامحفوظ ہوتو یہ جو کچھ ہوتا ہے جسم کے عوارض ہوتے ہیں۔ جدوجہد کی زندگی کے لیے ان میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثر حالتوں میں ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے۔بعض حالتوں میں ایک مشکل عقدہ اور کبھی کبھی ایک خطرناک التوا کی بھی صورت اختیار کرلیتا ہے۔لیکن جوں ہی وہ مدت ختم ہوتی ہے جواس نشۂ خمار کے لیے ضروری تھی۔معاً افسردگی کا یہ وقتی حجاب دور ہوجاتا ہے اور جدوجہد پھر اپنی اصلی سرگرمی کے ساتھ رونما ہوجاتی ہے۔ بلکہ اکثر حالتوں میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ وقتی وقفہ محض سطح کا تھا۔ گہرائیوں کی قوتیں برابر کام کرتی رہی تھیں۔اب دوسرے ظہور میں تازہ قوت کے ساتھ پچھلی قوتوں کی مقدار بھی موجود ہوتی ہے۔

دنیا کے تمام تغیرات وحوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی ختم ہوجاتے ہیں یا جاری رہتے ہیں۔ بار بار پیدانہیں ہوتے۔ البتہ اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ہم غلطی سے اتار کو خاتمہ اور چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔کسی قومی جدوجہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اتار دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ پھر کل نہیں چڑھے گا۔

ہماری اس قومی جدوجہد کو بھی ایک حرکت کے بعد ایک وقفہ پیش آ گیا ہے جدوجہد پوری تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ یکا یک باردولی کے فیصلے نے اشارہ کیا کہ تھم جاؤ۔ وہ اچانک تھم گئی۔ لیکن یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے صدمہ محسوس کیا۔ اور اس سے وہ تمام نتائج پیدا ہوئے جو ایسے وقفہ کا قدرتی مقتضا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری جمعیت جنبش میں آ گئی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے گویا ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز تیزی کے ساتھ کھلتی اور بکھرتی جا رہی ہے۔ جدوجہد کا عام سکون کانگریس کا اختلاف، ہندو مسلم اتحاد میں فتور، اتحاد کی کوششوں کی درماندگیاں یہ سب اسی حالت کے برگ و بار ہیں۔

حضرات! یقیناً یہ ایک آزمائش ہے۔ جس پر ہمیں فتح مند ارادوں کے ساتھ غالب آنا پڑے گا۔ اور عجب نہیں کہ بڑی کش مکش کرنی پڑے۔ تاہم امید کروں گا کہ آپ اس سے زیادہ کوئی اثر اپنے دل و دماغ کے لیے قبول نہ کریں گے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اقوام کی نفسیات اور تاریخ کا شناسا ہو۔ یہ بالکل ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ایک آدمی کا دوڑتے دوڑتے ذرا رک جانا کہ دم لے کر پھر دوڑے۔

ہمیں اس کی بالکل پروا نہیں ہونی چاہئے کہ ہمارے مخالفین اور نکتہ چین ہماری اس حالت سے دھوکا کھانا پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حالت میں ہیں جس میں طاقت کا صرف اسی وقت اقرار کیا جاتا ہے جب وہ بالکل سامنے آ جائے۔ لیکن خود ہم کو نہیں چاہئے کہ اپنی حقیقت حال کی نسبت کسی قسم کا شبہ قبول کریں۔ کیا ہے جو ہم نے کھو دیا ہے؟ ہماری جدوجہد کے تمام دماغی قوی پوری طرح مضبوط ہیں۔ اس کی جڑوں میں اب تک کوئی جنبش نہیں آئی۔ ہم اس کے قدموں کی سستی سے کیوں گھبرائیں جب کہ اس کے دل کی حرکت میں کوئی سستی محسوس نہیں کرتے؟ کیا ہم کو خود اپنے محسوسات میں بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ کیا ہم محسوس نہیں

کرر ہے ہیں کہ وہ ایک عقیدہ کی طرح ہماری نگاہوں میں ہے اور روح کی طرح ہمارے جسم کی ایک ایک رگ میں دوڑ رہی ہے۔

حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آج سب کی جانب سے ایک ایسا اعلان کروں جو فی الحقیقت آپ کے یقین واحساس کی ترجمانی ہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری جدوجہد قائم ہے۔ بدستور جاری ہے اور ہم ایک ایسے وقفہ کی حالت میں ہیں جس نے فیصلہ کن معرکہ میں التواڈال دی ہے۔ مگر جنگ کے لیے التوا نہیں۔ ہمارے لیے ہوشیاری، سرگری اور کوشش کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں مگر ہم ان سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ التوا یا ناامیدی کا کوئی سوال درپیش ہے۔ لیکن جب میں نے آپ کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تو مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجئے کہ غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی روزانہ زندگی کی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ بیماری کتنی ہی بے حقیقت ہو لیکن غفلت اور بدپرہیزی سے فوراً مہلک بنادی جاسکتی ہے۔ آج جو آزمائش ہمیں پیش آئی ہے فی الواقعہ یہ ایک عارضی وقفہ ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو زیادہ بڑھنے نہ دیں۔ ہم ایسا کیوں کر کر سکتے ہیں؟ وقت کی مشکلات کا علاج کیا ہے؟ اس کا جواب ہم سب کو معلوم ہے لیکن اس پر عمل دشوار ہو رہا ہے ہم کو صرف اتحاد کی ضرورت ہے اور ہم اسی کی ڈھونڈھ میں آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

حضرات! آج کا یادگار دن اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں اس آزمائش سے گزر جانے کی نہایت قیمتی مہلت دے۔ ہم نے آج تمام دنیا کی نگاہوں کو دعوت دی ہے کہ وہ ہماری آزمائش کے نتیجہ کا تماشہ کریں۔ کیا ہم اس کی یادگاروں کا بہتر اور صحیح استعمال کریں گے۔؟

اس کا جواب ہمیں چند گھنٹوں کے اندر دینا ہے۔

حضرات! میرے لیے ناگزیر ہے کہ میں اپنی گزارش کسی ابتدائی سرحد سے شروع کروں۔ ہم نے حصول مقصد کے لیے عدم تشدد اور ترک تعاون کا اصول اختیار کیا ہے۔

''نوان کوآپریشن'' کی بنیاد دراصل دنیا کی اس سادہ مگر عالم گیر اعتقاد پر ہے کہ ہمیں برائی کا ساتھ نہیں دینا چاہئے اور اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہئے تاکہ وہ پھول پھل نہ سکے۔ دنیا کے تمام مذہبوں اور اخلاقی تعلیمات کی یہ ایک مشترک سچائی ہے اگر اس اصولی تعریف میں ''برائی'' کا لفظ ''نقصان'' سے بدل دیا جائے (اور میرے خیال میں دونوں کو مترادف ہی ہونا چاہئے) تو پھر یہ نوع انسانی کا نہ صرف عالم گیر اعتقاد بلکہ حیوانی فطرت کا ایک قدرتی رجحان ہوجاتا ہے اور یہاں بھی مذاہب کی صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو ''ترک موالات'' کا حکم دیا ہے۔ جس کا منشا یہی ہے کہ جن لوگوں کے کاموں میں تمہارے لیے قومی نقصان ہے۔ تم کسی طرح ان کی مدد اور مضبوطی کا ذریعہ نہ ہو۔ دوسرے مذہبوں میں بھی ایسی ہی تلقین موجود ہے۔

قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے بلکہ متفقہ عمل ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ حقوق کوآپریشن کے ذریعہ حاصل نہیں کرسکی ہے۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جدوجہد کر کے حاصل کیے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور کش مکش ہے کوآپریشن نہیں ہے۔

مقاطعہ اور مقاومت سلبی یا سول ڈس اوبیڈینس بھی جو اس کے سبب سے زیادہ قومی ہتھیار ہیں کوئی نئی تعلیم نہیں ہے۔ کمزور افراد اور جماعتیں جب کبھی مسلح مقابلہ سے مجبور ہوئی ہیں تو انھوں نے اسی طریقہ کو اپنے مقاصد کی حفاظت کا تنہا ذریعہ پایا ہے۔ مذہب، اخلاق اور قومیت کی یہ متفقہ آواز دنیا کی بہت پرانی چیز ہے کہ مصیبت برداشت کرلو مگر حق سے منہ نہ موڑو۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب اور تعلیم کی ابتدائی

کمزوری اور بے بسی میں صرف یہی اصول ثبات وقرار کا ذریعہ ہوا ہے۔ ہم اس کا عکس سقراط کے جام زہر میں دیکھتے ہیں۔ یروشلم کی صلیب پر نقش پاتے ہیں اور مکہ کی گلیوں میں بھی اس کا غلغلہ سنائی دے چکا ہے۔ مسیحی مذہب کی ابتدائی دوصدیاں تمام تر اسی کا افسانہ ہیں۔ روم کے قیصر سیویرس کے زمانہ میں جب کہ مسیحی چرچ کی ابتدائی بنیادیں ظلم وستم کے طوفان سے ہل رہی تھیں۔ یہی اصول تھا جس کی غیر مسخر قوت اسے تھامے رہی۔ اسی عہد کے ایک مسیحی فداکار ٹرٹلین کی ایک تحریر آج تک محفوظ ہے جو اس نے رومی عدالت کے ججوں کے سامنے بطور اپنے تحریری بیان کے پیش کی تھی۔ اس کے یہ الفاظ ہم امریکن مصنف ڈریپر کی کانفلکٹ بٹوئن ریلیجن اینڈ سائنس میں پڑھ سکتے ہیں۔

> ''اگرچہ ہماری جماعت کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن وہ کونسی جگہ ہے جہاں ہم موجود نہیں؟ شہر، جزیرے، صوبے، قلعے، فوجی بارکیں، دربار کے محلات، سینٹ کے اجلاس غرض کہ ہر اس مقام پر جو تمہارے اقتدار کی علامتیں ہیں۔ ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں۔ بجز تمہاری عبادت گاہوں کے ہم نے تمہارے قبضہ میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ غور کرو۔ اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان بپا ہو جائے؟ لیکن ہمارا مذہب ہم کو سکھلاتا ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے۔ اس لیے ہم جھیلتے ہیں مگر مقابلہ نہیں کرتے۔''

اس سے زیادہ مکمل اور مؤثر اسپرٹ مقاومت سلبی کی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم چاہیں تو سترہ برس کے ان پرانے لفظوں کو بجنسہٖ آج بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

البتہ یہ بات کہ سیاسی حقوق کے حصول اور نامنصفانہ حکومت کے نظاموں کو شکست دینے کے لیے اسے بطور ایک دستور العمل کے اختیار کیا جائے، اور مسلّح

انقلاب کی جگہ صرف اسی پر قناعت کر لی جائے۔ ایک ایسا خیال ہے جو غالباً موجودہ زمانہ میں سب سے پہلے روس کے سچے مسیحی معلم کاؤنٹ لیوٹالسٹائی نے اپنی شہرۂ آفاق تعلیمات میں ظاہر کیا ہے اور اس قابل تعظیم کا دماغ دراصل مغربی تمدن کے بے روح مادیت، نظام ہائے معاشرت کی بے حد ناہمواری، سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کی بے روک بے اعتدالی اور روس کے ارتھوڈکس چرچ کے مذہبی استبداد اور جمود کے برخلاف ایک انتہائی پروٹسٹ تھا۔ اسی انتہائیت کا اثر ہے کہ اس کے انقلابی نظریات کی نسبت ہمیں امریکہ کے گذشتہ پریذیڈنٹ روز ویلٹ کے نقطہ چین لفظوں میں (جو اس نے ایک مرتبہ امریکن آؤٹ لک میں لکھے تھے) ماننا پڑتا ہے کہ "وہ بلا کسی جھجک کے عملیت اور اعتدال کی سرحد عبور کر گئی ہیں۔" تاہم اس کی تعلیمات میں یہ تعلیم ایک ایسی معتدل ہے جس کی سادہ عملیت بالکل آشکارا ہے اور بلاشبہ دنیا کو اس کی سب سے بڑی جستجو کا نہایت صاف اور آسان سراغ بتلا دیتی ہے۔ ٹالسٹائی کی تعلیم کی اصلی روح یہ تھی کہ قتل انسانی اور جنگ کا خاتمہ ہونا چاہیے، جو قوتیں انصاف اور انسانی حقوق کی راہ میں حائل ہیں ان کا نہ تو اسلحہ سے مقابلہ کرنا چاہیے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کی طاقت ان کے کارخانوں سے ہے۔ جو انھوں نے ہر طرف پھیلا رکھے ہیں۔ اگر لوگ اپنی شرکت اور اعانت سے ان کے پھولنے پھلنے کا باعث نہ ہوں تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ٹک سکتے۔

ٹالسٹائی نے یہ دعوت بے شمار تحریروں میں دی ہے۔ اس کے مضامین کا مجموعہ "سوشل ایول" کے نام سے مرتب ہوا ہے اس میں جا بجا اس کی صدائیں موجود ہیں۔ 1900ء میں جب انارکسٹوں نے "ہمبرٹ" شاہ اٹلی کو قتل کیا تو اس نے ایک پیام تمام ان جماعتوں اور قوموں کے نام شائع کیا جو حقوق اور انصاف کے لیے انقلاب چاہتے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ "ظلم و استبداد کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسانوں کو قتل

کیا جائے ۔ یہ تو ایک مرض دور کرنے کے لیے دوسرا مرض لگالینا ہے ۔ حقیقی علاج صرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے اس نام کی تائید ترک کردی جائے جس سے تمام ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں۔''

یہ طریقۂ عمل بالکل صاف اور سہل ہے مگر اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا۔ وہ خاتمہ میں خود جواب دیتا ہے۔''اس لیے کہ حکومتوں نے اپنے قیام ودوام کے لیے نہایت ہوشیاری سے پبلک کو مسحور بنا رکھا ہے۔ وہ اس طرح سوئی ہوئی ہے کہ نہ کچھ دیکھتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ پس اب ہمارا کام یہ نہ ہونا چاہئے کہ حکومتوں کا استبداد دور کرنے کے لیے قتل وخون ریزی سے کام لیں۔ بلکہ چاہئے کہ اس جادو کو توڑ دیں اور لوگوں کو ان کی طلسمی نیند سے بیدار کردیں۔''

دنیا کو ہمیشہ تعلیم سے زیادہ عملی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کی کوئی بات بھی اس کے لیے نئی نہیں ہے لیکن جو بات نئی عظمت اور کامیابی بخشتی ہے وہ سچائی کا یقین اور عمل ہے۔ یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے۔ ہر آدمی کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہئے واشنگٹن جیسے چند آدمیوں ہی کو معلوم تھی۔

پس اگرچہ ٹالسٹائی نے دنیا کو اس اصول کی طرف بلایا۔ لیکن اس کے قدم ایک دوسری ہی شخصیت کے انتظار میں رکے ہوئے تھے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت جس کو قدرت نے خاص اس کام کے لیے چن لیا ہو۔ یہ شخصیت مہاتما گاندھی کے وجود میں نمایاں ہوگئی۔ ٹالسٹائی سے پہلے بھی دنیا کو نوان کوآپریشن کی سچائی معلوم تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی سے پہلے اس کی عملی طاقت کا راز اسے معلوم نہ تھا۔

ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں نوان کوآپریشن کا جو طریقہ اختیار کیا۔ اس کے مبادیات اگرچہ وہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ۔ تاہم بہت سی باتوں میں اس

سے مختلف بھی ہو گیا ہے۔ پہلے وہ ایک اخلاقی وعظ تھا اب وہ ایک سیاسی پروگرام ہے۔ ٹالسٹائی کی دعوت میں عقائد اور اصول کی ایسی انتہائی وسعتیں موجود تھیں جو ایک طرف لوگوں کے موجودہ افکار وعقائد اور بہت سے نظام ہائے عمل سے ٹکراتی تھیں۔ دوسری طرف ان کی عملی دشواریوں پر بھی غالب آنا بہت مشکل تھا لیکن موجودہ شکل نے پوری طرح دامن سمیٹ لیے ہیں۔ اب اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی جماعت کے مذہبی یا سیاسی عقیدہ کو تبدیل کرنا چاہتی ہو۔ یا ایسی دشواری رکھتی ہو جن کو ایک محدود وقت کے اندر قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔ عدم تشدد اس کی اصلی روح ہے لیکن یہ اس امر پر قانع ہے کہ اگر اسے بطور اعتقاد کے تسلیم نہیں کیا جاسکتا تو بطور ایک مضبوط پالیسی کے اختیار کر لیا جائے۔ ان تمام تعلقات کو ترک کر دینا جو ہندستان کے دفتری اقتدار کے قیام کا باعث ہیں بلاشبہ اس کا اصل اصول ہے۔ لیکن اس کا دائرۂ نفاذ بھی اس نے بہت محدود کر دیا ہے اور جس قدر بھی ہے اس طرح عمل میں لانا چاہتا ہے کہ اس کی سختیاں کم سے کم صورت میں باقی رہ جائیں۔ ایثار، ضبط نفس اور اخلاقی روح کی بلندی اس کی جنگ کے اصل ہتھیار ہیں تاہم وہ اس بارے میں بھی پوری رواداری برتتا ہے اور بجز ایک مرکزی اور ملک کے لیے نمونہ بننے والی جماعت کے اور کسی سے ایسا مطالبہ نہیں کرتا۔ جس کا پورا کرنا ملک کی عام استعداد کے لیے بہت دشوار ہو۔ موجودہ شکل میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام حقوق طلب جماعتوں کے لیے ایک ایسا سیاسی دستور العمل بن گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ واضح، سادہ اور اس لیے عملی ہوسکتا ہے اور دنیا کی قوتوں کی غیر مسلح فتح مندی کا یقین دلاتا ہے۔ ان میں نہ صرف اصول کی سچائی ہی ملحوظ ہے بلکہ عمل کی بھی دشواریوں پر نظر رکھی گئی ہے۔

حضرات! نوان کوآپریشن کے پروگرام کی بعض دفعات کی نسبت ہم میں جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اگرچہ فی الحقیقت صرف اس کے ایک جزوی طریق عمل

سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن جب اس نے بحث ومباحثہ کی صورت اختیار کر لی تو جیسا کہ قاعدہ ہے طرح طرح کے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے گئے۔ اب سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہمارے موجودہ پروگرام کی نوعیت کا ہے۔ یہ پروگرام ایک ہی مرتبہ عمل میں لایا گیا اور جس قدر نتائج اس وقت حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے حاصل کیے۔ لیکن جنگ کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے تمام معرکے ابھی باقی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں اس پروگرام کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ایک ایسا پروگرام تھا جو صرف ایک ہی عمل میں لایا جا سکتا تھا اگر چل گیا تو چل گیا۔ نہیں تو پھر کسی دوسرے پروگرام کی جستجو کرنی چاہیے۔ یا یہ اخلاق اور مذہب کی دعوت کی طرح ایک دائمی اور غیر متغیر دعوت ہے۔ جسے کسی غیر معلوم وقت تک کے لیے ہمیں کہتے رہنا چاہیے۔ ہمارا مقصد اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام ملک یا ملک کا غالب حصہ اس پر پورا پورا عمل کرے گا۔ اگرچہ ایسا وقت کتنی ہی مدت کے بعد آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کر لینا چاہیے۔ میں سوال کے ان دونوں پہلوؤں کا جواب نفی میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ نہ تو اس معنی میں محض ایک ہنگامی اور ایک ہی مرتبہ تجربہ میں آنے والا عمل تھا۔ جو سوال کے ایک پہلو میں نظر آتا ہے اور نہ اس معنی میں دائمی اور غیر تغیر پذیر جس کا رجحان دوسرے پہلو میں پایا جاتا ہے۔ دونوں دو انتہائی پہلو اختیار کر لیے گئے ہیں اور اصلیت دونوں کے درمیان ہے۔ اس میں اعتقاد کا استحکام بھی ہے اور دستور العمل کی تغیر پذیری بھی۔ فرض اور ضرورت دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔

لیکن اس کے صاف صاف فیصلے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ اس پروگرام کے طریق عمل کی ترتیب پر غور کر لیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بارے میں اپنے وہ خیالات آپ کے سامنے رکھ دوں جو نو ان کو آپریشن کے پروگرام کے اولین دن سے

آج تک بلاتغیر میرے سامنے رہے ہیں۔نوان کوآپریشن کا پروگرام قبل اس کے کلکتہ کے اسپیشل اجلاس میں منظور ہوکر پوری طرح مرتب ہو چکا تھا۔سب سے پہلی مرتبہ جس کمیٹی نے اس پر غور کیا وہ اسی دہلی میں مارچ 1930ء میں منعقد ہوئی تھی۔اس میں مہاتما گاندھی کے ہمراہ لالہ لاجپت رائے جی، حکیم اجمل خاں صاحب اور میں غور ومشورہ میں شریک تھے۔میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تاریخ سے لے کر آج تک مجھ پر کوئی وقت ایسا نہیں گزرا ہے جب مجھے اس کا خیال بھی ہوا ہو کہ یہ اس سوال کے دونوں انتہائی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کا نام ہے۔

اس پروگرام کی بنیاد اصل یہ ہے کہ ہم ہندستان کی موجودہ مسلح بیوروکریسی کے مقابلہ میں غیر مسلح اور مسلمی (نوان وائیلنٹ) جدوجہد کے ذریعہ ایسی فتح مندی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ ہندستانی قوم کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے ہم نے ''ہندستان کی مرضی'' کو خلافت اور سوراج سے تعبیر کیا ہے۔لیکن فی الحقیقت ہمارا معاملہ ان بہت سے لفظوں میں نہیں بلکہ اسی ایک لفظ میں مضمر ہے۔ہر ملک کی طرح ہندستان کے لیے بھی آج جس سوال کا فیصلہ درپیش ہے وہ صرف یہ ہے کہ قوم کی مرضی یا کوئی ایسی حکومت جو فوجی طاقت کے ذریعہ منوائی گئی ہو؟

یہ غیر مسلح جدوجہد کیوں کر عمل میں لائی جائے؟ تو بلاشبہ اس سوال کے جواب میں وہ ہمیں ایک ایسی بات کی طرف بلاتا ہے جو محض ضرورت اور وقت کا مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک مستحکم اعتقاد بھی ہے۔وہ کہتا ہے کہ ہمیں موجودہ نظام حکومت کی شرکت عمل سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔اس لیے کہ ہمیں ایسے اقتدار کا ساتھ نہیں دینا چاہئے اور اس لیے کہ ہم کنارہ کش ہوکر اسے اس طرح گرا سکتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلہ کے ناقابل ہو جائے۔اس کا یہ مطالبہ فرض اور ضرورت دونوں پر مشتمل ہے۔وہ مذہب، اخلاق، تجربہ اور تاریخ سب کی متفقہ صداقت ہے۔ہمیں اس ناانصافی کے

لیے آلہ عمل نہیں بننا چاہئے جو ہمارے ساتھ کی جا رہی ہے۔اس اعتقاد سے کس انسان کو انکار ہوسکتا ہے۔ تجربہ اور تاریخ کی قطعی شہادت ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے کسی اجنبی اقتدار سے کوآپریشن کر کے اپنی آزادی حاصل نہیں کی ہے اور نہ کسی کو یہ متاع بطور عطیہ کے ملی ہے۔ یہ حاکمانہ اقتدار کی فطرت ہی کے خلاف ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے؟

شرکت عمل کی یہ علیحدگی اگر بیک وقت پوری طرح عمل میں آجائے تو کسی عقل کو بھی اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ سورج کے ایک طلوع وغروب کے اندر ہندستان کی تاریخ پلٹ دی جاسکتی ہے۔لیکن کیوں کرعمل میں آئے؟ اس آسانی کی ساری دشواری اسی سوال میں پنہاں ہے۔اس جنگ میں جو جنگ ہونے کے ساتھ بھی جنگ نہیں ہے اگر جنگ کی کوئی تیاری ہے تو یہی ہے۔

میں دشواریوں کی تفصیل میں نہ جاؤں گا لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ ان ہی دشواریوں کالحاظ رکھ کر اس نے ایسا طریق کار اختیار کیا ہے جو تمام دشواریوں کو حل کر دیتا ہے وہ اپنی کامیابی کے لیے کسی ایسے وقت کا انتظار بالکل ضروری نہیں سمجھتا جب ملک کے تمام کوآپریٹر نوان کوآپریٹر ہو جائیں یا ایک بڑی اکثریت اس کے پروگرام پر عمل کرے۔ بلکہ اس نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس کے لیے صرف ایک خاص مقدار کا عمل کفایت کرتا ہے۔اگر اتنی مقدار مہیا ہو جائے تو وہ گو بقیہ کا بھی خواہش مند رہے گا۔لیکن اس کے انتظار میں رکے گا نہیں۔

صورت اس کی یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک جنگ کے لیے مواد کا مہیا کرنا اور ایک خود جنگ کا معرکہ، جنگ کے سروسامان کے لیے اسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔اور اس اسپرٹ کی جو وہ اپنی غیر مسلح جنگ کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ جنگ کے میدان کے لیے اسے ایسے مناسب تصادم کی

ضرورت ہے جواس کی سلبی (بازنیو) قوت اور دفتری اقتدار میں پیدا ہو جائے اور جو بالآخر ایک فیصلہ کن معرکہ کی طرح نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پہلی غرض کے لیے اس نے وہ پروگرام اختیار کیا ہے جس میں وہ سرکاری درباروں، تعلیم گاہوں اور عدالتوں سے نوان کو آپریشن کی دعوت دیتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہے کہ آپریشن کی ان ہی بستیوں میں ایسے آدمی موجود ہیں جو دفتری اقتدار اور قومی جدوجہد دونوں کے لیے بہترین سپاہی ہو سکتے ہیں۔ پس وہ ان کو بلاتا ہے تاکہ ایک طرف حریف کے قبضہ سے اس کی بہترین فوج نکل جائے دوسری طرف اس کی جنگ کے لیے بہترین سپاہی مہیا ہو جائیں۔ جب اس دعوت کے ذریعہ ایک تعداد فراہم ہوگئی تو گویا اس نے اپنی پہلی فوج تیار کرلی۔ اب یہی فوج اس کی تمام جدوجہد کے لیے اصلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کی تمام آئندہ امیدیں ملک سے نہیں بلکہ اسی جماعت سے وابستہ ہیں۔

یہ پہلی فوج ایک طرف بلا انتظار جنگ شروع کردے گی۔ دوسری طرف اپنی دعوت اور عملی نمونہ کی تاثیر سے وقتاً فوقتاً نئی نئی جماعتوں کو بھی اپنے میں جذب کرتی جائے گی۔

دوسری غرض کے لیے اس نے مقاومت سلبی یا سول ڈس اوبیڈینس کا پروگرام اختیار کیا ہے۔ یہی اس کی اصلی جنگ ہے اور اسی پر اس کے مقصد کا فیصلہ موقوف ہے۔

پس اس طریق عمل نے اس سوال کو بالکل غیر ضروری کردیا ہے کہ تمام ملک نوان کو آپریشن پر ایک معین وقت کے اندر عمل کر سکے گا یا نہیں۔ اور اگر ایک بڑی تعداد اس پر عمل کر کے عدالتوں اور کالجوں سے نکل بھی آئی تو ہم اسے اپنی جاری جنگ کے ہر وقت میں یکساں استقامت کے ساتھ اپنے ساتھ رکھ سکیں گے یا نہیں؟ اگر تمام ملک

عمل نہیں کرسکتا تو نہ کرے۔ اگر بہت سے لوگ اس پر عمل کر کے قائم نہیں رہ سکتے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ نوان کو آپریشن کو اس پر افسوس ہوگا مگر ہراس نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ بطور ایک اعتقاد اور فرض کے سب کو بلاتا ہے لیکن بطور ایک جدوجہد کے پروگرام کے وہ کسی ایسی مکمل اور یکساں حالت کا بالکل محتاج نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ جماعت کے اعمال عقل واستدلال کے تابع نہیں ہیں۔ تمام تر جذبات کی مخلوق ہیں۔ جماعت یا تو دوڑتی ہے یا بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یکساں رفتار سے چلتی رہے۔ پس یہ ناگزیر ہے کہ اتار چڑھاؤ ہوتے رہیں۔ جب کبھی ایک خاص طرح کی فضا پیدا ہو جائے گی ایک اشارے پر ہزاروں قدم دوڑتے آئیں گے۔ پھر جب وہ بدلے گی تو بار بار کے بلاوے پر بھی ایک قدم جنبش نہ کرے گا۔

ایسی فضا کیوں کر پیدا ہوسکتی ہے؟ صرف جنگ سے، اس کی جنگ سول ڈس اوبیڈینس ہے۔ پس اگر وہ کسی بات کے لیے فکر مند ہے تو وہ صرف اس کی پہلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کے میدان کی فتح وشکست کا دارومدار اس کی اخلاقی فتح وشکست پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پہلی فوج خواہ کتنی کم تعداد میں ہو لیکن اپنے اندر کمیت نہیں بلکہ کیفیت کی طاقت پیدا کرلے۔ وہ نوان کو آپریشن کا اپنے آپ کو مجسم عملی نمونہ بنالے پہاڑ کی طرح اٹل اور سمندر کی طرح لبریز ہو جائے۔ وہ قربانیوں پر قربانیاں کرتی جائے اور عملی نمونہ کی کشش اور گیرائی سے ملک کی غفلت اور اعراض کو شکست دے دے۔ اس کو یقین ہے کہ اگر ایسی جماعت ملک میں قائم ہوگئی اور اس نے اپنی جنگ جاری رکھی تو یہ اس طرح کی کش مکش کے نفسیات کا قانون ہے کہ بہت جلد جنگ کے معرکوں کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ اور جوں ہی ایسے معرکوں کی فضا پیدا ہوئی پھر خود بخود ہزاروں لاکھوں قدم اس کی طرف بن بلائے دوڑیں گے۔ اس کے لیے سپاہیوں کی کمی نہیں رہے گی۔

اگر پہلے مقابلہ میں وہ نتیجہ حاصل نہ کرسکی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی ہراساں نہ ہوگی کہ اب سپاہی اپنے بستروں پر واپس جا چکے ہیں۔ وہ اپنا کام جاری رکھے گی۔ اس وقفہ کو اس طرح خرچ کرے گی تاکہ جلد از جلد دوسرے مقابلہ کے لیے فضا مہیا ہو جائے۔ پھر جب ایسی فضا مہیا ہو جائے گی۔ وہ مقابلہ کا اعلان کر دے گی اور اس کو یقین ہے کہ وہ سب جو بستروں پر لیٹ چکے ہیں اچانک میدان میں کھڑے نظر آئیں گے۔

البتہ اس کا پروگرام بالطبع ایک محدود وقت کے اندر نتیجہ حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ لمبے لمبے وقتوں کا نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے اندازہ کیا تھا کہ پہلے مقابلہ کا نتیجہ سال بھر کے اندر نکل آنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ترتیب عمل کے واضح ہو جانے کے بعد اب اس سوال کا جواب خود بخود مل جاتا ہے جو موجودہ مباحثہ نے پیدا کر دیا ہے۔ سوال کے دونوں پہلو اصلیت سے منحرف ہیں۔ نہ تو یہ پروگرام کوئی ایسا پروگرام تھا جو صرف ایک مرتبہ عمل میں لا کر ترک کر دیا جائے اور نہ یہ صحیح ہے کہ نتائج اور حالات سے بالکل آنکھیں بند کر کے محض ایک اخلاقی اصول کی طرح اس کا وعظ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کا نصف حصہ خود جنگ نہیں ہے بلکہ جنگ کے لیے سپاہیوں کی طلب ہے اور وہ ہمیں اس طرح بار بار کام دے گا جس طرح بار بار ہم فیصلہ کن معرکے گرم کریں گے۔ بقیہ نصف اصل جنگ کا میدان مہیا کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی مرتبہ فیصلہ کن ہو۔

یہاں سے یہ بات بھی ضمناً واضح ہوگئی کہ نوان کو آپریشن کی ذہنیت کی نسبت غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں وہ کس قدر دور از کار ہیں! کہا گیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و علوم کے برخلاف ایک چیلنج ہے۔ وہ سیاسی جدوجہد کی جگہ ایک نئے مذہب اور اخلاق کا

وعظ ہے۔ وہ ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دے کر دنیا میں تقدم کی جگہ واپسی کی خواہش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ ہمارے خیالات کی ایسی تعبیر ہے جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔

دراصل تمدن، تعلیم اور معیشت کے سوالوں سے اسے براہِ راست کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بلاشبہ ہندستان میں مغربی تہذیب وتمدن کے محاسن اور نقائص کی نسبت مختلف قسم کی رائیں موجود ہیں۔ خودی یورپ اور مریکہ کا ذہنی سکون جنبش میں آچکا ہے اور نئے نئے اصولوں اور خیالات کے سیلاب امنڈ آئے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ٹالسٹائی کی طرح خود مہاتما گاندھی کے بھی اس بارے میں خاص خیالات ہیں۔ لیکن نوان کوآپریشن اپنے مقصد کے سوا اور کوئی رائے نہیں رکھتا۔ وہ اپنے پیرووں کو نہ تو کوئی مذہبی اعتقاد سکھاتا ہے نہ ترک دینا اور زہد وعبادت کی ایک نئی خانقاہ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح ایک سیاسی دستور العمل ہے جس کی بنیاد حقیقت اور سچائی ہے۔ اس لیے مذہب، اخلاق، تاریخ سب کی نگاہیں یکساں طور پر اسے پہچانتی ہیں اور اپنی اپنی زبان میں پکارتی ہیں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ سرکاری تعلیم گاہیں اور قانون کی پریکٹس چھوڑ دو تو اس لیے نہیں کہ وہ یوروپین علوم اور قانون کی پریکٹس کا مخالف ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اس اقتدار کا مخالف ہے جس کے ماتحت وہاں رہنا اور اس کی اعانت کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ کھدر پہن لو تو یہ اس لیے نہیں کہ وہ قیمتی لباس یا کسی خاص وضع قطع کا مخالف ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ غیر ملکی لباس پر ملکی لباس کو ترجیح دیتا ہے۔ اور نیز اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ ملک کو اپنی آزادی اور نجات کے لیے طرز معیشت کی سادگی اور ضبط نفس کی اخلاقی روح کی ضرورت ہے۔

آیئے اب غور کریں ہماری موجودہ حالت کیا ہے؟ ہم نے پروگرام کے پہلے حصے کے مطابق لوگوں کو بلایا۔ وہ آئے اور ایک پہلی اور مرکزی جماعت تیار ہوگئی۔ پھر

اس کے دوسرے حصہ کے مطابق حالات نے جلد تصادم کی فضا بھی مہیا کر دی اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ یہ دسمبر 1921ء کی بات ہے۔ اب نہ صرف ہمارے لیے بلکہ دنیا کے لیے یہ سوال نہایت اہم ہے کہ یہ پروگرام کہاں تک کامیاب ہوا۔

لیکن کامیابی کی جانچ کا ٹھیک معیار کیا ہے؟ دو چیزیں ہیں دونوں کی کامیابی کا ایک معیار نہیں ہوسکتا۔ ایک نوان کو آپریشن کا دستور العمل ہے۔ ایک ہماری وہ جدوجہد ہے جو اس پر عمل پیرا ہوکر ہم نے حاصل کی ہے۔ اگر ہم اپنی جدوجہد میں اپنا آخر مقصد حاصل نہ کر سکے تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی ذمہ داری دستور العمل کے سر عائد ہو۔ بحثیت ایک عملی پروگرام کے اس کی کامیابی یہ ہے کہ تجربہ سے اس کے قابل عمل، مؤثر اور نتیجہ خیز ہونے کی شہادت مل جائے تو پھر اس کی کامیابی کے لیے کوئی بات نہیں رہ جاتی۔ اگر چہ ہمارے لیے کامیاب ہونا باقی رہ جاتا ہے۔

باقی رہی ہماری جدوجہد کی کامیابی تو مجھے اس سے بھی انکار ہے کہ اس کے لیے آخری مقصود کا پالینا معیار ہوسکتا ہے۔ آخری مقصود کا پالینا صرف کامیابی ہی نہیں ہے بلکہ آخری کامیابی ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس سے پہلے متعدد کامیابیاں حاصل کر لی جائیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ کامیابیاں ہم حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرات! میں بلا کسی تامل کے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرے یقین میں پروگرام کامیاب ہوا بلکہ اس نے وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے جو کسی ایک پروگرام کے لیے ہوسکتی ہے اگر اب سے تین برس پہلے وہ ایک اصول تھا جس کی کامیابی استدلال سے واضح تھی تو اب وہ ایک تجربہ میں آیا ہوا یقین ہے جس کی کامیابی مشاہدہ نے ثابت کر دی ہے۔

ایک منٹ کے لیے ان تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کو اپنے سامنے لایئے جو اس کی راہ میں حائل تھیں۔ اس تھوڑے سے وقت کا بھی خیال کیجئے جو اس کو تعلیم، تیاری

اور عمل تینوں منزلیں طے کرنے کے لیے ملا۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ راہ آزادی میں یہ ملک کا پہلا عملی قدم تھا۔ پھر دیکھئے کہ کیسے حیرت انگیز نتائج کا کیسا عظیم سلسلہ آپ کے سامنے موجود ہے؟ کیوں کر ممکن ہے کہ ہم اس کی ناکامیابی کا خیال بھی کرسکیں؟ اس کی کونسی بات ہے جس پر عمل نہ ہوسکا اور کون سا عمل ہے جس نے کامیاب اثر نہیں دکھلایا؟ کیا بے شمار آدمیوں نے سرکاری انسٹی ٹیوشنوں کو نہیں چھوڑا؟ کیا ان تمام دنیوی فائدوں اور راحتوں سے دست بردار نہیں ہو گئے جو انھیں حاصل ہو رہی تھیں؟ کیا تمام ملک میں ایثار اور قربانی کا عام ولولہ نہیں پیدا ہو گیا؟ کیا ہزاروں آدمی خوشی خوشی جیل خانوں میں نہیں چلے گئے؟ کیا حکومت کا پورا مسلح نظام اس سے عاجز نہیں آ گیا کہ پرنس آف ویلز کے ورود کے موقع پر ہڑتال کی ایک دکان کا تختہ بھی کھلوا سکے؟ کیا 1921ء کی ہر صبح اور ہر شام نے اس کی شہادت نہیں دے دی کہ ہندستان میں بھی قوم کی مرضی ہے اور وہ میدان میں نمایاں ہوسکتی اور مقابلہ کے لیے کھڑی ہوسکتی ہے؟

قوموں کا انقلاب پہلے سطح پر نہیں بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے اس نے بارہ مہینے کے اندر ہندستان کا دماغ پلٹ دیا۔ قوم کے تمام طبقوں اور جماعتوں کی سیاسی استعداد دفعتاً بلند کردی۔ براعظم کے ایک ایک فرد تک آزادی اور وطن پرستی کا پیغام پہنچا دیا۔ ہزاروں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب طاری کردیے، راہ آزادی کی سزاؤں اور تکلیفوں کا خوف ملک کے دل سے اس طرح نکال دیا کہ قید ہونا کھیل اور سزا دینے والی عدالتیں تماشا گاہ بن گئیں۔

غرض کہ آزادی کی جدوجہد کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا دروازہ اس نے ملک پر نہ کھول دیا ہو۔ اگر یہ تمام باتیں کل تک کے واقعات ہیں تو پھر اس بات کے لیے اور کیا چاہئے کہ پروگرام صحیح ہے، عملی ہے اور اپنی تاثیر میں بے خطا ہے

؟ تو ان کو آپریشن نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ قدیم روایتوں کے معجزے دکھلائے گا۔ اس کا عاجزانہ اعلان یہ تھا کہ اس پر چل کر ملک بلا اسلحہ کے ایسی طاقت پیدا کر سکتا ہے جو دفتری اقتدار کے لیے نا قابل تسخیر ہوگی۔ پھر کیا یہ تمام نتائج اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں؟

اگر سوال کیا جائے کہ ہماری جدوجہد میدان جنگ میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکی؟ تو اس کے جواب کے لیے ہمیں دسمبر 1921ء کے واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ جب دفتری اقتدار نے کریمنل لا امنڈمنٹ ایک ایکٹ نافذ کر کے ڈیفنس سول ڈس اوبیڈنیس کی راہ صاف کر دی تھی۔ فی الحقیقت یہی جدوجہد کا اصلی معرکہ تھا۔ میں اس کی تاریخ کا یہ واقعہ یہاں ثبت کرتا ہوں کہ 2/دسمبر کو مقابلہ شروع ہوا اور ابھی دو ہفتے پورے نہیں گزرے تھے کہ دفتری اقتدار پر شکست کے آثار طاری ہو گئے۔ حتیٰ کہ اسے مجبوراً جدوجہد کی طاقت کا کھلا اعتراف کرنا پڑا اور اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ التوائے جنگ یا صلح کے لیے آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ بالکل تیار تھا کہ جدوجہد سے ایک مقابل حریف کی طرح معاملت کرے۔ دونوں میں سے کسی فریق کے لیے ہار جیت کا سوال نہ ہو۔ دونوں عارضی طور پر اپنی اپنی کارروائیوں کو ملتوی کر دیں۔ گورنمنٹ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کا نفاذ اٹھا لے اور قیدیوں کو رہا کر دے۔ کانگریس پرنس آف ویلز کے ورود کا مقاطعہ ملتوی کر دے۔ اس کے بعد راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہو اور وہ جدوجہد کے مطالبات پر غور کرے۔ ہز ایکسیلینسی وائسرائے نے 21/دسمبر کو کلکتہ میں ایک وفد کا جواب دیتے ہوئے ان ہی شرائط پر زور دیا تھا اور بار بار طلب و تمنا اور صلح و صفائی کے لیے ایسے لب و لہجہ میں جس کا دفتری اقتدار کبھی عادی نہیں ہوا اپنی انتہائی خواہش ظاہر کی تھی کہ التوا اور صلح کی صورت نکل آئے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اسے جدوجہد کی کوئی بہت بڑی فتح مندی سمجھتا ہوں۔ ہمارا مقصد بلند ہے اور ضروری ہے کہ اسی مناسبت سے ہماری کامیابی کا معیار بھی بلند ہو۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی چیز نہیں ہے کہ ہم سے صلح کی ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی جس کے ساتھ کوئی وعدہ نہ تھا۔ البتہ میں اسے جدوجہد کی ابتدائی کامیابی ضرور یقین کرتا ہوں۔ اس نے دکھایا کہ ہمارا طریق عمل کس قدر رزوداثر اور بے خطا ہے اور کس طرح وہ دو ہفتہ کے اندر اغماض اور گھمنڈ کی جگہ اعتراف اور طلب کی تبدیلی پیدا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

حضرات! ہر قومی جدوجہد کی تاریخ میں جہاں اس کی بہت سی باتیں یادگار ہوتی ہیں وہاں چند غلطیوں کا بھی ذکر ضرور ملتا ہے۔ ان غلطیوں کا ہونا گویا اس طرح کی حالت کی ایک قدرتی بات ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ باردولی کا فیصلہ ہماری جدوجہد کے لیے ایک ایسی ہی غلطی تھی۔ ہم اس پر اپنے تاسف کو تو روک نہیں سکتے۔ لیکن ہم اسے اس طرح محسوس کرتے ہیں گویا ایک ہونے والی بات تھی۔ اس سے ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے تھے۔ دراصل باردولی کے فیصلہ پر ہماری جدوجہد کا پہلا فیصلہ کن معرکہ ختم ہو گیا اور اس وقت سے ہم ایک ایسے وقفہ جنگ کی حالت میں ہیں جس میں جنگ تو قائم ہے لیکن مقابلہ کے لیے وقفہ پیدا ہو گیا ہے۔

حضرات! گزشتہ جنوری میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے سب سے زیادہ ضروری خدمت یہ ہے کہ اس اختلاف کے دور کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے ذاتی خیالات ظاہر کر کے کوئی خاص جانب اختیار کرنے سے پرہیز کروں۔ اس لیے مجھے اس وقت تک کوئی موقع نہیں ملا کہ اصلی مسئلہ کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کرتا۔ آج پہلا موقع ہے کہ اس بارے میں زبان کھولتا ہوں۔ اس اختلاف نے دو جماعتیں قائم کر دی ہیں۔ ان

دونوں میں میرے ایسے محترم احباب موجود ہیں جن کی قابلیت اور خدمت کی میرے دل میں ویسی ہی عزت ہے جیسی ہر باشندۂ ہند کے دل میں ہونی چاہئے۔ تاہم یہ بات اس سے مانع نہیں ہوسکتی کہ میں اپنے خیالات کو صاف صاف عرض کردوں۔ کیوں کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو علاوہ ادائے فرض کی کوتاہی کے یہ اس اعتماد کا بھی صحیح استعمال نہ ہوگا جو آج آپ نے مجھ پر ظاہر فرمایا ہے۔

سب سے پہلی بات جو اس اختلاف کی نسبت میں عرض کروں گا یہ ہے کہ اوّل روز سے جس قدر اہمیت اس مسئلہ کو فریقین کی جانب سے دی گئی ہے۔ مجھے کلیتاً اس سے اختلاف ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ دراصل ہماری تمام موجودہ مشکلات کی اصل بنیاد اسی غلطی میں پنہاں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب کبھی کوئی اختلاف رائے پیدا ہو۔ ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دیکھیں یہ اختلاف اصول کا ہے یا فرع کا؟ اس کا اثر کسی جڑ پر پڑتا ہے یا محض شاخ پر؟ اگر وہ اختلاف اصول کا اختلاف ہے تو بلاشبہ ہمارا فرض ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ثبات واستقامت اس میں ظاہر کریں۔ نرمی اور درگذر کی اس میں گنجائش نہیں ہوسکتی۔ کثرت وقلت رائے کا سوال اس کے لیے خارج از بحث ہے۔ ڈسپلن کا سوال بھی اس پر مؤثر نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر وہ محض ایک شاخ کا اختلاف ہے تو پھر صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں بھی ہمیں اپنی رائے میں کمزور ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن عمل میں اتنا سخت نہ ہونا چاہئے کہ کسی طرح کی لچک قبول نہ کریں۔ ضرورت ہوگی تو ہم اس سے قطع نظر بھی کرلیں گے۔ کوئی بڑی مصلحت سامنے آجائے گی تو اس چھوٹی چیز کو اس پر قربان بھی کردیں گے۔ جماعت کا ساتھ مجارٹی کا اتباع، نظام کا ڈسپلن، سب اس سے اوپر رہیں گے۔ اس کے لیے چھوڑ نہیں دیے جائیں گے۔ عزم اور ثبات یقیناً انسان کے لیے اول درجہ کے اوصاف ہیں۔ مگر اسی حال میں جب کہ اپنے

صحیح محل پر خرچ کیے جائیں اور صحیح تعداد میں خرچ کیے جائیں میں بلا کسی تامل کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا اختلاف نوان کوآپریشن کے لیے قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ نوان کوآپریشن بحیثیت ایک اصول کے کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کوئی شخص اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ پروگرام کی دفعات ہیں۔ جن میں کالج، عدالت اور کونسلوں کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ یقیناً وہ سرکاری کالجوں کو چھوڑ دینے یا کونسلوں کے ووٹروں کو ووٹ دینے سے روکنے ہی کا نام نہیں ہے۔ وہ ان سب سے بالاتر کوئی چیز ہے اور وہی نوان کوآپریشن ہے۔

لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ اختلاف نوان کوآپریشن میں نہ تھا۔ اس بارے میں نہ تھا کہ ہمیں کونسلوں کے دوسرے انتخاب کے موقع پر بھی وہی طرز عمل اختیار کرنا چاہئے جو پچھلی دفعہ اختیار کیا تھا یا اس میں تبدیلی کرنی چاہئے؟ میں بالکل یہ سمجھنے سے عاجز ہوں کہ نوان کوآپریشن کی مضبوط سے مضبوط پابندی کے ساتھ کیوں اس بارے میں دو رائوں کی گنجائش نہیں ہے؟ یہ تو صرف پروگرام کی ایک دفعہ کا اختلاف تھا۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ کیوں پورے پروگرام کی تبدیلی وعدم تبدیلی کا سوال بھی نوان کوآپریشن کے لیے ایک اصولی سوال سمجھا جائے؟ نوان کوآپریشن کی اصل صرف یہ ہے کہ ہم موجودہ دفتری اقتدار سے اشتراک عمل نہیں کر سکتے۔

پس جب ایک شخص نے اس سے اتفاق کیا تو وہ نوان کوآپریٹر ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کس طرح یہ بات بطور ایک قومی حرکت کے عمل میں لائی جائے؟ تو اس کے لیے جو کچھ بھی ہم طے کریں گے وہ ضرور واجب العمل ہے۔ لیکن بہرحال اصل نہیں ہے۔ فرع ہے۔ مقصود نہیں ہے وسیلہ ہے اور اگر اس میں اختلاف رائے ہو تو وہ کبھی اس اہمیت کا مستحق نہیں ہو سکتا جو اصولی اختلاف کو دی جا سکتی ہے۔

آزادی ہمارا مقصد ہے۔ عدم تشدد اور نوان کوآپریشن ہمارا اصول ہے اور حصول

مقصد کے لیے ہم نے ایک پروگرام اختیار کیا ہے۔ جس کی ہر دفعہ ایک وسیلہ ہے، مقصد ہے، ہم اعتقاد نہیں بدل سکتے۔ ہم اصول نہیں ترک کر سکتے۔ لیکن ہم وسائل میں ہر آن اور ہر لحہ تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اگر اس تبدیلی سے ہمیں انکار ہوگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ سے انکار کر دیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اس اختلاف نے ایسی اہمیت فریقین میں حاصل کر لی گویا یہ ایک اصولی اختلاف ہے اور دونوں طرف سے اس پر اس قدر قوت خرچ کی گئی گویا قومی جدوجہد کا جینا مرنا اسی پر موقوف ہے۔ ایک طرف سے کہا گیا کہ یہ خود نوان کو آپریشن کا اختلاف ہے۔ حالانکہ اگر نوان کو آپریشن کا اصول اس قدر تنگ مان لیا جائے تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ دنیا میں نوان کو آپریشن کا کوئی عمل چند دنوں سے زیادہ نہیں جی سکتا۔ دوسری طرف اس بات پر اس قدر زور دیا گیا کہ اس کی وجہ سے کانگریس کی متحدہ قوت کا تفرقہ گوارا کر لیا جائے۔ حالانکہ اگر اس طرح کے جزئی اختلاف کی بنا پر تفریق اور جماعت بندی درست تسلیم کر لی جائے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

بہر حال جو اہمیت اس معاملہ کو دی گئی مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ مسئلہ ہرگز ایسا نہ تھا جس کی خاطر ہم اپنا اتحاد، اپنی سرگرمی اور اپنا وہ سب کچھ جو ہم نے حاصل کیا ہے خطرہ میں ڈال دیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ گیا کانگریس میں آپ نے خواہ یہ فیصلہ کیا ہوتا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ خواہ یہ کیا ہوتا کہ ان پر قبضہ کرنا چاہئے۔ جو کچھ بھی ہوتا، لیکن اگر آپ متفق رہتے تو آج ان مشکلات کا نام ونشان نہ ہوتا۔ جن کی وجہ سے جدوجہد کا ایسا قیمتی برس جیسا کہ 23ء ہے بالکل ضائع ہوگیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے فتور کا بھی اصلی باعث کیا ہے؟ میں عرض کروں گا صرف آپ کا یہ اختلاف اور اختلاف کی وجہ سے ملک کی بے کاری۔ لوگوں کے لیے جب وہ اصلی

کام باقی نہ رہا جس میں سب کے دل اٹک گئے تھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ آپس میں ٹکرانے لگیں۔ آپ جب کہ طریق عمل کی ایک خاص صورت کے لیے اس قدر طاقت خرچ کر رہے ہیں تو ایک لحہ کے لیے اس حقیقت کو بھی یاد کر لیجئے کہ کامیابی کا دارو مدار محض ہتھیاروں اور راستوں کی نوعیت پر نہیں ہے۔ بلکہ خود فوج کی طاقت پر ہے۔ یہ بات کہ ہتھیار کیسے ہوں؟ ایک دوسرے درجہ کا سوال ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ سپاہی کیسے ہوں اور ان کی اخلاقی حالت کیسی ہو؟ ہتھیار کے لیے صرف اتنا دیکھ لینا بس کرتا ہے کہ کاٹ رکھتا ہو۔ اگر وہ بہتر قسم کا نہیں ہے تو مضائقہ نہیں۔ فوج میں ایکا اور مضبوطی ہونی چاہئے۔ ایک متحد فوج خراب ہتھیاروں کے ساتھ بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن اچھے سے اچھے ہتھیار بھی منتشر اور بے دل سپاہیوں کو جیت نہیں دلا سکتے۔ ہم ایک برس سے صرف اتنی بات پر لڑ رہے ہیں کہ ہتھیار کیسا ہو؟ لیکن اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ فوج کا کیا حال ہو رہا ہے۔ اگر فوج ہی منتشر ہو گئی تو آپ کو اچھی سے اچھی بندوق بھی کیا کام دیگی؟ مان لیجئے کہ کونسلوں کا بائیکاٹ ہی سب سے بڑا کام ہے۔ یا کاؤنسلوں پر قبضہ کرنے میں دنیا جہان کی فتح ہے تاہم جب آپ کی کوئی متحدہ طاقت ہی نہ رہی۔ آپ کا نظام الٹ گیا۔ کسی قومی مرکز کا ڈسپلن قائم نہ رہا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد میں رخنے پڑ گئے تو فرمایئے آپ بائیکاٹ کیوں کر کریں گے؟ کونسلوں کی نشستوں پر کیوں کر قابو پائیں گے؟

حضرات! ہمارے لیے محافظت کی اصلی چیز جزئیات نہیں ہیں۔ اصول ہیں۔ پس یہ کسی طرح صحیح طرز عمل نہ ہوگا کہ ہم کسی جزئی مسئلہ کے جوش میں اس قدر دور چلے جائیں کہ اس کی وجہ سے نئے نئے اصولوں کے قائم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور وہ آگے چل کر ہمارے لیے اصولی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس اختلاف نے جب دو جماعتیں قائم کر کے فریقانہ بحث و نزاع کی شکل اختیار کر لی تو یہ ناگزیر تھا کہ افراط

وتفریط کی طرف میلان پیدا ہو۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے اپنے دل ودماغ کی نگہبانی کریں۔ ہمیں کبھی کورانہ تقلید کی دعوت نہیں دینی چاہئے۔ لیکن ہمیں ہمیشہ اطاعت (ڈسپلن) میں مضبوط رہنا چاہئے۔ تقلید سے مقصود ایسی دماغی حالت ہے جب کہ انسان کسی بڑے آدمی کی پیروی کرتا ہوا اعتدال سے گزر جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنے ذہن ودماغ سے کام لے۔ محض ایک شخص کا قول اس کے لیے حق وباطل اور صحیح وغلط کا معیار بن جاتا ہے۔ مذہب اور علم دونوں کے راستہ میں اس طرح کی تقلید انسانی ترقی وسعادت کے لیے سب سے بڑی روک ثابت ہوئی ہے اور ہمیں کبھی نہیں چاہئے کہ سیاست کو بھی اس سے آشنا کریں۔ برخلاف اس کے اطاعت سے مقصود ایسی پیروی ہے جو ایک سپاہی اپنے کمانڈر کی کرتا ہے۔ جس طرح تقلید ہر طرح کی ترقی وکامیابی کے لیے روک ہے اسی طرح اطاعت ہر جماعتی عمل کے لیے پہلی شرط ہے ممکن ہے کہ کمانڈر نے حکم دینے میں غلطی کی ہو لیکن سپاہی اس کے خلاف رائے رکھ سکتا ہے۔ مگر خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اگر ہمارے کمانڈر کا حکم غلط بھی ہو۔ جب بھی ہمیں چاہئے کہ سباسٹوپول کی اس انگریز رجمنٹ کی طرح جس کی بربادی کا مرثیہ ٹینی سن نے لکھا ہے کٹ جائیں لیکن اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ ایک حکم کی غلطی کا جھیل لینا اس سے بہتر ہے کہ پوری فوج کا ڈسپلن غارت ہو جائے۔

آج انڈین نیشنل کانگریس ہماری تنہا حکمران جماعت ہے۔ ہم جنگ کی سی حالت میں ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ خواہ کانگریس کا فیصلہ ہو یا ہمارے بڑے سے بڑے لیڈر کی رائے، ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں اطاعت سے باہر بھی نہ ہونا چاہئے۔ جو جماعت تبدیلی کی مخالف ہے۔ وہ اس میں احتیاط نہیں کرتی کہ کہیں تقلید وجمود کی طرف قدم نہ بڑھ جائیں۔ اور جو جماعت تبدیلی پر مصر ہے وہ اس بات پر توجہ نہیں کرتی کہ ایک جزوی اختلاف کی وجہ سے ہمیں

اپنے نظام کے ڈسپلن سے باہر نہ ہونا چاہئے۔

حضرات! مجھے اب اجازت دیجئے کہ میں موجودہ حالت اور آئندہ طریق عمل کی نسبت اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میرا یقین ہے کہ ہندستان کے لیے مہاتما گاندھی کی رہنمائی ایک سچی رہنمائی ہے۔ اگر ہندستان آزادی اور نجات حاصل کرسکتا ہے تو صرف ان ہی کی رہنمائی سے۔ ہندستان کے لیے آج صرف تین راہیں ہیں۔ یا موجودہ حالت پر قانع رہے یا مسلح انقلاب کرے۔ یا نو ان کوآپریشن پر عمل کرے۔ ہم موجودہ حالت پر قانع نہیں رہ سکتے۔ ہم مسلح انقلاب نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے صرف تیسری راہ سچائی ہے اور وہ نو ان کوآپریشن ہے۔

باقی رہا اس کا پروگرام، تو اس وقت تک کوئی بات ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی ہے جس کی وجہ سے کسی اصولی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ البتہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہمارا پہلا مقابلہ ہو چکا۔ ہم اس وقت ایک وقفہ جنگ کی حالت میں ہیں اور ہمیں آئندہ مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہئے۔ ہمارا فیصلہ کن مقابلہ بجز سول ڈس اوبیڈینس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم اس سول ڈس اوبیڈینس سے بالکل قطع نظر بھی کرلیں جب بھی ہمیں ڈیفنسو سول ڈس اوبیڈینس کی طاقت پر پورا اعتماد ہے۔

البتہ اس کے لیے ایسے حالات کی ضرورت ہے جن میں سے بعض تو ہماری تیاریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض کا تعلق تمام تر دفتری اقتدار کے طریق عمل سے ہے۔ ایک خاص طرح کا طریق عمل وہ اختیار کرے جب کہیں وہ صورت پیدا ہوسکتی ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔ مثلاً وہ جبر وتشدد کے ذریعہ ہماری سرگرمیوں کو روکے، یا قوانین کا غلط استعمال کرے، جیسا کہ پچھلے موقعوں پر اس نے کیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں مطمئن رہنا چاہئے کہ

موجودہ حالات کے قدرتی قوانین ہمارے حق میں ہیں۔ہمیں صرف یہی معلوم نہیں ہے کہ ہم صحیح راستہ پر ہیں بلکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا مقابل فریق گمراہ ہے اور یہ ایسے مقابلہ کی طبیعت ہے کہ گمراہ حریف کوٹھوکریں لگیں۔ ہندستان میں آج دفتری اقتدار کے افراد اور ہندستانیوں کے دماغ کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ ایک غلط نظام اور ایک صحیح مطالبہ میں مقابلہ ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس سے غلطیوں پر غلطیاں ہوں اور ضروری ہے کہ قومی جدوجہد نئی نئی طاقتیں اور مہلتیں حاصل کرے۔ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ اگر ہم نے اپنی تیاریاں قائم رکھیں تو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر ایسی فضا پھر پیدا ہو جائے گی کہ ہم اپنا دوسرا فیصلہ کن معرکہ شروع کرسکیں گے۔ جوں ہی معرکہ شروع ہوگا پھراز سرنو سپاہیوں کے لیے کشش پیدا ہوجائے گی۔ہم دیکھ لیں گے کہ بستر خالی ہو گئے ہیں اور میدان پھر سے بھر رہا ہے۔

لیکن یہ وقفہ کیوں کر اس طرح بسر کیا جائے کہ جلد سے جلد مقابلہ کے لیے مناسب فضا مہیا ہو جائے؟ اور ساتھ ہی ہماری موجودہ مشغولیت کے لیے بھی مفید ہو؟ کیا اس وقفہ کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم موجودہ انتخاب کا بائیکاٹ کریں یا یہ کہ جہاں کہیں اکثریت کے ساتھ کونسلوں میں جاسکتے ہیں جائیں اور انھیں بھی تو ان کو آپریشن کی سرگرمیوں کا ایک عارضی گوشہ بنالیں۔

حضرات! حالات کے تمام پہلوؤں پرغور کرنے کے بعد میں جو رائے قائم کرسکا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے لیے باہر رہ کر بائیکاٹ کرنا کچھ بہتر چیز نہیں ہوسکتا جس طرح گذشتہ انتخاب کے موقع پر ہمارے لیے بائیکاٹ ضروری تھا اسی طرح آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم نشستوں پر قبضہ کرلیں اور کونسلوں اور اسمبلیوں میں جائیں اور ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ یہ مقامات بھی ہماری جدوجہد کا ایک گوشہ بن جائیں۔

میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے۔ دوسری طرف کونسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے ماتحت دونوں جگہ کام ہو۔ یہ بات قطعی طور پر طے کردی جائے کہ کونسلوں میں جانا ایک مقررہ پروگرام کے ماتحت ہے جو کانگریس قرار دے دے۔ اس پروگرام میں صاف طور پر تمام باتیں موجود ہیں جو ہمارے طرزِ عمل کو شرکت عمل کی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ یہ قطعی ہے کہ وہاں جا کر کوئی زیادہ مدت تک کام جاری نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ ہمارا مقصود کسی حال میں بھی شرکت عمل نہیں ہے اگرچہ بظاہر اچھے کاموں کے لیے ہو۔ یہ بات بھی بالکل صاف کردینی چاہئے کہ کسی چھوٹی سی چھوٹی مدت کے لیے بھی وہاں کسی عہدہ کی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی خواہ کسی نیت ومقصد سے ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کونسلوں میں جا کر کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا؟ تو اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں اور بہت کچھ یہ وقت کے حالات پر موقوف ہے۔ تاہم ایک بات تو بالکل واضح اور ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی مناسب موقع پر نو ان کو آپریٹر ممبروں کو کونسلوں سے باہر آنا پڑے گا اور باہر کی جماعت کے ساتھ مل کر سول ڈس اوبیڈینس کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

کونسلوں کا داخلہ ہم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ اس مقابلہ کی تیاری کے لیے بمقابلہ بائیکاٹ کے اسے بھی گوشہ جنگ بنالینا زیادہ مفید ہے۔ اگر آج ظن غالب پیدا ہوجائے کہ ہم وقفہ کی جگہ مقابلہ کی حالت میں ہیں تو کم از کم میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ رائے نہ دوں گا کہ کونسلوں میں جانے کا خیال بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ گو میں گیا پروگرام کی طرف سے بالکل مایوس تھا۔ تاہم جب تک ذرا بھی امید اس کی کامیابی کی کی جاسکتی تھی، میری کوشش یہی رہی کہ سب مل کر اسے کامیاب بنانے کی

سعی کریں اور کونسلوں میں جانے کا کوئی خیال سامنے نہ لائیں۔ بہرحال اگر ہم چاہیں تو انتخاب کے بعد کا پروگرام آج ہی بنا سکتے ہیں۔ چاہیں تو اسے آئندہ سالانہ اجلاس پر موقوف کریں۔ یہ آخری صورت شاید زیادہ بہتر ہوگی۔ باہر کا کام کیا ہو؟ یہ سب سے زیادہ اہم چیز ہے اور اسی پر اس نئے گوشۂ جنگ کا مفید ہونا موقوف ہے۔ اس بارے میں حسب ذیل امور پر آپ کو توجہ دلاؤں گا۔

1- تعمیری پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کا کام از سرنو شروع کرنا چاہئے تفصیلات کی طرف میں ابھی آپ کو توجہ دلاؤں گا۔

2- ملک کی مزدور جماعتوں کی تنظیم، جن سے غافل رہ کر ہم آئندہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔

3- عوام کی سیاسی تعلیم۔ تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ہم کو اپنی جدوجہد کی گزشتہ سرگرمی میں تیاری، بلاوا، اور مقابلہ سب کام بیک وقت کرنا پڑے لیکن موجودہ وقفہ میں ہمیں اس سے غفلت نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ قومی اتحاد نوان کوآپریشن، عدم تشدد اور سول ڈس اوبیڈینس کے اصول و مقاصد عوام کے دلوں پر نقش کردیں۔ وہ اسے محض کسی مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ خالص جذبہ حب الوطنی سے اپنا فرض سمجھیں۔

بکثرت ہندستانی زبانوں میں لٹریچر تیار کر کے تقسیم کرنا چاہئے۔ کانگریس کمیٹیوں کے ورکر اور والنٹیر قصبوں اور دیہاتوں میں دورہ کریں۔ ہر جگہ جم کر اسی طرح تعلیم دیں گویا عارضی سیاسی تعلیم گاہیں ہر طرف کھل گئی ہیں۔ اسی کام کا ایک پروگرام تین مہینے یا چھ مہینے کا بنالیا جائے۔ ہم اتنے عرصہ کے اندر تمام ملک کو ایک خاص مقصد کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اگر حکومت کی جانب سے اس میں روکاٹیں ڈالی گئیں تو وہ ہمارے لیے اور زیادہ مفید ہوگا۔ عجب نہیں کہ اسی کے ذریعہ سے ہماری مطلوبہ فضا پیدا

ہو جائے۔

4-تعمیری پروگرام کا بقیہ حصہ

البتہ میں یہ بالکل صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے کونسلوں میں داخلہ کی صرف ایک ہی صورت صحیح ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگریس نہ صرف اس کی اجازت دے بلکہ خود اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ لیکن اگر آج آپ کا فیصلہ اس کے برخلاف ہو تو جیسا کہ میں بہ تفصیل عرض کر چکا ہوں پھر ہم میں سے کسی فرد یا جماعت کو بھی نہیں چاہئے کہ اس کے خلاف قدم اٹھائے۔ میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا معاملہ ہے جس کے لیے ہم قومی نظام کی اطاعت سے باہر ہونے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ اگر آج بھی آپ کا فیصلہ یہ ہو کہ کونسلوں کے لیے نہیں کھڑا ہونا چاہئے تو اس صورت میں میری رائے یہ ہو گی کہ بائیکاٹ کو داخلہ پر ترجیح ہے۔ کیوں کہ ہمارے کام کے لیے اصلی چیز متحدہ جدوجہد ہے۔ جو راہ ہم سب مل کر اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ ہر متفرق قدم سے بہتر ہو گی اور جب تک اصول اور اعتقاد کا سوال نہ آئے ہمیں اپنے نظام کی اطاعت سے باہر نہ ہونا چاہئے۔

حضرات! گیا کے موقع پر علمائے اسلام کی کانفرنس نے یہ رائے قائم کی تھی کہ مسلمانوں کو کونسلوں کے لیے کھڑے ہونے سے احتراز کرنا چاہئے۔ دراصل مذہبی نقطۂ خیال سے ان کے سامنے ترک موالات کی اصل تھی اور جہاں تک طریق عمل کا سوال ہے قدرتی طور پر انھیں ان تمام طریقوں سے انکار ہونا چاہئے جن سے اصل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ بات کہ کونسلوں میں جانا اس کے لیے مفید ہے یا مضر؟ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر وہی لوگ رائے قائم کر سکتے ہیں جنھیں ان معاملات کا تجربہ ہے۔ لیکن اس وقت خود ان لوگوں میں اختلاف تھا پس ضروری تھا کہ حضرات علماء اسی

پہلو کو اختیار کریں جس میں احتیاط ہو۔ بصورت اختلاف احتیاط اسی میں تھی کہ احتراز کیا جائے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آج آپ اس بارے میں ایک مطمئن فیصلہ کرلیں گے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کی جانب سے اس معاملہ میں اصرار ہو۔

حضرات! میں نے آپ کا اس قدر وقت در و دیوار کی فکر میں لے لیا۔ حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جد و جہد کی بنیاد کا کیا حال ہے؟ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندستان کی آزادی کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔

ملک کی موجودہ حالت کیا ہے؟ کون ہے جو ہندستان کے عشق و محبت کا ایک ذرّہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہے اور اسے صبر اور برداشت کے ساتھ دیکھ سکتا ہے؟ چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا اور دنیا سے کہا کہ وہ ہماری آزادی کا انتظار کرے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لیے گوش برآواز ہے۔ ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی اور

اپنے مجنونانہ کشت وخون کی اس کے لیے کہانی ترتیب دیں۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک اس کی مدافعت اور سنگھٹن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔ ایک طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ۔ دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملے سے حفاظت کرو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار بلند ہو رہی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ بدنصیب ہندستان کی حفاظت کا ولولہ کب قائم رہ سکتا ہے؟ ایک طرف جلسوں اور اخباروں میں لوگوں کے اندر مجنونانہ مذہبی تعصبات بھرے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف نادان اور فریب خوردہ عوام ہندستان کی سڑکوں پر بے دریغ اپنا خون بہا رہے ہیں۔ اجمیر، میرٹھ، سہارن پور، آگرہ، پلول اور کہاں کہاں سخت فسادات ہو چکے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے نتائج کس قدر افسوس ناک ہوں گے۔

حضرات! میں آج ان تمام لوگوں سے جو ان جذبات کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حالت نا قابل برداشت ہے۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ہم آزادی کی طرف جا رہے ہیں آپ ہمارا راستہ نہ روکیے۔ اگر آپ روکیں گے تو ہمارا فرض ہے کہ رکاوٹوں سے راستہ صاف کریں میں آپ تمام حضرات سے جو ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہیں اور اپنے اندر ہندستان کا دماغ اور ہندستان کی زبان دونوں رکھتے ہیں یہ عرض کروں گا کہ آج آپ اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ نوان کو آپریٹرز کونسلوں میں جائیں یا نہیں تو مضائقہ نہیں لیکن خدارا آج اس کا فیصلہ کر کے یہاں سے اٹھئے کہ ہندستان اپنی آزادی ونجات کی زخمی امیدوں کو بچائے رکھے یا آگرہ اور سہارن پور کی خون آلود سرزمین میں دفن کر دے؟ آج آپ کو صاف صاف اس بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہئے اور اپنی تمام قوتیں اس کے لیے صرف کر دینی چاہئیں۔ اگر آپ ایک دن کے لیے بھی اسے

برداشت کریں گے تو یقین کیجئے کہ برسوں کے لیے آپ کا سفر پیچھے پڑ جائے گا۔

حضرات! ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کانگریس کی سیاسی حرکت میں شریک نہ تھے۔ مسلمانوں میں یہ جذبہ عام تھا کہ ہندستان میں ان کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے۔ تعلیم اور دولت میں بھی ان سے پیچھے ہیں اگر وہ کسی متحدہ حرکت میں شریک ہوں گے تو ان کی ہستی پامال ہو جائے گی۔ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصہ تک ان کی قومی پالیسی یہ رہی کہ الگ رہ کر اپنی جماعتی تنظیم کی جائے۔

لیکن غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گذشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اس سے واقف ہوں گے کہ 1912ء میں سب سے پہلی صدا میری صدا تھی جو اس طرز عمل کے برخلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بلایا کہ وہ علیٰحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں۔ کانگریس میں شریک ہوں۔ ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں اور فرقہ وار تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گزری۔ پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی۔ لیکن بالآخر وہ وقت بہت جلد آ گیا جب مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا۔ جب 1916ء میں میں رانچی میں نظر بند تھا تو سن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔

حضرات! جس طرح میں نے 12ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہار حق سے نہ روک سکا ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا

بلند کروں جو ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علم بردار ہیں۔ میں حیرت سے محسوس کر رہا ہوں کہ جو دماغی حالت اس وقت مسلمانوں کے سیاسی حلقوں کی تھی۔ ٹھیک ٹھیک وہی آج ان حضرات کی ہو رہی ہے۔ وہی دلائل آج بھی ہمیں سنائے جا رہے ہیں۔ وہی اسباب وبواعث آج بھی ان کی زبان پر ہیں۔ مسلمانوں کا یہ خیال اس کے ساتھ تھا کہ ان کی تعداد کم ہے اور آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ یہ ''انڈین نیشنل کانگریس'' ہے۔

میں اس وقت اس معاملہ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا جو دلائل ان تحریکات کی تائید میں بیان کیے جاتے ہیں۔ مجھے ان کی صحت سے بالکل انکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ فلاں فلاں سنہ میں فسادات ہوئے اور ان میں ایک فریق کا نقصان زیادہ ہوا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے فریق کے مقابلہ میں اپنا علیحدہ سنگھٹن کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ طریق استدلال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہندستان کی ہر جماعت اپنے نقصانات کی ایسی ہی ایک فہرست تیار کر سکتی ہے اور اس کے بعد سنگھٹن کا اعلان کر سکتی ہے۔ اگر بمبئی کے گزشتہ بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو کئی فسادت ایسے ملیں گے جو خود مسلمانوں کے دو فرقوں میں ہوئے ہیں اور ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کو اچھی طرح لوٹا اور قتل کیا ہے۔ البتہ میں اس بات کا صاف صاف اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے نئے دور کے بعد ملتان میں فساد کا ہونا اور وہاں کے مسلمان بلوائیوں کے ہاتھ سے ہندوؤں کو سخت نقصان پہنچنا ایک ایسا افسوس ناک حادثہ ہے جس پر ہر مسلمان کے دل پر زخم لگنا چاہئے۔ تاہم ہندستان جیسے ملک میں جہاں کروڑوں انسان بستے ہیں اور ابھی ابھی نئی زندگی کے دور

میں داخل ہوئے ہیں اور جہاں غلط مذہبی تعصب اور بے جا مذہبی جوش کا اُبھر آنا کچھ دشوار نہیں ہے ایسے حوادث ناممکن نہیں کر دیے جا سکتے۔ اس کا صحیح علاج صرف یہی ہے کہ ملک کے دیگر طبقات اس کی وجہ سے فریقانہ جذبہ پیدا نہ کرلیں۔ جس کی زیادتی ہو اسے ملامت کی جائے۔ جس پر ظلم ہوا ہو اس سے ہمدردی کی جائے۔ یہ علاج نہیں ہے کہ ایک مقامی معاملہ کو طول دے کر اور تمام ملک اور فرقہ کا مسئلہ بنا کر کسی ایک فریق کو مقابلہ کی دعوت دی جائے۔ پھر دوسرا فریق بھی نئی نئی تیاریاں کرے اور اس طرح ختم نہ ہونے والی جنگ قائم ہو جائے۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ہندستان کی ہر جماعت کو اپنی اندرونی اصلاح و درستگی کے بے شمار کام درپیش ہیں اور ضروری ہے کہ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے کوشش کرے۔ لیکن میں اس سے قطعاً انکار کرتا ہوں کہ کوئی ایسی تحریک اس حالت میں قائم ہو سکتی ہے جب کہ اس کا خمیر فرقہ وار فسادات اور باہمی جنگ کے خون سے مہیا کیا گیا ہو۔

اس تحریک کے بعض ذمہ دار حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ مقابلہ کا وعظ کہہ کر آخر میں اتحاد و محبت کا بھی پیغام سنا دیتے ہیں۔ میں ان حضرات سے کہوں گا کہ آپ نے ہمیں غلط راستہ کی طرف بلایا ہے لیکن اب فطرت انسانی کے انکار کی دعوت نہ دیجیے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش دو مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی نہ بخش سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلہ کا جذبہ مشتعل کر کے دوسری طرف محبت و اتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں؟

اس طرح میں شدھی کی تحریک کی نسبت یہی عرض کروں گا کہ اگرچہ ہم کاغذ پر سیاست کی متحدہ تحریک اور مذہب کی فرقہ وار کش مکش کو دو مختلف خانوں میں رکھ سکتے

ہیں۔ لیکن عمل میں کوئی ایسی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں متحدہ قومیت کی ضرورت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ہندستان میں ایک طرف سے ملچھ اور دوسری طرف سے کافر کی صدائیں اٹھتی رہیں گی تو محال ہے کہ وہ رواداری پیدا ہو سکے جس کے بغیر اتحاد کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

حضرات! میں ملک کی تمام جماعتوں سے عرض کروں گا کہ انھیں ایک مرتبہ ہندستان کی قسمت کا فیصلہ کر لینا چاہئے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندستان آزادی ونجات حاصل کرلے تو پھر انھیں اور تمام کام اس کے لیے ملتوی ہی کرنے پڑیں گے۔ خواہ وہ کام انھیں کتنے ہی محبوب ہوں لیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔

میں آج اس پلیٹ فارم سے جو ہندستان کی متحدہ قومیت کا گہوارہ ہے تمام ہندو مسلمانوں سے وطن کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کی امیدوں کو اس بے دردی کے ساتھ پامال نہ کریں اور بلا اس بحث کے کہ اب تک کیا ہو چکا ہے آئندہ کے لیے ان تمام سرگرمیوں کو بند کر دیں جو شدھی موومنٹ، اس کی مدافعت اور فرقہ وار تحریکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر بند کر دینے کے لفظ سے وہ متفق نہیں ہو سکتے تو کم از کم ملتوی کردیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو نہ صرف اپنے وطن کی بلکہ تمام عالم انسانیت کی ایک سب سے بڑی خدمت انجام دیں گے۔

حضرات! اس سلسلہ میں مجھے یہ بھی یاد دلانے دیجئے کہ اب ہمیں اس بات میں تساہل نہیں کرنا چاہئے کہ ہندستان کے لیے ایک میثاق قومی تیار ہو جائے جو نہ صرف ہمارے قومی نصب العین کو ہمیشہ کے لیے صاف اور واضح کر دے بلکہ ہندستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی علائق اور روز مرہ کے پیش آنے والے جھگڑوں کا بھی فیصلہ کر دے۔ اس اعتبار سے ہندستان ایک عجیب ملک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تیس کروڑ انسانوں کی آزادی صرف اس لیے تاخیر میں پڑ جائے کہ کسی مسجد کے سامنے

سے ایک جلوس ڈھول بجاتا ہوا گزر گیا۔ یا کسی راستہ کے درخت کی شاخ کاٹ ڈالی گئی۔ پس جب ملک کی مصیبتوں کی نوعیت کا یہ حال ہے تو ہمیں ان مسائل کے قطعی اور دائمی فیصلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر بھی غور فرمائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ منتخب افراد کی ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کردی جائے اور آئندہ اجلاس سے پہلے ایک مسودہ تیار کرلے۔

خاتمہ

حضرات! قوموں کے تمام بڑے دنوں کی طرح آج کے دن کے نتائج بھی دو انتہائی قسموں میں منقسم ہیں۔ آج ہم بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کرسکتے ہیں اور بہت بڑی ناکامی بھی ہمارے حصے میں آسکتی ہے۔ ہمارے عزم، ہمارے ثبات اور ہماری حب الوطنی کے لیے آج بہت بڑی آزمائش درپیش ہے۔ آیئے! اس پر غالب آئیں اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جائیں۔

مہاتما گاندھی

بلگام ——— 1924ء

دوستو! کافی ڈر اور وسوسوں کے بعد میں نے اس اعزاز کے بوجھ کو اٹھانا قبول کرلیا جس کا آپ نے آج مجھے شرف بخشا ہے۔ بہتر ہوتا کہ یہ بے مثال عزت اس سال شریمتی سروجنی نائیڈو کو بخشی جاتی جنھوں نے کنیا اور جنوبی افریقہ میں حیران کن خدمات سرانجام دی ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ داخلی اور خارجی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ میرے لیے اس بوجھ کو اٹھانا ضروری ہوگیا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اس عظیم مرتبہ کے فرائض کو سرانجام دینے میں مجھے آپ کی مدد حاصل ہوگی۔

شروع میں ہی مجھے مؤدبانہ احساسات کے ساتھ اس سال کے دوران میں بائی امان، سر اسوتوش مکرجی، مسٹر بھوپندر ناتھ باسو کی ہندستان میں اور مسٹر رستم جی اور مسٹر پی کے نیڈو کی جنوبی افریقہ میں اموات کی طرف توجہ منعطف کرنی چاہئے۔ میں آپ کی طرف سے ان کے لواحقین کے ساتھ نہایت ادب سے اظہار تعزیت کرتا ہوں۔

ستمبر 1920ء سے کانگریس خاص طور پر ایک ادارہ کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ اس نے اپنے اندر کافی طاقت جمع کرلی ہے۔ اس نے اپنی شکایات کو دور کرنے کے لیے ریزولیشنوں کے ذریعہ حکومت کی خدمت میں درخواستیں گزارنا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ اسے برقرار نظام حکومت کے سودمندانہ کیریکٹر پر اعتماد جاتا رہا۔ ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ وعدہ شکنی نے حکومت میں لوگوں کے اعتماد کی

بنیادیں ہلادیں۔ رولٹ ایکٹ اوراڈوائرازم نے جس کی انتہا جلیاں والہ باغ کے قتل عام میں ہوئی اس نظام کی حقیقی نوعیت کے متعلق لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ کسی نظام کے قیام کا دارومدار لوگوں کے محسوس یا غیر محسوس اور رضا کارانہ یا جبریہ تعاون پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نظام کی اصلاح یا اسے ختم کرنے کے لیے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کے ساتھ اوپر سے رضا کارانہ تعاون کو واپس لے لیا جائے، کلکتہ کانگریس 1920ء کے اجلاس خصوصی میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری خطابات، قانونی عدالتوں، تعلیمی اداروں، لیجسلیٹو اسمبلیوں اور بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس بائیکاٹ کے پروگرام کو متعلقہ پارٹیوں نے اپنے اپنے ہاتھ میں لیا۔ میں عدم تعاون کی تحریک کے پراز رکاوٹ کام کی تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا۔ یہ بات درست ہے کہ کہیں بھی یہ بائیکاٹ تکمیل کا سہرا حاصل نہ کرسکا۔ لیکن بائیکاٹ کے ہر جز نے اس خاص ادارہ کے وقار کو کم کردیا جس سے اس جز کا تعلق تھا۔

سب سے اہم بائیکاٹ تشدد کا بائیکاٹ تھا۔ ایک وقت میں اگرچہ وہ مکمل طور پر کامیاب معلوم ہوتا تھا۔ مگر جلد ہی یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اس کی بنیادیں گہری نہیں۔ یہ مجبوری کا منفعل عدم تشدد تھا اور سوجھ بوجھ کا روشن عدم تشدد نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کے خلاف جو عدم تعاون نہ کرتے تھے ایک بارگی جذبات کا کوہ آتش فشاں پھوٹ پڑا۔ یہ خود نازک قسم کا تشدد تھا۔ اس اہم نقص کے باوجود میں نہایت جرأت سے یہ کہتا ہوں کہ عدم تشدد کے پروپیگنڈہ نے اس جسمانی تشدد کے رونما ہونے کو روک دیا۔ جو یقیناً پھوٹ پڑا ہوتا۔ اگر عدم تشدد اور عدم تعاون معرض وجود میں نہ آئے ہوتے۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ عدم تعاون اور عدم تشدد نے لوگوں میں اپنی طاقت کا احساس پیدا کردیا ہے۔ اس نے لوگوں کے مصائب اٹھا کر مزاحمت کی

مخفی طاقتوں کو اجاگر کر دیا ہے۔ اس نے عوام الناس میں ایسی بیداری پیدا کر دی ہے۔ جو غالباً کسی اور طریقہ سے ممکن نہ تھی۔

چنانچہ عدم تعاون اور عدم تشدد اگر چہ سوراج نہیں لا سکا۔ اس نے اگر چہ چند نہایت افسوس ناک نتائج پیدا کیے ہیں اور بیشک جن اداروں کا وہ بائیکاٹ کرنا چاہتے تھے۔ اب بھی پھل پھول رہے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں عدم تعاون اور عدم تشدد آزادی حاصل کرنے کے طریقہ کی حیثیت میں زندہ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی جزوی کامیابی ہمیں سوراج کے قریب لے آئی ہے۔ اس حقیقت کو چھپانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کسی مقصد کے لیے مصائب جھیلنے کی صلاحیت اسے ضرور آگے لے جائے گی۔

لیکن آج ہمیں ایسی صورت حالات کا سامنا ہے کہ جو ٹھہر جانے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے کہ اگر چہ افراد عدم تعاون میں پختہ یقین رکھتے ہیں۔ اکثریت کا جس کا فوری طور پر اس سے براہ راست تعلق ہے۔ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کو چھوڑ کر عملاً اس سے اعتماد کھو چکے ہیں۔ درجنوں وکلا نے پھر پریکٹس شروع کر دی ہے۔ بہت سے لوگ جو کونسلوں کو ترک کر چکے تھے پھر ان میں جا داخل ہوئے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو کونسلوں میں شامل ہونے پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ سینکڑوں لڑکے اور لڑکیاں جو گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ چکے تھے اپنی حرکت پر متاسف ہو رہے ہیں اور پھر ان میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ گورنمنٹ اسکول اور کالجوں میں داخلہ اس قدر زیادہ ہے کہ یہ ادارے ان سے عہدہ برا نہیں ہو رہے۔ ان حالات میں ان بائیکاٹوں پر اس وقت تک قومی پروگرام کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کانگریس متعلقہ طبقات کی امداد کے بغیر اس پر عمل کرنے کا فیصلہ نہ کر لے۔ لیکن میں ان طبقات کو کانگریس سے باہر رکھنا اتنا ہی ناقابل

عمل سمجھتا ہوں جتنا کہ اس وقت عدم تشدد کو باہر کرنا نا قابل عمل ہوگا۔ ان دونوں کو کانگریس میں رہنا چاہئے۔ ایک پارٹی کو دوسری پارٹی میں مداخلت اور ایک دوسرے کے خلاف بغض وعناد کا اظہار نہ کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ جو بات بھی ہندو مسلم اتحاد پر منطبق ہو مختلف سیاسی گروہوں کو اپنے پر چسپاں کرنی چاہئے، وہ ہمیں ایک دوسرے کو برداشت کرنا چاہئے اور اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے کہ جب دوسروں کو اپنے خیالات کے ساتھ ملا سکیں۔ ہمیں اس سے بھی آگے بڑھنا چاہئے۔ ہمیں لبرلوں اور دوسرے لوگوں کو جو کانگریس سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ پر زور استدعا کرنا چاہئے۔ اب جب عدم تعاون کی مہم معرض التوا میں ڈالی جا چکی ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ کانگریس کے باہر رہیں۔ یہ استدعا ہماری طرف سے ہونی چاہئے یعنی ان لوگوں کی طرف سے جو کانگریس میں موجود ہیں۔ ہمیں بڑے تپاک سے انھیں دعوت دینی چاہئے اور ان کے کانگریس میں شامل ہونے کے کام کو آسان بنا دینا چاہئے۔

اب آپ شاید احساس کرنے کے قابل ہیں کہ میں نے سوراجیوں سے کیوں سمجھوتہ کیا۔

آپ مشاہدہ فرمائیں گے کہ ایک بائیکاٹ برقرار رکھا گیا ہے۔ ایک انگریز دوست کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے باہمی سمجھوتہ سے ''بائیکاٹ'' کے لفظ کو بدیسی کپڑے کو استعمال کرنے سے انکار کے الفاظ سے بدل دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بائیکاٹ کے لفظ سے بدمزگی کی بو آتی ہے۔ اس کا عموماً مدعا نفرت ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ بائیکاٹ کا تعلق برطانوی کپڑے سے نہیں۔ بدیسی کپڑے سے ہے۔ یہ بائیکاٹ محض حق نہیں بلکہ فرض ہے۔ یہ اسی طرح کا فرض ہے کہ جس طرح بدیسی پانیوں کا بائیکاٹ ہوگا۔ اگر ہندستانی دریاؤں میں بہنے والے پانی کی جگہ کسی ایسے پانی کو بہا دیا جائے جو باہر سے لایا گیا ہو۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ سمجھوتہ ہمیں محفوظ رکھتا ہے اور بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ پر زور دیتا ہے۔ میرے لیے یہ متشددانہ طریقوں کا پراثر نعم البدل ہے۔ انسان کے چند افعال ایسے ہیں جن سے تشدد کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ذاتی ناجائز فائدہ، چڑچڑی طبیعت، دروغ بیانی، قتل اور کسی کو چوٹ پہنچانا اور اسی طرح سے کچھ اور افعال ایسے ہیں جن سے عدم تشدد کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً خوش خلقی، غیر مضرت رساں سلوک اور سچائی وغیرہ۔ بعینہٖ اسی طرح میرے نزدیک بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ، عدم تعاون کی علامت ہے۔ انقلابی جرم سے دباؤ کی بو آتی ہے لیکن یہ غصہ اور نفرت کا مجنونانہ دباؤ ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ متشددانہ افعال کی نسبت غیر متشددانہ افعال زیادہ موثر دباؤ ڈالتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے دباؤ کا سرچشمہ شرافت اور نیک نیتی ہوتا ہے۔ بدیسی مال کا بائیکاٹ ایسا ہی دباؤ ڈالتا ہے۔ ہم لنکا شائر میں بننے والے کپڑے کے سب سے بڑے خریدار ہیں۔ یہ ہماری درآمد کی سب سے بڑی جز ہے۔ شکر کھانڈ دوسرے درجہ پر ہے۔ برطانیہ کا سب سے بڑا مفاد ہندستان میں لنکا شائر کے مال کی کھپت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس نے ہندستانی کسان کو اس ضمنی کام سے محروم بنا کر اسے جزوی بے کاری کا شکار بنا دیا ہے۔ اس نے ہمارے کسانوں کو تباہ کرنے میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ چنانچہ اگر کسان کو زندگی مقصود ہے تو بدیسی مال کے بائیکاٹ کی شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا ہماری تجویز صرف یہ نہیں کہ کسانوں کو اس بات کی ترغیب دی جائے کہ نفیس اور خوش نما سستے بدیسی کپڑے کو خریدنا ترک کر دیں۔ بلکہ ہم کو انھیں یہ تعلیم دینی چاہئے کہ وہ اپنے فالتو اوقات سوت کاتنے میں صرف کریں۔ پھر اس سوت کو دیہاتی جلاہے سے بنوائیں بلکہ اس طرح بنے ہوئے کھدر کو پہن کر گزارا کریں۔ تاکہ انہیں نہ تو بدیسی کپڑے پر رقم صرف کرنی پڑے اور نہ ہی ہندستانی ملوں کے بنے ہوئے کپڑے پر۔

چنانچہ ہاتھ سے بنے ہوئے اور ہاتھ سے کاتے ہوئے کھدر کے ذریعہ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ سے نہ صرف کسان کی رقم محفوظ رہتی ہے۔ بلکہ اس سے ہم کارکنوں کو اول درجہ کی مجلسی خدمت سرانجام دینے کا موقع میسر ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں دیہاتوں کے ساتھ براہ راست تعلق قائم کرنے کا موقع ملتا ہے اور ہم اس قابل ہوجاتے ہیں کہ ہم انہیں خودکفیل بننے کی حقیقی سیاسی تعلیم دے سکیں۔لہٰذا کھدر کی تنظیم انجمن ہائے امداد باہمی یا دیہات کی کسی اور تنظیم کی نسبت زیادہ بہتر تنظیم ہے۔ اس سے نہایت اعلیٰ سیاسی نتائج برآمد ہوں گے۔ کیوں کہ اس طرح برطانیہ کے ساتھ منافی اخلاق رغبت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ میں نے لنکا شاڑ کی تجارت کو منافی اخلاق اس لیے کہا ہے کہ اس کی بنیادیں کروڑہا ہندستانی کسانوں کی بربادی پر رکھی گئی تھیں اور رکھی جارہی ہیں۔ چونکہ ایک منافی اخلاق حرکت سے کئی اور منافی اخلاق افعال جنم لیتے ہیں۔ اس لیے برطانیہ کے اس ایک منافی اخلاق بیوپار سے کئی مصدقہ منافی اخلاق حرکات کی تاریخ بیان کی جاسکتی ہے۔ پس اگر ہندستان کی رضا کارانہ سعی سے برطانیہ کے راستہ سے اس ایک وجہ تحریص کا قصہ پاک ہوجائے تو یہ ہندستان اور برطانیہ دونوں کے لیے نیک شگون ہوگا۔ چونکہ برطانیہ ایک بڑی بھاری عالم گیر طاقت ہے۔ اس لیے انسانیت کے لیے بھی نیک شگون ہوگا۔

میری رائے میں یہ برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی برآمد کو ہندستان کی بھلائی کے پیش نظر عمل میں لائے۔ اسی طرح ہندستان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بہبودی رکھتے ہوئے اپنی درآمد سے متعلق اصولات مرتب کرے۔ ایسا نظام اقتصادیات جھوٹا ہے جو اخلاقی اصولات کو نظرانداز کرکے وضع کیا گیا ہو۔ اقتصادی دنیا میں عدم تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بین الاقوامی کاروبار کا دارومدار اخلاقی اصولوں پر ہو۔ اور مجھے تسلیم کرنا چاہئے کہ میری خواہش اس سے کچھ کم نہیں کہ ہندستانی

مساعی کے طفیل بین الاقوامی روابط کی بنیادیں اخلاقی اصولوں پر کھڑی کی جائیں۔ میں محدود طور پر عوامی عدم تشدد کے بیج بونے میں ناامید نہیں ہوں۔ میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ انسانی فطرت کا رجحان ہمیشہ پستی کی طرف ہے۔

ہاتھ سے سوت کاتنے اور کھدر کے ذریعہ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کا یہ مطلب ہے کہ اس سے نہ صرف کمال درجہ کے سیاسی نتائج پیدا ہوں گے بلکہ یہ ہندستان کے غریب مرد عورتوں کو اپنی طاقت کا احساس دلا دے گا۔ انھیں ہندستان کی جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے لیے تیار کردے گا۔

اب اس بات کی چنداں ضرورت نہیں کہ برطانوی کپڑے یا یوں کہئے کہ برطانوی مال کے بائیکاٹ کے غیر موثر ہونے یا اس کی غیر متشددانہ نوعیت کا مظاہرہ کیا جائے۔ جیسا کہ بہت سے محبان وطن نے تجویز کی ہے۔ میں بائیکاٹ پر خالصاً ہندستان کی بھلائی کے زاویہ نگاہ سے غور کرتا ہوں۔ تمام برطانوی اشیاء ہمیں نقصان نہیں پہنچاتیں۔ کچھ اچھی چیزیں مثلاً انگریزی کتابیں ہمیں خود اپنی ذہنی ترقی اور روحانی بھلائی کی خاطر درکار ہیں۔ جہاں تک کپڑے کا تعلق ہے صرف برطانوی کپڑے سے ہی ہمیں نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمام بدیسی کپڑا اور اس مقصد کے لیے کسی حد تک ملوں کا بنا ہوا کپڑا بھی ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ بہرکیف محض برطانوی کپڑے بائیکاٹ کردینے سے وہی نتائج برآمد نہیں ہوسکتے جو ہاتھ سے کاتے ہوئے کھدر سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کم از کم تمام بدیسی کپڑے سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ ہم یہ کنارہ کشی کسی کو سزا دینے کی غرض سے نہیں کرتے۔ یہ قومی حیات کی شدید ضرورت ہے۔

لیکن معترضین یہ کہتے ہیں کہ چرخہ سے کوئی جوش پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو محض عورتوں کا کام ہے۔ اس کا مقصد پھر قرون وسطیٰ کو لوٹ چلنا ہے۔ یہ سائنٹیفک علم کی پروقار

رفتار کے خلاف کہ جس پر مشینوں کا دارومدار ہے بے کار کوشش ہے۔ میری ناچیز رائے میں ہندستان کو جوش کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ٹھوس کام کی ضرورت ہے۔ کروڑہا لوگوں کے لیے ٹھوس کام بذاتہٖ پر جوش اور ساتھ ہی تقویت بخش شے بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے چرخہ کو آزمائش کا پورا موقع نہیں دیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ہم میں سے اکثر نے اس پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ آل انڈیا کانگریس کے ممبران بھی ہاتھ سے کاتنے کے ریزولیوشنوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکے۔ جو گا ہے بہ گا ہے وہ خود پاس کرتے رہے ہیں۔ ہم میں سے اکثریت نے اس پر اعتقاد نہیں قائم کیا۔ ان حالات میں یہ کہنا درست نہیں کہ کاتنے بننے کا کام اپنے اندر ہیجان نہ رکھنے کی وجہ سے ناکام رہا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ صرف بوڑھی عورتوں کا کام ہے حقائق سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ کاتنے کی مشینیں بھی تو محض بہت سے چرخوں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی انسان نگہداشت کرتے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم اس وہم کو چھوڑ دیں کہ فلاں پیشہ مردوں کے وقار سے گرا ہوا پیشہ ہے۔ بلاشبہ عام حالات میں کاتنے کا کام عورتیں کریں گی لیکن ہماری آنے والی ریاست کو لازمی طور پر چند مرد اس کام پر معمور کرنے پڑیں گے۔ تاکہ وہ حدود کے اندر اس میں تبدیلیاں لاسکیں۔ جب کہ آج دیہاتی انڈسٹری میں مردوں کا کام ضروری ہے۔

میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ذہنوں سے مشینری سے متعلق ان خیالات کو نکال دیں گے جو میرے نام منسوب کیے جاتے ہیں۔ اول تو میری یہ کوشش نہیں کہ مشینری سے متعلق میرے خیالات کو تمام قوم قبول کرے البتہ عدم تشدد کے متعلق میری یہ ضرور کوشش ہے۔ چرخہ بذات خود ایک نفیس مشین ہے۔ میرا سر ہر روز عقیدت سے اس کے نامعمول موجد کے سامنے جھک جاتا ہے۔ میں جس بات کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتا ہوں وہ ہندستان کی اس دیہاتی صنعت کو گلا گھونٹ کر تباہ کر دینا ہے۔

جس نے ہزار ہا گھرانوں کو جو 1900 میل طول اور 1500 میل عرض پر بکھرے پڑے ہیں۔ بھوک وفلاکت سے محفوظ کر رکھا تھا۔

اب آپ حیران نہ ہوں گے کہ میں چرخہ کا اتنا شیدائی کیوں ہوں۔ آپ اس بات پر بھی حیرت کا اظہار کریں گے کہ میں نے اسے کیوں حقوق شہریت میں شامل کرنے پر زور دیا؟ اور پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھن داس نے سوراج پارٹی کی طرف سے اسے کیوں قبول کرلیا۔ اگر میری بات چلتی۔ تو میں کسی ایسے فرد کو کانگریس کا ممبر نہ بننے دیتا جو سوت کاتنا پسند نہ کرتا ہو اور جو کھدر پہننے کا عادی نہ ہو۔ بایں ہمہ میں سوراج پارٹی کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس کو قبول کرلیا ہے۔ اس میں ترمیم کمزوری یا اعتقاد کے فقدان کی رعایت ہے لیکن اس سے ان لوگوں کو اپنی سرگرمیاں تیز کر دینا چاہئیں۔ جو چرخہ اور کھدر پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔

میں نے چرخہ پر اس لیے شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ کیوں کہ میرے پاس قوم کے لیے اس سے بہتر اور کوئی پیغام نہیں۔ میں سوراج حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر کسی اور طریقہ سے واقف نہیں۔ کہ ہم اسے پرامن اور جائز ذرائع سے حاصل کرسکیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ تشدد کا نعم البدل ہے جسے تمام قوم قبول کرسکتی ہے۔ میں سول نافرمانی کی قسم کھاتا ہوں۔ لیکن سوراج حاصل کرنے کے لیے سول نافرمانی اس وقت تک ناممکن بات ہے کہ جب تک ہم میں بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کی طاقت نہیں آجاتی۔ اب آپ نے اس کا احساس کرلیا ہوگا کہ اگر میرے چرخہ سے متعلق خیالات آپ کو قبول نہ ہوں تو میں کانگریس کے لیے مفید راہ نما ثابت نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ مجھے اس نظریہ کی تشریح میں غلطی پر سمجھتے ہیں جو چرخہ کی تہ میں موجود ہے۔ تو آپ یقیناً مجھے قومی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے۔ اگر یہ نظریہ آپ کے دل ودماغ کو اپیل نہیں کرتا۔ تو آپ میری

رہنمائی کو رد نہ کرنے میں اپنے فرائض سے کوتاہی کا ثبوت دیں گے۔ تاکہ ہمارے متعلق اب کوئی یہ نہ کہہ سکے جیسا کہ ایک بار لارڈ ولنگڈن نے بجا طور پر کہا تھا کہ ہم میں 'نہ' کرنے کی جرأت اور دلیری نہیں۔ اگر آپ کو میری تجاویز پر یقین نہیں تو بلاشبہ اسے رد کرنے کا مطلب سوراج کی طرف ایک اور اقدام ہوگا۔

ہندو مسلم اتحاد چرخہ سے کم اہم نہیں۔ یہ ہماری زندگی کی روح ہے میں اس مسئلہ پر آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ کیوں کہ اس کی ضرورت کا تقریباً تقریباً ہر ایک اعتراف کرتا ہے۔ تقریباً میں نے اس لیے کہا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ چند مسلمان اور ہندو دوست ایسے ہیں جو برطانیہ کی غلامی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ہندستان میں خالص ہندو یا خالص مسلمان راج قائم نہ ہو سکے۔ خوش قسمتی سے ان کی تعداد بہت کم ہے۔

میں مولانا شوکت علی کی سیدھی سادھی خوش امیدی میں شریک ہوں۔ کہ موجودہ جھگڑا ایک عارضی عارضہ ہے۔ خلافت تحریک میں ہندوؤں نے اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ دے کر عوام الناس کو بیدار کر دیا ہے۔ تمام طبقات اور عوام میں بیداری کی روح پیدا کر دی ہے۔ اب خود غرض افراد کو جو عدم تعاون کی تحریک میں مایوس ہو چکے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ اب تحریک گوناں گوں کی کشش سے محروم ہو چکی ہے۔ دونوں اقوام کے تعصبات اور ذاتی مفادات کو برانگیختہ کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس کا نتیجہ پچھلے دو سالوں کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی تاریخ میں ملتا ہے۔ مذہب کو لتاڑا گیا ہے۔ معمولی معمولی باتوں کو ان ہی مذہبی اصولات سے پہاڑ بنا دیا جاتا ہے۔ جن کے متعلق کٹر متعصب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھیں ہر صورت میں نافذ ہونا چاہیئے۔ جھگڑا کھڑا کرنے کے لیے اقتصادی اور سیاسی اسباب کو سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کی انتہا کوہاٹ میں آکر ہوئی ہے۔ مقامی ارباب حل وعقد کی بے دردلاپروائی نے اس المیہ کو اور بھی بدتر بنا دیا۔ میں نہ تو اس کے اسباب کا جائزہ لینا چاہتا ہوں اور نہ ہی ذمہ داری کو تقسیم

کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا کرنے کی میری خواہش بھی ہوتی۔ تو بھی میرے پاس اس کے لیے مناسب مصالح موجود نہیں۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ہندو پناہ گزیں اپنی جانوں کے خوف سے اٹھ بھاگے۔ کوہاٹ میں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں۔ انھیں جہاں تک ممکن ہے اجنبی اقتدار کے ماتحت پر اثر سیاسی کنٹرول حاصل ہے۔ چنانچہ اس بات کا ثبوت دینا ان کا فرض ہے کہ ہندوان کے درمیان ایسے ہی محفوظ رہیں گے جیسے وہ خود ہونے کی امید رکھتے ہیں اگر تمام آبادی ہندو ہو۔ کوہاٹ کے مسلمان اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں گے جب تک وہ ہر ایک پناہ گزیں کو واپس کوہاٹ نہ لے آئیں مجھے امید ہے کہ ہندو اس جال میں نہ آئیں گے جو حکومت نے ان کے لیے بچھا رکھا ہے اور وہ اس وقت تک کوہاٹ واپس جانے سے انکار کردیں گے جب تک کوہاٹ کے مسلمان ان کی جان و مال کی حفاظت کا پورا پورا یقین نہ دلادیں۔

ہندو مسلمان اکثریت میں اسی صورت میں رہ سکتے ہیں جب مسلمان ان کے وہاں رہنے پر رضا مند ہوں اور ان کے ساتھ دوستانہ اور مساوی سلوک برتنے کو تیار ہوں۔ یہ ہی بات مسلمانوں پر صادق اترتی ہے۔ وہ بھی غالب ہندو اکثریت میں اسی صورت میں رہ سکتے ہیں جب مؤخر الذکر ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے پر رضا مند ہوں۔ حکومت چوروں اور ڈاکوؤں کے خلاف حفاظت کی ضمانت دے سکتی ہے۔ لیکن سوراجی حکومت بھی اس قابل نہ ہوگی کہ وہ کسی ایک یا دوسری قوم کے مکمل بائیکاٹ کے خلاف اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ حکومت غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرسکتی ہے جب جھگڑا زندگی کا معمول بن جائے تو اسے خانہ جنگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کا تصفیہ متعلقہ پارٹیاں خود اپنی طاقت سے کرتی ہیں۔ موجودہ حکومت اجنبی حکومت ہے۔ یہ دراصل در پردہ عسکری راج ہے۔ اس کے پاس ذرائع

موجود ہیں۔ کہ اگر ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں تو بھی وہ اس سے عہدہ برا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر اس کی خواہش ہوتو وہ ہمارے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا بھی مقابلہ کر سکتی ہے۔ لیکن کوئی سوراجی حکومت جسے مقبول حکومت ہونے کا کوئی دعویٰ بھی ہو۔ جنگ کی بنیادوں پر نہ تو منظم کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اسے برقرار رکھنا ممکن ہے۔ سوراجی سرکار سے ایسی حکومت مراد ہے کہ جو ہندو مسلمانوں اور باقی سب لوگوں کی آزادانہ خوشنودی پر قائم کی جائے گی۔ لہٰذا اگر ہندو اور مسلمان سوراج چاہتے ہیں تو انھیں اپنے جھگڑے طے کر لینے چاہئیں۔

دہلی کی اتحاد کانفرنس نے مذہبی اختلافات کے تصفیہ کے لیے زمین تیار کر دی ہے۔ آل پارٹیز کانفرنس کی کمیٹی سے اور باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف ہندو اور مسلمانوں بلکہ تمام طبقات، مذاہب، فرقوں اور ذاتوں کے سیاسی اختلافات کو حل کرنے کا منصفانہ اور قابل عمل حل تلاش کر لے گی۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنی اوّلیں فرصت میں قوم وارانہ نمائندگی کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ مشترکہ انتخاب نہایت غیر جانب داری سے قابل افراد کو سامنے لائے گا۔ چنانچہ ہمارا ابھی یہ کام ہونا چاہئے کہ ہم قابل ترین مرد اور عورتوں کے لیے غیر جانب داری سے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ لیکن جب تک یہ وقت نہیں آتا۔ اور قوم وارانہ حسد اور اختلافات ماضی کی داستان نہیں بن جاتے۔ اقلیتوں کو جو اکثریتوں سے مطمئن نہیں۔ اپنے راستہ پر چلنے کی اجازت دی جانی چاہئے اکثریتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ قربانی کا ثبوت دیں۔

چھوت چھات موراج کے راستہ میں ایک اور رکاوٹ ہے۔ سوراج حاصل کرنے کے لیے اچھوت پن کو ختم کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ہندو مسلم اتحاد کو بروئے عمل لانا ہے۔ یہ خالصاً ہندو مسئلہ ہے اور ہندو جب تک مظلوم طبقات کو آزادی

تفویض نہیں کر دیتے۔ آزادی نہیں حاصل کر سکتے۔ تاریخ دان ہمیں بتاتے ہیں کہ آرین حملہ آوروں نے ہندستان کے آبائی باشندوں کے ساتھ بالکل وہی سلوک برتا جس کا آج ہم انگریزوں کے ہاتھوں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ حق بات ہے تو ہماری بری حالت ہمارے اچھوت طبقہ کو جنم دینے کے عمل کی سزا ہے۔ جس قدر جلد ہم اس بدنما داغ کو مٹائیں گے اتنا ہی ہندوؤں کے لیے بہتر ہوگا۔ لیکن پروہت ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اچھوت خود خدا کی پیداوار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مذہبی پیشوا راستی پر نہیں۔ یہ کہنا کفر ہے کہ خدا نے انسانیت کے ایک حصہ کو اچھوت بنا دیا۔ اور کانگریسی ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے جلد ان دیواروں کو زیر زمین کر دیں۔

باایں ہمہ میں اپنے ہندو بھائیوں کو ان کے اس رجحان سے متعلق متنبہ کر دینا چاہتا ہوں جس کا اظہار وہ سیاسی مقصد کے لیے مظلوم طبقات کی لوٹ کھسوٹ سے کر رہے ہیں۔ اچھوت پن کو ختم کرنا ہندوؤں کے لیے گناہ کا کفارہ ہے جو سورن ہندوؤں کو ادا کرنا ہے۔ جس پاکیزگی کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے وہ اچھوتوں کی پاکیزگی نہیں بلکہ نام نہاد بڑی جاتیوں کی پاکیزگی ہے۔ کوئی برائی یہاں کی غلاظت اور غیر صحت بخش رہائش اچھوتوں پر مخصوص نہیں۔ یہ تو ہم اعلیٰ ہندوؤں کا گھمنڈ ہے۔ جس نے ہماری خامیوں سے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور جو ہمارے ان پس ماندہ بھائیوں سے متعلق مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ جنھیں ہم نے اپنے نیچے دبایا ہوا ہے اور جن کو ہم دبائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اقوام کی طرح مذاہب بھی ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ خدا کی نوازشات یا نشانیاں کسی ایک نسل یا قوم کا اجارہ نہیں۔ اس کے کرم سے ہر وہ فیض یاب ہوتا ہے جو اس کے حضور میں دعا کرتے ہیں۔ ایسا مذہب یا ایسی قوم صفحۂ ہستی سے بالکل معدوم ہو جائے گی۔ جو ناانصافی، باطل اور تشدد میں ایمان رکھتی ہے۔ خدا نور ہے۔ اندھیرا نہیں۔ خدا محبت ہے نفرت نہیں۔ خدا سچائی ہے جھوٹ

نہیں۔صرف خدا ہی افضل ہے،ہم اس کی تخلیق فقط خاک ہیں۔بہتر ہے،ہم عجز وانکسار سے کام لیں اور اپنے لیے اس کی ادنیٰ مخلوق کا منصب قبول کریں۔کرشن مہاراج نے سداما کی پھٹے پرانے کپڑوں میں وہ عزت کی جو کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔تلسی داس جی نے کہا ہے کہ محبت مذہب وقربانی کا سرچشمہ ہے۔اور یہ جسم فانی لامذہبی اور 'میں' کا منبع ہے۔ہم سوراج حاصل کریں یا نہ کریں۔ہندوؤں کو ویدک فلسفہ کی تجدید اور اسے زندہ حقیقت بنانے سے پیش تر اپنے آپ کو پاک کرنا ہوگا۔

لیکن ہندو مسلم اتحاد، چرخہ اور اچھوت پن کو مٹانا ایک مقصد تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔مقصد سے ہم آگاہ نہیں۔میرے لیے ذرائع سے باخبر ہونا ہی کافی ہے۔میرے فلسفۂ زندگی میں ذرائع اور مقصد تغیر پذیر قضیے ہیں۔لیکن میں عرصہ سے بابو بھگوان داس کے خیالات میں اپنی تبدیلی کا اظہار کر چکا ہوں جن پر بابو موصوف کی طرف سے پبلک میں زور دیا جا رہا ہے۔وہ یہ اصول ہے کہ پبلک کو غیر مبہم طور پر اپنے مقصد سے آگاہ ہونا چاہئے۔یعنی انھیں سوراج کی اسکیم کا پوری طرح علم ہونا چاہئے۔جس کو تمام ہندستان اپنانا چاہتا ہے اور جس کے لیے اسے لڑنا ہے۔خوش قسمتی سے یہ فرض آل پارٹیز کانفرنس کے سپرد کیا جا چکا ہے اور ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ وہ ایسی اسکیم تیار کرلے گی جو سب پارٹیوں کو منظور ہوگی۔کیا میں اس پر غور کے لیے حسب ذیل نقاط پیش کردوں؟

1- حق رائے دہندگی کے لیے نہ تو جائداد کی شرط ہونی چاہئے اور نہ ہی حیثیت کی۔ یہ حق ہاتھ کی محنت کی بنیاد پر تفویض کیا جانا چاہئے۔جیسا کہ کانگریس کا ممبر بننے کے لیے اس کی تجویز کی گئی ہے۔علمی اور ملکیت کے حق فریب آمیز ثابت ہو چکے ہیں۔جسمانی محنت ان سب کو موقع فراہم کرتی ہے جو حکومت میں حصہ لینا چاہتے ہوں اور جن کو ریاست کی بھلائی دل سے عزیز ہو۔

2- تباہ کن عسکری خرچ کو گھٹا دینا چاہئے۔اس پر اتنا خرچ ہونا چاہئے جو عام حالات میں جان و مال کی حفاظت کے لیے ضروری ہو۔

3- عدل وانصاف کے نظم ونسق کو سستا کیا جائے اور اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپیل کی آخری عدالت لندن کی جگہ دہلی میں تبدیل کردی جائے۔ دیوانی مقدمات کی صورت میں طرفین کو اکثر حالتوں میں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے فیصلے ثالثوں سے طے کرائیں۔ان پنچایتوں کے فیصلے آخری ہوں۔درمیانی عدالتوں کی کثرت کو کم کیا جائے۔قانون مقدمات کو ختم کردیا جائے اور اس کی جگہ عام طریقۂ کار کو آسان بنادیا جائے۔ہم غلامانہ طور پر بوسیدہ اور گھسے ہوئے انگریزی ضابطہ کی پیروی کررہے ہیں۔نوآبادیوں کا رجحان اس طرف ہے کہ ضابطہ کو آسان بنادیا جائے۔تاکہ مرافعہ گزاروں کے لیے اپنے مقدمات کی خود پیروی کرنا آسان ہو جائے۔

4- منشیات سے محصولات منسوخ کردیے جائیں۔

5- سول وفوجی ملازموں کی تنخواہوں کے معیار کو اس قدر گرادیا جائے کہ وہ ملک کے عام حالات کے مطابق ہوسکیں۔

6- لسانی بنیادوں پر صوبجات کی از سر نو تقسیم کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو ہر صوبہ کو اپنے نظم ونسق اور ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ خودمختاری عطا کی جائے۔

7- بیرونی لوگوں کو دیے گئے اجاروں کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ اور کمیشن کا فیصلہ صادر کرنے کے بعد ان مستقل حقوق کی جو جائز طور پر حاصل کیے گئے ہوں باقاعدہ ضمانت دی جائے۔

8- ہندستانی والیان ریاست کو مرکزی سرکار کی طرف سے کسی رکاوٹ کے بغیر ان کے منصوبوں کو بحال رکھنے کی پوری پوری ضمانت دی جائے۔لیکن یہ ضمانت ان

ریاستوں کے باشندوں کو پناہ گزیں ہونے کے حق کے ماتحت دی جائے گی اور اس پناہ کو وہ ضابطہ فوجداری کے مجرم نہ ٹھہراتے ہوئے خود مختار ہندستان کی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔

9- تمام مطلق العنانہ طاقتوں کو منسوخ کیا جائے۔

10- ہر قابل انسان کے لیے بڑے سے بڑے منصب کے دروازے کھلے ہوں۔

11- باہمی رواداری کے ساتھ تمام مذاہب کے پیروکاروں کے لیے مکمل مذہبی آزادی کو تسلیم کیا جائے۔

12- صوبائی حکومتوں لیجسلیچر اور عدالتوں میں ایک مقرر عرصہ کے اندر اس صوبہ کی زبان کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ اور اپیل کی سب سے آخری عدالت پریوی کونسل میں ہندستانی کا رسم الخط چاہے دیوناگری ہو یا فارسی۔ مرکزی حکومت اور لیجسلیچر کی زبان ہندستانی ہو۔ بین الاقوامی بات چیت کے لیے انگریزی۔

مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ کہ آپ سوراج کی ضروریات کے ابتدائی نقشہ میں جو کہ میں نے کھینچا ہے۔ جو بات تصوری طور پر غیر معقول نظر آتی ہے، اس کا تمسخر نہیں اڑائیں گے۔ جن باتوں کا میں نے ذکر کیا۔ شاید آج ہم میں انھیں حاصل کرنے یا ان پر عمل پیرا ہونے کی طاقت نہ ہو۔ لیکن کیا ہم اس بات کا عزم رکھتے ہیں؟ آؤ ہم کم از کم اس کی آرزو ضرور رکھیں۔ پیش تر اس کے کہ میں اس نہایت دل کش موضوع سے آگے بڑھوں۔ دل کش اس لیے کہ یہ خیالی ہے۔ مجھے سوراج کی اسکیم مرتب کرنے والی کمیٹی کو یقین دلا دینا چاہئے کہ میں اس تجویز کے لیے اس سے زیادہ توجہ کا طلب گار نہیں کہ جو ہر ایک فرد کو حاصل ہو سکتی ہے۔

مذکورہ بالا نقشہ نہایت آبرومندانہ اور کامل طور پر مساوی بنیادوں پر اس بات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے کہ ہندستان کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات موجود رہیں۔

بایں ہمہ میں جانتا ہوں کہ کانگریس میں ایک حصہ ایسا بھی ہے جو تمام قابل تصور حالات کے ماتحت مکمل آزادی کا علم بردار ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ اگر برطانوی حکومت کا وہی مقصد ہے جس کا وہ اعلان کرتی ہے اور نہایت دیانت داری سے ہمیں مساوی حیثیت دینے میں معاون ہو۔ تو یہ برطانیہ کے ساتھ تعلقات منقطع کر لینے کی نسبت زیادہ کامیابی ہوگی۔ چنانچہ میں سلطنت کے اندر سوراج کے لیے کوشش کروں۔ لیکن اگر برطانیہ کی اپنی غلطی سے علیحدگی ضروری ہوگئی تو میں تمام تعلقات منقطع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ اس طرح میں علیحدگی کی تمام ذمہ داری برطانیہ کے کندھوں پر ڈال دوں گا۔ دنیا کا اچھا دماغ آج کامل طور پر آزاد ریاستوں کا آرزومند نہیں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوں بلکہ ایک ایسی فیڈریشن کی آرزو رکھتا ہے جس میں ریاستیں باہمی طور پر ایک دوسرے کی دست نگر ہوں۔ ایسے وقت کا آجانا ابھی دور ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے کسی نہایت شان دار چیز کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ لیکن میں اس بات کے اظہار کی نسبت کسی بات کو شان دار اور ناممکن نہیں سمجھتا کہ میں آزادی کی بجائے عالم گیر آزادی کی طرف داری کر رہا ہوں۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کا دارومدار برطانیہ پر ہے کہ آیا وہ ہندستان سے تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے یا منقطع کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آزادی پر زور دیے بغیر ہم میں آزاد ہونے کی قابلیت موجود ہونی چاہئے۔ جب برطانیہ ہندستان کے متعلق اپنے نصب العین کو واضح کرتا ہے کہ سلطنت کے اندر اسے مساوی درجہ حاصل ہوگا۔ تو جو اسکیم میں وضع کروں گا وہ برطانیہ سے علیحدہ ہونے کی اسکیم نہ ہوگی بلکہ اس کے ساتھ اتحاد کی اسکیم ہوگی۔ میں کانگریس کے ہر ایک رکن پر زور دوں گا کہ وہ ہر حالت میں اور ہر وقت آزادی پر زور نہ دیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ بلکہ یہ ہے کہ جب تک یہ بالکل عیاں نہ ہو جائے کہ برطانیہ اپنے اعلانات کے باوجود

ہندستان کو غلام رکھنے پر تلا ہوا ہے۔ ایسا کرنا غیر ضروری ہے۔

اب تک میں نے صرف عام سمجھوتہ اور اس سے متعلقہ مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ سوراج پارٹی کو مساوی حیثیت دینے کے سوال پر زیادہ روشنی ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ مجھے اس سلسلہ کو ٹال دینے کا موقع مل جاتا۔ اس لیے نہیں کہ میں سوراج پارٹی کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس لیے کہ مجھے اس کے کونسلوں میں شامل ہونے کے نکتہ نظر سے اتفاق نہیں۔ لیکن اگر میں نے کانگریس میں رہنا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کا فرض ادا کرنا ہے تو میرے لیے لازمی ہے کہ میں حقائق کو اپنی اصل حالت میں تسلیم کروں۔ میرے لیے کانگریس سے باہر رہنا یا صدارت سے انکار کرنا آسان تھا۔ مگر میں نے سوچا اور اب بھی اسی رائے کا مالک ہوں کہ ایسا کرنا ملک کے مفاد میں نہ تھا۔ اگر اس سوال پر کہ آئندہ آئین میں ہندستان کون سے درجہ کا حامی ہے۔ مجھے کانگریس کو تقسیم کرنا مقصود نہ تھا۔ میرے لیے یہ ضروری تھا کہ جب تک حالات ایسی نوعیت اختیار نہیں کرتے کہ وہ میرے ضمیر کی آواز کی مخالف سمت چلنے لگیں، میں ان کا ساتھ دوں۔ میرے خیال میں وہ غیر معقول نہیں۔ سوراجی اپنی پالیسی کے لیے کانگریس کے نام کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ایسا کرنے کے لیے ایک فارمولا تیار کرنا پڑا۔ تاکہ تبدیل ہونے والوں کو اپنی پالیسی سے متعلق کوئی حلف نہ اٹھانا پڑے۔ ایسا کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ انھیں اپنی پالیسی وضع کرنے کے لیے فنانشل اور ایگزیکٹو اختیارات تفویض کر دیے جاتے۔ کانگریس من حیث الجماعت ذمہ واری کا بوجھ اٹھائے بغیر اس پالیسی کو قبول نہ کرسکتی تھی۔ چونکہ میں ذمہ واری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ اور اب بھی میرا خیال ہے کہ جب تک کسی فرد کے خیالات نہ بدل جائیں وہ ایسی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ میں اس پالیسی کی تشکیل میں نہ تو شریک ہوسکتا تھا اور نہ ہی میں ایسی حالت میں اسے تشکیل دینا

ممکن سمجھتا تھا۔ کہ جب میرا دل ہی اس میں نہ ہو۔ دل اسی راہ کی پیروی کرسکتا ہے جس میں اس کا اعتقاد ہو۔ میں جانتا ہوں کہ سوراج پارٹی کو اس بات کے مکمل اختیارات تفویض کرنے سے کہ وہ کانگریس کے نام کو استعمال کرسکتی ہے۔ کانگریس میں شامل ہونے والی دوسری پارٹیوں کی پوزیشن خراب کردیتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ ناگزیر امر ہے۔ سوراج پارٹی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس رعایت سے سبک دوش ہوجائے گی جو اب اسے حاصل ہے۔ بہرحال وہ اس رعایت کو اپنی ذات کی بجائے ملک کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ تمام پارٹیاں ایسی خواہش رکھ سکتی ہیں۔ چنانچہ میں امید کرتا ہوں کہ دوسری پارٹیاں بھی کانگریس میں شامل ہوجائیں گی۔ تاکہ وہ سب مل کر ملک کے لیے لائحہ عمل تلاش کرسکیں۔ ڈاکٹر بیسنٹ نے اس ضمن میں رہنمائی کا فرض ادا کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس کے بغیر کئی کام کرسکتی تھیں۔ مگر آپ نے اس امید کے ماتحت کانگریس کے اندر رہ کر کام کرنا پسند فرمایا ہے کہ اس طرح وہ رائے دہندگان کو اپنے خیالات پر لاسکیں گی۔ میری ناچیز رائے میں نہ تبدیل ہونے والوں کے لیے راستہ کھلا ہے۔ وہ اپنے کھلے ضمیر کے ساتھ سمجھوتہ کے لیے رائے دے سکتے ہیں۔ مشترکہ طور پر کام کرنے کا واحد پروگرام کھدر، ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں کے لیے چھوت چھات کو مٹا دینا ہے۔ بہرکیف کیا یہ وہی کچھ نہیں جو میں چاہتا ہوں۔

کہا گیا ہے اس طرح کانگریس ایک خالصاً مجلسی اصلاحی جماعت بن گئی ہے میں اس رائے سے اختلاف کی اجازت چاہتا ہوں۔ سوراج حاصل کرنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ محض مجلسی پروگرام سے بڑھ کر کام ہے اور کانگریس کو اسے لازمی طور پر اپنا لینا چاہیئے۔ کیا یہ پہلے نہیں کہا گیا کہ کانگریس کو ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو اس پروگرام پر محدود کردینا چاہیئے۔ لیکن اس بات کا مشورہ دیا گیا ہے کہ

کانگریس کو اپنا تمام زور تعمیری کام پر صرف کر دینا چاہیے۔

سمجھوتہ بھی کانگریس کے تعمیری پروگرام کو پس پشت نہیں ڈالتا۔ اب میں جن امورات کا ذکر کرنے لگا ہوں وہ بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ غیر اختلافی امورات اور ایسی باتیں ہیں جو سوراج کے لیے از بس ضروری ہیں۔ اس لیے اوپر بیان کردہ تین شقوں کی طرح سمجھوتہ میں ان کا ذکر موجود نہیں۔

اوّل تو قومی تعلیمی اداروں کا قیام ہے۔ شاید لوگ اس بات سے واقف نہیں کہ کھدر کے بعد قومی تعلیمی اداروں کے قیام کا کام نہایت کامیاب رہا ہے۔ جب تک چند طالب علم بھی موجود ہیں ہم اس کام کو ترک نہیں کر سکتے۔ یہ ہر ایک صوبہ کی عزت کا سوال ہے کہ وہ اپنے اسکولوں اور کالجوں کو برقرار رکھیں۔ عدم تعاون کی تحریک کے التوا سے ان اداروں پر مضرت رساں اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ اس کے برعکس ان اداروں کو قائم رکھنے اور مضبوط بنانے کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ کوششیں عمل میں لائی جانی چاہئیں۔ اکثر صوبجات میں قومی اسکول اور کالج موجود ہیں۔ صرف گجرات میں نیشنل یونیورسٹی موجود ہے جس پر ایک لاکھ روپیہ سالانہ صرف ہوتا ہے۔ اس میں 3 کالج اور 70 اسکول ہیں جن میں نو ہزار طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ اس نے الہ آباد میں خود اپنی زمین خریدی ہے اور صرف عمارت پر 205323 روپے صرف کیے ہیں۔ ملک کے طول وعرض میں عدم تعاونی طلبا نے خاموش اور شاندار خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی قربانیاں بہت عظیم اور اعلیٰ ہیں۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے شاید انھوں نے اپنا مستقبل خراب کر لیا ہے۔ لیکن میں انھیں یہ کہتا ہوں۔ کہ قومی نقطۂ نظر سے انھوں نے خسارے کی نسبت زیادہ فائدہ حاصل کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اسکول اور کالج اس لیے چھوڑ دیے۔ کیوں کہ یہی وہ ادارے تھے جن کے ذریعے پنجاب کے نوجوانوں کو ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہماری غلامی کی زنجیروں کا پہلا سلسلہ ان اسکولوں میں تیار ہوتا ہے۔ ان کے متوازی اسکول چاہے انتظامی

لحاظ سے زیادہ بہتر نہ ہوں۔ مگر وہ ایسے کارخانے ہیں جہاں ہماری آزادی کے اولین اوزار تیار ہوتے ہیں۔ بہر حال قوم کی امیدیں ان قومی اداروں میں پڑھنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس لیے میں ان اسکولوں کو برقرار رکھنا صوبائی اخراجات کی اوّلین حد قرار دیتا ہوں۔ لیکن چونکہ یہ ادارے خالصتاً قومی ہیں اس لیے انھیں ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کی کلبوں کا کام دینا چاہئے۔ نیز ان کی ایسی درس گاہیں ثابت ہونا ضروری ہیں جہاں ہندو لڑکوں اور لڑکیوں کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ چھوت چھات ہندو دھرم کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا اور انسانیت کے خلاف بہت بڑا جرم ہے۔ کاتنے اور بننے کے ماہرین پیدا کرنے کے لیے ٹریننگ اسکول کھلنے چاہئیں۔ اگر کانگریس کو کھدر اور چرخہ کی طاقت پر اعتماد ہے تو ان اداروں سے یہ ضرور توقع کی جائے گی۔ کہ وہ چرخہ کی سائنس کو ترقی دیں۔ نیز کھدر بننے کے لیے فیکٹریاں قائم ہونی چاہئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ طلبا کو ادبی تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ لیکن میری یہ پختہ رائے ہے کہ دل اور ہاتھ کی تربیت دماغ کی تربیت کے ساتھ ساتھ ہونی چاہئے۔ کسی قومی اسکول یا کالج کی قابلیت اور مفید ہونے کا اندازہ اس بات سے نہیں لگایا جائے گا کہ اس کے فاضل ادبی تعلیم میں کتنے ہونہار ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے گا کہ انھوں نے قومی کیریکٹر کس قدر مضبوط پیدا کیا ہے۔ طلبا کو چرخہ کی دستی تکلے اور کمانی کو گھمانے کا کتنا ملکہ حاصل ہے۔ ایک طرف میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ کوئی قومی اسکول بند نہ کیا جائے۔ دوسری طرف مجھے ایسے اسکولوں یا کالجوں کو بند کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا جو غیر ہندو طلباء کو داخلہ سے محروم کرتا ہے۔ جو اچھوتوں پر اپنے دروازے بند کرتا ہے اور جو کاتنے اور بننے کی تربیت کو اپنی تعلیم کا لازمی جز نہیں سمجھتا۔ وہ وقت گزر گیا کہ جب صرف یہ دیکھ کر ہم مطمئن ہو جائیں گے کہ اسکول کے بورڈ پر '' قومی '' کا لفظ کندہ ہے اور وہ کسی سرکاری یونیورسٹی سے ملحق نہیں۔ مجھے یہ بھی کہنے سے گریز نہ کرنا چاہئے کہ

بہت سے قومی اداروں میں اب بھی یہ رجحان موجود ہے کہ ورنیکلر یا ہندستانی کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اکثر استادوں نے ورنیکلر یا ہندستانی کے ذریعہ تعلیم دینے کی اہمیت کا احساس نہیں کیا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ سرگنگادھر راؤ نے قومی معلموں کا اجلاس مدعو کیا ہے جس میں ان نقاط پر جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں غور کیا جائے گا اور اگر ممکن ہو سکا تو تعلیم اور عمل کی ایک عام تجویز عمل میں لائی جائے گی۔

میرے خیال میں غالباً یہ موزوں مقام ہے کہ یہاں ان وکلا کا جو پریکٹس ترک کر بیٹھے ہیں اور ان اسکول ماسٹروں اور دیگر سرکاری ملازموں کا ذکر کیا جائے جو ملازمتوں سے سبک دوش ہو گئے ہیں۔ وہ قومی امداد کے مستحق ہیں۔ کھادی بورڈ اور قومی اسکول دو ایسے ادارے ہیں جو ایسے محنتی اور دیانت دار افراد کی ایک تعداد کو کھپا سکتے ہیں۔ وہاں انھیں اوسط درجہ کا وظیفہ مل جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان اداروں میں بلا معاوضہ کام کرنے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ بلا معاوضہ کام کرنے کی خواہش قابل استحسان ہے لیکن ہر ایک کے لیے اس پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے۔ ہر محنت کش کو اس کی محنت کا اجر ملنا چاہیے۔ کوئی ملک ہزار ہا کی تعداد میں بلا اجرت تمام دن کام کرنے والے مزدور نہیں پیدا کر سکتا اس لیے ہمیں ایسی فضا پیدا کرنی چاہیے۔ جس میں محبان وطن اپنی ایسی خدمت کے لیے وظیفہ حاصل کرنا موجب عزت سمجھیں۔

قومی اہمیت کا ایک اور مسئلہ نشہ اور افیون کی تجارت ہے۔ اگر ان جذبات کی لہر جو 1921ء میں تمام ملک پر طاری ہوئی۔ غیر متشدد رہتی۔ تو آج ہم نے ایک ترقی پسندانہ اصلاح کا مشاہدہ کیا ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری پکٹنگ نے تشدد کا رنگ اختیار کر لیا۔ کہیں کہیں یہ رنگ نمایاں تھا اور کہیں پس پردہ۔ چنانچہ ہمیں پکٹنگ اٹھانا پڑی اور شراب اور افیون کی دوکانیں پہلے کی طرح پھر پھلنے پھولنے لگیں۔ لیکن آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ شراب نوشی کو روکنے کا کام بالکل فوت نہیں ہوا۔ بہت سے

کارکن خاموشی سے شراب نوشی کی لعنت کو دور کرنے کے نیک کام میں مصروف ہیں۔ بااین ہمہ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم جب تک سوراج حاصل نہیں کر لیتے۔ اس لعنت کا سدِ باب نہیں ہوسکتا۔ ہمارے لیے یہ باعث فخر نہیں کہ ہمارے بچے ان نشی اشیاء سے حاصل کیے ہوئے محصول سے تعلیم پائیں۔ میں کانگریس کارکنوں کو کونسلوں میں داخل ہونے کے لیے معاف کر دوں گا۔ اگر انھوں نے دلیری سے اس Revenue کو بند کر دیا اور اس بات کی پرواہ نہ کی کہ ایسا کرنے سے تعلیم کا گلا گھونٹا جائے گا۔ اگر انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ایسی صورت میں تعلیم کے مصارف فوجی اخراجات سے پورے کیے جائیں تو کوئی ایسی بات نہ ہوگی۔

آپ نے اس بات کا احساس کیا ہوگا۔ کہ میں نے اوپر بیان کردہ پیروں میں صرف داخلی مسائل پر تبصرہ کیا ہے۔

لیکن خارجی حالات اور ان میں بالخصوص ہمارے حکم رانوں کے افعال ہماری قسمت پر ہمارے اندرونی مسائل کی نسبت کم اثر انداز نہیں ہورہے۔ ہم انھیں اپنے مفاد میں ڈھال سکتے ہیں اگر ہم انھیں اپنے مفادات کے خلاف چلنے سے روک لیں۔ ہمارے حکم رانوں کا مؤخر ترین اقدام بنگال میں جبر کے دور کا آغاز ہے۔ آل پارٹیز کانفرنس نے اس کی غیر یقینی الفاظ میں مذمت نہیں کی۔ کانفرنس کو یہ کہنے میں تامل تھا کہ نشانہ دراصل سوراج پارٹی تھی۔ مجھے ایسا کہنے میں کوئی تامل نہیں۔ میں کلکتہ گیا اور وہاں مجھے مختلف آرا کے مالک افراد سے ملنے کا موقع ملا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نشانہ سوراج پارٹی تھی۔ لارڈلٹن اور لارڈ ریڈنگ کی حالیہ تقریروں نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ جو دلائل انھوں نے پیش کیے ہیں قطعاً باور کے قابل نہیں۔ لارڈلٹن کی رہائی کی شرائط ہماری ذہانت کی توہین ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر صورت حالات 1818ء کے ریگولیشن اور آرڈیننس سے کام لینے کی مقتضی تھی۔ اس بات کو بمنزلہ

ثبوت تسلیم کرلیا ہے۔قومی دلیل یہ ہے:

1- جس صورت حال کا انھوں نے ذکر کیا ہے اب موجود نہیں۔

2- یہ تصور کرتے ہوئے کہ وہ صورت حالات اب بھی موجود ہے مرض کے لیے جو علاج تجویز کیا گیا ہے۔مرض سے بدتر ہے۔

3- یہ کہ عام قانون اس صورت حالات کا مقابلہ کرنے کو کافی اختیارات کا حامل ہے۔

4- سب سے آخر یہ کہ اگر غیر معمولی اختیارات بھی ضروری تھے۔تو یہ انھیں لیجسلیچر سے حاصل کرنا چاہئیں تھے۔جو خود ان کی اپنی پیداوار ہے۔

حضور وائسرائے صاحبان نے اپنی تقریروں میں ان باتوں سے پہلو تہی کی ہے۔ ہندستانی قوم جسے حکومت کے بیانات کا کافی تجربہ ہے۔انھیں پیغمبرانہ سچائی کا مظہر نہیں مان سکتی۔وائسرائے صاحبان جانتے ہیں کہ ہم ان کے بیانات کو صحیح تسلیم نہ کریں گے۔اس لیے نہیں کہ وہ دانستہ طور پر غلط ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے ذرائع اطلاعات عموماً ایسے ہوتے ہیں جن پر رنگ چڑھا ہوا ہو۔لہٰذا ان کے بیان میں لوگوں کا مذاق ہوتا ہے۔یہ تقریریں ہمیں اس بات کا چیلنج ہیں کہ ہم سے جو کچھ بن پڑے کر دکھائیں۔لیکن ہمیں مشتعل یا بے قابو ہونے کی ضرورت نہیں۔جبر و تشدد اگر ہمیں مرعوب نہیں کرسکتا۔اگر وہ ہمیں اپنے راستہ سے نہیں ہٹا سکتا۔تو اس سے سوراج قریب آئے گا۔کیوں کہ یہ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرتا ہے اور ہمارے اندر خطرات کے مقابلہ میں بہادری اور قربانی کی روح بیدار کرتا ہے۔کسی سچے انسان کے لیے تشدد وہی کام کرتا ہے جو سونے کے لیے آگ۔1921ء میں ہم نے تشدد کا مقابلہ سول نافرمانی سے کیا اور حکومت کو دعوت دی کہ وہ زیادہ سے زیادہ سختی کر کے دیکھ لے لیکن آج ہم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہیں۔ہم سول نافرمانی کے لیے تیار نہیں۔ہم اس وقت صرف

تیاری کر سکتے ہیں۔ سول نافرمانی کے لیے تشدد کا مطلب ڈسپلن، ضبط نفس، مزاحمت کی غیر متشدد روح اور سب سے آخر خدا کے معروف قوانین اور انسان کے ایسے قوانین جو خدا کے قوانین کو فروغ دیں، کی محسوس وفاداری اور متابعت ہے۔ ہم نہ تو ڈسپلن کے حامل ہیں اور نہ ہی ایسے ضبط نفس کے مالک ہیں جو حصول مقصد کے لیے ضروری ہے۔ ہم یا تو متشدد ہیں۔ یا ہمارا عدم تشدد بے قابو ہے۔ ہم نہ تو ازبس قوت اتصال کے مالک ہیں۔ اور جن انسانی یا خدائی قانونوں کی تابعت بھی کرتے ہیں۔ وہ بھی مجبور اور بے بس ہو کر ایسا ماحول سول نافرمانی کے لیے موزوں نہیں۔ حالانکہ مظلوم لوگوں کے پاس سول نافرمانی ہی بہترین اور بے مثال ہتھیار ہے۔ اس کا بدل تشدد ہے۔ اس کے لیے فضا ساز گار ہے۔ ہندو مسلم لڑائیاں ہماری تربیت کو موجود ہیں۔ اور جو لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہندستان کی آزادی کا راز تشدد میں مضمر ہے۔ ان لڑائیوں کو شوق کی نگاہوں سے دیکھنے کے حق دار ہیں۔ جو ہم میں آزادانہ طور پر ہو رہی ہیں۔ لیکن میں ان لوگوں کی خدمت میں جو تشدد پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ہندستان کی ترقی کے راستہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں کروڑ ہا فاقہ مست انسانوں کے لیے رحم یا ہمدردی کا ذرا بھر جذبہ بھی موجود ہے۔ تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کا تشدد ان کی کوئی خدمت سرانجام نہ دے سکے گا۔ جن لوگوں کو آپ طاقت سے محروم کرنا چاہتے ہیں وہ آپ سے زیادہ مسلح اور مثبت طور پر آپ سے زیادہ منظم ہیں۔ آپ کو اپنی جانوں کی پرواہ نہ ہو۔ مگر آپ ان لوگوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو آپ کی طرح شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے کو تیار نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ حکومت جلیاں والہ باغ کے قتل عام کو اپنی حفاظت کا جائز ذریعہ قرار دیتی ہے۔ دوسرے ممالک کی حالت خواہ کچھ ہو۔ ہندستان تشدد کے عقائد کے لیے موزوں سرزمین نہیں۔ ہندستان مسلمہ طور پر عدم تشدد کا بہترین ترجمان اور خزینہ ہے۔

کیا آپ اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف نہیں کریں گے؟

مجھے معلوم ہے کہ متشدد وانقلاب پرستوں کے نام میری اپیل ایسی ہی بے ثمر ثابت ہوگی جس طرح کسی متشدد یا طوائف الملو کی کی شکار حکومت کے نام۔

چنانچہ ہمیں اس کا حل تلاش کرنا ہے۔ اور متشدد حکومت اور متشدد انقلابیوں پر اس بات کا مظاہرہ کرنا ہے کہ ایک طاقت ایسی بھی ہے جو ان کے تشدد سے زیادہ پر اثر ہے۔

میں اس جبر کو ایک دائمی مرض کی دائمی علامت قرار دیتا ہوں ۔ یورپی غلبہ اور ایشیائی غلامی اس کا علاج ہے۔ بعض اوقات مخفی طور پر اسے سفید بنام سیاہ کے قضیہ سے پکارا جاتا ہے۔ کپلنگ نے سفید انسان کے جواء کو سفید انسان کے بوجھ کے غلط نام سے موسوم کیا ہے۔ ملایا میں جہاں رنگ کا امتیاز عارضی طور پر اپنا رنگ جما سکا تھا اب مستقل ادارہ بن گیا ہے۔ مارکٹیس آباد کاروں کو بلا روک ٹوک ہندستانی مزدور چاہئیں۔ کنیا کے یورپی خاص طور پر ان ہندستانیوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ جو ان سے پہلے وہاں جا کر آباد ہوئے۔ یونین ''ساؤتھ افریقہ'' اگر بآسانی ممکن ہوا تو وہ ہندستانیوں کی سابقہ روایات کا بالکل لحاظ نہ رکھتے ہوئے انھیں کلیتاً وہاں سے جانے پر مجبور کر دے گی۔ ان تمام امورات میں ہندستان کی حکومت اور امپیریل سرکار بے بس نہیں ہیں۔ وہ ہندستانی آباد کاروں کی حفاظت کرنے کو رضا مند نہیں۔ یا وہ اس بات پر اتنا زور دینا پسند نہیں کرتے جتنا کہ ضروری ہے۔

اکالیوں کی نا قابل تسخیر روح کو کچلنے کا اقدام اسی بیماری کی ایک اور علامت ہے۔ انھوں نے اپنے اس مقصد کے لیے جسے وہ اپنے خون کی طرح عزیز سمجھتے ہیں اپنے خون کو پانی کی طرح بہایا ہے۔ شاید ان سے غلطی ہوئی ہو۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو اس کے لیے انھوں نے خود ہی اپنا خون بہایا ہے۔ انھوں نے کسی کو مجروح نہیں کیا۔...... جیتو اور گورو کا باغ ان کی بہادری ان کے چپ چاپ مصائب اٹھانے اور شہادت کے

گواہ رہیں گے۔ لیکن پنجاب کے گورنر سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اکالیوں کو کچل دینے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔

آج یہ بھی سنائی دیتا ہے کہ برمیوں کی روح کو بالجبر پامال کیا جارہا ہے۔

مصر کی قسمت بھی اچھی نہیں۔ ایک دیوانے مصری نے ایک برطانوی افسر کو قتل کر دیا۔ یقیناً یہ فعل قابل مذمت ہے۔ لیکن اس کی سزا جو دی گئی نہ صرف قابل مذمت فعل ہے بلکہ یہ تو تمام انسانیت پر اندھیر ہے۔ مصر کو جو کچھ حاصل تھا اس سے چھین لیا گیا ہے۔ ایک فرد کے جرم میں تمام قوم کو سزا دی گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ قاتل کے ساتھ تمام مصریوں کو ہمدردی ہے۔ کیا اتنی سی بات ایسی طاقت کے ہولناک تشدد کو حق بجانب قرار دے سکتی ہے جو اس کے بغیر بھی اپنے مفادات کی حفاظت کر سکتی ہے۔

چنانچہ کانگریس کو اپنے مطالبات کی پشت پناہی کے لیے اجازت حاصل کر لینا چاہئے۔ پیش تر اس کے کہ ہم ایسی اجازت حاصل کریں۔ ہم ہندو، مسلمان، عیسائی و پارسی وغیرہ سب کو متحد ہو جانا چاہئے اور اسی طرح سوراجیوں، عربوں، ہوم رولروں، مسلم لیگیوں اور دیگر سب کو۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اپنے ذہن میں صاف ہوں اور متحدہ اقدام اٹھا سکیں۔ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم بدیسی مال کو اپنے ملک سے دور رکھ سکیں۔ جب ایسا ہو جائے۔ تو اسی وقت ہم کسی اقدام کے لیے اجازت حاصل کرنے کو صحیح معنوں میں تیار ہوں گے۔

میں یہاں ذرا اپنے اعتقاد کا بھی اظہار کر دوں۔ ایک کانگریسی کی حیثیت سے اس خیال کے پیش نظر کہ کانگریس مضبوط رہے۔ میں عدم تعاون کی تحریک کو بند کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ملک اس کے لیے تیار نہیں ہے لیکن ایک فرد کی حیثیت سے میں اس وقت تک ایسا نہیں کر سکتا اور نہ ہی کروں گا جب تک حکومت وہی رہتی ہے جو کچھ کہ وہ ہے۔ میرے لیے یہ پالیسی نہیں۔ بلکہ میرا جزو

ایمان ہے۔عدم تعاون اور سول نافرمانی ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ یہ درخت ستیہ گرہ ہے۔یہ میرا جام جم ہے۔اہنسا اور عدم تعاون ایسی روشنی ہے جو مجھ پر سچائی آشکارا کرتی ہے۔سوراج میرے لیے اس سچائی کا ایک حصہ ہے۔ستیہ گرہ نے مجھے جنوبی افریقہ، کھیدا اور چمپارن اور دیگر کئی مقام پر کہیں دھوکہ نہیں دیا۔ میں تمام نفرت اور تشدد کو اس سے دور قرار دیتا ہوں۔ چنانچہ میں انگریزوں سے نفرت نہیں کرسکتا، اور نہ ہی کبھی ان سے نفرت کروں گا۔ہاں میں ان کے جواء کو بھی برداشت نہ کروں گا۔ میں اپنی موت تک ہندستان پر برطانوی طریقوں اور برطانوی اداروں کے نفوذ کے خلاف لڑوں گا۔ البتہ میں لڑائی عدم تشدد کے ساتھ لڑوں گا۔ میں ہندستان کی اس قابلیت کا معترف ہوں کہ وہ اپنے حکم رانوں کے خلاف عدم تشدد کے ساتھ جنگ لڑسکتا ہے۔ یہ تجربہ ناکام ثابت نہیں ہوا۔ یہ کامیاب رہا ہے۔مگر اس حد تک نہیں جس کی امید تھی۔ میں مایوس نہیں ہوتا۔اس کے برعکس میری یہ رائے ہے کہ ہندستان مستقبل قریب میں صرف ستیہ گرہ کے ذریعے اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہوسکے گا مجوزہ التوا تجربہ کا ایک حصہ ہے۔اگر میرا تجویز کردہ پروگرام پورا ہوسکے تو کہیں بھی عدم تعاون کی ضرورت نہیں۔عدم تعاون اور عدم تشدد کسی ایک یا دوسری شکل میں کانگریس کے ذریعہ یا اس کے بغیر اسی صورت میں جاری کیے جائیں گے۔ جب یہ پروگرام ناکام رہے گا۔میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ ستیہ گرہ کبھی ناکام نہیں ہوتا، اور یہ کہ صرف ایک سچا ستیہ گرہی سچائی کا مظاہر کرنے کو کافی ہے۔آؤ ہم سب صحیح طور پر ستیہ گرہی بننے کی کوشش کریں۔اس جدوجہد میں کسی ایسے وصف کی ضرورت نہیں جس کا ہم میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ حامل نہ ہوسکتا ہو۔کیوں کہ ستیہ گرہ تو ہمارے اندرونی من کی ایک صفت ہے۔یہ ہم ہر ایک میں بالقوۃ موجود ہے۔سوراج کی طرح یہ ہمارا پیدائشی حق ہے ہمیں اس کا علم ہونا چاہئے۔

مسز سروجنی نائیڈو

کان پور ——————— 1925ء

میں اگر انسانی زبان کے تمام خزانوں کی چھان بین کر ماروں تو بھی مجھے اس بات کا خوف معلوم ہوتا ہے کہ میں ایسے زوردار اور خوبصورت الفاظ تلاش کرنے میں ناکام رہوں گی۔ جو میرے اس گہرے جذبے کی ترجمانی کرنے کے قابل ہوں جن کو میرا دل آپ کی اس بے مثال عزت کے اعتراف میں محسوس کرتا ہے جس کا آپ نے مجھے شرف بخشا ہے۔ آپ نے میرے کمزور ہاتھوں میں اتنا بڑا بوجھ اور اتنے بڑے منصب کی ذمہ داریاں سونپ دی ہیں۔ مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ مجھے آپ نے وہ قیمتی سے قیمتی تحفہ عطا کیا ہے جس کے آپ مالک تھے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے یہ اس حقیر خدمت کے صلہ میں پیش نہیں کیا۔ جو میں ہندستان یا ہندستان سے باہر ادا کر چکی ہوں۔ بلکہ اسے آپ نے ہندستانی عورتوں کو خراج تحسین ادا کرنے اور روحانی اور دنیاوی مجلسوں میں اس کی جائز جگہ کے وفادارانہ اعتراف کی نشانی کے طور پر عطا کیا ہے۔ ایسے وقت میں کہ جو نہایت سنجیدہ مسائل اور فیصلہ کن نتائج سے بھرپور ہے۔ آپ نے اپنے منتخبہ خادموں میں مجھے سرداری کے لیے منتخب کر کے کسی عجوبہ بات کی مثال پیش نہیں کی۔ آپ نے تو صرف پھر پرانی روایات کو دہرایا ہے اور ہندستانی عورت کو وہ اعلیٰ درجہ پھر دے دیا ہے جس کی وہ ہمارے دیس کی مسرت آمیز کہانی میں کبھی مالک تھی۔ جب وہ اپنے مالک کی گھریلو اور روحانی زندگی میں چراغ

راہ تھی۔ میں اس بات سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ جس نہایت عمدہ اور اعلیٰ قربانی، ایثار اور دانش وری کا ہماری تاریخ اور کہانیوں کا شان دار نمونہ دیویاں پیش کر چکی ہیں میں اس کی ترجمانی کے ہرگز قابل نہیں۔ بااین ہمہ مجھے اس بات کا بھروسہ ہے کہ جس اعلیٰ کام کو سرانجام دینا آپ نے میرے سپرد کیا ہے میں اس لافانی ایمان کی کچھ حرارت دکھا سکوں گی جس نے سیتا کی شب بیداری کو جنگل کی جلاوطنی میں منور کر دیا اور ساوتری کے قدموں کو موت کے قلعہ کی طرف نہایت بے خوفی سے اٹھانے کی ترغیب دی۔

افسوس! کہ اس ہمایوں نشان اسمبلی کی مسلمہ روایات مجھے مجبور کرتی ہیں کہ میں آپ کے سامنے آئندہ سال کے لیے رسمی طور پر تجاویز اور پالیسی کا مسودہ پیش کروں۔ چنانچہ میں اپنے جذبات اور اپنی عادات کے برعکس لاحاصل طور پر ایسے مناسب محاورات کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ جو میرے خیالات کی ہلکی سی تصویر پیش کر سکیں۔ میرے خیالات دراصل اسی صورت میں اظہار کا جامہ پہن سکتے ہیں۔ جب میں آپ کے درمیان کھڑی ہوں اور آپ کی زندہ موجودگی کا وجدان میرے دل کو ان کی آواز اور امید عطا کر سکے اور میرے الفاظ کو ان کے پر اور قوت پرواز۔

پیشتر اس کے کہ ہم اس شمالی شہر میں اپنی مساعی کے منتہائے مقصود تک پہنچیں۔ جہاں ہم ہندستان کے اس قدر دور دراز علاقوں سے آئے ہیں۔ ہمیں اپنی ان مشہور ومعروف شخصیتوں کی یاد میں تعزیت آمیز عقیدت کا اظہار کرنا ہے جو حال ہی میں انتقال فرما گئی ہیں۔ سب سے پہلے ہندستان کی اس بلند مرتبہ شخصیت سر یندر ناتھ بینر جی کی طرف نگاہ اٹھتی ہے۔

آپ ہندستان میں تحریک احیاء العلوم کے بانی تھے۔ آپ نے تقریباً نصف صدی اپنے شاندار انداز خطابت سے ان زیادتیوں کے خلاف جن کا شکار ان کے ہم

وطن ہو رہے تھے۔ فضا میں طوفان پیدا کر دیے۔ آج دکن کے مشہور عالم رام کشن مدھار کر بھی ہم میں موجود نہیں۔ جنھوں نے نہایت صبر و اطمینان سے ہمارے سنسکرت کے قدیم تمدن کو از سر نو زندہ اور اسے سیاسی جھگڑوں اور دست درازیوں سے بلند اور بالاتر کر دیا۔ ہم تصورات کے شہنشاہ دیش بندھو چتر نجن داس کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ جن کا وجود ہی اپنے ملک کی آزادی کے لیے اس کے ناقابل موازنہ جذبہ کا ویشنوانہ رجز یہ کلام تھا اور جن کا مرنے کے بعد بھی اپنے اس دشمن کی طرف صلح کا خسروانہ ہاتھ کشادہ تھا جس کا مقابلہ انھوں نے اتنی بے دردی اور فاتحانہ روح کے ساتھ کیا تھا۔

یہ ہماری خوش نصیبی کا سامان ہوتا کہ وہ آج ہمارے اس کٹھن کام میں ہماری رہنمائی کے لیے ہم میں موجود ہوتے اور ان اہم مسائل کے حقیقی اور افسوس ناک نتائج سے ہمیں باخبر کرنے میں مدد دیتے جو فوری طور پر تصفیہ کے محتاج ہیں اور جن کے برے نتائج سے ہم اس طرح بریت نہیں پا سکتے کہ ہم انھیں کسی اور وقت پر التوا میں ڈال دیں۔ اس وقت بین الاقوامی اور اندرونی حالات نے مل کر ہماری خواہشات کے خلاف ہمیں ان میں الجھانے کی سازش کر رکھی ہے اور تقریباً تقریباً ہمارے علم کے بغیر ہمیں ایسی نہایت پیچیدہ بھول بھلیوں اور عجیب مشکلات میں پھنسا دیا ہے جن سے ہمارے قومی وجود کی مضبوطی اور موجودگی کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے پٹی کھول کر اپنی ذلیل کن غلامی کے قبیح اور غمناک نظارہ کو دیکھیں جسے ہمارے احمقانہ اختلافات نے جنم دے رکھا ہے اور جسے ہمارے اس جذبہ نے پالا پوسا ہے کہ ہم شہنشاہی طاقتوں پر ایک عرصہ سے بھروسہ قائم کیے بیٹھے ہیں۔ تو ہم ان بے شمار مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو آج ہمارے سامنے ہیں کیا ذرائع عمل میں لائیں؟ کون سی تجاویز وضع کریں؟ ہم ظلم و جبر کی ہولناک طاقتوں کا کیوں کر مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اور اس حریص اور بے رحم شہنشاہیت کو

کس طرح پچھاڑا جاسکتا ہے جو ہمارے انسانی حقوق آزادی کو چیلنج کر رہی ہے اور جو ہماری اقتصادی اور روحانی میراث کی رہی سہی جان نکالنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ ہم دیگر بیرونی ملکوں سے کیوں کر عہدہ برا ہو سکتے ہیں؟ جو ہماری ذہنی اور اقتصادی غلامی سے فائدہ اٹھانے پر بے تاب ہیں۔ ہم نو آبادیوں میں آباد اپنے بھائیوں کو کس طرح ہولناک تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ ہم رجعت پسندی کی خوفناک طاقتوں کو کس طرح شکست دے سکتے ہیں؟ اور اس تباہی سے اپنے آپ کو کس طرح بچا سکتے ہیں۔ جو ہمارے اندرونی جھگڑوں کی شکل میں ہمیں ہڑپ کرنے پر منہ کھولے بیٹھی ہے۔

ان سوالات کے جواب ہمیں مہاتما گاندھی کے شاندار عقیدہ میں ملتے ہیں جس کی مثال آپ اپنی بے مثال قربانی سے پیش کر چکے ہیں۔ آپ نے ہمیں نہایت سادہ مثال میں قومی خودداری کے اولوالعزمانہ بھید کا سبق دینے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ چاہے کچھ کہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عدم تعاون اور عدم تشدد کی تحریک نے جو ملک پر ایک طوفان کی طرح چھا گئی ہماری قومی زندگی کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور اب وہ اگرچہ خاموش ہے اور اس کا شور کانوں میں سنائی نہیں دیتا۔ اس نے ہماری حیات کے نظریہ کی حالت بدل دی ہے۔

ہمارے آئندہ پروگرام مہاتما گاندھی کے تصورات اور نظریات سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں ان پر اس گذشتہ دور کا اثر پڑنا ضروری ہے جنھوں نے مستقل طور پر ہمارے سیاسی خیالات کی ہوا بدل دی اور ہماری سیاسی قسمت کی سمت پھیر دی ہے۔

آج ہمیں مضبوط تدبر کے ایسے معجزہ کی ضرورت ہے جو ہندستان کو سیاسی غلامی کی زنجیروں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانے میں اس طرح معاون ثابت ہو کہ ہم اپنی منتشر اور حوصلہ شکستہ ہمتوں کو اپنے اس نہایت اعلیٰ کام کے لیے منظم کرسکیں، اور

جن کے طفیل ہم ایک ایسی وسیع اسکیم تیار کرلیں جو ہمارے سیاسی کاموں میں ہماری قدرتی اور ناگزیر معاون ثابت ہو اور اپنے دائرہ اثر میں ان تمام مسائل اور عزائم کو سمٹا سکے جو ہندستان کی ذہنی، صنعتی اور مجلسی ترقی کے لیے بروئے کار لائے جائیں اور جو حسب بالا امورات کی ضروریات کا تقاضا بہم پہنچا سکیں اور جدید ترقی کے نفیس تصورات پر پورا اترنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

ان سرگرمیوں سے متعلق اپنے فیصلہ کو ٹھوس شکل دینے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کو چاہئے کہ وہ ہر بات کے متعلق علٰیحدہ علٰیحدہ محکمے کھول دے جن پر ایسے مرد اور عورتوں کو نگراں کار کی حیثیت سے مقرر کر دیا جائے جو اس ضمن میں خصوصی قابلیت اور شوق رکھتے ہوں اور جو لوگوں کی اہم اور مختلف ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہو سکیں۔ بڑے بڑے محکمے محدود ہوں۔ مگر ان کے حلقہ عمل میں تمام مسائل آ جائیں۔ میری نظروں میں یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ دیش بندھو داس کے تصور کو سامنے رکھ کر دیہات میں تعمیری کام کا از سر نو آغاز کیا جائے۔ اس غرض کے لیے ہمیں ایسے نوجوان مبلغین کا حلقہ پیدا کرنا چاہئے جن کے سینے جذبات کی آگ سے منور ہوں۔ جو ہمارے دیس کے گزشتہ دور کے لوگوں کی متبرک خیرات پر اپنے دنیاوی منافع کو ترک کر دیں، اور ملک کے طول وعرض میں خودداری اور خود اعتمادی کی فرشتہ سیرت مثال کو اجاگر کر کے کاشت کاری اور چرخہ کے اس پیغام کو ہر ایک دیہاتی تک پہنچا دیں۔ جس سے ہمارے بدنصیب کسان بھوک، جہالت اور بیماری کے ظالم پنجہ سے نجات پا سکیں گے۔ دیہات کو از سر نو منظم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی منسلک ہے کہ گنجان آباد شہروں میں صنعتی مزدوروں کو منظم کیا جائے جنھیں اکثر ایسے حالات میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو انھیں ذلیل اور وحشی بنا دیتے ہیں۔ جو اپنے دیہاتی مکانات کی مانوس روایات و دل چسپیوں سے کٹ کر جنھیں وہ روٹی کی

تلاش میں چھوڑ دیتے ہیں، بداخلاقی اور برائیوں کی کششوں کے اتنے زیادہ شکار ہونے پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ہمارا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ہم ان لوگوں کے لیے بہتر جائے رہائش، بہتر اجرتیں اور صاف ماحول حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ انھیں قومی ترقی کا قیمتی مشترکہ اثاثہ سمجھ کر سرمایہ اور محنت میں منصفانہ اور موزوں اتحاد پیدا کرنے کی مساعی عمل میں لائیں۔

جس مجرمانہ سردمہری کا عام اظہار ہندستانی تعلیم کے مسئلہ پر کیا جا رہا ہے میں اس پر حیرت زدہ ہوں۔ اجنبی اقتدار کی لعنت کا مقصد ہمارے ذہن اور تصورات کو غلام بنانا اور ہمیں ہماری شان دار قومی روایات سے دور لے جانا تھا۔ ہم آج ایک ایسے مصنوعی تعلیمی نظام کی بے کاٹھ پتلیاں ہیں جو ہمارے نسلی ذہن کی روایات کے ہرگز موافق نہیں۔ جس نے ہمارے ذہنی قدروں اور دماغی اوصاف کو برباد کر دیا ہے اور اپنے خیالات کو مستند طریقوں سے بیان کرنے کی جستجو میں ہم سے اختراعی اور تخلیقی قوتیں چھین لی گئی ہیں۔ نوجوان نسل کی طرف یہ خاص طور پر ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے تعلیمی تصورات کو زندہ کریں جس میں مغرب کے نوجوان طبقہ کی تخلیق کردہ فلاسفی سائنس اور آرٹ کے اعلیٰ ترین علم کو اپنی ایشیائی تمدن کی روح پرور دانش وری کو ملا دیں۔

علاوہ بریں اپنی پوری قوت کے ساتھ میں اس بات پر زور دوں گی کہ فوجی تربیت کو قومی زندگی کے لازمی جز کے طور پر اپنا لیا جائے۔ کیا یہ ستم ظریفی کا انتہائی شرم ناک نقطہ نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو جن کی پسندیدہ لوریاں کوروکشتر کے جنگی ترانے ہیں۔ جن کے چھوٹے چھوٹے قدم راجپوت رزمیہ موسیقی پر خود بخود اٹھتے ہیں اس بات پر چھوڑ دیں کہ اپنے گھروں کی رکھوالی، مقدس مقامات کی حفاظت اور بحری و بری سرحدات کے بچاؤ کے لیے وہ بیرونی لوگوں کی طاقت اور ایمان داری پر تکیہ لگا

بیٹھیں۔ وحشی قبائل، عرب، آفریدی اور بلغاری اپنے ہتھیار اٹھا کر اپنے اس نا قابل تردید حق کا دعویٰ کریں کہ وہ اپنی نسل کی عزت برقرار رکھیں گے۔ لیکن دوسری طرف ہم ہیں جنھیں اس بات کا فخر ہے کہ ہم نے عالم گیر تہذیب کے چراغ کو روشن کیا خود اپنے اس حق سے محروم ہیں اور مجبوراً بزدل بنا دیے گئے ہیں اور اس قابل نہیں رہے کہ ہم دنیا کے اس چیلنج کا جواب دیں جو اس نے ہماری قوت مردانگی کو دے رکھا ہے اور اپنے گھروں اور مقدس مقامات کی حفاظت کر سکیں۔

اس کمیشن کے سفارش کردہ تجربات خواہ کچھ ہوں۔ جو اس وقت ہمارے عوام کی عسکری ترقی کے راستے ڈھونڈنے پر بیٹھا ہے، کانگرس کے لیے یہ نہایت ضروری امر ہے کہ وہ رضا کارانہ بھرتی کے ذریعہ ایک قومی فوج کو تشکیل دے۔ جس کا مرکز ہماری موجودہ والنیٹر تنظیم ہو۔ نیز ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ ہوائی، بحری تربیت کے سوال پر غور کرنا چاہیے۔ تاکہ قوم کو کسی حملہ کے خلاف ڈیفنس کے لیے تیار کیا جا سکے۔

ہمارے متعلق کوئی یہ نہ کہہ دے کہ اپنے گھریلو مسائل میں خود غرضانہ الجھنوں نے ہمیں بیرونی ملکوں میں ہمارے بھائی بندوں کی مشکلات سے بے خبر بنا دیا ہے۔ ہمارے ہم وطنوں پر جو روزی کی تلاش میں دور دراز ملکوں میں جا بسے ہیں۔ گاہے بہ گاہے تشددانہ قانونی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں ''وائٹ پیپر'' ہماری ناکامی کی اب بھی مذمت کر رہا ہے۔ جو ہمیں کینیا میں ہندستانیوں پر کی گئی زیادتیوں کا قلع قمع میں ہوئی ہے۔ لیکن مہذب آئین سازی کی تاریخ میں انٹی ایشیاٹک بل کی نسبت انسانیت کے خلاف کوئی زیادہ بے درد اور بے رحم دست درازی نہ ہوگی۔ اس بل کا مقصد ہندستانی قوم کو جنوبی افریقہ سے نکال دینا ہے۔

کیا ہم افریقہ میں اپنے مظلوم اور پریشان بھائیوں کو ان کی جگر دوز چیخوں کے جواب میں یہ محبت بھرا سندیس نہ بھیجیں کہ ہندستان ان کی اس دلیرانہ جدوجہد میں ان

کے ساتھ ہے جو انھوں نے اس درجہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ حملہ کے خلاف اپنے موروثی شہری اور انسانی حقوق کی حمایت میں جاری کر رکھی ہے اس سے پیش تر اتنے واضح طور پر ہمیں اپنے اس فرض کا احساس نہیں ہوا کہ بیرونی دیسوں میں رہنے والے اپنے بھائیوں کی طرف ہمیں دھیان دینا چاہیے۔ ہم نے اس طرف بھی توجہ نہیں دی کہ ان کے روز افزوں بدلتے ہوئے حالات سے اپنے آپ کو آگاہ رکھیں۔ ہمیں کانگریس میں ایک ''سمندر پار کا محکمہ'' کھولنے میں لمحہ بھر تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ ایسے افراد کی نگرانی میں دے دیا جائے جو ایسے قانونوں وغیرہ کے نفوذ سے متعلق باخبر ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہمارے ہندستانی آبادکاروں پر مضر اثر ڈالتے ہوں۔

اس سلسلہ میں مجھے ان لوگوں کی یاد آتی ہے جو تن تنہا رنج وہ ماحول میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ دنیا کے دور دراز حصوں میں اپنے دلوں میں مادر وطن کو دیکھنے کے بے پناہ جذبات کا ہجوم لیے ہوئے زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ وہ اپنے وطن کو واپس لوٹ نہیں سکتے۔ کیوں کہ کبھی انھوں نے اس کی خدمات بجالانے کی مساعی عمل میں لائی تھیں اور ایسے طریقوں سے اس کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی تھی جو عام قانون کی نظروں میں جائز نہ تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر اپنی بے صبر جوانی کی ولولہ انگیز حماقت کا پورا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کو ہولناک مصائب اور فلاکت کی آزمائشوں سے پرکھا گیا ہے۔ وہ یقیناً مظلومین، غربا اور بدحال لوگوں کی فلاح کی خاطر بے غرض خدمت کے برگزیدہ آلہ کار بنا دیے گئے ہیں۔

میں تصور نہیں کر سکتی کہ ہم نے پر اثر پبلسٹی کے فقدان کی بھاری زنجیروں کو منظور کیوں کر رکھا ہے۔ یہ تبلیغی مشینری ہر مہم کے لیے نہایت ضروری شے ہے اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ وسیع سیاسی پروپیگنڈا کے لیے ایک علیحدہ محکمہ کھولنے کا فوراً اقدام

اٹھائیں۔ جس کے ذریعہ ہم عوام الناس کو ان کے مجلسی مفادات اور شہری حقوق سے متعلق تعلیم دیں۔ انھیں ان زیادتیوں کا احساس دلائیں جن کا وہ شکار ہیں۔ انھیں اس جدوجہد سے آگاہ کریں جس میں قوم مصروف ہے اور انھیں ان نامنصفانہ، غیر مستقل مالی اور فنانشل حکمت عملی سے باخبر کیا جائے جو ملک کی خوش حالی کے لیے اس قدر تباہ کن ہیں۔ مجھے یقین ہے ہم ان لوگوں کی آسانی سے امداد حاصل کرسکیں گے جو اور طرح پبلک زندگی میں حصہ لینے میں مجبور ہیں۔ وہ ہمیں گھریلو صنعتوں کے اجراء کامرس، ریلوے، جہاز سازی، بنک ہائے امداد باہمی اور ترقی کی دوسری مدوں پر جو ہماری مادی بہبودی کے لیے ضروری ہیں، اپنے مستند علم سے فائدہ حاصل کرنے کا شرف بخشیں گے۔

ورنیکلر اور انگریزی قوم پرست پریس ہمارے پروپیگنڈہ کے لیے ہونے چاہئیں۔ نیز ہمیں ایک معتبر خبر رساں سروس قائم کرنی چاہیے۔ جس کے ذریعہ ہم تمام دنیا میں ہندستانی حالات کی اصل تصویر پیش کرسکیں۔ اس کے علاوہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ہندستان اور دوسرے ممالک کے لوگوں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کے لیے وہاں اپنے سفیر روانہ کریں۔

اور اب میں بڑے تامل اور افسوس کے ساتھ اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتی ہوں۔ جو اس وقت ہمارے درپیش مسائل میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ میں کہ جس نے اپنی زندگی ہندو مسلم اتحاد کے خواب پر وقف کر رکھی ہے۔ خون کے آنسو بہائے بغیر اپنے اندر ان جھگڑوں اور اختلافات کا تصور نہیں لاسکتی جس نے میری امید کی دنیا کو پامال کر رکھا ہے۔ میں نے ان دونوں اقوام کے درمیان اس قدر گہری خلیج پیدا ہونے کے نہایت افسوس ناک اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان اختلافات نے مسلمان بھائیوں کا ذہن ایسے علیحدگی کے جذبہ کی

طرف پھیر دیا ہے جو سرکاری شہری، تعلیمی اور سیاسی دائرہ زندگی میں علیحدہ اور ترجیحی حقوق کے لیے پر زور اور مستقل مطالبہ کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ ہندو اس جذبہ سے خوف محسوس کر رہے ہیں۔ اگرچہ میرا یہ یقین ہے کہ قوم ورانہ نمائندگی جس کی بنیادیں مشترکہ انتخاب پر قائم ہوں یا جداگانہ طریقہ انتخاب پر قومی استحکام کے تصور کو دھکا لگاتی ہے۔ بایں ہمہ میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ جن حالات میں ہم آج ہیں یعنی اس قدر شدید تلخ اور تاریک ماحول میں جو غیر معقول قوم ورانہ، حسد، شبہات، شکوک، بدظنی اور نفرت کے جذبات سے معمور ہے۔ کسی تسلی بخش سمجھوتہ کا اس وقت تک ہونا ممکن نہیں۔ جب تک ناقابل انکار جذبہ حب الوطنی کے مالک مسلمان اور ہندو مدبرین نہایت خلوص اور صبر سے ایک جگہ جمع نہ ہوں جن کے سپرد ہم یہ نہایت نازک اور مشکل کام کر دیں کہ وہ اس تباہ کن عارضہ کا کوئی مجرب علاج تلاش کریں۔

میں اپنے ہندو بھائیوں سے التجا کرتی ہوں کہ وہ اپنی اس روایتی رواداری تک اوپر اٹھنے کی کوشش کریں جو ہمارے ویدک ایمان کی شاندار اساس ہے اور اس بات کے احساس کی کوشش کریں کہ اسلامی اخوت کا نظریہ کس قدر دوررس حقیقت ہے جو سات کروڑ ہندستانی مسلمانوں کو ازبس اذیت کے ساتھ ان بدنصیبوں میں شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ جن کے آج اسلامی ممالک شکار ہیں اور جو انھیں بیرونی طاقتوں کی عسکری استبدادیت کے پاؤں تلے کچل رہی ہیں۔

اب میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں یہ عرض کرتی ہوں کہ وہ شام، مصر، عراق اور عرب کے دکھوں میں اپنے آپ کو اتنا مدغم نہ کر دیں کہ انھیں اپنے مادر وطن کے سب سے بڑے مقصد کا احساس ہی نہ رہے۔ مادر وطن کو ان کی وفا کیشی پر بہت بڑا دعویٰ ہے۔

اگر ہندو اور مسلمان رواداری کے ملکوتی اوصاف کو اپنا لیں اور اگر بغیر کسی جبر و تشدد

کے ایک دوسرے کو اپنے مذہبی فرائض اور قربانیوں کی اجازت دے دیں اور جس طرح کوئی رہنا پسند کرے اس کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اگر وہ اپنے اندر ایک دوسرے کے اعتقادات کے لیے احترام کا جذبہ پیدا کرلیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کی تہذیبوں کے محاسن کا اعتراف کرنے لگیں۔ اگر دونوں اقوام کی عورتیں اپنے آپ کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کرلیں اور اپنے بچوں کی پرورش باہمی اتحاد و اتفاق کی فضا میں کریں۔ تو ہم اپنی آرزوئے زندگی کے کس قدر قریب آجاتے ہیں۔

اگر ہم نے اپنے والیان ریاست اور عظیم ہندستانی ریاستوں کے لوگوں کے درمیان ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے احتیاط کے ساتھ گریز کرتے ہوئے اعتماد اور ہمدردی کی روح پیدا کرنے کی کوشش نہ کی تو ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی کا ثبوت دیں گے۔

ہم ان سرحدی صوبجات کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔ جو نقشہ پر اپنی مخصوص پوزیشن کی بنا پر ایک طرح کے مسلسل مارشل لا کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کے عام شہری اور مجلسی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو ان کے ہمسایہ صوبجات کو اتنی فراوانی سے حاصل ہیں۔ حتی المقدور پوری پوری مدد دینی چاہیے۔

ہمارے ضروری فرائض کی یہ چند مدیں ہیں۔ بااین ہمہ انڈین نیشنل کانگریس کا حقیقی کام جلد سے جلد سوراج حاصل کرنا ہے۔

کانگریس کارکنوں کا ایک بھاری اور پراثر حصہ ایسا ہے جو عدم تعاون کے واضح عقیدہ کے ساتھ ابھی تک وفاداری سے بندھا ہوا ہے۔ وہ آئین ساز اسمبلیوں سے بالکل فائدہ اٹھانے کے حق میں نہیں اور مہاتما گاندھی کے فیض رساں مشن کی پیروی میں اپنا زیادہ وقت چرخہ پر صرف کررہا ہے اور ہمارے سماج کے قابل رحم طبقات کی طرف جنھیں اپنے غرور میں ہم نے ان کے ابتدائی حقوق سے محروم کررکھا ہے توجہ

مبذول کر رہا ہے۔ چنانچہ آج کانگریس کے اندر سوراج پارٹی ہی ایک ایسی سیاسی جماعت ہے، جو اپنی نہایت اعلیٰ تنظیم اور اپنے کامیابی کے نمایاں ریکارڈ کے ساتھ نوکر شاہی اختیار کے حقیقی مقابلہ میں مصروف ہے۔ کیا اس نہایت نازک دور میں یہ تمام دیگر سیاسی پارٹیوں کا ناقابل تردید فرض نہیں کہ وہ بلا لحاظ اپنے ناموں اور اعتقادات کے کانگریس میں شامل ہو جائیں جو انھیں کھلے دروازوں اپنے پاس آنے کی دعوت دیتی ہے اور ان کی منتشر توجہات کو ایک مشترکہ نصب العین کے لیے مشترکہ لائحہ عمل وضع کرنے پر مرکوز کرنا چاہتی ہے۔

ان سب جماعتوں نے کھلے بندوں اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے کہ 1919 کی اصلاحات جو ترقی کا ایک نیا عہد آغاز کرنے والی تھیں۔ سراب کی بجائے اور کچھ ثابت نہیں ہوئیں۔ وہ طاقتیں جو لوگوں کو منتقل کرنے کا دعویٰ کرتی تھیں، ایک خیالی قصہ ثابت ہوئی ہیں۔ وہ سب کی سب یقیناً اندر ہی اندر اب بھی مل کر کچھ زیادتیاں برداشت کرنے اور کچھ حقوق حاصل کرنے پر متفق ہیں اور میری ذاتی رائے چاہے کچھ ہی ہو۔ وہ ہر حالت میں درجۂ نو آبادیات کے تصور کی حکومت خود اختیاری ایسی ابتدائی شکل کے حق میں ہیں جس کی کامن ولتھ آف انڈیا بل میں کھول کر وضاحت کی گئی ہے۔ اس پر قومی مطالبہ کی شکل میں لیجسلیٹو اسمبلی میں ہر رائے اور خیال کی مالک سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں نے حمایت کی ہے۔ اس مطالبہ کی حدود سے نیچے ہندوستانی قوم اپنے وقار اور عزت کو دھکا لگائے بغیر نہیں اتر سکتی۔ اب یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنے رویہ کا اشارہ کرے۔ تاکہ اس کی روشنی میں ہم اپنا آئندہ پروگرام وضع کر سکیں۔ اگر حکومت کی طرف سے اس کا جواب نہایت خلوص اور فیاضی سے دیا گیا تو ہمیں اپنی تمام موجودہ پالیسی کو از سر نو وضع کرنا ہوگا اور اگر موسم بہار کے اجلاس تک ہمیں کوئی جواب نہ ملا یا ایسا جواب ملا جس میں حقیقی مسائل کو ٹالنے کی کوشش کی

گئی، یا وہ جواب کانگریس کی منظوری کے قابل نہ ہوا تو کانگریس ان تمام لوگوں کے نام ایک حکم جاری کرے گی جو اس کے حلقہ اثر میں آتے ہیں کہ وہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں اپنی نشستیں خالی کر دیں اور کیلاش سے کماری اور سندھ سے برہم پتر تک ایک ایسی برقی مہم کا اجرا کیا جائے گا جس کا مقصد لوگوں کو اپنی متحدہ جد و جہد کے لیے بیدار کرنا، تعلیم دینا اور تیار کرنا ہوگا۔ انھیں یہ بتایا جائے گا کہ اس مقصد کے لیے جو ہمارے مادر وطن کو نا قابل بیان بے حرمتی سے محفوظ کرنے کا سبب بنتا ہے اور ہمارے بچوں کو ایک نا قابل فنا امن کی میراث بخشتا ہے۔ کوئی قربانی زیادہ اہم، کوئی دکھ بہت عظیم، کوئی شہادت بہت خوفناک نہیں۔

آزادی کی لڑائی میں خوف نا قابل معافی دھوکہ اور مایوسی نا قابل معافی گناہ ہے۔

میں اپنے ہاتھ پر جوش التجا کے ساتھ بلند کرتے ہوئے دعا مانگتی ہوں کہ اے خدا! ہمیں ہماری آنے والی آزمائش کی گھڑی میں نہایت فراوانی سے نا قابل تسخیر ایمان اور پختہ ارادے کی دولت سے فیض یاب کر، اور وہ جس کے نام میں ہم اپنی مسائی کا آج آغاز کرتے ہیں، ہماری فتح کے وقت ہمیں فروتن اور منکسر المزاج رکھے گا اور ہم اپنی دعا کے خوبصورت الفاظ میں التجا کرتے ہیں۔

ہمیں غیر حقیقی سے حقیقی کی طرف لے چل۔

ہمیں تاریکی سے اُجالے کی راہ دکھا۔

ہمیں موت سے حیاتِ جاودانی کی طرف راہ نمائی کر۔

ڈاکٹر ایم۔اے انصاری

مدراس ــــــــــــ1927ء

ڈیلی گیٹ حضرات، بہنو اور بھائیو!

میں الفاظ میں اس اعتماد کا شکریہ ادا کرنا مشکل سمجھتا ہوں۔ جس کا اظہار آپ نے آزادی کی جدو جہد میں ہماری تاریخ کے اس نازک موقع پر مجھے انڈین نیشنل کانگریس کی کارروائی پر صدارت کے فرائض سرانجام دینے کے لیے میری ذات میں کیا ہے۔ مدراس میں کانگریس کا یہ اجلاس مجھے آج سے 25 سال پیشتر ان دنوں کی یاد دلاتا ہے کہ جب میں کالج میں طالب علم تھا۔ دل امیدوں اور جذبات کا مخزن تھا اور جب میں نے پہلی بار اس بڑے قومی ہجوم کا نظارہ دیکھا۔ میں اس وقت اپنے ذہن میں یہ تصور تک نہ لاسکتا تھا کہ اسی شہر میں مجھے اس کرسی پر بیٹھنے کا شرف نصیب ہوگا۔ جس پر اس سے پیشتر ہندستان کے چند عظیم ترین فرزند بیٹھ چکے ہیں۔ ان دنوں سے لے کر آج تک ہماری قومی تحریک اپنی قوت اور جماعتی اعتبار سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ لوگوں میں سیاسی بیداری کا احساس بڑھ چکا ہے۔ جدوجہد کی شدت اور بڑھ گئی ہے۔ اور رفتار زمانہ کے ساتھ ہمارے حل طلب مسائل اور پیچیدہ بن گئے ہیں۔ چنانچہ آپ کے صدر کا کام زیادہ نازک اور زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔ میرے دل میں صرف اس امید نے اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے کا حوصلہ بھر دیا ہے کہ میں آپ پر بھروسہ رکھ سکتا ہوں کہ آپ مجھے میرے فرائض کی انجام دہی میں پوری مدد دیں گے

اوراس سلسلہ میں مجھے میری کمزوریوں کے لیے معاف فرمائیں گے۔

آج بتدریج اس بات کا احساس کیا جارہا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں سیاسی مسائل کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ قائم ہے، اور یہ کہ ہندستان کی اقتصادی اور سیاسی غلامی سے انسانیت کی پرامن ترقی اور بالخصوص برطانیہ عظمیٰ کے مزدوروں کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ آج جب کہ شہنشاہی اور سرمایہ دارانہ مفادات کی طرف سے ہندستان کے خلاف اہتمام سازی اور غلط ترجمانی کی ایک مہم جاری ہے ہمیں اس جگہ ہمارے سمندر پار کے ممتاز ڈیلی گیٹوں کی موجودگی نے اس بات کی امید ولا دی ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں ہماری طرح شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی لوٹ کے شکار ہونے والے ہمارے بھائی بندوں نے اس بات کا احساس کرلیا ہے کہ مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد اور متحدہ اقدام کی ضرورت ہے۔ میں انڈین نیشنل کانگریس اور ہندستان کے لوگوں کی طرف سے انھیں نہایت خلوص اور محبت سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

میرے لیے اس سے بھی زیادہ خوشی کا باعث یہ امر ہے کہ کانگریس کو از سرنو متحد کرنے کی میری اپیل کا اس قدر فیاضی سے جواب دیا گیا ہے۔ میں اپنی صفوں میں ایک بار پھر ان بہادر اور آزمودہ جواں مردوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ جن کے نام ناقابل تحلیل طور پر ہندستان کی آزادی کے ساتھ منسلک ہیں۔ میں ان تمام رفیقوں اور ساتھیوں کو پھر کانگریس کی آغوش میں آنے پر مبارک باد دیتا ہوں اور اس بات کی آرزو اور دعا کرتا ہوں کہ ماضی کی طرح مستقبل میں ملک ان کی خدمات سے پورا پورا فائدہ حاصل کرے۔

میں اس بیان میں جسے میں نے کچھ عرصہ قبل شائع کیا تھا، موجودہ سیاسی حالات کے نمایاں خدوخال پر روشنی ڈال چکا ہوں اور اس میں مختصر طور پر اس بات کی طرف

بھی توجہ دلا چکا ہوں کہ میری نظروں میں ان سے دوچار ہونے کا کون سا طریقہ موزوں ہے۔ چنانچہ میں آج اس بات پر آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ بایں ہمہ اس مختصر سے تجزیہ میں بھی ہمیں ہر اس مسئلہ پر نگاہ رکھنا چاہیے جس کے ساتھ ہمارے سیاسی پروگرام کو آگے لے جانے کا رشتہ منسلک ہے۔ ہندستان میں ہر سیاسی نکتۂ نگاہ کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ہماری سرگرمیوں کی منزل مقصود آزاد اور خودمختار ہندستان ہے۔ جس میں ہر ایک کو ایسے مواقع حاصل ہوں اور تمام طبقات اور گروہوں کے جائز اور مبنی برحق حقوق کو تسلیم کیا جائے اور ان کی ضمانت دی جائے یعنی ایسا ہندستان جو اندرونی طور پر امن کی دولت سے مالا مال ہو اور بیرونی طور پر جس کے تمام دنیا کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم ہوں۔ ہندستان اس سے کم یا زیادہ کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا کہ اس کے باشندوں کو بالکل وہی مراعات اور وہی حیثیت حاصل ہو جو آزاد لوگوں کو اپنے وطنوں میں میسر ہے۔ اگر انھیں یہ پوزیشن برطانوی سلطنت کے اندر رہ کر حاصل ہو جائے تو اسے سلطنت سے علیٰحدہ ہونے کی کوئی خواہش نہیں۔ لیکن اگر یہ شہنشاہی رشتہ ہمارے نصب العین کی راہ میں حائل ہوا، تو ہم اس سے اپنے آپ کو منقطع کرنے میں کسی تامل سے کام نہ لیں گے۔ مہاتما گاندھی کے الفاظ میں ہمارا ماٹو یہ ہوگا ''اگر ممکن ہوا تو سلطنت کے اندر اور ضروری ہوا تو اس کے بغیر۔''

میں اپنی راہ کی مشکلات کا کم اندازہ نہیں لگانا چاہتا۔ ان کا کوئی شمار نہیں۔ سیلن جارحانہ شہنشاہیت اور ''فنانس اعظم'' کی پیدا کردہ حرص، آج دنیا میں یہ ہی دو چیزیں مصیبت اور فلاکت کے اہم سرچشمے ہیں۔ شہنشاہانہ آرزوؤں کی تسکین اور خام اشیاء پر اجارہ داری قائم کرنے کی خاطر سلطنتیں محض اس لیے معرض وجود میں لائی جاتی ہیں اور اقوام کو ان کی آزادی سے محض اس لیے محروم کیا جاتا ہے کہ یورپ میں فیکٹریوں کے پیٹ بھرے جا سکیں اور صنعتی اشیاء کی کھپت کے لیے منڈیاں حاصل کی جا سکیں۔

یورپی مدبرین اور سیاست دان اپنی زبان دانی کے جوہر دکھاتے نہیں تھکتے۔ لیکن سیسل روہڈس کی نسبت ان دعاوی کے کھوکھلے پن کا کسی نے بہتر نقشہ نہیں کھینچا۔ جنوبی افریقہ کے اس مبتدی نوآبادکار نے کہا ہے:

"خالص فیاضی اپنی جگہ پر بہت اچھی چیز ہے۔ مگر اس میں پانچ فی صدی کے اضافہ سے یہ اور بھی بہتر ہو جاتی ہے۔"

شہنشاہیت کے علم بردار جوزف چیمبرلین نے اس سے بھی زیادہ صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"سلطنت تجارت ہے اور ہندستان ہمارے گاہکوں میں جو ہمیں اس وقت حاصل ہیں یا کبھی حاصل ہوں گے سب سے قیمتی اور بڑا گاہک ہے۔"

یورپ کی اس فیاضانہ چوری کی تاریخ کانگو سے کانٹن تک خون اور قتل و غارت سے لکھی گئی ہے۔ حکومت کی آہنی ہاتھ کی تھیوری، بے زبان کروڑ ہا انسانوں کی ٹرسٹی شپ کے پرغرور دعوے، قبل از جنگ کی کنسرٹ آ دیورپ پر پردہ پوشی کے لیے جمعیت اقوام کے نام سے ایجاد کردہ نیا فریب ایک ہی اسپرٹ کی نئی شکلیں ہیں۔ جب تک ان خطرناک اصولات کی پیروی کی جاتی رہے گی، انسانی مصائب کے سرچشمے بہتے رہیں گے۔ اس عالم گیر بدنصیبی کا علاج ہندستان کے پاس موجود ہے۔ چوں کہ وہ شہنشاہیت کے ستون کی بنیاد ہے۔ ہندستان اگر آزاد ہو گیا، یہ تمام عمارتیں زیر زمیں ہو جائیں گی۔ ایشیا کی آزادی اور دنیا کے امن کی سب سے بڑی ضمانت آزاد، اور خود مختار ہندستان ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم ہندستان کو کیوں کر آزاد کرا سکتے ہیں؟ پوری ایک نسل تک پبلک کے راہنما حکومت کے ساتھ مکمل تعاون اور اشتراک کے نظریہ کی تبلیغ اور اس پر

عمل کرتے رہے۔ یہ پالیسی شروع سے ہی ناکام ثابت ہوئی۔ تعاون صرف ان دو برابر کے گروپوں میں ہوسکتا ہے جن کے نظریات ایک جیسے ہوں۔ جہاں منتہائے نظر بنیادی طور پر مختلف ہو، تعاون ممکن نہیں ایسی صورت میں تعاون کا مطلب یہ ہے کہ کمزور طاقت ور کی خواہشات اور مفادات پر اپنے ہردل عزیز تصورات کو نثار کردے۔ ان دو اقوام کے نظریات میں اختلاف کبھی اس قدر زیادہ نمایاں نہیں ہوا جتنا کہ ہندستان کے ایک لبرل سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹگو کی رپورٹ میں جو کہ ہندستان کے ساتھ اپنی ہمدردی کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ وہ رپورٹ ہے جس پر 1919ء کے انڈیا ایکٹ کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ اس میں ذمہ دار حکومت تفویض کرنے اور مستقبل میں کئی امیدیں دلانے کے ساتھ کہا گیا ہے۔

''یہ امر ہمیں بدیہی معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی کامن ولتھ کے دوسرے خودمختار یونٹوں کی بنیادوں پر ہندستان میں اس وقت تک نمائندہ اور ذمہ دار حکومت نہیں قائم کی جاسکتی۔ جب تک کہ ایسی ریاستیں جن پر وہ مشتمل اور جن کے لوگوں کی وہ نمائندہ ہوگی اور جن کے سامنے وہ جواب دہ ہوگی یا ان کی ایک بھاری اکثریت بہ ذات خود مکمل خودمختار ریاست کے مرحلہ تک نہیں پہنچ جاتی۔ ہم اس صورت میں یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ذمہ داری کی شکل یا درجہ جو ہندستان حاصل کرے گا ان درجوں کے برابر ہوگا جو سلطنت کے اندر دوسری نوآبادیات کو حاصل ہے۔ ہندستان کے آئین کی قطعی صورت ہندستان کے حالات ہی سے ڈھالی جاسکتی ہے اور اس کی تشکیل میں یہ بات کافی اثر رکھے گی کہ امپیریل ذمہ داریوں کی ضروریات کس چیز کی متقاضی ہیں۔''

باایں ہمہ اگر ہمارے حکم ران ادنیٰ نسلوں، کومہذب بنانے کے یزدانی مشن سے دست کش ہوجائیں اور احکامات الٰہی کو نافذ کرنے کے کام کو ترک کردیں اور اگر وہ محسوس کریں کہ سیاسی اور اقتصادی جوئے میں بندھے ہوئے بیزار اور دشمن مقبوضہ کی

نسبت آزاد ہندستان بہتر گاہک ہوگا۔ المختصر اگر وہ تسلیم کریں کہ اکثر تہذیبیں اور تمدن ان سے افضل نہ سہی، مگر ان تہذیبوں میں ایسی بہتر موجود ہیں۔ اگر وہ حاکم اور محکوم کے انداز میں سوچنا چھوڑ دیں اور ہمارے ساتھ مساویانہ سلوک روا رکھنے کو تیار ہوں، تو یہ ہمارے لیے وقت ہوگا کہ ہم باہمی تعاون پر اپنے خیالات پر پھر غور کریں گے۔

عدم تعاون کی تحریک کو دھکا لگنے کے بعد جس پالیسی کو بدل کے طور پر پیش کیا گیا وہ یہ تھی کہ کونسلوں پر قبضہ کر کے تعطل پیدا کرنے سے حکومت کو لوگوں کی خواہشات کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ مگر اس پالیسی کے ترجمان اس حقیقت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے۔ کہ 1919ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر عائد کردہ قیود نے ایسی مزاحمت کو بے اثر بنا دیا ہے اور آئینی تعطل پیدا کرنا ناممکن کر دیا ہے۔ انھیں تعاون کی پالیسی پر علیحدہ ہونے والوں کی طرح اس بات کا احساس ہو چکا ہوگا کہ آئینی حد سے آگے نکلے ہوئے مسائل کو خالص آئینی بنیادوں پر نہیں لڑا جا سکتا۔ طاقت کے مقابلہ میں اگر آپ کا مدمقابل خود منصف ہو تو کسی کامیابی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایسی پالیسی قطعاً لاحاصل ہے۔ یہ پالیسی ایسے صوبوں میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی جن کی آئین ساز مجلسوں میں اس پر اعتقاد رکھنے والوں کی اکثریت تھی۔ بلاشبہ انھوں نے نام نہاد اصلاحات کے کھوکھلے پن کو آشکارا کر دیا ہے اور حکومت کو اپنے خاص آدمیوں سے اسمبلیاں بھرنے سے روک کر انھوں نے حکمرانوں کے لیے یہ ناممکن بنا دیا ہے کہ وہ اپنی ظالمانہ اور مطلق العنان کارروائیوں کو لوگوں کی اعلان کردہ رائے کا اس بنا پر نام دے سکیں کہ یہ ان کے منتخبہ نمائندگان کے اپنے فیصلے ہیں۔ لیکن یہ تمام کام جس کے لیے ہمیں بہت زیادہ قربانی ادا کرنی پڑی ہے، نہ تو ہمیں کو آگے بڑھانے کی کوئی خدمت سرانجام دے سکے ہیں اور نہ ہی ہمیں ہماری منزل مقصود کے قریب لانے کا فریضہ ادا کر سکے ہیں۔ البتہ اس نے ہمارے چند قابل ترین افراد کی توجہات قومی اہمیت کے اصلی

مسائل سے ہٹا دینے کا فریضہ ضرور سرانجام دیا ہے۔ پچھلے دنوں میں اختیار کردہ کونسل پروگرام ،مسلمہ طور پر ایک تجربہ تھا۔ ہم نے اسے آزمائش کا موقع دیا۔ اور اگر وہ ہماری امیدیں پوری نہیں کر سکا تو اس میں ناامید یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ آؤ ہم ذرا اپنی پالیسی پر اپنے تجربات کی روشنی میں ازسرنو غور کر لیں۔

ہمارے نصب العین سے متعلق دو آرا کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر ہمارا کسی خاص پالیسی سے نکاح نہیں بندھ چکا اور نہ ہی ہم کسی پروگرام کو مقدس یا ہمیشہ کے لیے لازم قرار دیتے ہیں۔ ہم نے کسی پالیسی یا پروگرام کو اس نکتہ نگاہ سے اپنایا ہے کہ وہ سارے مخصوص مجلسی اور سیاسی حالات پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ اور اس کا اندازہ ہم نے اس بات سے لگانا ہے کہ ایک خاص وقت کے اندر اس سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ان تین تجربات کے نتائج موجود ہیں۔ جنھیں کانگریس آزما چکی ہے۔ ہم نے 35 سال کا وقت تعاون کی بھینٹ چڑھایا۔ تقریباً 1-1/2 سال عدم تعاون پر صرف کیے اور چار سال آئینی تعطلوں اور کونسلوں کے اندر مزاحمت پر لگائے۔ اس وقت ہم ہر ایک پروگرام کے مقابلتاً فوائد اور نقصانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تعاون سے ہم نے کوئی استفادہ حاصل نہیں کیا۔ کونسلوں کے اندر مزاحمت سے کوئی خاص اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ عدم تعاون کی تحریک نے یقیناً وہ سب کچھ حاصل نہیں کیا۔ جس کی توقعات تھیں۔ مگر یہ توقعات خود ہماری اپنی کمزوریوں کے باعث پوری نہیں ہو سکیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس پالیسی کے وجود میں ہی ایسی خامیاں موجود تھیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم خود اس حد تک اوپر نہیں اٹھ سکے۔ جس کی یہ پالیسی متقاضی تھی۔ عدم تعاون نے ہمیں ناکام نہیں بنایا۔ ہم عدم تعاون پر خود پورے نہیں اتر سکے۔ ہمیں پہلے مقابلہ میں کافی دھکا لگا ہے۔ میں اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ

فرقہ وارانہ جھگڑوں کی پیداوار موجودہ باہمی منافرت اور شبہات کے ماحول اور ایسے وقت میں کہ جب تمام ملک مخالفانہ سیاسی گروہوں اور کیمپوں میں منقسم ہو چکا ہے۔ عدم تعاون کی تحریک کے فوراً اجراء کے کوئی امکانات موجود نہیں۔ بایں ہمہ ہندستان کی سیاسیات میں عدم تعاون کی روح ایک پختہ طاقت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہی بات میں کسی اور جگہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔

میں پختہ یقین کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ غیر معمولی اور غیر متوقع واقعات کے قطع نظر ہم اپنی آزادی اپنے نظم وضبط، اپنی تنظیم اور خود اپنی مدد اس تحریک کے ذریعہ حاصل کریں گے کہ جس میں ہمیں ایک یا دوسری شکل میں عملی قدم سے کام لینا پڑے گا۔ میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ ہندستان تباہ کن جنگ کے اخلاقی اور مادی نقصانات کے اثرات سے صحت یابی حاصل کر رہا ہے اور بہت جلد اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے از سر نو زندہ ہو جائے گا۔

ہم اس از سر نو زندہ ہونے کے عمل میں کس طرح بہترین طور پر مدد کر سکتے ہیں، اور کیوں کر اپنے آپ کو آئندہ مقابلہ کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔ میں اس بات پر نہایت مضبوطی کے ساتھ اعتقاد رکھتا ہوں کہ یہ کام اس وقت تک سرانجام نہیں پاسکتا جب تک ہم ملک میں اتحاد نہیں پیدا کر لیتے۔ اس اتحاد کی خود کانگریس کو اپنی صفوں میں ضرورت ہے اور کونسلوں میں بھی اگر لوگوں نے انھیں استعمال میں لایا ہے اس کی ویسی ہی ضرورت ہے۔ اختلاف رائے ناگزیر امر ہے وہ موجود رہا ہے اور موجود رہے گا۔ ہمیں تو صرف اس بات کا سبق حاصل کرنا ہے کہ کس مرحلہ پر ان پر زور دینا ملک کے حق میں زہر قاتل بن جاتا ہے۔ ہمیں اپنے ذاتی وقار اور پبلک بھلائی میں امتیاز روا رکھنے کی تمیز ہونی چاہئے اور سب لوگوں کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دینے کی سپرٹ رکھنی چاہئے۔

ہندستان کے سیاسی ماحول میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی نسبت

کوئی چیز زیادہ شرم ناک موجود نہیں۔فرقہ وارانہ بلووں میں جو رنج دہ مسرت کے ساتھ آئے روز رونما ہوتے رہتے ہیں لوگوں کے جان و مال کی تباہی اور قاتلانہ حملوں کی مذمت میں کوئی زبان زیادہ سخت نہیں ہو سکتی۔شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا کہ جب ہم ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں اس طوفان خیز حادثہ کی خبر نہ سنتے ہوں۔ یہ حادثات اپنے پیچھے نفرت اور تلخی کے ایسے جذبات چھوڑ جاتے ہیں جو ملک کو ان برسرپیکار گروہوں کے بڑے بھاری کیمپ میں بانٹ دینے کی دھمکی دیتا ہے کہ جو ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں۔ان ہی کی بدولت کانگریس اپنی مقبولیت کھو بیٹھی ہے۔اکثر صوبوں میں اسے ثانوی حیثیت میں دھکیل دیا گیا ہے اور جنگ جو فرقہ وارانہ انجمنوں کو اولین اہمیت حاصل ہوگئی ہے ۔ہمیں اس صورت حالات کو زیادہ عرصہ برقرار رہنے کی اجازت نہ دینا چاہئے۔ہندو مسلم اختلافات کے مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کر دینا چاہئے اور اس کام کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی نسبت اور کوئی جماعت زیادہ موزوں نہیں۔

ہندو مسلم اختلافات کو دور کرتے ہوئے ہمیں اس بیماری کی علامات کا غلط اندازہ نہ لگانا چاہئے۔یہ سیاسی اور مذہبی اختلافات جنھوں نے دو اقوام کے تعلقات کو ناگوار بنا رکھا ہے۔اس گہری کش مکش کی بظاہر شکلیں ہیں۔جو ہندستان کے لیے خاص عجوبہ یا تاریخ کے لیے نیا واقعہ نہیں۔ یہ دراصل دو مختلف تمدنوں کا مسئلہ ہے، جو زندگی سے متعلق اپنا مخصوص زاویہ نگاہ رکھتی ہیں۔اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ہر تمدن کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کر لیا جائے ۔ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور عزت کی سپرٹ کو بیدار کیا جائے اور ایسے قومی اداروں کے قیام سے کلچرل یگانگت کو فروغ دینے کے کام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔جن میں دونوں اقوام کے بچے ایک دوسرے کے ساتھ ملیں جلیں اور دونوں تہذیبوں کی تہ میں موجودہ تصورات کو سمجھنے اور مطالع

کرنے کے مواقع سے فیض یاب ہوں۔ تعلیم یافتہ ہندستانیوں کو مغربی تہذیب کے مطالع پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مگر وہ ان لوگوں کی تہذیب سے تقریباً تقریباً کورا ہوتا ہے جو اس کے گھر کے پاس ہمسایہ میں رہتے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہمیں اس خطرناک علیحدگی اور عظیم جہالت کا قصہ پاک کر دینا چاہئے۔ ایک دوسرے کے گہرے جذبات کے علم اور ایک دوسرے کے تصورات کے لیے ہمدردی کے جذبہ سے فرقہ وارانہ نمائندگی کے مسائل، گائے کشی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجنے کے جھگڑے ماضی کی داستان بن جائیں گے اور ان کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رہ جائے گی کہ ہندستانی تاریخ کے محقق ان کے اسباب کی تحقیق کرتے ہیں۔

اس دوران میں ہم اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اس کی اہمیت کو کم کر سکتے ہیں جو آج ہمارے سامنے ہے۔ کچھ بنیادی حقائق ایسے ہیں جنھیں یاد رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مفید رہے گا۔ انھیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ہندستانی ہیں۔ انھیں ہندستان میں مرنا ہے۔ قدرت نے ان کی قسمتوں کو ناقابل تحلیل طور پر ملحق کر رکھا ہے۔ اگر میرا کوئی ہندو بھائی یہ سوچتا ہو کہ وہ سات کروڑ مسلمانوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے تو وہ ایک بھاری فریب میں مبتلا ہے۔ جس قدر جلد اس فریب کا طلسم ٹوٹ جائے بہتر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی میرا مسلمان بھائی یہ خواب لے رہا ہے کہ وہ 25 کروڑ ہندوؤں پر غالب آجائے گا تو وہ احمقوں کی بہشت میں آباد ہے اور جس قدر جلد وہ اپنی آنکھیں کھول لے یہ مسلمان قوم اور ہندستان کے لیے بہتر ہے۔ جس سوراج کے لیے ہم برسر پیکار ہیں وہ نہ تو ہندو راج ہوگا اور نہ ہی مسلمان راج۔ یہ ایک مشترکہ راج ہوگا۔ جس میں ہر ایک فرد کے جائز حقوق اور مراعات محفوظ ہوں گے۔ دائمی لڑائی انسانی سماج کی عام حالت نہیں ہو سکتی۔ قوم ورانہ مفاد کے لیے سرگرمیاں کسی ایک قوم کی مجلسی، اقتصادی اور تعلیمی

حالت کو بہتر بنانے پر محمول ہوتی ہیں۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن کسی ایک گروہ یا ایک قوم کی بھلائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ امن اور چین ضروری چیزیں ہیں۔ متشددانہ فرقہ وارانہ فسادوں سے شاید کسی اور پارٹی کی خدمت ہو سکے۔ مگر وہ نہ تو ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مجموعی طور پر کسی خاص قوم کے مفاد کی خدمت کر سکتے ہیں۔ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے ان وحشیانہ طریقوں پر عمل پیرا ہونے کے بجائے میں اپنے ہم وطن بھائیوں کی خدمت میں اپیل کروں گا کہ وہ اس عظیم قومی ٹریبونل تمام اقوام اور گروہوں کے حقوق و مراعات کی محافظ، انڈین نیشنل کانگریس کے پاس اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنی شکایات کو رفع کرنے کے لیے آئیں۔

اجنبی اقتدار کے جوئے سے نجات کی کوششوں میں منہمک غلام لوگ اندرونی جھگڑوں میں الجھ کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم ایک ہی سانس میں آزادی اور ایسی فرقہ پرستی کا نام نہیں لے سکتے۔ چونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں کسی باہر سے مشاہدہ کرنے والے کے لیے ہمیں آپس میں لڑتا دیکھ کر ہمارے مطالبہ کی صداقت کو تسلیم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہماری حب الوطنی اس طرح بالکل فریب معلوم دیتی ہے، اور ہم اپنی ان کوششوں سے کہ کہیں تھوڑی سی برتری یہاں اور تھوڑی سی فضیلت وہاں حاصل ہو جائے اپنے مخالف کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننے کا کام دیتے ہیں۔ جس کی پوزیشن ان کے طفیل ہر روز مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ کیا ہم سب مشترکہ مسائی اور فیصلہ کے ساتھ اس ذلیل کن ذہنیت سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ ہماری عزت اور یہاں تک کہ خود ہمارا اپنا مفاد اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنے زاویۂ نگاہ کو وسیع کریں اور مستقل قومی مفاد کی خاطر فرقہ وارانہ اور عارضی فائدوں کو نظر انداز کر دیں۔

فرقہ وارانہ منافرت کے اسباب جن کے زیر اثر دونوں اقوام کے رہنما کام

کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ کئی یونٹی کانفرنسوں میں نمایاں ہو چکے ہیں دو طرح کے ہیں یعنی سیاسی اور مذہبی۔

اس تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کو یہ خوف دامن گیر ہے کہ اکثریت کا نقطۂ نگاہ ذمہ داری کا بوجھ سنبھالنے میں اتنا وسیع نہیں کہ مسلمان اپنے حقوق کا تحفظ اس کے سپرد کر سکیں۔ اس لیے انھوں نے جداگانہ طرز انتخاب اور جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ یہ گذشتہ تاریخ کی ایک واضح حقیقت ہے۔ اور اس اسمبلی میں ہم میں سے ہر ایک اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔

اس جگہ اپنے موجودہ مقصد کے زیر نظر اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ان خوف ناک نتائج کا احساس کرتے ہوئے جو اس نئی صورت حالات سے پیدا ہونے والے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے سابقہ اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ وہ ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے ذرائع اختیار کرے۔ کانگریس کے ریزولیوشن کے الفاظ یہ ہیں:

> ''یہ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے التجا کرتی ہے کہ ہندو اور مسلمان راہ نماؤں کے ساتھ صلاح مشورہ کے فوری اقدام اٹھائے۔ تا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں موجودہ نہایت افسوس ناک جھگڑوں کو ختم کرنے کے ذرائع تلاش کیے جائیں۔ 31/مارچ سے پہلے پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے رپورٹ پیش کی جائے کہ اس ضمن میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا فریضہ ادا کیا ہے۔ یہ کانگریس آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ ملک میں کانگریس کے اراکین کی طرف سے ضروری ہدایات جاری کرے اور مذکورہ رپورٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد

دیگر مناسب اقدامات اٹھائے۔"

کانگریس کے صدر نے دونوں اقوام کے راہ نماؤں سے صلاح مشورے کیے۔ اس نے ملک کے طول وعرض میں اس غرض سے بڑے بھاری پیمانہ پر دورے کیے کہ دونوں اقوام میں سرگرم تعاون پیدا کیا جاسکے اوران کے ذوق معاملہ شناسی کو اجاگر کیا جائے۔ چنانچہ دہلی میں گفت وشنید کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ اس بات کا کریڈٹ مسٹر سری نواس آئینگر کی خلوص دلی، سرگرمی اوران تھک مساعی کو پہنچتا ہے۔ آخرکار بڑے بڑے سیاسی جھگڑوں کو ختم کرنے کا فارمولا تلاش کرلیا گیا۔ میں اپنے فرض سے کوتاہی کا مجرم ہوں گا اگر میں نے انڈین نیشنل کانگریس کے جذبہ حُب وطنی کی تعریف نہ کی اوران مسلمان راہ نماؤں کے تدبر کو خراج تحسین ادا نہ کیا۔ جنھوں نے تعصبات تنگ نظری اور شبہات سے اوپر اٹھ کر بڑی دلیری سے ان تجاویز کو پیش کردیا جن کی بدولت ہندستان میں مسلم پالیسی نے ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے۔ 15رکو کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں نمائندہ مسلمان راہ نماؤں کی طرف سے پیش کردہ تجاویز پرغور کیا گیا۔ ان مسلمانوں نے 20رمارچ کو دہلی میں جمع ہوکر یہ تجاویز وضع کی تھیں۔ اس کے علاوہ کانگریس کے اسی اجلاس میں ہندومہا سبھا کے راہ نما، دیگر ہندو جماعتوں کے ترجمان اور دونوں اقوام کے کئی نمائندے شامل ہوئے۔ انھوں نے 16رمئی 1927ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس اجلاس میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ یہ ریزولیوشن کانگریس ورکنگ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں وضع کیا گیا تھا۔ ریزولیوشن کو اجلاس میں موجود تمام ممبران نے جن میں ہندوسبھا کے چند چیدہ چیدہ ممبر بھی شامل تھے، اتفاق رائے سے پاس کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی نے کس قدر دانش وری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کانگریس کے صدر کی ذاتی فتح کا نمونہ اورآپ کی ترغیبی طاقتوں کا مسلمہ ثبوت ہے۔

ریزولیوشن حسب ذیل ہے:

آل انڈیا کانگریس کمیٹی ورکنگ کمیٹی کی اس رپورٹ کو جو اس نے ہندو مسلم مسئلہ پر مرتب کی ہے اور ان سفارشات کو جو اس ریزولیوشن میں موجود ہیں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے قبول کرتی ہے، اور کانگریس کی ماتحت جماعتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ حسب ذیل سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری اقدامات اٹھائیں۔

1- یہ کہ آئین کی کسی آئندہ اسکیم میں جہاں تک مختلف لیجسلیچر میں نمائندگی کا تعلق ہے۔ صوبائی اور مرکزی لیجسلیچر میں مشترکہ طریقۂ انتخاب عمل میں لایا جائے۔

2- یہ کہ دو بڑی اقوام کو اس بات کا یقین دلانے کی غرض سے کہ موجودہ طور پر لیجسلیچر میں ان کے جائز حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور اگر ان اقوام نے اس بات کی خواہش کی کہ مرکزی لیجسلیچر اور ہر صوبہ میں آبادی کی بنیادوں پر ہر قوم کے لیے نشستیں مقرر کر دی جائیں، تو ایسا بھی کر دیا جائے گا۔

لیکن اس ضمن میں یہ بات لازمی ہے کہ باہمی سمجھوتہ سے اقلیتوں کے حق میں جن میں سکھ بھی شامل ہیں۔ باہمی رعایتیں تفویض کی جائیں۔ تاکہ ان اقلیتوں کو ہر صوبہ میں ان نشستوں سے زیادہ نشستیں حاصل ہو جائیں جن کے وہ آبادی کی بنیادوں پر حق دار ہیں۔ اس طرح صوبوں میں جس نسبت پر اتفاق کیا جائے گا یہی نسبت مرکزی لیجسلیچر میں دونوں اقوام کے حق

میں برقرار رہے گی۔

3- یہ کہ اس کمیٹی کی رائے میں مسلمان راہ نماؤں کی طرف سے پیش کردہ یہ تجویز کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور برٹش بلوچستان کو دوسرے صوبوں کی بنیادوں پر مراعات حاصل ہونی چاہئیں۔ اپنے اندر معقولیت رکھتی ہے اور جائز تجویز ہے۔ یہ کمیٹی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اس سلسلہ میں اصلاحات عمل میں لائی جائیں اور ساتھ ہی اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ انتظامی اصلاحات کے دیگر اقدامات کے ساتھ ساتھ مذکورہ صوبوں میں عدالتی اصلاحات کا موزوں نظام بروئے عمل لایا جائے۔

3-(ب) یہ کہ اس مطالبہ کے متعلق کہ سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جسے کانگریس کے آئین نے اپنا لیا ہے۔

کمیٹی اس رائے کی بھی مالک ہے کہ صوبوں کی اس طرح کی از سر نو تشکیل کے کام کو فوراً شروع کر دیا جائے اور ہر صوبہ جو لسانی بنیادوں پر علیحدگی کا طلب گار ہو۔ اس کے مطالبہ کو عملی شکل دینے پر غور و خوض کیا جائے۔

نیز کمیٹی اس رائے کی مالک ہے کہ آندھرا، سندھ اور کرناٹک کو علیحدہ علیحدہ صوبوں میں تشکیل دینے کا کام شروع کر دیا جائے۔

4-یہ کہ آئندہ آئین میں آزادی ضمیر کی ضمانت دی جائے گی۔ اور صوبائی یا مرکزی لیجسلیچر کو آزادی ضمیر میں مداخلت کا کوئی حق نہ حاصل ہوگا۔

آزادی ضمیر کا مطلب ہے۔ اعتقاد اور عبادت کی آزادی، مذہبی رسومات پر عمل اور مذہبی جماعتوں کے قیام کی آزادی، اور دوسروں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اور دوسروں کے ایسے ہی حقوق سے مداخلت نہ کرتے ہوئے مذہبی تعلیم اور مذہبی تبلیغ و اشاعت کی آزادی۔

5-یہ کہ اگر کسی قوم کے 3/4 ممبران ان پر اثر انداز ہونے والے کسی اقدام کے مخالف ہوں، تو کسی صوبائی یا مرکزی لیجسلیچر میں کوئی بل، ریزولیوشن، تجویز یا ترمیم نہ تو کسی ایسے مسئلہ پر پیش کی جائے گی اور نہ ہی اس پر غور وخوض ہوگا۔''

یہ ریزولیوشن 1916ء کے معاہدہ لکھنؤ سے کہیں زیادہ ترقی کا مظہر ہے۔ معاہدہ لکھنؤ ہندو مسلم تعلقات کو بہتر بنانے کا پہلا اقدام تھا۔ موجودہ ریزولیوشن کے الفاظ اس قدر صاف ہیں کہ وہ میری طرف سے کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ البتہ میں اس ریزولیوشن میں پاس شدہ مشترکہ انتخاب کے فیصلہ کی اہمیت پر ضرور زور دینا چاہتا ہوں۔ اب تک باہم اختلاف کا ایک بڑا سبب فرقہ وارانہ انتخاب تھا۔ اگر کسی امیدوار کی کامیابی کا دارومدار صرف اپنی قوم کے اراکین سے ووٹ حاصل کرنے پر ہوتو یہ امر ناگزیر ہے کہ وہ قومی منافرت اور تفریق کی باتوں کو ہوا دینے کی کوشش کرے گا۔ اس ریزولیوشن نے نشستوں کے تقرر سے جہاں اقلیتوں کے خدشات کو دور کرنے کے بہترین مواقع فراہم کیے ہیں۔ وہاں اس بات کے لیے بھی زمین تیار کر دی ہے کہ باہمی دوستانہ تعلقات اور

باہمی اعتماد کی روح اُجاگر ہو۔ یہ متحدہ ہندستان کے لیے بہترین شگون ہے۔

آبادی کی بنیادوں پر نمائندگی کے اصول کی منظوری نے ہمارے انتخابی نظام کو جائز اور منصفانہ بنیادوں پر لا کھڑا کیا ہے۔ ایک طرف تو اس نے اقلیتوں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ کے خلاف بداطمینانی کے جذبات کا قصہ پاک کردیا ہے اور دوسری طرف بنگال اور پنجاب کی اکثریتوں کو جو اقلیتوں میں منتقل کردی گئی تھیں، مطمئن کردیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقلیتوں کے خاص مفادات کو اس دفعہ سے محفوظ کردیا گیا ہے۔ اگر کسی ایسے اقدام کی جس سے ان کے مفادات پر اثر پڑنے کا اندیشہ ہو، اس قوم کے 3/4 نمائندوں کی اکثریت مخالفت کرتی ہے تو ایسا کوئی مسودہ نہ تو پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس پر بحث ہوسکتی ہے۔

بعض حلقوں کی طرف سے کانگریس کے اس حق کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اسے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو طے کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کانگریس کو اقوام کے باہمی مسائل میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ مسئلے سیاسی نوعیت کے ہوں یا مذہبی نوعیت کے۔ میری یہ رائے ہے کہ ایک فرقہ وارانہ تنظیم یا تنظیمیں اس کی مجاز نہیں کہ کانگریس کے فیصلوں کو منسوخ کرسکیں یا یہ کہ انھیں کانگریس کے متوازی اختیار حاصل ہوسکے۔ انڈین نیشنل کانگریس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مختلف قوم ورانہ انجمنوں کے فیصلوں پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ لازمی طور پر یہی ایک جماعت ہے جو ایسے مسائل پر فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور جو ایک یا دوسری قوم کے درمیان توازن برقرار رکھ سکتی ہے۔ اگر کسی فرقہ وارانہ تنظیم کے رہنما کسی ایسے مسئلہ کا خود تصفیہ کرلیں جس نے ان کے ذہنوں کو پریشان کررکھا ہو تو کانگریس ایسے فیصلہ کو خوش آمدید کہے گی۔ لیکن اگر وہ کسی سمجھوتہ پر نہ پہنچ سکیں تو کانگریس کا ایک مقتدر جماعت کی حیثیت سے یہ فرض ہے کہ وہ سامنے آکر فرقہ وارانہ مسائل کو سلجھانے کی غرض سے

سبک دوش ہو اور مشتعل اور آزردہ فرقہ پرستوں کی دھمکیوں اور چیلنجوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فرقہ وارانہ امن ومصالحت کے راستے نکالے۔

کانگریس نے سیاسی اختلافات کو حل کرنے کے لیے بمبئی کے اجلاس میں ایک اطمینان بخش فارمولا تلاش کیا۔ لیکن مذہبی اور مجلسی اختلافات ابھی جوں کے توں موجود تھے۔ کانگریس کے صدر نے شملہ کے اجلاس میں دونوں اقوام کے راہ نماؤں کو موقع بہم پہنچایا کہ وہ ان کے متعلق کوئی سمجھوتہ کرلیں۔ لیکن جب طویل گفت وشنید کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، تو صاحب صدر نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس اجلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جس کا انعقاد کلکتہ میں عمل میں آنے والا تھا۔ مشہور ہندو اور مسلم راہ نماؤں کی خدمت میں اس مطلب کے دعوت نامے ارسال کیے کہ وہ کمیٹی کو اپنے نیک مشوروں سے مستفید فرمائیں اور اس کام کو تکمیل کا سہرا پہنانے میں امداد دیں۔ جس کا آغاز بمبئی میں ہوا تھا۔ ان کوششوں سے جو نتائج برآمد ہوئے انھیں ان دو ریزولیوشنوں میں مختصر طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ریزولیوشن یونٹی کانفرنسوں نے پاس کیے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے انھیں منظوری عطا کی۔

1- تبدیلی مذہب: آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ہر فرد یا گروہ کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی فرد یا افراد کو ترغیب یا دلائل سے مذہب تبدیل کرنے کو کہہ سکتا ہے۔ مگر کوئی فرد یا گروہ طاقت، فریب یا روپیہ پیسہ کی پیش کش سے بزور طاقت تبدیلی کی نہ تو کوشش کرے گا اور نہ ہی طاقت کے بل بوتے پر کسی کو ایسا کرنے سے روکے گا۔ 18 سال سے کم عمر بچوں کو مذہب تبدیلی کرنے کی ترغیب نہ دی جائے گی۔ البتہ اگر ان کے والدین

سرپرست ایسا کریں تو ان کے ساتھ وہ بھی مذہب تبدیل کر سکتے ہیں اگر 18 رسال سے کم عمر کے کسی لڑکے کو اس کے والدین یا سرپرستوں کے بغیر دوسرے مذہب کے افراد مصیبت میں گرفتار کردیں تو اس کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس کے ہم مذہبوں کے حوالے کر دینا چاہئے۔ مذہب کی تبدیلی یا تبدیلیوں سے متعلق کوئی اس طرح کی بات پردۂ راز میں نہ رکھنی چاہئے۔ کہ وہ شخص یا اشخاص کون ہیں۔ یا کون سے مقام یا وقت پر اور کس طریقہ سے یہ تبدیلی عمل میں لائی گئی ہے اور نہ ہی تبدیلی یا تبدیلیوں کے موقع پر کوئی مظاہرہ یا نمائش کی جائے۔

جب کبھی اس بات کی شکایت کی جائے کہ کوئی تبدیلی فریب وطاقت سے یا رازداری یا کسی ایسے ہی اور طریقہ سے عمل میں لائی گئی ہے۔ اور جب کوئی 18 سال سے کم عمر کے فرد کا دین تبدیل کرے تو اس امر کے متعلق باقاعدہ تحقیقات کی جائے گی اور اس کا فیصلہ ان ثالثوں کے ذریعہ کرایا جائے گا جنھیں ورکنگ کمیٹی مقرر کرے گی۔

2-گائے اور موسیقی: آل انڈیا کانگریس کمیٹی گائے اور موسیقی کے مسئلہ پر اس ریزولیوشن کی منظوری دیتے ہوئے جسے وہ متناقض امور اور نقطۂ نگاہ کا صحیح حل سمجھتی ہے۔ کانگریس کے ممبران کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اس ریزولیوشن میں بیان کردہ طریقوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں پروپیگنڈہ

کریں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ان لائنوں پر وپیگنڈہ کے کام کو چلانے کی خاطر ایک سب کمیٹی کا وجود عمل میں لائے۔

نیز کمیٹی اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ جس آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے منظوری کے لیے یہ اجلاس بلایا جائے اس کا اجلاس مدراس میں منعقد ہو۔

ایک طرف جب کہ ہندستان میں کسی قوم کو اپنے مذہبی خیالات کو دوسروں پر ٹھونسنے یا ٹھونسے جانے کی کوشش کرنے کا حق نہیں ہے۔ دوسری طرف ہر قوم اور ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دی جائے۔ کہ پبلک نظم اور اخلاقی اصولوں کا پاس رکھتے ہوئے ہر فرد کو اپنے مذہبی اعتقاد پر قائم کرنے اور اس کی رسومات پر عمل پیرا ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہو۔

ہندوؤں کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ ہر مسجد کے سامنے جلوس گزار سکتے ہیں اور باجہ بجا سکتے ہیں۔ لیکن مسجد کے سامنے نہ تو کسی جلوس کو کھڑا ہونا چاہئے اور نہ ہی کوئی خاص مظاہرہ کرنا چاہئے۔ اس بات کا بھی خیال رہے کہ کسی مسجد کے سامنے بجنے والی موسیقی ایسی نہ ہو کہ جس سے مسجدوں میں عبادت کرنے والے نمازیوں کو پریشانی یا تکلیف ہو۔

مسلمانوں کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ گائے کی قربانی دیں۔ یا ان میونسپل قانونوں کے ماتحت جن کی رو سے خوراک کے لیے جانور ذبح کیے جاتے ہیں کسی گاؤں یا قصبہ یا کسی ایسے

مقام پر جو برسرِ عام نہ ہو۔ یا کسی مندر کے پاس نہ ہو اور نہ ہی
ہندوؤں کی نظروں کے سامنے ہو۔ گائے کو ذبح کرلیں۔

قربانی یا ذبح کرنے کی گائیں جلوس کی شکل میں بازاروں
میں نہ گھومائی جائیں اور نہ ہی کسی ایسی گائے کا مظاہرہ کیا جائے۔

گائے کشی سے متعلق ہندوؤں کے گہرے جذبات کا
احترام کرتے ہوئے مسلم قوم کی خدمت میں نہایت خلوص سے
درخواست کی جاتی ہے کہ گائے کشی یا گائے کی قربانی کے سلسلہ
میں متعلقہ گاؤں یا قصبہ کے ہندوؤں کو دکھ نہ پہنچایا جائے۔

جب کبھی اس بات کی شکایت کی جائے کہ اس ریزولیوشن کی
کسی دفعہ کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو اس معاملہ کی تحقیقات
کانگریس ورکنگ کمیٹی کے منتخبہ ثالثوں کے ذریعہ کرائی جائے گی۔
اور ان کا فیصلہ آخری فیصلہ تصور کیا جائے گا۔

گذشتہ دور میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کو دور کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن ایک قوم کی طرف سے دوسری قوم کو اپنے حقوق سے محروم کرنے کی کوششوں نے انھیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بجائے اس کے کہ دونوں قوموں میں شکوک وشبہات مٹ جاتے اور ایک قوم کے دل میں دوسری کے متعلق عزت وتکریم کے جذبات جگہ حاصل کرتے، دونوں قوموں میں جھگڑا اور بھی شدت کی صورت اختیار کرگیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ریزولیوشنوں کی بنیاد میں اس بات پر قائم کی گئی ہیں کہ ہر قوم کے اس حق آزادی کو تسلیم کرلیا جائے جو کہ پرامن باہمی مجلسی زندگی کے لیے ضروری ہیں اور کم سے کم پابندیوں کے اندر ہر قوم کو اپنے حقوق سے مستفید ہونے کا

حق حاصل رہے۔ اب جب اس خطرہ کا سدّباب ہوگیا ہے کہ ان کے حقوق کے کم ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں تو اس بات کی کامیابی کے امکانات روشن ہو گئے ہیں کہ دونوں اقوام کے اعلیٰ جذبات کے نام یہ اپیل مؤثر ثابت ہو کہ وہ برداشت اور رواداری کا ثبوت دیں۔ یہ ناممکن نہیں کہ ہر ایک قوم رضا کارانہ طور پر دوسروں کے جذبات اور احساسات کا احترام کرتے ہوئے اپنے چند حقوق سے خود دست بردار ہو جائے۔

کانگریس نے لوگوں کی براہ راست راہ نمائی کا فرض ادا کیا ہے۔ اس نے اس فرقہ وارانہ ناسور کو ختم کرنے کے لیے کہ جو ہماری تمام زندگی کا ستیاناس کر رہا ہے ایک مستند نسخہ کی تجویز کی ہے۔ اب یہ کانگریس کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان ریزولیشن کو مقبول بنانے اور ان کی وضاحت میں بھاری پیمانہ پر وپیگنڈہ کریں، اور انھیں ملک کے طول وعرض میں ہر ایک ہندو اور مسلمان تک پہنچا کر دم لیں۔ میں نہایت عجز سے ہندستان کے ہر ہمدرد سے اپیل کرتا ہوں کہ چاہے اس کا سیاسی مسلک کیا ہو اس کام میں کانگریس کا ہاتھ بٹائے۔ میں تمام پریس سے خاص طور پر التجا کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی اہم ذمہ داری کا احساس کرے۔ پریس کے بغیر ہندستان میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو پبلک رائے کو تشکیل دینے اور قوموں کے باہمی تعلقات میں ربط پیدا کرنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہو سکے۔ بھلائی یا برائی کے لیے یہ ایک ایسا طاقت ور ہتھیار ہے۔ اور مجھے افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ ہماری پریس نے بالعموم اور ورنیکلر پریس نے بالخصوص بھلائی کے لیے اسے استعمال نہیں کیا۔ چند ایک قابل احترام اخبارات کے ماسوا تمام اخبارات نے فرقہ پرستی کی آگ کو ہوا دینے کا رول ادا کیا ہے اور انھوں اپنے فرائض منصبی کو سرانجام دینے میں قابل افسوس طور پر ناکامی کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے اینگلو انڈین

اخبارات سے کوئی گلہ نہیں۔ انھوں نے قدرتاً ان لوگوں کے مفادات کی ترجمانی کرنا ہے جن کے وہ پروردہ ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے صحافت نگاروں اور اخباروں سے اس بات کی توقع رکھنا بہت بری چیز ہے کہ وہ مشترکہ قومی مفاد کے پیش نظر اپنے خود غرضانہ مفادات کو قربان کر دیں گے اور ان طاقتوں کا ساتھ دیں گے جو اتحاد و اتفاق کے لیے برسرِ عمل ہیں۔ خبر رساں ایجنسیوں کا رویہ بھی اس ضمن میں اطمینان بخش نہیں رہا۔ ہمیں ان سے بھی یہ ہی امید رکھنی چاہئے کہ وہ ملک میں اتحاد و اتفاق کی روح پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گی، آؤ ہم سب اس بات کو محسوس کریں کہ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے اور ہماری اتحاد پیدا کرنے کی مسائی پر ہندستان کے تمام مستقبل کا دارومدار ہے۔

میں نے یہاں اس تفصیل کے ساتھ ہندو مسلم مسئلہ پر اس لیے روشنی ڈالی ہے کہ ہر جگہ موجود جرثومہ کی طرح اس نے ہماری قومی زندگی کے ہر حصہ کو زہریلا بنا رکھا ہے۔ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ ہندو مسلم تعلقات کا سوال اقلیتوں اور پس ماندہ طبقوں کے بڑے مسئلہ کا محض ایک جز ہے۔ شمال میں سکھ، جنوب میں غیر برہمن اور ہندستان بھر میں دلت جاتیاں ہماری توجہ کی خاص طور پر محتاج ہیں۔ میں غیر برہمنوں اور سکھوں سے متعلق آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ مگر کروڑہا اچھوتوں کے لیے میں اپیل کرنے کی خواہش کو دبا نہیں سکتا۔ اچھوت پن کو ختم کرنا اگرچہ ایک ایسا سوال ہے جس کا صرف ہمارے ہندو بھائیوں سے تعلق ہے۔ بایں ہمہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کے ساتھ ہر ایک ہندستانی کو پوری توجہ کا اظہار کرنا چاہئے کیوں کہ ہمارے ہم وطنوں پر یہ مجلسی پابندیاں اور سیاسی تقریریں ہمارے ملک کو نجات دلانے کی جدوجہد میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔

فرقہ وارانہ اتحاد کے مسئلہ کے بعد بڑی اہمیت کا سوال یہ ہے کہ کانگریس کو وسیع بنیادوں پر از سرنو منظم کیا جائے۔ جو دھکا ہمیں عدم تعاون کی تحریک میں لگا ہے اس نے کانگریس پر بہت برا اثر کیا ہے۔ 21-1920ء کے خوش نما ایام کا گہرا جذبہ جب کہ ہر گاؤں اور قصبہ نے اپنی کانگریس کمیٹی قائم کر رکھی تھی ٹھنڈا پڑ گیا ہے اور فرقہ پرستانہ منافرت کے طفیل اس کی جگہ کانگریس کی طرف سرد مہری نے لے لی ہے۔ پھر بھی مقام شکر ہے کہ یہ کھلی سرد مہری پر نہیں پہنچا۔ اب جب کہ بمبئی اور کلکتہ ریزولیوشنوں کی بنیادوں پر فرقہ وار مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیا گیا ہے، اس بات کی نہایت سرگری سے کوشش ہونی چاہئے کہ کانگریس کو مقبول بنایا جائے اور تمام اقوام کو ترغیب دی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں شامل ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے غیر برہمن دوستوں نے پھر ہم میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس بات سے مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ وہ یہاں اتنی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ با ایں ہمہ ایک چیز ضرور رنج دہ ہے وہ یہ کہ مسلمانوں اور سکھوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔

پارسیوں کا معاملہ جنھوں نے اس کے اولین ایام میں سرگرم حصہ لیا اور بھی خراب ہے۔ میں بالخصوص ہندستانی عیسائیوں سے خطاب کرنا چاہتا ہوں جو اب تک من حیث الجماعت کانگریس سے دور رہے ہیں۔ میں انھیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ کانگریس سے دور رہ کر اپنی قوم کی خدمات سرانجام دے سکتے ہیں تو انھیں میرے ہم مذہب بھائیوں سے سبق سیکھنا چاہئے۔ ہندستان کے مسلمانوں نے کئی سالوں تک غیر قومی طاقتوں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کیے رکھا۔ اور آخر تلخ تجربہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے مفادات کی بھلائی کا راز انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ رشتہ منسلک کرنے اور اپنے باقی ہم وطن بھائیوں کے ساتھ مشترکہ مفاد بنانے میں مضمر ہے۔ ہندستانی عیسائی اپنی علیٰحدگی کی پالیسی کو ترک کر کے ایک

ہندستانی قومی نظریہ وضع کر کے اپنی قوم کی بہتر خدمت کریں گے۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں گا کہ ہمارے عوام الناس کا ہر ایک جز کانگریس کے ذریعہ قومی امورات میں حصہ لینے کی دوڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ کانگریس کے دروازے تمام پارٹیوں پر کھلے چھوڑ دیے جائیں گے اور ہم ہر پارٹی کو اپنی صفوں میں واپس لانے کے لیے بنیادی اصولوں کو ترک کر دینے کے علاوہ کسی قربانی سے گریز نہ کریں گے۔ اختلاف رائے کا موجود رہنا لازمی امر ہے۔ لیکن ان کا مقابلہ کرنے کی بہترین جگہ ہندستان میں تمام سیاسی جماعتوں کی ماں انڈین نیشنل کانگریس کا پلیٹ فارم ہے یا ہونا چاہئے۔ ہر ایک پارٹی کے لیے کانگریس کو اس بات کا یقین دلانے کا پورا موقع اور حق حاصل ہے کہ اس کا نقطۂ نظر صحیح ہے اور وہ اس پالیسی کے لیے جس کی وہ ترجمانی کرتی ہے، اکثریت کی مدد حاصل کر سکتی ہے۔ اگر اکثریت غلط یا درست طور پر اس پالیسی کو درست سمجھنے میں ناکام رہتی ہے تو جب تک ہم اکثریت کے غلبہ کے اصول کا کوئی بدل نہ تلاش کر لیں، واحد قابل عمل اور جمہوری طریقہ یہ ہے کہ اکثریت کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقلیت اپنے آپ کو اکثریت میں تبدیل کرنے کی کوششیں عمل میں لانے کا حق ضائع کر بیٹھتی ہے۔ تفصیلات یا طریقہ کار میں اختلاف کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بڑی تنظیم سے رشتہ منقطع کرنے کا بہانہ بنا لیں، اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ اتنی سی بات پر، ہم اس تنظیم سے باہر ایک علیحدہ پارٹی کھڑی کر لیں۔ معمولی معمولی اختلافات پر نت نئی پارٹیاں بنا لینا ان ممالک کے لیے بھی مفید نہیں کہ جو پہلے ہی آزاد ہیں۔ ہم جو اپنے ابتدائی حقوق کے لیے جدوجہد میں مشغول ہیں اپنے آپ کو پارٹی بازی کے پیچیدہ نظام میں الجھا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہندستان کے روشن دماغ لوگوں پر ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ عائد ہوتا ہے۔ جن کا فرض یہ ہے کہ وہ عوام الناس کو اپنے حقوق اور مراعات کو حاصل کرنے کی

تعلیم دیں۔ لاتعداد پارٹیوں کے وجود سے پیدا شدہ کھلبلی نے عوام الناس کی بھلائی کے کام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ آؤ ہم اختلافی نقاط کی بجائے ان باتوں پر زور دیں جن پر ہم میں زیادہ سے زیادہ اتفاق موجود ہے۔ بہر حال جن نقاط پر ہمیں اتفاق ہے۔ بہت زیادہ ہیں، اور جن پر اختلاف ہے بہت کم ہیں۔

مجھے کونسلوں میں کوئی اعتقاد نہیں۔ لیکن میں اس حقیقت سے کما حقہ واقف ہوں کہ کانگریس نے اپنے ممبران کو اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اگر چاہیں تو کونسلوں میں جا سکتے ہیں اور میرے کارکن دوستوں کی ایک بھاری تعداد اس بات پر ایمان رکھتی ہے کہ وہ کونسلوں کے اندر رہ کر ملک کی مفید خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔ میں ان سب کی خدمت میں نہایت عجز سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ کونسلوں میں جائیں تو ان سے ملک کم از کم اس بات کی امید رکھتا ہے کہ وہ اپنی پارٹی بازی کو اس حد تک نہ لے جائیں کہ ان کے مخالف ان کی اس تفریق سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ کونسلوں کے اندر حزب المخالف کی عوامی پارٹی بنانے کی غرض سے قومی گروہوں کا ساتھ دیں اور ان کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کریں۔ اکثر مسئلوں پر قوم پسند گروہ اب بھی لابی میں ایک جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ کونسلوں کے اندر کام کرنے کے متعلق کانگریس کی ہدایات اتحاد عمل کے لیے اچھی بنیادیں ہیں۔ اگر متحدہ اقدام کی خاطر کوئی گروہ یہ سمجھتا ہو کہ ان ہدایات میں ترمیم کی ضرورت ہے تو وہ کانگریس کے پاس آ کر اپنے نقطۂ نظر پر زور دے سکتے ہیں اور کانگریس جو کچھ فیصلہ بھی دے۔ اس کی وفاداری سے تعمیل ہونی چاہیے۔

''گئے گزرے بھلے'' دنوں کی بات ہے کہ ہم بڑی بے صبری سے اپنے حکمرانوں کی طرف عنایات کے لیے دیکھا کرتے تھے۔ قدرت نے اپنی کمال عنایات سے کام لیتے ہوئے ہمیں قانونی کمیشن کی صورت میں حقیقی کرم فرمائی سے نوازا ہے۔ جس

طریقہ سے ہندستانی عوام کی اعلان کردہ خواہشات اوراحساسات کوٹھیس لگائی گئی ہے۔ ہم میں خوش امید سے خوش امید انسان کی بھی آنکھیں کھول دینے کا موجب ہوگا۔ یہ واقعہ ہمیں اپنے اختلافات کو مٹا دینے اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کی پرزور اپیل کرتا ہے۔ اس کمیشن پر بہت کچھ کہا جاچکا ہے۔ مگر ایسی باتیں بہت کم کہی گئی ہیں جو لوگوں کے دلوں کو براہ راست اپیل کرسکیں۔ کمیشن کے عملہ میں کسی ہندستانی کو نہ شامل کرنے پر انتہائی ناامیدی اور حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مجھے تسلیم کرلینا چاہئے کہ میں ان تاثیرات کے احساس میں ان کا شریک نہیں۔ مجھے نہ تو مایوسی ہوتی ہے اور نہ ہی حیرت۔ میرا پہلے سے یہی اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ سوال یہ نہیں کہ اس میں ہندو یا مسلمان خطاب یافتہ ہستیوں کو شامل کیا جائے۔ سوال یہ بھی نہیں کہ ہندستانی اس میں صلاح کار ممبران کی حیثیت سے شامل ہوں۔ پیش نظر اصول اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ بات ہی بنیادی اور حقیقی ہے کوئی ذی ہوش اور خوددار انسان برطانیہ عظمیٰ کے اس دعویٰ کو تسلیم کرسکتا ہے کہ وہ ہندستان کی سیاسی ترقی کا فیصلہ کرنے کا واحد منصف ہے؟ ہم اپنی ضروریات اور حاجات کو خود بہتر جانتے ہیں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں ہماری آواز ہی آخری آواز ہوسکتی ہے۔ یہ ہمارا ناقابل تردید موروثی حق ہے۔ ان اصولوں پر کھڑے ہوکر کانگریس نے ہندستان اور انگلستان کے نمائندگان کی گول میز کانفرنس منعقد کرنے پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ ان نمائندوں کو ہندستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے مکمل اختیارات حاصل ہونے چاہئیں اور پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ سے اسے باقاعدہ طور پر منظور کیا جائے۔ صرف ان شرائط پر ہی ہندستانی لوگ مستقل طور پر اپنے قومی وقار اور عزت کو محفوظ رکھ کر تعاون کرسکتے ہیں۔ جب تک برطانیہ عظمیٰ ان شرائط کو نہیں مانتا انڈین نیشنل کانگریس کے پاس اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ قانونی کمیشن کے ساتھ بالکل اسی سلوک کا ثبوت دیں

جس کا اظہار ہمارے مصری بھائیوں نے ملز مشن کے ساتھ کیا تھا اور وہ اسے بالکل تن تنہا چھوڑ دیں۔

قانونی کمیشن کی آمد سے ہماری توجہ ہندستان کا آئین مرتب کرنے کی طرف سے ہٹ نہ جانی چاہیے۔ اس کی ضرورت کا احساس آج سے کافی وقت پیشتر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی میں کیا گیا تھا۔ جس میں ورکنگ کمیٹی سے کہا گیا تھا کہ وہ سیاسی رائے کے راہ نماؤں کے صلاح مشوروں سے ہندستان کے لیے ایک موزوں آئین مرتب کرے۔ اس نوعیت کا آئین مختلف اقوام کے دلوں سے اپنے تمام شکوک وشبہات دور کردے گا کہ ملک کے آخری نظم ونسق میں انھیں کیا درجہ حاصل ہوگا۔ یہ مختلف سیاسی پارٹیوں کو کانگریس کے گرد جمع کردے گا اور لوگوں کو اپنے سیاسی حقوق کا احساس دلانے میں بے بہا اہمیت کا موجب ثابت ہوگا۔ جب انھیں یہ بتایا جائے گا کہ انھیں کیا فرض سرانجام دینے کو کہا جا رہا ہے ہم اس کی اہمیت کو اس لحاظ سے نظر انداز نہیں کرسکتے کہ سوراج حاصل کرنے کی جدوجہد میں یہ ہمارے ہاتھ مضبوط کرے گی۔

ہندستان کے بتیس کروڑ انسانوں کے لیے ایک آئین مرتب کرنا جو مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ جمہوریت کی تاریخ میں ایک انوکھی بات ہوگی۔ اس آئین کو مرتب کرنے والوں کے راستہ میں یہ ایک اور پیچیدہ مسئلہ ہوگا کہ انھیں ہندستانی ریاستوں کے سوال کو کیوں کر نبھانا چاہیے۔ ان ریاستوں کو اپنے علاقوں میں خودمختاری حاصل ہے۔ ہندستان کا آئندہ آئین چاہے کچھ بھی ہو۔ ایک بات قدرے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس کی بنیادیں فیڈرل طریقہ پر قائم کی جائیں گی اور ریاست ہائے متحدہ ہندستان کا ایک ایسا نقشہ ہوگا جس میں موجودہ ہندستانی ریاستوں کو فیڈریشن میں خودمختار اکائی کی حیثیت حاصل ہوگی اور وہ ملک کے دفاع، معاملات خارجہ کی تشکیل اور دوسرے مشترکہ معاملات میں اپنا حصہ ادا

کریں گی۔

جوں ہی آئین مرتب ہو جائے کانگریس تمام اقوام، مفادات اور سیاسی پارٹیوں کے نمائندگان کی ایک کنونشن کا اجلاس اس غرض کے لیے مدعو کرے گی کہ وہ اس آئین پر غور وخوض کرنے کے بعد اسے آخری شکل عطا کریں۔

کسی ملک پر سب سے بڑی مصیبت یہ نازل ہوتی ہے کہ وہ آزادی کھو بیٹھے۔ جذبہ حب الوطنی آزاد لوگوں میں کلی طور پر سب سے بڑی نیکی تصور کیا جاتا ہے۔ مگر غلام لوگوں میں اس جذبہ کی بدترین جرم کے طور پر مذمت کی جاتی ہے۔ پبلک کارکنوں کی صفوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی وقت ایک ادنیٰ قیدی کی حیثیت سے جیل میں بند ہو کر اپنے اس جذبہ کی قیمت نہ ادا کی ہو۔ امن وامان میں کی گئی بے آئینیوں کے شکار لوگوں کی صحیح تعداد بیان کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اگر صرف ان لوگوں کو سامنے رکھا جائے جو کاما مارا گاٹو کے مقدمہ میں ماخوذ ہوئے، پنجاب میں جہاں دس دس گیارہ گیارہ سال کے بچوں کو بادشاہ کے خلاف بغاوت کے الزام میں عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ مارشل لاء کے دنوں کے قیدی، اکالی تحریک میں گرفتار کیے گئے سکھ اور 1922ء کے سزا یافتہ موپلے تو یہی تعداد 60,000 کی پریشان کن تعداد سے بڑھ جاتی ہے ان 60,000 کو نمائشی عدالتوں، مثلاً معمولی عدالتوں، سپیشل ٹریبونل اور مارشل لا کورٹس میں مقدمات چلا کر سزائیں دلائی گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ دردناک معاملہ ان سونو جوانوں کا ہے جنھیں محض اپنے وطن سے محبت کے جرم میں اپنے عنفوان شباب میں مقدمہ چلانے کے مذاق وتماشہ کے بغیر اس ظالمانہ ہتھیار کے ساتھ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ عہد رفتہ کی پرانی یادگار ہے۔ یعنی 1818ء کے ریگولیشن 3 کی دفعہ 3 یا جبر کا وہ ظالمانہ ہتھیار بنگال کا 1924ء کا آرڈی ننس ہے۔ جسے بعد ازاں بنگال کے پروقار قانون فوج داری کے

ترمیمی ایکٹ 1925ء کے نام پر قانونی کتابوں میں شامل کرلیا گیا۔ بنگال کے نظر بندوں کی کہانی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک عجیب ورق معلوم ہوتی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں اخلاقی احساسات اتنے ترقی یافتہ نہ تھے۔اور تہذیب کا معیار ابھی اس درجہ بلند نہ تھا لیکن بنگال کا بیسویں صدی کا واقعہ ہے کہ جب لوگوں کا احساس انصاف اور اچھے اور برے میں تمیز کرنے کا اخلاقی معیار ازمنہ وسطیٰ سے کئی صدیاں ترقی یافتہ ہے اور یہ کام ان لوگوں کا ہے کہ جو اپنے آپ کو تہذیب کے شمع بردار کہتے ہیں۔یہ اخلاقی دیوالہ پن کا نہایت مذمت آمیز اعتراف ہے کہ حکومت کو خود اپنی عدالتوں کے سامنے اپنے منصفوں کے حضور میں خود اپنے نفوذ کردہ قوانین کی رو سے ان پر مقدمہ چلانے کی جرأت نہیں۔میں حکومت کو متنبہ کرتا ہوں کہ قوم کی روح میں جو آگ ان مظالم سے اٹھ رہی ہے وہ ان کے تلخ نتائج سے باخبر رہے۔ دوسری حکومتوں نے بھی آزادی کی روح کو کچلنے کے لیے تشدد سے کام لیا۔لیکن اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس کے لیے میں روس اور آئرلینڈ کی مثال دینے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ ہم میں سے خوش اعتقاد سے خوش اعتقاد انسان بھی ہندستان کے مستقبل اور اس سلسلہ میں اعلان کردہ بلند بانگ اصولوں سے متعلق حکومت کی نیت کی صداقت پر مشکل سے اعتماد کرے گا۔جس کے متعلق وہ آئے روز باضابطہ طور پر دعویٰ کرتی رہتی ہے۔لوگوں کے ابتدائی حقوق اور آزادی کو اس بے دردی سے کچلا جا رہا ہے۔ان لوگوں کو رہا کرنے سے ہی اس بات کا پتہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ہندستان اور برطانیہ عظمیٰ میں بہتر روح پیدا ہونے کے آثار پیدا ہوچکے ہیں۔ ہماری مساعی صرف ان لوگوں کو رہا کرانے پر ہی محدود نہ ہونی چاہئے۔ بلکہ ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ لوگوں کے حقوق پر چھاپہ مارنے کی کسی اور حرکت کا ہمیشہ کے لیے سد باب ہوجائے۔اس کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک "اعلان حقوق" مرتب کیا جائے اور حکومت کو

اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اسے ملک کے بنیادی حقوق کے طور پر قانون کی شکل دے دے۔ اس میں ہر ایک شہری کی شخصی آزادی، تقریر کی آزادی، ضمیر کی آزادی اور انجمن سازی کی آزادی کی ضمانت موجود ہو۔

نظر بندوں کے سوال کے ساتھ ان ہندستانی قوم پسندوں کے سوال کا چولی دامن کا رشتہ منسلک ہے جنھیں اجنبی ملکوں میں جلاوطن ہونے پر مجبور کیا گیا ہے۔ گزشتہ دور میں ہم ان کے طریقہ کار سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ مگر وہ غیر معمولی حالات جنھوں نے ان کو ایسے ہتھیاروں سے کام لینے کی ترغیب دی اب معدوم ہو چکے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ انھیں اپنے پیدائشی وطن واپس آنے کی اجازت نہ دی جائے تا کہ وہ امن کے ساتھ اس کی خدمت سرانجام دے سکیں۔

نظر بند اور جلاوطن ہی جبر کا شکار نہیں۔ بلکہ عام شہریوں کو آزاد نقل و حرکت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ پاسپورٹوں کے ذریعہ ان سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے حق کو چھین لیا گیا ہے۔ ہماری نوکر شاہی سرکار کو پاسپورٹوں کی شکل میں ہمارے خلاف استعمال کرنے کا ایک اور ہتھیار مل گیا ہے۔ ہندستان کو ایک وسیع نظر بند کیمپ میں بدل دیا گیا ہے اور اجنبی دیسوں میں رہنے والے ہندستانیوں پر اس کے داخل ہونے کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں معزز ہندستانیوں کو صحت، کاروبار اور سیر و سیاحت کی غرض سے دوسرے ملکوں میں جانے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان ریگولیشن کے ناجائز طور پر استعمال کرنے کی نہایت روشن مثال شاید مسٹر شاپر جی سکلا توالہ کی ذات سے زیادہ نہ مل سکے۔ آپ انگلستان کی پارلیمنٹ کے رکن ہیں اور اس لحاظ سے انگلستان میں بڑے سے بڑے اعزاز اور اعتماد کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ یہ حق آپ کو ان لوگوں نے تفویض کیا ہے جنھوں نے آپ کے حق میں ووٹ ڈالے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ آپ جیسی نمایاں شخصیت کو بھی اپنے پیدائشی ملک میں داخل

ہونے سے روک دیا گیا۔ یہ پابندیاں اور جیلوں کی زنجیریں قطعی طور پر مٹ جانی چاہئیں۔

میں پیشتر ازیں ذکر کر چکا ہوں کہ ہمارے سامنے یہ کام ہے کہ ہندستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ اس بات کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہمیں اپنے مسائل کے حل کے لیے خود اپنی تنظیم اور اپنے ذرائع پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ لیکن ایک چیز اور قابل غور ہے۔ اس بات سے ہمیں فائدہ پہنچے گا کہ ہم اپنے مسائل کو صرف نجی مسائل سمجھنا چھوڑ دیں۔ ہم ایک عرصہ سے اس غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں کہ ہم نے انھیں کلیتاً ہندستانی مسائل قرار دے رکھا ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم ان پر بین الاقوامی نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کریں اور عالم گیر سیاسیات میں ہر اس بات کو زیر نظر رکھیں جو ان پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ اس غلطی کے سب سے بڑے ذمہ دار ہمارے ہندو بھائی ہیں۔ شاید ان کے مخصوص مجلسی نظام نے ان میں علیحدگی کی روح پیدا کردی جب انگریز اس دیس میں منظر عام پر آئے تو انھوں نے علیحدگی کی اس روح سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور اسے اس حد تک مکمل علیحدگی میں بدلنے میں سرگرم رہے کہ باقی دنیا سے ہمیں بالکل توڑ کر رکھ دیں۔ یہ دیواریں اس درجہ اونچی کھڑی کی گئیں کہ ہم اپنے قریب ترین ہمسایہ ممالک میں صورت حالات سے بے خبر رہے۔ ہمارا ان کے ساتھ تھوڑا بہت جو تعلق قائم رہا۔ وہ لندن کے ذریعہ تھا اور صرف اس حد تک کہ جسے برطانیہ عظمیٰ موزوں سمجھے۔ ہم نے دنیا کو برطانوی عینکوں سے دیکھا۔

بلاشبہ مسلمان گاہے گاہے بیرونی حالات سے ہندستان کی قطعی لاتعلقی کے سکوت کو توڑتے رہے لیکن چونکہ عالمگیر سیاسیات میں ان کی یہ دل چسپی زیادہ تر مذہبی تھی۔ اس لیے قومی سیاسیات جوں کی توں رہی۔ اب علیحدگی ممکن نہیں۔ سائنس نے فاصلہ کو کم کردیا ہے اور بڑی بڑی دیواریں زیر زمیں ہوگئی ہیں۔ ایک ملک کے

واقعات فوراً دوسرے ملک پر اثر انداز ہوتے ہیں۔قومی سیاسیات کے تمام نظریہ کو اس بات نے بنیادی طور پر ہلا دیا ہے کہ تمام ملک کسی نہ کسی بات میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اگر ہم باہر کے حالات اور واقعات سے بالکل بے تعلق رہے تو ہمیں اس کا بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یورپ اور ایشیا کی جنگ میں فتح کا سہرا اس لیے یورپ کے سر رہا کہ وہ اس کے منتشر شدہ حصوں کے خلاف متحدہ اقدام اٹھاسکتا تھا۔ یورپی شہنشاہی اور سرمایہ دارانہ طاقتوں کو روکنے کی امید صرف اس بات کے ساتھ وابستہ کی جاسکتی ہے کہ ایشیائی اقوام ایک دوسرے کے زیادہ قریب قریب ہوجائیں اور ان مسائل میں زیادہ گہری دل چسپی کا اظہار کریں جو ان سب کے درپیش ہیں۔ خوش قسمتی سے ہماری جغرافیائی حالت ایسی ہے کہ ہماری آبادی کا ایک حصہ ایشیا کے مغربی ممالک کے ساتھ کلچرل رغبت رکھتا ہے اور دوسرا حصہ اس براعظم کے ان ملکوں کے ساتھ کہ جو مشرق میں واقع ہیں۔ ہمارے اقتصادی مسائل بھی قریباً قریباً ایک ایسے ہیں۔ چنانچہ مشترکہ تمدن اور مفادات کو اس ایشیاٹک فیڈریشن کی اسکیم کو تکمیل کا جامہ پہننے میں معاون ثابت ہونا چاہئے۔ جسے دیش بندھو چترنجن جیسے محبِّ وطن نے پیش کیا ہے۔ آپ ہی وہ دیش بھگت ہیں کہ جنھیں فطرت کی طرف سے وہ قوت خیال اور وسیع زاویہ نگاہ ودیعت ہوا ہے کہ جس کے نزدیک جغرافیائی دیواریں ہیچ ہیں اور جو ایشیا کی تمام نسلوں کو ایک احاطہ میں جمع دیکھنا پسند کرتا ہے۔

اس ضمن میں کانگریس نے ''امپریلزم کے خلاف کانگریس'' منعقدہ برسلز میں شامل ہوکر اور ''امپریلزم کے خلاف لیگ'' کے ساتھ رشتہ منسلک کرنے سے آغاز کیا۔ کانگریس نے اس سے بھی اہم اور عملی اقدام اس تجویز کو پیش کرکے اٹھایا کہ چین کے لوگوں کو ان کی موجودہ جدوجہد میں میڈیکل ریلیف مشن بھیج کر امداد دی جائے۔ مشن نہ بھیجا جاسکا۔ چونکہ ہندستان کی سرکار نے پاسپورٹ دینے سے انکار کردیا۔

حکومت کو پاسپورٹ نہ ادا کرنے کے لیے بہانہ تلاش کرنے میں دو بار جگہ بدلنا پڑی۔ اس سے اس حقیقت کا حال معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا اصل مقصد وہ نہ تھا جس کا انکار کرتے ہوئے سرکاری طور پر اعلان کیا گیا۔ حکومت اس دلیل کی جگہ کہ کسی ایک یا دوسرے محارب ملک کی امداد میں میڈیکل مشن کو بھیجنے کی اجازت دینا اصول غیر جانب داری کے خلاف ہوگا، اگر یہ کہہ دیتی کہ یہ اصول جانب داری کے خلاف ہے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر جانب دار ممالک کی ہی یہ پوزیشن ہے کہ وہ ایک دوسرے ملک کو بلا روک ٹوک مدد بھیج سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بات صلیب احمر اور ہلال احمر جیسی بین الاقوامی انجمنوں کے غایت وجود کے خلاف ہے جو گزشتہ دور میں اس قدر امداد دے چکی ہیں۔ یہ دلیل دیتے ہوئے حکومت خود ہی اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی کہ آج سے پندرہ سال پہلے اس نے بذات خود ایک ایسے مشن کو ٹرکی میں جانے کی اجازت دی تھی کہ جب برطانیہ عظمیٰ غیر جانب دار تھا۔

میں نے قوم ورانہ اتفاق اور سیاسی پارٹیوں کے اتحاد پر ایسے مسائل پر زور دیتے ہوئے آپ کا بہت وقت لے لیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ قومی بھلائی کے لیے اس وقت یہ مسئلے از بس اہمیت کے مالک ہیں بایں ہمہ ایک اور مسئلہ ایسا ہے جو ان تمام لوگوں کی گہری دل چسپی کا محتاج ہے جنھیں وطن کی بھلائی دل سے عزیز ہے۔ شاید یہ کہا جائے کہ قومی صحت کا مسئلہ بجا طور پر ایک سیاسی جماعت کے دائرہ میں نہیں آتا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی اتنی توجہ کا موجب نہیں ہو سکا جتنا کہ وہ مستحق تھا۔ یہ مسئلہ ہمارے چند ایسے مسائل پر جو خود مختار قوم کی حیثیت سے ہمارے لوگوں کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہیں، اس قدر زیادہ اثر رکھتا ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ کانگریس کے لیے ہماری قومی اکانومی میں اس کی اہمیت کا احساس کر لینے اور اپنی توجہ کو اس کی طرف مبذول کر دینے کی یہ موزوں

گھڑی ہے۔

اس بات کا احساس کرنے کے لیے کوئی زیادہ تیز قوی مشاہدہ کی ضرورت نہیں کہ ہماری صحت میں عام طور پر گراوٹ آ رہی ہے۔ پچھلے پچاس سالوں میں یہ کمی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ لمبی تفصیلات میں جانے کے بغیر موجودہ نسل کے کسی نوجوان اور پچھلی دونسلوں کے نوجوانوں میں موازنہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کافی کمی واقع ہو چکی ہے۔ پچھلی دونسلوں کے لوگ جو غالباً کم صاحب فہم مگر نسبتاً زیادہ سرگرم، زیادہ قوت برداشت کے مالک، زیادہ دلیر اور بیماریوں کا کم اثر قبول کرنے والے تھے۔ یہ موازنہ اور بھی نمایاں نظر آتا ہے کہ جب ہم اپنی صحت کا مقابلہ مغرب کے کسی ملک سے کرتے ہیں۔ اگر ہم اس تنزل کے اسباب کی تحقیق کرنا شروع کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کے بواعث مجلسی، اقتصادی، تعلیمی اور حفظان صحت اور آب وہوا سے متعلق ہیں۔

گرم ممالک میں جہاں سال کے اکثر حصوں میں آب وہوا نہایت گرم رہتی ہے۔ لوگوں کے نظام عصبی جلد ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ سرد ممالک کی نسبت گرم ممالک میں لوگ اتنے ہی اوقات کار میں جلد تھک جاتے ہیں اس کے باوجود ہندستان میں مغرب کی نسبت اوقات کار زیادہ ہیں۔

ہندستانی مزدور کے لیے تفریح یا آسائش کے کوئی سامان موجود نہیں۔ جب کہ عصبات پر دن بدن زیادہ زور پڑتا رہتا ہے۔ اس سے اوسط زندگی اور معیار قابلیت پر زیادہ اثر پڑتا ہے۔

ہماری مخصوص مجلسی زندگی کی خرابیاں اس قدر معلوم ہیں کہ ان پر زیادہ وقت صرف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مجلسی مفادات کے لیے کام کرنے والا ہر کارکن جانتا ہے کہ ہماری صنف نازک کو علیحدہ رکھنے کی کوششوں اور ان ضوابط نے

کیا ستم ڈھایا ہے کہ بیاہ کا انتخاب ایک محدود حلقہ سے کیا جائے۔ ہماری گھریلو زندگی پر اثر پیدا کرنے والے مجلسی ضوابط میں کٹر پن اس قدر اینٹھا ہوا ہے کہ وہ خاندان کی ذہنی اور جسمانی ترقی کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور بچوں پر نہایت مضرت رساں اثر پیدا کرتا ہے۔ قدرت اپنے انتقام میں نہایت بےرحم ہے۔ اگر ہم نسلیات کے مسلمہ اصولات کا مقابلہ کرتے رہے تو عام نسل کا خراب ہونا لازمی امر ہے۔

کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی عام اقتصادی حالت ایسی ہے کہ ان کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنے جسم اور روح کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ یہ مزدور ہماری کل آبادی کا 3/4 حصہ ہیں۔ انھیں کام زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ اجرتیں کم ہیں۔ خوراک میسر نہیں۔ لباس اچھا نہیں ملتا اور مکانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان کی بیماریوں کے خلاف قوت مزاحمت اتنی کم ہے کہ عام بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ ہیضہ، طاعون، انفلوئینزا، چیچک اور ملیریا سال بہ سال ہزاروں لوگوں کا صفایا کر جاتا ہے۔

شراب نوشی کی بڑھتی ہوئی لعنت نہ صرف ہمارے ملک کی پبلک صحت کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ بلکہ اس کے ہماری تمام مجلسی زندگی پر اثرات نمایاں ہیں۔ شراب نوشی مسلمانوں کے لیے مذہبی طور پر حرام ہے۔ ہندو اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اگر حکومت نے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہوتا جو اسے روکنے کی کوششوں میں منہمک تھے۔ تو یہ اس قدر زیادہ سرعت اور شدت کے ساتھ نہ پھیل سکتی۔ اس کے برعکس ان قومی کارکنوں کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں جو اس لعنت کو ختم کرنا چاہتے تھے اور سینکڑوں نوجوانوں کو شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرنے کی سرزنش میں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ تاکہ وہ وہاں اپنے اصلاح پسندانہ جذبہ کی سزا بھگتیں۔ سیاسی میدان میں لوگوں کو آزادی سے محروم کرنے کے عوض قانون کی

تلوار انھیں اس آزادی کا حق محفوظ کرنے کے عوض ننگی ہوگئی۔ انھیں خود مخمور ہونے اور لوگوں کو مخمور کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہندستان اس کی بجا طور پر شکایت کرسکتا ہے۔ کچھ تو پیدائشی شراب خور ہیں۔ چند اور اس عادت کو دوسروں سے لے لیتے ہیں۔ اور بعض پر شراب نوشی ٹھونسی جاتی ہے۔ قوم کی صحت خراب ہوجائے۔ شرح جرم بڑھ جائے۔ کاشتکاروں اور مزدوروں کی حکومت ٹوٹنے لگے۔ ان کے بچے بھوکوں مرنے لگیں۔ لیکن فروخت منشیات کی ممانعت نہیں کی جاسکتی چونکہ بجٹ کی کمی کو پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔

نیم متوسط اور متوسط طبقات کے حالات بھی کم تشویش ناک نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شہروں میں جہاں زندگی نسبتاً گراں ہے انھیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی قلیل آمدنیاں، گنجان آبادیوں میں رہائش، غیر صحت بخش علاقے انھیں خاص طور پر تپ دق کا شکار بنا دیتے ہیں۔ اموات بچگان کے خوف ناک اعداد و شمار اور شہری اور دیہاتی دنیا میں بچہ جننے کے دوران میں اموات ایسے مسائل ہیں جن کی طرف فوری طور پر اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

صحت اور حفظان صحت کے مناسب سامان کی کمی نے ان لعنتوں کو اور بھی شدید بنا دیا ہے۔ ہمارے پاس اس بات کے کافی مواقع موجود ہیں۔ کہ ہم اپنے اور اپنے گھروں کے عام معیار صفائی کو بلند کریں۔ مکانات اس طرح بنائے جائیں کہ ان میں روشن دان موجود ہوں۔ روشنی کا خاص لحاظ رکھا جائے اور حفظان صحت کے مناسب انتظامات عمل میں لائے جائیں۔ دیہات اور قصبات پانی، حفظان صحت وغیرہ کے باقاعدہ انتظامات کے ساتھ بنائے جائیں ہر چھوٹے بڑے گاؤں اور قصبہ میں سامان خوراک کی بہم رسانی منڈیوں کا بہتر انتظام ملک کی اہم ضرورت ہے۔ طبی امداد کا وسیع پیمانہ پر انتظام کرنا چاہیے۔ صرف ان طریقوں سے ہم تمام قابل رفع

بیماریوں کو قابو میں لا سکتے ہیں اور قطعی طور پر ان کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

حفظان صحت کی تعلیم کے ساتھ عام لوگوں کی صحت کا سوال وابستہ ہے۔ جب تک مناسب تعلیم کے ذریعہ لوگوں کا ذہن تیار نہیں ہوجاتا وہ نہ تو ان ضروری اصلاحات کا احساس کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں جن کے ساتھ عوام الناس کی خوش حالی اور صحت کا سوال وابستہ ہے۔ ہماری میونسپل کمیٹیاں اور لوکل بورڈ باوجود اس بات کے کہ ان کے اختیارات پر بے حد پابندیاں موجود ہیں۔ لوگوں کی جسمانی حالت میں کمی کو روکنے میں کافی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں اور قوم کی عام صحت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

میں نے اب تک قومی صحت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ اسے بہتر بنانے کے راستہ میں کون کون سی رکاوٹیں موجود ہیں۔ لیکن میں یہاں اس عام سردمہری پر افسوس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس کا اظہار جسمانی صحت کے نہایت اہم مسئلہ کی طرف کیا جارہا ہے۔ خوش حال لوگ بھی جن کے پاس وقت اور ذرائع موجود ہیں۔ اس میں دل چسپی نہیں لیتے۔ یہ سردمہری غالباً قوم کو غیر مسلح کرنے کے عمل اور فوجی راہ نمائی کے لیے اس کے اوصاف کو فوت کرنے کا ناگزیر نتیجہ تھی۔ لوگوں کو اپنے اہل وعیال اور گھروں کی حفاظت کے لیے دوسروں پر بھروسہ رکھنے پر مجبور کیا گیا۔ کسی پر آسرا رکھنے کی روح تمام قوم پر حاوی ہوگئی۔ پرانے اکھاڑے اور ورزش گاہیں معدوم ہوگئیں۔ ان کے ساتھ ہی قومی خودداری کی نچوڑ اور خود اعتمادی کی روح بھی فوت ہوگئی۔ جب کبھی یہ سوال سامنے لایا جاتا ہے کہ ہندستان کے لوگوں کو غیر مسلح کرکے خصی کرنے کے کام کو ختم کردیا جائے اور انھیں اپنے ملک کے دفاع کے لیے تیاری کا موقع دیا جائے، تو حکومت کمال اضطراب کا اظہار کرتی ہے۔ اس خوف کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں کہ لوگوں کے پاس ہتھیار ہونے سے امن وامان عام خطرہ میں پڑ جائے

گا۔ ہندستانی ریاستوں میں جہاں ہتھیار رکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ برطانوی ہند کی نسبت کم جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ ورزشی اکھاڑوں اور جسمانی کلچر کے مراکز کے قیام الغرض قومی صحت کے تمام سوال کا دارومدار روپیہ پر ہے۔ ذاتی کوششیں کتنی ہی منظم کیوں نہ ہوں، ضروریات وقت کو پورا نہیں کرسکتیں۔ اس کا تو صرف یہ طریقہ ہے کہ پبلک خزانہ سے ایک معقول رقم قومی تعمیر کے کاموں پر وقف کردی جائے۔ ہندستان کی سالانہ آمدنی کا ساٹھ فی صدی دفاع کے نام پر فوجی محکمہ ہضم کرجاتا ہے۔ لیکن حکومت کو معلوم ہونا چاہئے کہ جب لوگوں کو اس طرح جسمانی تنزل کا شکار ہونے پر چھوڑ دیا گیا ہے تو ملک کا دفاع نہیں ہوسکتا۔ ملک کے دفاع کا دارومدار نہ تو بڑی بڑی دفاعی دیواریں کھڑا کرنے اور بڑے بڑے قلعے تعمیر کرنے پر ہے اور نہ ہی بیش قیمت سامان جنگ کی فراہمی اور فوج کی ترکیب وترتیب پر ہے۔ روپیہ سے خندقیں تو تعمیر ہوسکتی ہیں۔ مگر ان میں لڑنے کے لیے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک کا صحیح دفاع مسئلہ مردانگی کے حل اور قوم کی عام صحت کو بہتر بنانے سے ہوسکتا ہے۔

اخیر میں میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ملک کو آگے بڑھنے کے آئندہ اقدام کی تیاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنی چاہئے۔ میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ہماری تمام انرجی اور تمام ذرائع صرف اس بات پر وقف ہوجانے چاہئیں کہ ہم اپنے اندرونی دشمن یعنی سیاسی وقوم ورانہ نفاق وتفریق کو ختم کریں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپیل کرتا ہوں کہ وہ کانگریس کے سمجھوتہ کو مان لیں اور اپنے اختلافات کو دور کردیں۔ یہ سمجھوتہ انصاف پر مبنی ہے۔ میں کانگریس کو بہت وسیع پیمانہ پر فوراً منظم کرنے پر زور دیتا ہوں اور تمام پارٹیوں کو اس قومی تنظیم میں شامل ہونے کی نہایت خلوص سے دعوت دیتا ہوں تا کہ وہ اسے مضبوط کریں اور اسے صحیح معنوں میں نمائندہ اور قومی جماعت بنائیں۔ میں ان لوگوں سے جو ابھی تک کونسلوں میں جانے پر اعتقاد

رکھتے ہیں یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں اور کانگریس پروگرام کی بنیادوں پر حزب المخالف کی مضبوط پارٹی بنائیں میں نہایت زور دار الفاظ میں کانگریس کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قانونی کمیشن سے بالکل پرے رہے۔ میں کانگریس کے اس فیصلہ کو دوبارہ دہراتا ہوں کہ ہندستانی اور برطانوی نمائندگان کی گول میز کانفرنس بلائی جائے۔ ان نمائندوں کو مکمل اختیارات حاصل ہوں۔ ہم برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ ہندستان کے مستقبل کو طے کرنے کے لیے صرف اس بنیاد پر تعاون کر سکتے ہیں۔ میں اس بات کی سفارش کرتا ہوں کہ ہندستان کے آئندہ آئین کو فی الفور تیار کیا جائے اور اسے منظور کرنے کے لیے قومی کنونشن کا انعقاد عمل میں لایا جائے۔ میں عوام الناس کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ ہمیں ہندستانی مسائل پر بین الاقوامی مسائل کی روشنی میں غور کرنا چاہیے۔ ایشیا کے لوگوں کے ساتھ تمدنی یگانگت پیدا کرنی چاہیے۔ اور دوستانہ تعلقات کو بڑھانا چاہیے۔ میں اپنے ہم وطن بھائیوں سے التجا کرتا ہوں کہ جب تک وہ بنگال کے نظر بندوں کو رہانہ کرالیں اور مستقبل میں ایسی بے آئینیوں کے راستے بند نہ کر دیں اس وقت تک اپنی کوششوں کو ملتوی نہ کریں۔ میں ملک کی توجہ اس کی خطرناک قومی صحت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور نہایت خلوص سے درخواست کرتا ہوں کہ ان اسباب کی روک تھام کے مناسب اقدامات اٹھائے جائیں جو اسے دن بدن گراوٹ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم ہندستان کو ان لائنوں پر ایک قوم میں ڈھال سکتے ہیں جو ایسے پختہ عزم اور مضبوط ارادہ کی مالک ہو کہ اپنے عظیم نصب العین کے راستہ میں بڑی سے بڑی رکاوٹ کو دور کر سکے اور دنیا کی اقوام میں اپنی مناسب جگہ حاصل کرنے کے قابل ہو۔

پنڈت موتی لال نہرو

کلکتہ ———— 1928ء

دوستو! میں آپ کا ازبس شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک بار پھر اس عظیم قومی اسمبلی کا صدر منتخب کرنے کا شرف بخشا ہے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی عزت ہے۔ مگر اس کے ساتھ ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ بھی وابستہ ہے۔ جسے اٹھانے میں شاید ہم میں دلیر سے دلیر بھی ہچکچاہٹ محسوس کرے۔ آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ میں نے اسے قبول کرنے میں کس قدر پس و پیش سے کام لیا۔ مگر جن گراں قدر نوازشات کے ساتھ آپ نے میری ذات میں اعتماد کا اظہار کیا۔ میں مجبور ہو گیا کہ آپ کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں اور پورے زور کے ساتھ اس بوجھ کو اٹھانے کی کوشش کروں جو اس فریضہ نے میرے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔ یعنی یہ کہ مجھکو اس عظیم قوم کی آزادی کی لڑائی میں راہ نمائی کرنی ہے۔ آپ کی ان نوازشات نے میرے دل میں آپ سے یہ توقع کرنے کا حوصلہ بھر دیا ہے کہ جس بھاری کام کو سرانجام دینے کا فریضہ آپ نے میرے سپرد کیا ہے۔ آپ اس میں میرے ساتھ پورے تعاون اور امداد سے کام لیں گے۔

آج سے دس سال پیشتر مجھے اس کانگریس کی صدارت کا فخر حاصل ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب مارشل لا اپنے مہیب نتائج اور الجھنوں کے ساتھ نافذ ہو کر ختم ہو چکا تھا اور ہم اپنے اجنبی حکمرانوں کے خلاف جنگ کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ وہ آزمائش کی گھڑی اس کے فوراً بعد رونما ہوئی۔ جنگ میں فتح اگرچہ ہمیں

نصیب نہ ہوئی مگر سرفرازی کا سہرا ہمارے سر رہا، اور ہمیں یہ وعدہ بھی نصیب ہوا کہ آئندہ جدوجہد میں کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ یہ بڑا دیو یعنی ہندستان لمحہ بھر کے لیے بیدار ہوگیا اور اس بیداری نے برطانوی راج کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس کا ردعمل بھی ہوا اور کچھ عرصہ کے لیے ہندستان پر غفلت کی نیند بھی طاری ہوگئی۔ لیکن آج پھر ہم غیر مبہم بیداری کے آثار نمایاں دیکھتے ہیں۔ اگر ہندستان بیدار ہوگیا تو اسے آگے بڑھنے سے کون روک سکتا ہے؟ عدم تعاون کی تحریک کے بعد ڈائر اور اڈوائر کے عہد کا دور دورہ شروع ہوا۔ آج پھر فضا ویسے ہی تباہ کن حالات سے مکدر ہے۔ ہم ایک بار پھر جنگ آزادی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

اس جدوجہد میں بدقسمتی سے ہمارے کئی وفادار ساتھی اور بہادر سپاہی ہمارے ساتھ نہیں۔ آج حکیم اجمل خاں اور لالہ لاجپت رائے ہم میں موجود نہیں۔ ان کی وفات نے ہندستان کو اس نازک مرحلہ پر اپنے بہادر اور آزمودہ کار سپوتوں سے محروم کردیا ہے۔ اس سال کے دوران میں کانگریس کے سابقہ صدر بھی انتقال فرما گئے ہیں۔ آپ لارڈ سنہا ہیں۔ اس دنیا سے رخصت ہونے والے کارکنوں میں منگل لال گاندھی، گوپابندھن داس اور گوپال کرشن کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں اس کانگریس کی طرف سے اپنے مرحوم ساتھیوں کے پس ماندگان کے ساتھ نہایت ادب سے اظہار تعزیت کرتا ہوں۔

اب میں ان مسائل پر اپنی رائے اور خیالات کا اظہار کرنا شروع کرتا ہوں جو آج ہمیں درپیش ہیں۔ سب سے پہلے میں اپنے سیدھے سادھے دوٹوک بیان کے لیے آپ کے ذہن تیار کرلینا چاہتا ہوں۔ مجھ ایسے سیدھے سادھے اور دوٹوک انسان سے آپ کو کسی اور بیان کی توقع نہ کرنی چاہیے۔ میں آپ کو پہلے ہی متنبہ کردوں کہ اگر آپ مجھ سے خوبصورت الفاظ اور محاورات سے مزین بہت بلند پایہ تخیل کی امیدیں

وابستہ کیے بیٹھے ہیں تو آپ کو مایوس ہونا پڑے گا۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ وسیع معنوں میں مجھے تصور پرستی سے نفرت ہے۔ اگر آپ کسی تصور کے مطابق زندگی بسر کرنے کی سعی عمل میں لائیں تو ایسی تصور پرستی معیوب نہیں۔مگر ایسی تصور پرستی کی سیاسیات میں کوئی جگہ نہیں کہ جسے حقائق زندگی سے کوئی دور کا لگاؤ نہ ہو۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کا تار بدیر وزود بیدار ہونے پر ٹوٹ کر رہے گا۔تخیل کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اسے حاصل کرنے کے لیے حقیقی کام کی بنیادیں عملی نکتہ نظر سے قائم کرنی چاہئیں۔ مجھے یقین ہے ہم کب ایسے تخیل کو مانتے ہیں۔ اگرچہ ہم اسے مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ نیز مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم اسے حاصل کرنے کے واحد ذریعہ پر بھی متفق ہیں۔مگر بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے فروعی اختلافات کو اس قدر بڑھالیا ہے کہ ہمیں پگڑی اور عمامہ میں ضرور فرق معلوم ہوتا ہے ۔ یہ اختلافات ہماری ناکامیوں کا اصل باعث ہیں۔اور اس متضاد نکتہ نظر کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے متحدہ اقدام کو ناممکن بنادیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں اس جھگڑے کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم صورت حالات کے ایک پہلو پر بہت زیادہ اور دوسرے پر بہت کم زور دے جاتے ہیں۔ مثلاً ہم میں ایک نکتہ نگاہ کے لوگ ہماری کمزوریوں کو اس قدر زیادہ مبالغہ دے جاتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کی خوشی اور نوازشات کے بغیر کچھ حاصل کرنے میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں کہ جو ہمیں لوٹتے اور ہم پر ظلم و جبر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ ہیں کہ جو ہماری کمزوریوں یا مخالف طاقت کی مضبوطی کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے، اور پورے زور کے ساتھ اندھا دھند ہلا بول دینے پر زور دیتے ہیں۔ میری یہ حقیر کوشش ہوگی کہ میں بلا تعصب آپ کے سامنے صورت حالات کے ٹھوس پہلو رکھ دوں اور پھر بتاؤں کہ آپ کی منظوری کے لیے میں کون سے لائحہ عمل کو بہتر سمجھتا ہوں۔

میں اس رائے کا مالک ہوں کہ اپنے ملک کو رہنے کے قابل بنانا ہر انسان کا فرض ہے۔ لیکن اس بات کا دارومدار کہ ایسا کرنے کے لیے کونسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے، ایسے حالات پر ہے جو ہر ملک میں ہر وقت ایک ایسے نہیں ہوتے۔ نظری طور پر بنیادی باتیں سب کی ایک سی ہوتی ہیں۔ لیکن ٹھوس واقعات اپنی ہی مخصوص گتھیاں پیش کرتے ہیں۔ جنھیں سلجھانے کے لیے کسی خاص اصول یا مثال سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

پھر عرض کرتا ہوں۔ دو آدمی ہیں جو دنیا میں ایک ہی نکتہ سے چلتے ہیں اور ایک ہی لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان دونوں کو وقت بے وقت بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے لائحہ عمل میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ ہم دوسروں کی ناکامیوں سے ہمیشہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن ان کامیابیوں سے یہ نفع حاصل کرنا کبھی ممکن نہیں۔ وجہ بالکل صاف ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو انھیں حالات میں گھرا ہوا پائیں۔ جن کے ماتحت دوسروں نے غلطیوں کا ارتکاب کیا تو ہم ان سے بہ آسانی پہلو بچا سکتے ہیں۔ لیکن ان مخصوص حقائق کو اگر وہ ہمارے ملک میں موجود نہ ہوں، پیدا کرنا ممکن نہیں جن کے طفیل دوسرے ممالک نے کامیابیاں حاصل کیں۔ ہمارے سامنے عملی مسئلہ یہ ہے کہ جن حالات میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں اور جو مصالح ہمیں میسر ہیں۔ ہم کس طرح کم سے کم قیمت پر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں؟ دوسرے ممالک کی جھوٹی مثالیں حقیقی مسائل میں الجھاؤ پیدا کرنے کی خدمت ہی سرانجام دے سکتی ہیں۔ اپنے سامنے کام کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ہمیں حسب ذیل سوالات کا جواب دینا ہے۔

1- ہم کہاں کھڑے ہیں؟

2- ہمارا نصب العین کیا ہے؟

3- ہم اپنے نصب العین کو کیوں کر حاصل کر سکتے ہیں؟

میں کلامیاتی نقطۂ نگاہ کی نسبت عملی نقطۂ نظر سے اپنی بہتر سے بہتر قابلیت سے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کر لینا چاہئے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ تاکہ آگے چل کر ہم اپنی سدھ گم نہ کر بیٹھیں۔ اس نکتہ کے دو پہلو ہیں۔ اوّلاً اپنے اور ثانیاً حکومت سے متعلق۔ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جو بھی سیاسی حقوق ہمیں حاصل ہیں ان کی نوعیت ایک مشروط تحفہ کی ہے۔ جس کا دارومدار ہمارے حکمرانوں کی خوشنودی پر ہے۔ وہ ہمیں اس سے محروم کر سکتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں ہزاروں کو فی الواقع گاہے بگاہے ان حقوق سے محروم کر چکے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں وسیع مطلق العنان طاقت محفوظ ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ ہر وقت کسی خاص سبب کی بنا پر یا بلاوجہ اس طاقت کا استعمال کر لیتے ہیں۔ میں اس آئے روز دہرائی جارہی کہانی کے بیان سے اس خطبہ کو بوجھل نہیں بنانا چاہتا۔ یہ ایک معروف امر ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت نے اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں لیجسلیٹو، ایگزیکٹیو اور انتظامی کارروائیوں سے اپنی طاقت کو مضبوط اور پختہ بنایا ہے۔ اس سے کوئی مفید مطلب حاصل نہیں ہوگا کہ میں ان متشددانہ اقدامات کی طویل داستان چھیڑ بیٹھوں۔ جو برطانوی راج کے قیام سے لے کر آج تک اٹھائے گئے۔ یا یہ بتانے بیٹھ جاؤں کہ ہمیں مکمل طور پر بے بس کر دینے کے بعد ہمارے از سرِ نو زندہ ہونے کے امکانات بالکل معدوم کر دیئے گئے۔ میں خود بینی اور غیر محتاجی کے ان تمام ذرائع سے محروم کر دیا گیا جن کے لیے دیش بندھو چیتر جی داس اپنی زندگی کے آخری دنوں میں نہایت تن دہی سے برسرِ پیکار ہوئے۔ ہم پر نہایت ہوشیاری سے اپنے ملک کے داخلی اور خارجی معاملات میں پر اثر حصہ لینے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

ذمہ دار حکومت کے ان مخلصانہ وعدوں نے اس عظیم فریب کی شکل میں تکمیل کا

جامہ پہنا ہے۔ جسے قانونی کمیشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو ہماری گلیوں میں اپنے پیچھے لہو میں لت پت سروں کے ڈھیر اور شکستہ ہڈیوں کے انبار چھوڑتے ہوئے بے دھڑک آگے بڑھے جا رہا ہے۔ اس کمیشن کی ترقی کی نسبت کسی اور چیز نے اس بات کو زیادہ آشکارا نہیں کیا کہ افسران کتنے بے درد اور لوگ خود اپنی حفاظت کرنے میں کتنے بے بس ہیں۔ میرے خیال میں آج پھر آثار وہیں نظر آتے ہیں۔ سماج کا تمام جسم اس متعدی وبا سے اثر قبول کرتا معلوم ہوتا ہے اور حکومت کے ارباب حل وعقد کی نااہلیت مسلمہ اور معروف ہے۔ اس کے اقتصادی عمل ودخل سے ڈائزم کے متعدی زہر کی موجودگی کا پتہ معلوم ہوتا ہے۔ لاہور اور لکھنؤ کے حادثات تو جسم پر پھوڑے ہیں۔ جن کی تہ میں گہری بیماری کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ ہم کلکتہ کے ایک انگریزی نامہ نگار کی حماقت کے ممنون ہیں کہ اس نے اس وفد کے ممبران کی حقیقی ذہنیت کو قدرے آشکارا تو کر دیا۔ اس سے اس بات کا پتہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی ذہنیت کس طرح کام کرتی ہے۔ نامہ نگار رقم طراز ہے۔

> ’’شور وشر سے پیدا ہونے والے تاثرات کو کانپور کے حادثات نے اوج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ وفد کے چند اراکین اپنی ناراضی کو مخفی نہیں رکھ رہے کہ ایسے واقعات کی اجازت دی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وفد کے ارکان کو اگر اس ہفتہ رپورٹ دینی پڑی تو ترقی کے اقدام کے لیے سخت گیرانہ حکومت کے بیس سالوں کی بجائے وہ کسی اور چیز کی سفارش کریں۔ لارڈ سالبری کا معاملہ اور ہے۔‘‘

چنانچہ ہندستان کے لیے ذمہ دار حکومت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وفد کے ان بڑے بڑے اراکین کی چاپلوسی یا یہ ہے کہ ان کے اعتماد پر ان کے جھوٹے اعلانوں

کے ساتھ خوشامد کی جائے اور سخت گیرانہ حکومت کے بیس سالوں کی سفارش کرنے کا مطلب وفد کے متعلق تمہارے حقیقی جذبات کا اظہار ہے۔ میرا یہ مطلب ہے کہ ہندستان ذلت کے عوض ذمہ دار حکومت خریدنے سے انکار کردے گا، اور سخت گیرانہ حکومت کو خوش آمدید کہے گا۔ لیکن اس بات کا دارومدار مستقبل پر ہے کہ یہ بیس سال قائم رہے گی۔ شر کے اس پیغمبر نے مستقبل کا مقابلہ کرنے کی بھی جرأت کی ہے۔

ایسا معلوم دیتا ہے کہ میں نے مہیب اور کڑی حقیقتوں کا صحیح اندازہ لگایا ہے اور آگے بڑھ رہے لوگوں کے بھاری قدموں کی رپ رپ کو ٹھیک طور پر سنا ہے۔

یہ ریمارکس اس عظیم بائیکاٹ کے مظاہرہ پر کسے گئے جن سے کانپور میں وفد کی آمد پر ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب یہ نامہ نگار اپنے پرجوش تاثرات کی رپورٹ بھیج رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کانپور مظاہرہ کے منتظمین کے نام ایک خط بھیجنے میں مصروف تھا جس میں ان کا شکریہ ادا کیا گیا تھا، اور کسی ناگوار واقع کے رونما نہ ہونے پر انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ خط اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اب ایڈیٹر صاحب کے متعلق عرض ہے کہ انھوں نے اپنی بڑی حیثیت کے مطابق نامہ نگار کو بھی مات کر دیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے نہایت درشت اور کڑے حملے کیے ہیں۔ اس نے اپنے مضمون میں دھمکی دی ہے کہ ہندستان کے مطالبہ آزادی کا بارود کے آخری ذرہ کے ساتھ مقابلہ کیا جائے گا۔ میرا یقین ہے کہ اگر ایڈیٹر اور نامہ نگار تھوڑی بہت سمجھ بوجھ کے مالک بھی ہوتے تو انھوں نے سرکاری رازوں کو یوں افشا نہ کیا ہوتا۔ لیکن ہمیں ان کی بروقت تنبیہ کے لیے شکر گزار ہونا چاہیے۔ اور انھیں یقین دلانا چاہیے کہ ہم تیار ہیں۔ اس وقت صورت حالات میں گرمی پیدا کرنے کے لیے سخت گیرانہ حکومت کی نسبت اور کوئی چیز مفید ثابت بھی نہیں ہو سکتی۔

ہمارے انگریز دوست ان مظاہروں پر حیران نظر آتے ہیں۔ میں نے ان بیہودہ بیانوں کو جن کا وہ مظاہرہ کررہے ہیں، نظرانداز کردیا ہوتا۔ اگر وائسرائے صاحب نے پبلک طور پر اسی مقام پر حال ہی میں اس موضوع پر ایک بیان نہ دیا ہوتا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا جواب دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناخوش گوار واقعات پر چاہے جس قدر اظہار افسوس کیا جائے ۔لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ لوگوں کو اپنے شدید جذبات کے اظہار کے لیے مظاہرہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہندستان میں وفد کی آمد کے بعد کیے گئے مظاہروں کو غیر مہذبانہ اور متشددانہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف یہ مظاہرے کیے گئے ان کے لیے قدرتی طور پر ان کی نوعیت متشددانہ ہوگی، اور ایک مخالف ہجوم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ آداب محفل پر پورا اترے گا، بالکل غیر معقول بات ہے۔ وائسرائے نے پرانی فرسودہ باتوں کا پھر ذکر کیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے۔

> ''جولوگ ان مظاہروں کو منظم کرتے ہیں۔ وہ بذات خود تشدد کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں، وقت پر ان طاقتوں کو قابو میں رکھنے کے ناقابل ثابت ہوتے ہیں جن کو انھوں نے خود مشتعل کیا ہوتا ہے۔''

دوسری بات یہ ہے:

> ''جولوگ دانستہ طور پر اس راستہ پر گامزن ہوتے ہیں کہ جو اس قدر خطرناک اور اس درجہ بیہودہ ہے۔ وہ چاہے کسی مقصد کی بھی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ اپنے کندھوں پر ذمہ داری کا بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں۔''

دھمکی یہ ہے:

''حکومت کا یہ واضح فرض ہے کہ وہ ان شرم ناک واقعات کا
سد باب کرنے کے لیے جو ذرائع مناسب سمجھے اختیار میں
لائے۔''

مجھے ہز ایکسیلینسی کی پہلی بات سے اتفاق ہے، اور دوسری پر بھی اتفاق کرنے کو تیار ہوں۔ اگر آپ ''نامہذبانہ'' اور ''بیہودہ'' کے الفاظ کی جگہ قدرتی کا لفظ رکھ لیں۔ لیکن ان دونوں باتوں کا اصل حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک دھمکی کا تعلق ہے اس کے متعلق ایک ہفتہ پیشتر ہی انگریزی اخبار نے پیش گوئی کر دی تھی۔ اس نے سخت گیرانہ حکومت کو جلد تکمیل کا سہرا نصیب ہونے کا قبل ہی اشارہ کر دیا تھا۔ جہاں تک مؤخرالذکر کا تعلق ہے میں پیش تر ازیں ہی اس پر اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں اور اس کے متعلق مجھے کچھ اور نہیں کہنا ہے۔ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ ذمہ دار ہندستانی راہ نماؤں کے پبلک بیانوں سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ جس کی کوئی سرکاری تحقیقات تردید نہیں کر سکتی کہ ان مظاہروں پر کیے گئے تشدد کا آغاز ہمیشہ پولیس کی طرف سے ہوا اور ایک آدھ مقام پر لوگوں کی طرف سے بدلہ لینے کی کوششوں کو ان کے راہ نماؤں نے فوراً روک دیا۔ لیکن اگر کسی بھولے بھٹکے ہاتھ نے کسی ایسی موٹر کار پر کنکر پھینک دیا جس میں ایک عدد انگریز خاتون بھی تشریف فرما تھیں۔ یا ہجوم میں سے کوئی آدمی وفد کے بڑے رکن کے اس قدر قریب آ گیا اور اس نے ان کے نہایت قابل احترام رکن کے پاس سیاہ جھنڈا لہرا دیا تو یہ ایسا معاملہ نہیں ہے جس پر اس قدر ہنگامہ آرائی کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں حالات کے ماتحت انگلستان میں اس سے بدتر واقعات رونما ہوئے۔ میں ان لوگوں سے یہ چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں جنھوں نے لاہور، کانپور اور لکھنؤ کے واقعات پر بے جا ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ وہ سوالات حسب ذیل ہیں:

1- کیا کسی یورپی ملک اور بالخصوص انگلستان میں یہ ممکن ہوگا کہ کوئی تحقیقاتی کمیشن جسے اس ملک کے لوگ قومی تحقیر سمجھتے ہوں۔ سر جان سائمن اور اس کے ساتھیوں کی طرح آرام وحفاظت سے سفر کر سکے؟

2- کیا وہ تمام ملک کے جھنڈے اور سنہری گل کاری سے مزین جھنڈیاں جیسی کہ بٹلر پارک میں لہرائی گئیں، توڑ مروڑ کر نہ رکھ دی جائیں گی اور رنگ برنگی قمقمے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیے جائیں گے اگر انگلستان میں اس بات کی کوشش کی جائے کہ پبلک طور پر اس وفد کے افراد کو دعوت دی جائے۔ جن کا مشن انگریزوں میں ایسا ہی نامقبول ہو جیسا کہ ہندستان میں سر جان سائمن اور آپ کے ساتھیوں کا؟

3- ایک انگریز کیا محسوس کرے گا اگر اسے محض اپنے مکان پر سے پر امن مظاہرہ کرنے کی سرزنش میں گرفتار کر کے ایک دن قید رکھ دیا جائے۔ اس کے مکان پر حملہ کیا جائے اور اس کے مہمانوں کو خوب زدوکوب کیا گیا ہو؟

4- ایک انگریز کیا محسوس کرے گا۔ اگر اسے برقرار حکومت کے خلاف رائے رکھنے کے جرم میں اس کے مکان میں خواہ تھوڑے ہی عرصہ کے لیے قید کر دیا جائے؟

5- انگلستان میں کوئی ایسی حکومت کتنا عرصہ برقرار رہ سکتی ہے۔ جو حکومت 3 اور 4 شق کی مذکورہ باتوں کی اجازت دیتی ہو؟

ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اودھ کے مشہور قوم پرست نواب مہاراجہ آف محمود آباد کے مکان کے گرد پولیس نے حلقہ باندھ لیا۔ جب کہ آپ کے ہمسایہ پارک میں آپ کے رجعت پسند بھائی بند کمیشن کے ممبران کی دعوت میں مصروف تھے۔ یہ امر معروف ہے کہ مہاراجہ صاحب بڑی جرأت سے کمیشن کے بائیکاٹ کے حق میں تھے اور آپ نے کسی ایسی تقریب میں شامل ہونے سے بالکل انکار کر دیا تھا جو وفد کے اعزاز میں دی جارہی ہو۔ ایک عام شہری کی آزادی کہاں ہے جب کہ اودھ کے سب

سے بڑے نواب یو پی سرکار کے سابق ہوم ممبر جس مرتبہ کے ساتھ بڑے سے بڑے اعزازات وابستہ ہیں کو اس کے گھر میں قید کیا جاسکتا ہے۔ محض اس بنا پر کہ اس کی رائے ایسی ہے جو برقرار حکومت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں۔ کیا یہ اس سخت گیرانہ حکومت سے کوئی مختلف چیز ہے جس کے انگریزی اخبارات اور وائسرائے اشارے کر رہے ہیں۔ اس دور کا فی الواقع آغاز ہو چکا ہے۔

حال ہی میں لاہور میں ایک پولیس افسر کے قتل نے ان لوگوں کے لیے بہانے بہم پہنچادیے ہیں جن کے ذہن ہندستان میں قومی طاقتوں کو فنا کرنے کے لیے نئے ہتھیار استعمال کرنے پر غور وخوض کر رہے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جرم ایک افسوس ناک امر ہے۔ تمام کانگریسی خواہ ان کا تعلق مکمل آزادی کے حامیین سے ہو یا درجۂ نو آبادیات سے اس بات پر قائم ہیں اور ہمیشہ قائم رہے ہیں کہ وہ مکمل طور پر عدم تشدد پر کار بند ہیں۔ اور انھوں نے کئی مواقع پر جن میں لاہور، لکھنؤ، کانپور اور پٹنہ کے واقعات بھی شامل ہیں، اس اصول پر سختی سے کار بند رہنے کے عملی ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔ اس وقت یہ کہنا ممکن نہیں کہ لاہور کا قتل سیاسی نوعیت کا ہے۔ لیکن اگر یہ تصور کرلیا جائے کہ اس کی نوعیت ایسی ہی ہے تو ہم اس حقیقت سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے کہ ایسے واقعات کی صحیح ذمہ داری حکومت کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اس طرح کے واقعات ان حالات کا نتیجہ ہیں جن پر بنیادی طور پر سرکاری پالیسی میں تبدیلی لانے سے ہی قابو پایا جاسکتا ہے۔ جبر وتشدد کے ہتھیاروں سے جو اپنا مقصد خود فوت کر دیتے ہیں اور جن کا لوگوں کی طرف سے حتی الوسع مقابلہ کیا جاتا ہے اسے بس میں نہیں لایا جاسکتا۔ لیکن نوکر شاہی حکومتیں تواریخ کے اسباق سے فائدہ نہیں اٹھایا کرتیں۔ پنجاب میں ابھی تشدد کے دور کا آغاز ہو چکا ہے اور عنقریب ہی اس کے دوسرے صوبوں میں پھیلنے کے

امکانات موجود ہیں۔

آپ مجھے کمیشن پر اتنا وقت لینے پر معاف فرمائیں۔ بہتر ہوتا کہ اس کا سرے سے ذکر ہی نہ کیا جاتا۔ مگر جس کام کا ہم آغاز کرنے والے ہیں اس کا اس سے بالواسطہ تعلق ہے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ میں اس کا ذکر کرتا۔ یہ برائی کی نشانی ہے۔ لیکن اس نیکی سے خالی نہیں جو ہر برائی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نے ہمیں اپنے آدمیوں اور بالخصوص طلبا کی دلیرانہ روح سے شناسا کر دیا ہے اور دکھا دیا ہے کہ وہ زبردست سے زبردست اشتعال کے باوجود کس طرح ضبط وتحمل سے کام لے سکتے ہیں اور لاٹھی چارج کے زبردست حملوں میں اپنے خالی ہاتھ سینوں پر باندھ کر کس طرح کھڑے رہ سکتے ہیں۔ اور کس طرح خود زخم اور چوٹیں کھا کر اپنے راہ نماؤں اور ساتھیوں کو بچا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو اسے بزدلی سمجھتے ہیں اپنی سخت گیرانہ حکومت سے انھیں آزما کر دیکھ لیں۔ انھیں ان نہتے آدمیوں پر گولیاں چلا کر تسکین ہو جائے گی۔ جو اپنی پشتیں دیواروں کے ساتھ لگائے اور سینے گولیاں کھانے کے لیے ننگے کیے ہوئے تیار کھڑے ہیں۔

آؤ اب ہم اقتصادی دنیا کا رخ کریں۔ اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے جس کی آماج گاہ ہندستان کو ایک عرصہ سے بنایا جا رہا ہے اور قانونوں اور دیگر ذرائع سے انگلستان نے اقتصادی طور پر ہندستان کو جس طرح جکڑ رکھا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہندستان پر انگریزی راج کے تمام عہد پر تبصرہ کیا جائے۔ میں یہاں آپ کی خدمت میں صرف ان حقائق کو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ جن کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے سروں پر دنیا بھر سے مہنگی حکومت قائم کرنے کے علاوہ ہمارے لیے ہمارے ٹرسٹیوں کی ہمدردی کا رخ ہندستان میں انگلستان کے صنعت کاروں کے لیے منڈیاں قائم کرنے کی طرف رہا ہے۔ یہ بلند پایہ مقصد کئی

بالواسطہ اور بلا واسطہ طریقوں سے تکمیل تک پہنچایا گیا۔ یہ طریقے اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا اس خطبہ میں مناسب طور پر کھپانا ممکن نہیں۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ جس کا آغاز ڈھاکہ کے کاریگروں پر بے پناہ ستم رانیوں سے ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ حتیٰ کہ ہم اقتصادی ذرائع کے نازک اور پیچیدہ عمل تک آ پہنچتے ہیں۔ یہ عمل ان بڑے بڑے بنکوں، تجارتی اور صنعتی اداروں کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ جو بڑی کامیابی سے ہمارے دیسی کاروباروں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ اہم اقتصادی غلبہ جو حکومت نے قانون سازی یا دیگر ذرائع سے ہندستان پر قائم کر رکھا ہے۔ کرنسی پر قبضہ ہے۔ اس ٹیکنیکل مسئلہ کی تفصیلات میں جانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ دیسی تجارت اور صنعت میں انحطاط اور کاشتکار کی قوت خرید میں کمی کا سبب حکومت کا وہ قانون ہے جس کے ذریعہ روپیہ کی قیمت ایک شلنگ چار پنس سے بڑھا کر ایک شلنگ چھ پنس کر دی گئی ہے اس سے ٹیکسوں کے نیچے دبے ہوئے کاشت کار پر اور بوجھ آن پڑا ہے۔ اب اسے خود پیدا کردہ خام اشیاء پر 12-1/2 فی صدی کا خسارا اٹھانا پڑے گا اور ان لوگوں کی جیب میں 12-1/2 فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا جو ہندستان میں مال بھیجتے ہیں۔ اگر حکومت کو ذرا بھر بھی لوگوں کا مفاد عزیز ہوتا تو اسے 12-1/2 فی صدی کے حساب سے مالیہ میں کمی کر دینا چاہئے تھی۔ اور اس مال پر جو اس ملک میں تیار کیا جا سکتا ہے جس میں کپڑا وغیرہ بھی شامل ہے 12-1/2 فی صدی ٹیکس و برآمد عائد کر دینا چاہئے تھا۔

بنگال چیمبر آف کامرس کے سر جارج گاڈفرے کا ہی کمال ہے کہ آپ نے پہلی دفعہ یہ دریافت کیا ہے کہ انگریزوں کے ہندستان میں آنے سے پیشتر ہندستانی تجارت اور کامرس کے مستند ریکارڈ خیالی قصوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ چیمبر

آف کامرس کے سابقہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے ہر ہندستانی چیز پر حملہ کیا اور انگریزوں کی اقتصادی لوٹ کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے حقائق کو خیالی قصوں کا نام دیا۔ آپ نے فرمایا:

> ''اگر لنکا شائر پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ہندستان کو تباہ کیا تو اس پر انگریزی دیہاتی دنیا کی تباہی کا الزام بھی صادق اترتا ہے۔''

موازنہ قابل داد ہے۔ میرے خیال میں سر جارج گاڈفرے کے قبضہ میں ایسی تاریخ ہے جس سے باقی دنیا واقف نہیں۔ کیوں کہ دنیا تو یہ کہتی ہے کہ انگریزی دیہات کے جلاہوں پر ایسے ظلم ڈھائے گئے اور ان پر ایسے جرمانے لگائے گئے جن کا مشاہدہ یورپی گواہوں نے ہندستان میں ان مظالم اور جرمانوں کی شکل میں کیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستانی جلاہوں پر کیے تھے۔ یعنی یہ کہ انگریزی دیہاتی آبادی کو گھر کے بنے اور کاتے ہوئے کپڑے کی بجائے لنکا شائر کا کپڑا استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا۔ نیز یہ کہ لنکا شائر کے کپڑوں پر ''سوتی کپڑا ٹیکس'' کے نام سے ایک ٹیکس لگا دیا گیا جب کہ بیرونی اشیاء بلا محصول ملک میں درآمد ہوتی تھیں۔

ہندستانی جہاز رانی کے متعلق بھی آپ نے اسی افسانوی اشتیاق کا اظہار کیا ہے جیسا کہ سوتی مال کے متعلق پہلے کر چکے ہیں۔ حقائق کا مطالعہ کرنے کے لیے میں مسٹر موصوف اور آپ کی توجہ اس بے ضرر بل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جو مسٹر حاجی نے شائع کیا ہے۔ انگریزی مفاد پر ہندستانی جہاز رانی کو اسی طرح قربان کر دیا گیا جس طرح کہ ہندستان کی بڑی بھاری گھریلو صنعتوں کو اس وقت جب کہ وہ بل آئین ساز مجلس کے سامنے ہے۔ جسے آج سے بہت عرصہ قبل نافذ ہو جانا چاہیے تھا۔ اور جس کا مدعا ان ناانصافیوں کو ختم کر دینا ہے جن کا ایک طویل عرصہ سے ہندستانی

صنعت جہاز رانی شکار ہو رہی ہے۔ تو انگریزی اجارہ دار ہمیں اس بات کے موردالزام ٹھہرا رہے ہیں کہ ہم نسلی امتیازات سے کام لینا چاہتے ہیں۔ اب وہ شور مچا رہے ہیں کہ آئین ساز اسمبلی کو یہ بل پاس کرنے کے اختیارات حاصل نہیں ہونا چاہئیں۔

اس انگریزی تاجر کی تاریخ کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے تسکین نہیں ہوئی۔ آپ نے اپنی پوزیشن سے گر کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ آئین کا مسودہ تیار کرنے والے لوگوں کے سامنے انگریزوں کو حق شہریت سے محروم کر دینے کا سوال ہے۔ آپ کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ ذمہ دار افراد کے خلاف اتنا بڑا الزام لگانے سے قبل حقائق کی جانچ پڑتال کر لیتے۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ جوں ہی کمیٹی کو معلوم ہوا کہ شک وشبہ کے امکانات موجود ہیں۔ انھوں نے اسے اپنی اس ضمنی رپورٹ میں منسوخ کر دیا۔ جو سر گاڈفری کی پرجوش تقریر سے پہلے ہی ملک کے سامنے تھی۔

اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں دائمی غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے نئی زنجیریں تیار کر لی گئی ہیں۔ یہ زنجیریں ہی ہمارے مادی ذرائع کو ایک طویل عمل سے نہایت بے دردی کے ساتھ لوٹ رہی ہیں۔ ایک طرف جب کہ اس تمام لوٹ کھسوٹ کی ذمہ داری بڑی حد تک حکومت پر عائد ہوتی ہے،، ہم اپنے آپ کو بھی ذمہ داری سے مستثنٰی نہیں قرار دے سکتے۔ کسی قوم کی طاقت یا کمزوری کا دارومدار روابط پر ہوتا ہے جو اس کے متعدد عناصر کو ایک لڑی میں پروئے ہوتے ہیں۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ یہ رشتہ صدیوں سے کچلا چلا آ رہا ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ اس کی وہ طاقت بھی فوت ہوتی جا رہی ہے جو اس سے پیشتر اس میں موجود تھی۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہم کئی چھوٹی بڑی اقوام میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ اقوام بہ ذات خود تنظیم سے عاری اور اخلاقی گراوٹ کی شکار

ہیں۔ بلاشبہ حکومت موجودہ غربت اور جہالت کی ذمہ دار ہے اور کافی حد تک متعدد طبقوں میں منافرت اس کی خود پیدا کردہ ہے۔ لیکن ہم اسے اپنے اس مجلسی نظام میں موجود خرابیوں کے مجرم نہیں قرار دے سکتے۔ جس نے ہمارے لاکھوں بھائیوں کو جو ہم سے کسی طرح کم نہیں، اچھوت اور نیچی جماعتوں کے زمرہ میں گرا کر رکھ دیا ہے۔ اور جس نے ہماری عورتوں کو کئی پابندیوں کے نیچے دبا رکھا ہے۔ ان پابندیوں نے نہ صرف انھیں کئی قدرتی فرائض کی ادائیگی سے محروم کر دیا ہے بلکہ انھیں قومی خدمت سرانجام دینے کے بھی ناقابل بنا دیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم حکومت پر ہی ان فرقہ پرستانہ اختلافات کی ذمہ داری نہیں ڈال سکتے جنھوں نے ہمارے اپنے وقت کی تاریخ میں سیاہ باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

آل پارٹیز کانفرنس نے اپنی رپورٹ میں فرقہ پرستانہ مسئلہ پر کھول کر بحث کی ہے۔ اس نے ایک حل سوچا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس حل کو کانگریس قبول کر لے گی۔ سوال صرف یہ نہیں کہ ہم کیوں کر فرقہ پرستانہ جھگڑوں کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے اس کا وسیع اور بنیادی پہلو ہے۔ وہ یہ ہے کہ مذہب اپنی آج کی شکل میں ہماری پبلک زندگی میں کون سی جگہ حاصل کرے گا؟

مذہب کا تصور کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ اس نے ہمارے آئے روز کی زندگی میں تعصب، ناروا داری، تنگ نظری، خود غرضی اور دیگر ان اوصاف کے نفی کی جگہ حاصل کر لی ہے جو صحت مند سماج کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فیضان ہر اس فرد سے نفرت ہے جو اس کا پیروکار نہیں۔ اس کے مقدس نام پر مسلمہ طور پر برے سے برے مقصد کی نسبت زیادہ جرم کیے گئے ہیں۔ کیا کوئی باہوش انسان ہندوؤں اور مسلمانوں اور مختلف فرقوں میں نہایت معمولی اور بیہودہ اختلافات پر حیرت کا اظہار نہ کرے گا ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے انھیں کیا حاصل ہوتا ہے؟

ہر قسم کی تعلیم اور ترقی کا مقصد انسان کی خلقی طاقتوں کونشو ونما دینا ہے یعنی اسے اس بات کی تعلیم دینا کہ اپنے ہمسایہ کے ساتھ اسے کیا سلوک کرنا چاہئے اور یہ کہ اسے اس کا احساس دلانا کہ اس کی ذاتی بہبودی کا دارومدار سماج کی مجموعی ترقی پر ہے۔ صرف اسی طریقہ سے انسان کے انفرادی اور خودغرضانہ خلقی جذبات کو دبایا جاسکتا ہے اور صرف اسی طریقہ سے نوع انسان کی انرجی کو باہمی مقابلہ کی جگہ مشترکہ انسانی بھلائی کے لیے صرف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مذہب آج کی شکل میں سب سے بڑی تفریقی طاقت ہے۔ یہ انسان کے درمیان مصنوعی دیواریں کھڑی کرتا ہے اور صحت مند مشترکہ قومی سماج کی نشوونما کو روکتا ہے۔ اس نے مجلسی امورات میں ہی اپنا رجعت پسندانہ اثر پیدا کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اقتصادیات اور سیاسیات کے میدان میں بھی پاؤں پھیلانے شروع کر دیے ہیں اور ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر اثر ڈالنا شروع کیا ہے۔ اس نے سیاسیات میں اپنی ٹانگ اڑا کر سیاسیات کی اور خود اپنی کوئی خدمت نہیں کی۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے بالکل جدا کر دیا جائے۔

یہیں پر موقوف نہیں۔ ابتدائی مرحلہ سے ہی ایک نہایت مہلک مظہر ہماری سیاسی سرگرمیوں کا پیچھا کر رہا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ شدید اختلافات رکھنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ جنھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ اپنے ملک کو آزاد کرانے کا فرض اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور جنھوں نے اپنی بہترین قابلیت کے مطابق اس فریضہ کو سرانجام دینے میں کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ان اختلافات نے ہماری ترقی کو روک دیا ہے اور تفریقی طاقتوں کے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ رہنماؤں میں شدید اختلافات چلے آرہے ہیں۔ برقی رفتار کے ساتھ انھوں نے ان اختلافات کو لوگوں تک پہنچا دیا ہے اور جب کبھی کوئی ترقی کا اقدام اٹھانے کی تجویز سامنے آئی یہ

اختلافات بیچ میں آن کھڑے ہوئے۔ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم سابقہ واقعات سے سبق حاصل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے رحم قسمت جو بیس سالوں سے ہمارا پیچھا کر رہی ہے آپ نے اسے اور قریب آنے دیا تو یہ مکمل آزادی اور درجہ نو آبادیات دونوں کو ہڑپ کر جائے گی۔

اوپر کے مختصر سے خاکہ سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم آج گھناؤنے جنگل کے عین بیچ کھڑے ہیں۔ ہماری راہ میں دو مشکلات حائل ہیں اوّلاً وہ جو اجنبی راج نے ہماری راہ میں پیدا کی ہیں۔ اور ثانیاً ہماری خود پیدا کردہ ہیں۔ بیرونی راج کی پیدا کردہ مشکلات کے لیے متحدہ محاذ کی ضرورت ہے۔ اس وقت جب کہ اجنبی طاقتیں غلبہ قائم کیے ہوئے ہیں، متحدہ محاذ قائم کر لینا کوئی آسان بات نہیں۔

دو قسم کی مجبوریوں نے ہمارے گرد حلقہ باندھ رکھا ہے اور ہم اس کے درمیان کھڑے ہیں۔ ہم جب ایک سے پلہ چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو دوسری قدم روک لیتی ہے۔ ہمیں اس استدلال دوری سے باہر نکلنا ہے۔

یہ ہے میرے پہلے سوال کا جواب کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے؟

میں اس کا دوٹوک جواب یہ دیتا ہوں کہ ہماری منزل مقصود حقیقی آزادی ہے۔ وہ آزادی کا خول نہ ہو۔ بلکہ اس کی حقیقت ہو۔ نام آپ چاہے اسے جو دے لیں۔ آل پارٹیز کمیٹی نے درجہ نو آبادیات کی سفارش کی ہے۔ میں کئی بار کھول کر اپنی پوزیشن واضح کر چکا ہوں مگر آپ کی اجازت سے میں اسے حتی الوسع صاف طور پر پھر بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ لب لباب یہ ہے کہ میں مکمل آزادی کا حامی ہوں۔ میرا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ مکمل۔ لیکن میں مکمل درجہ نو آبادیات کے خلاف نہیں۔ البتہ وہ اتنا ہی مکمل ہو۔ جیسا کہ آج کسی نو آبادی کو حاصل ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اسے ہمیں اس

سے قبل مل جانا چاہئے کہ ہماری اس کے لیے تمام رغبتیں ہی فوت ہو جائیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آج کی طرح کا رشتہ جو برطانیہ سے قائم ہے وہ ٹوٹ جانا چاہئے مگر میں اس صورت میں روابط قائم رکھنے کے مخالف نہیں۔ جس طرح ایک نوآبادی کے برطانیہ کے ساتھ منسلک ہیں۔

میں ایک بار پھر اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ غیر مشروط غیر پابند قومیت پسندی ہی انسانی روح کی قدرتی جستجو ہے۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں کہ ہندستان میں کوئی مرد عورت کسی پارٹی یا گروپ سے منسلک یا ان سے علیحدہ ایسا نہیں جو آزادی حاصل نہ کرنا چاہتا ہو یا جو اس آزادی کو قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ اختلافات اس صورت میں اٹھتے ہیں جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ آزادی حاصل کرنا یا اسے برقرار رکھنا ممکن ہے اور اسی صورت میں ہم لوگوں کو شدید اختلاف رائے کا حامل پاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنی ذات میں اور اپنے ہم وطنوں میں اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ اس سوال کا جواب پرزور الفاظ میں "ہاں" میں دیتے ہیں۔ مجھے فوراً اس بات کا اعلان کر دینا چاہئے کہ میں بھی انھیں لوگوں میں شامل ہوں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چند تو اپنے اعتقاد کی بنا پر اور دیگر شکوک کی بنا پر اپنے سر ہلا دیں گے۔ مکمل آزادی اول الذکر لوگوں کا نصب العین ہے اور درجہ نوآبادیات ثانی الذکر کا۔ مجھے یہاں بے سود تحقیقات کرنے کی ضرورت نہیں کہ مکمل آزادی اور درجہ نوآبادیات میں کیا رشتہ قائم ہے یا ان میں کیا فرق ہے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ وہ ایک ہی زمرہ کی مختلف مدیں ہیں یا یہ کہ ایک دوسرے کی نفی ہے یا نہیں کہ وہ ایک ہی زمرہ کی مختلف مدیں ہیں۔ یا یہ کہ ایک دوسرے کی نفی ہے یا نہیں۔ مجھے صرف اس بات سے واسطہ ہے کہ درجہ نوآبادیات سے ہمیں کافی حد تک ایسی مراعات مل جاتی ہیں جن سے ہم مکمل آزادی کی سرحد پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے اپنے نصب العین میں تبدیلی

لانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ اگر ہمیں کامل آزادی کے عوض درجہ نوآبادیات کی پیش کش کی جائے تو میں درجہ نوآبادیات کو اپنا نصب العین نہیں ٹھہرا سکتا کیوں کہ یہ کسی اور پارٹی کی طرف سے آ رہا ہے جس پر ہمیں قابو حاصل نہیں۔ اس پر کنٹرول حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ مکمل آزادی کے لیے نہایت خلوص سے جدوجہد کی جائے۔ نہایت خلوص سے میں نے اس لیے کہا ہے کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ محض گیدڑ بھبکیوں سے ہم کچھ زیادہ نہیں حاصل کر سکتے۔ کامل آزادی کے قریب آ جانے کی صورت میں ہی برسر اقتدار پارٹی اس سے کچھ کم دینے پر رضا مند ہو سکے گی۔ خالی خولی گیدڑ بھبکیاں ہمیں اس مرحلہ پر ہرگز نہ لے جا سکیں گی۔ یہ مقصد ٹھوس کام پر بے غرض مساعی سے ہی سرانجام پا سکے گا۔ جب ایسا کر دیا گیا اور قربانیاں دی گئیں تو وہ پارٹی جس کے ہاتھ مضبوط ہوں گے اپنی شرائط طے کرا سکے گی۔ یہ درجہ نوآبادیات ہوگا یا مکمل آزادی اس کا دارومدار اس وقت کے حالات پر ہوگا کہ آیا وہ حالات اس وقت آئرلینڈ ایسے ہیں یا صوبجات متحدہ امریکہ کی طرح۔ اس دوران میں ماسوائے اس کے ہمارے سامنے اور کچھ نہیں کہ ایک طرف زندگی اور موت کی طویل جدوجہد ہے اور دوسری طرف جبر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا منتہائے مقصود خواہ کچھ ہی ہو ہمیں اس کے لیے خاردار راستوں سے گزرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہئے۔ اگر ہم اس کے لیے تیار نہیں تو کامل آزادی ایک خواب ہوگا اور درجہ نوآبادیات محض خیالی قصہ۔

میں یہاں وائسرائے صاحب کی اس تقریر سے جس کا میں پیشتر ازیں ذکر کر چکا کچھ اور اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے ان نقصانات کا بہت ڈراؤنا نقشہ پیش کیا ہے۔ ''جو ہندستان کو ان دوستوں کے ہاتھوں اٹھانا پڑیں گے۔ جو آزادی کی دلدل کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں۔'' زیادہ درست کہنا یہ ہوگا کہ ہمیں آزادی تک پہنچنے

کے لیے دلدل کو عبور کرنا ہوگا لیکن دلدل تو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ہم اسے عبور کیے بغیر کہیں نہیں پہنچ سکتے۔اس صورت میں ہماری تحریک کے معاون دوست ہمیں یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اس خالص آزادی کے لیے ایسی مساعی خواہ وہ جاں کش اور طویل کیوں نہ ہوں عمل میں لائی جائیں جن کا دارومدار تمہاری اپنی ہمتوں پر ہو اور درجہ نوآبادیات کے لیے سردردی کا خیال چھوڑ دیا جائے کہ جس کا دارومدار برطانیہ کی خوشنودی پر ہے۔وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ محض وقت، انرجی اور قربانی کو رائیگاں کرنا ہوگا کہ پہلے تو درجہ نوآبادیات کی دلدل سے نکلنے کے لیے کوشش کی جائے اور جب تم اپنا راستہ رکا ہوا پاؤ تو پھر از سرنو جہاں سے پہلے چلے تھے وہیں سے پھر اسی دلدل میں آزادی حاصل کرنے کے لیے چھلانگ لگائی جائے۔لارڈ ارون کے نکتہ نگاہ سے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔میرے خیال کے مطابق درجہ نوآبادیات آزادی کے راستہ میں آتا ہے۔اور اگر وہ نہ مل سکے تو آپ کا فرض اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتے جانا ہے جو کامل آزادی سے کسی طرح کم نہیں۔لارڈ ارون کے تاج سے وفاداری کے بیان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔وفاداری بہت اچھی چیز ہے لیکن اس کے لیے جس قدر بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اس کی کوئی حد نہیں۔

ایک بات بالکل واضح ہے کہ آزادی کا مطلب دنیا سے کٹ جانا نہیں۔اگر آپ اس میں رہیں تو آپ کو ان لوگوں سے واسطہ پڑے گا جو اس دنیا میں رہتے ہیں۔آج کی دنیا میں ایک آزاد ریاست کے لیے نہ تو یہ ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے کہ وہ اپنے مجلسی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات دوسری ریاستوں سے منقطع کرلے۔دراصل آپ جس قدر زیادہ آزاد ہوں گے اسی نسبت سے آپ کو دوسرے لوگوں سے زیادہ تعلقات استوار کرنے پڑیں گے۔ چنانچہ جب برطانیہ کے ساتھ اپنا رشتہ منقطع کرلینے کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مطلب تمام تعلقات کو یک قلم منسوخ کردینا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا

ہے کہ برقرار روابط میں ایسی موزوں تبدیلی لائی جائے جو اس مقبوضہ ریاست کو آزاد ریاست میں بدلنے کے لیے ضروری ہے۔ تبدیلی کا دارومدار اس آزادی پر ہوگا جو ہم حاصل کرتے ہیں۔ اگر یہ درجہ نوآبادیات ہوا تو تبدیلی جیسا کہ یہ ایک کھلی بات ہے مقبوضہ ریاست سے ایک خودمختار ریاست کی ہوگی۔ یہ ریاست برطانوی کامن ولتھ آف نیشنز کی آزاد اور مساوی رکن ہوگی۔ اور اگر یہ کامل آزادی ہوئی تو ہندستان برطانوی کامن ولتھ آف نیشنز سے باہر ہوگا اور اس کے برطانیہ کے ساتھ تعلقات کا دارومدار باہمی افہام تفہیم اور معاہدہ جات پر ہوگا۔ ہر حالت میں ہمیں دنیا کی دوسری اقوام اور برطانیہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلقات ضرور وابستہ کرنے پڑیں گے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے اور دنیا کے مستقبل کی تعمیر میں سرگرم حصہ لیں۔

مہاتما گاندھی نے بلگام کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا:

> میری رائے میں اگر برطانوی سرکار کا وہی مدعا ہے جو کچھ وہ کہتی ہے۔ اور دیانت داری سے ہمیں اپنے مساوی حیثیت دینا چاہتے ہیں تو یہ برطانیہ کے ساتھ قطعی علیٰحدگی کی نسبت زیادہ کامیابی ہوگی۔ چنانچہ میں سلطنت کے اندر سوراج کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر برطانیہ کی اپنی غلطی سے علیٰحدگی ضروری ہوگئی تو میں ایسا کرنے میں کسی تامل سے کام نہیں لوں گا۔ اس طرح میں علیٰحدگی کی تمام ذمہ داری برطانوی لوگوں پر ڈالوں گا۔"

یہ بیان آج سے چار سال قبل دیا گیا۔ اس دوران میں دریاؤں کا بہت پانی بہہ چکا ہے۔ ہم سلطنت کے اندر سوراج کے لیے تن دہی سے کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن انگریزوں نے ہمیں مساوی درجہ دینے کی خلوص دل سے کوئی کوشش نہیں کی۔ بلاشبہ ذمہ دار انگریز مدبرین کئی بار اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ درجہ نوآبادیات ابھی دور کی

بات ہے۔ اس لیے میں ان کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں جن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور جواب مکمل علیحدگی کی آواز اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں مہاتما گاندھی کے بیان کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میرا یقین ہے آپ کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ جوں ہی ہمیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ برطانیہ ہمیں درجہ نوآبادیات تفویض کرنے کو تیار نہیں ہم فوراً اس بات کا لحاظ رکھے بغیر کہ ہم اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں یا نہیں، آزادی کا اعلان کردیں۔ میرے خیال میں آپ اس وقت اس بات کی طرف اشارہ کررہے تھے کہ ہمیں ایسا اس وقت کرنا چاہئے کہ جب ہمارے بازو میں طاقت ہو۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔

اسی خطبہ میں مہاتما جی نے ارشاد فرمایا:

> ''دنیا کا بہتر دماغ آج ان کامل طور پر آزاد ریاستوں کا خواہاں نہیں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوں۔ بلکہ وہ آزاد ریاستوں کی ایسی فیڈریشن پسند کرتا ہے جن کا دارومدار باہمی طور پر ایک دوسرے پر ہو۔ ایسا وقت شاید ابھی بہت دور ہو۔ میں اپنے ملک کے لیے کوئی نہایت شاندار دعویٰ نہیں کررہا لیکن میں اس چیز کی نسبت کوئی بات ناممکن اور شاندار نہیں سمجھتا کہ ہم آزادی کی بجائے عالم گیر باہمی دارومدار کی رضامندی کا اظہار کردیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا برطانیہ کا کام ہے کہ وہ ہندستان کے ساتھ کوئی حقیقی رشتہ قائم نہیں رکھے گا۔''

اس کے بعد آپ کا وہ معنی خیز پیرا آتا ہے جسے میں بڑے جذبہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ حسب ذیل ہے:

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آزادی پر زور دیے بغیر ہم میں کامل طور پر آزاد ہونے کی قابلیت موجود ہونی چاہئے۔ آج جب کہ برطانیہ ہندستان کے لیے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ اسے سلطنت کے اندر مساوی حیثیت تفویض کرنا چاہتا ہے، میں جو بھی تجویز بناؤں گا وہ برطانیہ کے ساتھ اتحاد کے بغیر آزادی کی بجائے اتحاد کی تجویز ہوگی۔"

جہاں تک ہندستان کے لیے رسمی اعلان کا تعلق ہے وہ سلطنت کے اندر مکمل آزادی ہے۔ چنانچہ آل پارٹیز کانفرنس کی تیار کردہ اسکیم مہاتما گاندھی کے نکتہ نگاہ سے بالکل ملتی ہے:

"اصل بات یہ ہے کہ ہم اپنی طاقت کا ثبوت دیے بغیر انگلستان سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس طاقت کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے ذرائع کو منظم کریں۔ ایسی تنظیم ان لوگوں کے لیے جو درجۂ نوآبادیات کے حامی ہیں، ایسی ہی ضروری ہے جیسے ان لوگوں کے لیے جو کامل آزادی کے لیے کام کرتے ہیں۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تو کام کرنے کا واضح طریقہ یہ ہے کہ اس نکتہ تک بڑھا جائے جہاں تک ہم سے کمزور سے کمزور جانے کو تیار ہو۔ مگر جب کوئی وہاں پہنچ کر نا امید ہو جائے تو اسے پیچھے چھوڑ کر ہمیں آگے بڑھنا چاہئے۔"

اس سے ان لوگوں کی تسکین ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ جوں ہی ہمیں درجۂ نوآبادیات حاصل ہوا ہم اسے برطانیہ سے بالکل تعلقات منقطع کر لینے کے لیے

استعمال کریں گے۔ لارڈ ارون نے اپنی اس تقریر کے دوران میں جس کا میں قبل ازیں ذکر کر چکا ہوں۔فرمایا:

''جو لوگ برطانیہ عظمیٰ میں نہایت جوش کے ساتھ ہندستان کے اس تصور کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں کہ ہندستان کو بہت جلد تاج کی دوسری نوآبادیوں کا درجہ مل جانا چاہئے اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکی ہوئی پائیں گے۔ اگر انگریزوں کی یہ رائے پختہ ہوگئی ،جیسا کہ آج کئی لوگ اس رائے کو پختہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ نام نہاد درجہ نوآبادیات ہندستانیوں کو اس لیے زیادہ پسندیدہ ہے کہ وہ اسے حاصل کر لینے کے بعد برطانوی کامن ولتھ سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر لیں گے۔''

اس خطرہ کی کوئی بنیاد نہیں اور اس بات میں کوئی معقولیت نہیں کہ اگر ہمیں دوسری نوآبادیوں کے ساتھ مساوی حیثیت حاصل ہوگئی تو ہم کیوں برطانیہ سے کلیتاً علٰیحدگی اختیار کر لیں گے۔ اگر ہمیں وہی مراعات نہ دی گئیں تو یہ درجہ نوآبادیات نہ ہوگا۔ ہم ایسی رنگین نقل کو قبول نہ کریں گے یہ بات ٹھیک طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ درجہ نوآبادیات اپنے تمام مفہومات فرائض اور حقوق کے ساتھ دیا اور قبول کیا جائے گا جس کو برقرار رکھنا دونوں پارٹیوں کا اخلاقی فرض ہوگا۔ لیکن جیسا کہ مہاتما جی فرما چکے ہیں کہ'' اگر برطانیہ کی غلطی سے تمام تعلقات منقطع کرنے ضروری ہو گئے تو ہم ایسا کرنے میں گریز نہیں کریں گے۔'' یہ بات تصور کی جاسکتی ہے کہ ہم برطانیہ کے ہاتھوں کیے گئے سلوک سے ہی علٰیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ اب میری یہ بات صاف ہو چکی ہوگی کہ میں کیوں کامل آزادی کا حامی ہوں اور درجہ نوآبادیات کے مخالف نہیں۔ بشرطیکہ مؤخر الذکر بلا تاخیر ہمیں مل جائے۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس نازک لمحہ پر آہنی بازو کسے میسر ہوگا۔ آج برطانیہ کو آہنی بازو میسر ہے اور درجہ نوآبادیات کی پیش کش کرنے اور قبول کرنے کا نازک

وقت آپہنچا ہے ۔آج برطانیہ نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو کل آہنی بازو ہندستان کو حاصل ہوگا۔اور تب وہ نازک لمحہ آوارہ ہوگا کہ وہ برطانیہ سے کامل آزادی چھین لے۔اس وقت درجہ نوآبادیات کی کوئی پیش کش قابل قبول نہ ہوگی۔

ہماری طرف سے درجہ نوآبادیات کی بنیادوں پر حکومت کی اسکیم پر اس لیے اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کی برطانیہ نے پیش کش کرنی ہے۔ ہندستان کو ایسا نہیں کرنا ہے۔کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے درجہ نوآبادیات حاصل کیا ہے وہ اس کے لیے نہیں لڑے۔ بلکہ انھوں نے اسے مکمل آزادی کی جنگ کے دوران میں حاصل کیا ہے ۔ پیش کش کرنے والا برطانیہ تھا۔ میں اپنے ذہن میں اس چیز سے متعلق بالکل صاف ہوں کہ اگر ہمیں درجہ نوآبادیات حاصل ہوا تو ہمیں بھی اسی عمل سے گزرنا پڑے گا۔ اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہم اسے اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک مکمل آزادی ہمارے سامنے نہ ہو۔لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کیوں ہندستان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خود برطانیہ کے سامنے شرائط رکھے جب کہ برطانیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہندستان کو شرائط پیش کر سکتا ہے۔اگر پیش کش قبول کرنے والوں اور پیش کرنے والوں کے لیے باعزت ہو تو یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ اسے پیش کرنے والا کون ہے۔ میں نہیں مانتا کہ آزادی کے سپاہیوں میں ہمارے پاس کوئی فرد بھی دیش بندھو چیتر جی داس کی نسبت ہندستان کی آزادی کے لیے زیادہ لڑنے والا اور زیادہ بے خوف جواں مرد موجود ہے۔ مجھے آپ اجازت دیں کہ میں آپ کی توجہ اس شان دار تقریر کی طرف مبذول کراؤں جو آپ نے فرید پور کے مقام پر کی تھی اور جس میں آپ نے کہا تھا کہ جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے وہ استقلال نفس، خوداختیاریت اور اپنے نشو ونما پانے کے مواقع ہیں۔ آپ نے نوکرشاہی کو مکمل تعاون کی پیش کش کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔لیکن شرط یہ تھی کہ برطانیہ تبدیلی قلب کا ثبوت دے۔ مستقبل قریب میں

پورن سوراج دینے کا یقین دلائے وہ پیش کش کسی کمزوری کا مظہر نہ تھی۔اسے طاقت کے مکمل احساس کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔آپ نے کہا۔"اگر ہماری سمجھوتہ کی شرائط تسلیم نہ کی گئیں تو ہمیں اسی راہ پر اپنے کام کو جاری رکھنا چاہئے جس پر ہم دو سال سے گامزن ہیں تاکہ حکومت کے لیے غیر معمولی طاقتوں سے کام لیے بغیر نظم و نسق کے کام کو چلانا ناممکن ہو جائے۔اور جب وقت آئے ہم اپنے ہم وطن بھائیوں کو مشورہ دینے میں تامل محسوس نہ کریں کہ وہ ان ٹیکسوں کو ادا کرنا بند کر دیں جنھیں غیر معمولی طاقتوں کے استعمال سے اکٹھا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

یہ ایک سیاست دان، ایک سیاسی فلسفی اور آزادی کے پکے سپاہی کے الفاظ ہیں۔ وہ فرد جو کہ اپنی ذات پر بھروسہ رکھنے کے فلسفہ کی تبلیغ کرتا تھا۔یہ بات اس کے بلند وقار کے خلاف نہ تھی کہ جس چیز کے لیے وہ لڑنے کی تیاری کر رہا تھا حکومت کے سامنے اس کی پیش کش کر دے۔دراصل برطانوی حکومت انڈیا ایکٹ کے آغاز میں نہایت خلوص سے خود اس چیز کی پیش کش کر چکی ہے۔یہ سچ ہے کہ یہ پیش کش نامکمل اور ناقابل قبول ہے۔تو صحیح راستہ یہ ہے کہ اس کے برعکس اور پیش کش کی جائے۔آل پارٹیز کانفرنس نے ایسا ہی کیا ہے۔

کسی فیصلہ کی اجازت حاصل کرنے کے سوال پر کافی لے دے ہو چکی ہے۔اس نکتہ پر میں مہاتما گاندھی کی رائے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔'ینگ انڈیا' میں آپ رقمطراز ہیں:

> "ابھی بہت ڈپلومیٹک کام سرانجام دینا درکار ہے۔لیکن ڈپلومیٹک کام کی نسبت زیادہ ضروری ایک فیصلہ کی اجازت حاصل کرنا ہے۔پنڈت جواہر لال نہرو نے درست کہا ہے کہ یہ درجہ نوآبادیات ہو یا کامل آزادی ایک باقاعدہ اجازت حاصل

کرنے کی اشد ضرورت ہے۔قومی مطالبہ کو اسی صورت میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ فیصلہ عدم تشدد کا ہوا۔تو بارد ولی نے ہمیں راستہ دکھایا ہے۔عدم تشدد کا عقیدہ کانگریس کا ضروری جز ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ باردولی سے پہلے عدم تشدد کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔لیکن جس طرح کہ نہرو رپورٹ نے ایک متفقہ فیصلہ کو ممکن بنادیا ہے۔ باردولی نے عدم تشدد کے لیے فوت ہورہی طاقت میں زندگی پیدا کردی ہے۔اس لیے اگر ہم ایک فیصلہ کے لیے اجازت حاصل کرلیں تو ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے کہ سوراج کو درجہ نوآبادات کا نام دیا جاتا ہے۔ یا مکمل آزادی کا۔ درجہ نوآبادیات کامل آزادی کی نسبت زیادہ آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے اگر اس کی پشت پر لوگوں کی اجازت موجود ہو۔آزادی آسانی سے فریب کی شکل اختیار کرسکتی ہے اگر اس کے پیچھے لوگوں کی آواز موجود نہ ہو۔اگر ہمیں اصلیت مل جائے تو نام کی کیا بات رہ جاتی ہے۔گلاب کا پھول ویسی ہی خوش گوار خوشبو دیتا ہے چاہے آپ اسے اس نام سے پکاریں یا کسی اور سے چنانچہ ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا چاہئے کہ یہ تشدد یا عدم تشدد کی اجازت ہوگی اور عوام الناس کو اس فیصلہ کے لیے اتنے ہی خلوص سے کام لینا چاہئے جتنا ڈپلومیٹوں کو آئین سازی کے لیے۔

اب میں اپنے دوسرے سوال کا جواب دے چکا ہوں۔وہ یہ ہے:

''ہماری منزل مقصود آزادی ہے۔'' رہا اس چیز کا سوال کہ اس کی کیا شکل ہوگی اور

کس حد تک ہمیں حاصل ہوگا؟ اس کا دارومدار اس وقت کے اور ان حالات کے ماتحت ہوگا جب وہ آئے گا۔

اس دوران میں ہمارے لیے یہی کام ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کی آزادی کے لیے برسرپیکار ہوجائیں۔ وہ کام ایک ہی ہے۔ اوراب میں اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں۔

یاد رہے کہ جس کانگریس نے مکمل آزادی ہمارا منتہائے مقصود مقرر کیا اسی نے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ تمام پارٹیوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ متفقہ طور پر ملک کے لیے ایک آئین مرتب کریں۔ یہ بات اس وقت اتنی ہی واضح تھی جتنی کہ آج ہے کہ کانگریس سے باہر کوئی پارٹی بھی مکمل آزادی ایسا بلند پروگرام اپنے عملی سیاسیات کے نقطۂ نگاہ کی روشنی میں اپنانے کو تیار نہ تھی۔ چنانچہ کانگریس کو اس حقیقت سے کامل طور پر آگاہ ہوکر تحقیقات کرنا چاہیے تھی۔ اگر کامل آزادی اصل منتہائے مقصود نہ تھا بلکہ دوسرا مرحلہ تھا تو ایسی صورت میں آل پارٹیز کانفرنس یا مشترکہ اجلاس بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کوئی مذاق نہ تھا۔ کنونشن بلانے کی اہمیت اور مشترکہ فیصلوں کی سیاسی قدر و وقعت اسی وقت واضح ہوگئی۔ جب اس نے ریزولیوشن پاس کیا اور اس نے کانگریس کی دانش مندی کی تصدیق کردی لیکن اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ کہ جب کنونشن ریزولیوشن پاس کردے تو آئندہ اقدام کیا ہوگا۔ اس کا دارومدار ان طے شدہ فیصلوں پر ہوسکتا تھا کہ جو اس وقت تک معلوم نہ تھے۔

کانگریس کی مجلس عاملہ نے نہایت وفاداری سے اس کانگریس کے فیصلوں پر عمل کیا اور آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس بلایا گیا۔ ان قومی اجتماعوں کی ہندستان کے آئین کے لیے زیادہ سے زیادہ متحدہ بنیادیں ڈھونڈ لینے کی مساعی خوب معلوم ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں اس سے پیشتر کبھی بھی اتنی زیادہ سیاسی، مزدور، مذہبی، تجارتی

جماعتیں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہوئیں۔ اس حقیقت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اس بھاری کامیابی کا سہرا کانگریس کے سر پر ہے جس نے اس خیال کو جنم دیا اور اس سے بھی زیادہ کریڈٹ کے مستحق ڈاکٹر انصاری صدر کانگریس ہیں جنھوں نے اسے عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نیشنل کنونشن میں پاس شدہ ریزولیوشن اسی اجلاس کے دوران میں آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور یہ اہم فرض آپ کے ذمہ لگایا جائے گا کہ آپ مدراس کانگریس سے ترکہ میں ملے ہوئے کام کو سرانجام دیں اور اس بات کا فیصلہ کریں کہ اب دوسرا اقدام کیا ہوگا۔ آپ کو کانگریس کا بڑا بھاری اثاثہ ورثہ میں ملا ہے۔ یعنی مکمل آزادی کی منزل مقصود۔ آپ اس کی ذمہ داری سے پہلو نہیں بچا سکتے۔ مستقبل کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہوگا کہ آپ اس ذمہ داری کو کس طرح نبھاتے ہیں۔

آل پارٹیز کانفرنس کی کمیٹی کی بڑی اور حتمی رپورٹوں کی بنیادیں بڑے سے بڑے متفقہ سمجھوتے کے اصول پر قائم ہیں۔ میں نہایت خلوص سے اس کانگریس سے سفارش کرتا ہوں کہ وہ اس اصول کو قبول کرلے۔ کانگریس بذاتہ ایک آل پارٹیز کانفرنس ہے۔ اور یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے سامنے جو بھی مسئلہ پیش ہو وہ اس پر تمام پارٹیوں اور ہندستان کے عوام الناس کی بڑی سے بڑی بھلائی کے نکتہ نظر سے غور وخوض کرے۔ اس وقت تک کانگریس یہ فرض اپنی مرضی سے سرانجام دے رہی تھی۔ وہ خود ہی طے کرلیتی کہ لوگوں کی بھلائی کا راز کس بات میں مضمر ہے اور پھر اس کے مطابق اپنی پالیسی وضع کرلیتی۔ کانگریس کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس نے مختلف پارٹیوں کے نمائندوں کی شکل میں ہندستان کے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ خود اس بات کا فیصلہ کرلیں کہ ان کی بھلائی کس چیز میں مضمر ہے۔ اس طرح کانگریس نے خود ارادیت کے اصول پر کام کیا ہے۔ مدعو کیے جانے والوں نے

کانگریس کی دعوت کو قبول کرلیا۔ اس سے پیشتر کسی ایسے واقعہ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ عدم تعاون کے ان شان دار ایام میں بھی کہ جب لاکھوں لوگ کانگریس کی پشت پر تھے اسے ان مشہور جماعتوں کی حمایت نہ تھی۔ آج کوئی قابل ذکر مزدور، کمرشل، سیاسی، مجلسی، مذہبی، فرقہ پرست اور صنعتی جماعت ایسی نہیں جس نے آل پارٹیز کانفرنس یا نیشنل کنونشن میں حصہ نہ لیا ہو یا جس نے وہاں حصہ لے کر مشترکہ مفاد کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی ضرور کی ہو۔ یہ ایک ایسی کامیابی ہے کہ جس پر دنیا کا ہر ایک ملک فخر کرے گا۔ اب اس کارنمایاں کی روداد آپ کے سامنے پیش کی جائے گی۔ کیا آپ اسے قبول کریں گے یا رد کریں گے؟ اگر آپ کو اپنے لیے حق خود اختیاری کا کچھ دعویٰ ہے تو آپ کو اسے رد کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ خواہ آپ اس سے متفق نہ ہوں۔ سوال یہ ہے کہ آیا اس اسکیم پر اس قدر اتفاق رائے موجود ہے کہ ہم اسے خود اختیاریت کا رتبہ دے سکیں؟ میری یہ رائے ہے کہ ہاں موجود ہے۔ اس پر چند فرقہ پرستوں کے ماسوا کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ ان کے متعلق مجھے نہایت بے تکلفی سے کہہ دینا چاہیے کہ میں انھیں سمجھ نہیں سکا اور میں ان کی آرزوئے آزادی اور فرقہ پرستانہ مفادات میں کوئی یگانگت پیدا نہیں کرسکا۔ ان میں سے کچھ معدودے چند افراد کے ہاتھوں میں ملک کی آئین سازی کے عمل کی باگ ڈور دے کر اس گاڑی کو کھڑا کر دینا چاہتے ہیں۔ چند اور کی یہ کیفیت ہے کہ مشترکہ انتخاب کے اصول سے منحرف ہونے کو تیار ہیں اگر انھیں قانون ساز مجلسوں میں اپنی چند اور نشستیں تفویض نہ کی گئیں۔ میں اس سے پیشتر وائسرائے کی تقریر پر مخالفانہ رائے کا اظہار کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی اسی تقریر کے ایک اور حصہ کی مجھے تعریف کرنا چاہیے۔ یہ حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے جس کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

''اس حقیقت سے انکار کرنے میں کوئی فائدہ نہیں کہ ہندستان کے مختلف طبقات مختلف جھنڈے نہیں رکھیں گے لیکن ایسے اختلاف میں کوئی چیز مضر یا غیر قدرتی نہیں۔ اگر مفادات آپس میں ٹکراتے ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک طرح کے مفادات کو بالکل قربان کر دیا جائے۔ یا یہ کہ ایک قوم تمام اقوام سے تعاون کرنے کی غرض سے اپنی ہستی ہی کھو بیٹھے۔ ہر ایک قوم اپنے مخصوص اوصاف کی مالک ہے۔ اس کے سامنے اپنے خاص تصورات ہیں اور اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے اسے خاص حق حاصل ہیں۔''

میں آپ کے احساسات سے کامل اتفاق رکھتا ہوں۔ مگر مجھے اس بات کا یقین نہیں کہ میرا اور ہز ایکسیلینسی کا ایک ہی نصب العین ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ آل پارٹیز کمیٹی کی رپورٹ میں ہر قوم کو اپنے تصورات کی پیروی کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے اور وہ اس بات کے کافی مواقع بہم پہنچاتی ہے کہ ہر قوم اپنے ماحول میں استکمال نفس کی ضروریات پوری کر سکے اور اس کے ساتھ ہی وہ ہر قوم کو قومی زندگی کے خاکہ میں اپنی اپنی جگہ عطا کرتی ہے۔ میرے دل میں اس کے متعلق شبہ موجود ہے کہ لارڈ اروِن کا یہی مطلب ہے۔ مجھے اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔

حق خود اختیاری کے اصول کے علاوہ آل پارٹیز اسکیم کو پرکھنے کی واحد کسوٹی یہ ہے کہ اس سے ملک کی حقیقی اور دائمی بھلائی کا اندازہ لگایا جائے۔ اگر آپ نیک نیتی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے سامنے منتہائے مقصود کو قربان کرنا صرف عارضی مفاد ہے اور اس میں ملک کی حقیقی اور دائمی بھلائی مضر نہیں تو آپ اسے ضرور رد کر دیں۔ لیکن اسے محض اس بنا پر نامنظور نہ کریں کہ یہ ان نظریات اور کلیات سے ٹکراتی ہے جن کا

حالات زمانہ کی برقرار حقیقتوں سے دور کا کوئی واسطہ نہیں۔

ان سفارشات کو نہ تو سفارش کرنے والوں نے اور نہ ہی اُس کانفرنس نے یہ سمجھ کر منظور کیا کہ یہ لاریب صلاح ہے۔ میں کمیٹی سے اپنے اور اپنے رفقاء کی طرف سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تن تنہا ایسی رپورٹ مرتب کرسکتا کہ جسے ہم سب نے مل کر مرتب کرنا اپنا ایمان سمجھا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہماری سفارشات ہماری پختہ آراء کے خلاف ہیں۔ مثلاً اقلیتوں کے لیے نشستوں کا تحفظ مگر وقتی ضروریات نے ہمیں یہ تحفظات دینے پر مجبور کردیا۔

لہٰذا اس کانگریس کے لیے جواب طلب ایک یہ سوال ہے کہ آیا یہ ریزولیوشن اور سفارشات ملک کی حقیقی اور دائمی بھلائی کے اس قدر خلاف اور اس قدر غیر مستقل ہیں کہ اس کے پیچھے ملک کی متفقہ آواز ہونے کے باوجود وہ انہیں رد کردے؟ اگر وہ ایسی نہیں تو اس کانگریس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ انہیں قبول کرلے؟

یہ کہا جائے گا کہ سفارشات کو دو بڑی بڑی مدوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّلاً عام، ثانیاً قوم ورانہ، دونوں اس قدر ایک دوسرے میں خلط ملط ہیں کہ ایک کو قبول کر کے دوسری کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہم لکھنؤ ریزولیوشن کو نظر انداز نہیں کرسکتے جس پر تمام پارٹیوں نے اتفاق کیا کہ "ہر ایک اس کا مجموعی طور پر ساتھ دے گی اور اس کے کسی ایک حصہ کو تمام ریزولیوشن پر زور دیئے بغیر قبول کرنے سے انکار کردے گی۔" یہاں کچھ فرقہ پرستانہ سیاست اور مذہب سے ملی جلی جماعتیں ہیں جو درجہ نو آبادیات کی حامی ہیں۔ انھوں نے قوم ورانہ سمجھوتہ کو صرف ایک پارٹی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا بلکہ ایک متفقہ فیصلہ کی خاطر ان امورات سے دست بردار ہوگئے جنہیں وہ بنیادی حقوق سمجھتے تھے۔ ہندستان بھر میں ہزارہا پبلک جلسے منعقد ہوئے جس میں ہر رائے کے لوگوں نے حصہ لیا۔ ان جلسوں میں ان سفارشات کو مجموعی طور پر منظور کیا گیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ

کتنے لوگوں نے درجہ نوآبادیات کی خاطر قوم ورانہ حل کو نا اور کتنے لوگوں نے قوم ورانہ حل کے لیے درجہ نوآبادیات کو تسلیم کیا تاہم ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان پر اعتماد کریں۔ چنانچہ جس راستہ کی طرف اشارہ کیا گیا وہ کانگریس کے لیے کھلا نہیں۔ اس کے سامنے صرف یہ راستہ ہے کہ وہ یا تو کانفرنس کے سفارش کردہ قوم ورانہ تصفیہ اور درجہ نوآبادیات کو تسلیم کرلے اور اپنے کامل آزادی کے تصور کو خیال میں نہ لائے یا اس تمام اسکیم کو تہ وبالا کردے۔

تو میری نظروں میں اس وقت یہی پوزیشن ہے۔ یہاں آپ کے سامنے اب ایک ایسا آئین ہے جس پر ان تمام پارٹیوں نے اتفاق کا اظہار کیا ہے جن کو کانگریس نے یہ آئین مرتب کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ یہ پارٹیاں جانتی ہیں کہ کانگریس کا نصب العین کامل آزادی ہے۔ وہ کانگریس کو یہ نہیں کہتیں کہ وہ اپنا نصب العین تبدیل کرے۔ بلکہ اس کے سامنے اپنی مساعی کا ثمر پیش کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہاں تک جانے کو تیار ہیں۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتیں وہ اپنے تعاون کی پیش کش کرتی ہیں۔ اور اس کی کانگریس سے توقع رکھی ہیں تاکہ دونوں اس نکتہ تک پہنچ جائیں جہاں تک وہ خود جانے کو تیار ہیں۔ جب وہاں تک پہنچ جائیں۔ وہ اس بات کی آزادی چاہتی ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو وہیں ٹھہر جائیں۔ اور کانگریس چاہے تو اسے دوسرا قدم اٹھانے کی آزادی ہو۔ کیا کانگریس انھیں یہ تعاون اور آزادی دینے سے انکار کردے گی؟ کیا کانگریس انہیں ایک جگہ اکٹھے کرکے پھر منتشر گروہوں میں تاریکی میں اپنا راستہ آپ تلاش کرنے پر چھوڑ دے گی اور خود پھر سر پیٹنے بیٹھ جائے گی کہ درجہ نوآبادیات ٹھیک ہے یا کامل آزادی؟ اگر کانگریس ایسا کرے گی تو وہ قوم کو آگے لے جانے کے جائز فرض کی راہ نمائی سے دست بردار ہونے کا کام سرانجام دے گی۔ موقع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم درسی قسم کی بحثوں کو چھوڑ کر مدبرانہ راہ نمائی کا ثبوت دیں۔ قوم ہمارے دروازے پر دستک

دے رہی ہے آپ اسے کھلا چھوڑ دیں، اتنا زیادہ کھلا کہ ہر ایک اس کے اندر آ سکے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ کو اعلیٰ راہ نمائی کے فرض سے دست کش ہونا پڑے گا۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ اسے قبول کر لیں اگر آپ نے ایسا کیا تو منزل مقصود کی طرف آپ کا راستہ بالکل صاف ہے۔

آپ اس نکتہ سے آغاز کریں جہاں پر آل پارٹیز کانفرنس اب پہنچی ہے۔ اور جہاں تک وہ جائے آپ اس کا ساتھ دیں۔ پھر آپ ذرا آرام کا سانس لیں۔ زادراہ کا جائزہ لیں اور آخر کار اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے اپنے آپ کو اس اہم جدوجہد میں پھینک دیں۔

یہ ہے میرا جواب اس سوال کا کہ ہم اپنی منزل مقصود پر کیوں کر پہنچ سکتے ہیں؟

اس وقت ہمارا سب سے اول اور واضح فرض یہ ہے کہ ہم اپنے گھر کو درست کر لیں۔ اس مقصد کے لیے تمام پارٹیوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع کیجئے اور ان کے شانہ بشانہ مشترکہ راستہ پر چلنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیں۔ یہ مشکل سفر کا پہلا حصہ ہوگا۔ میں اس کے لیے حسب ذیل پروگرام کی سفارش کرتا ہوں:

1- ملک میں اس قوم ورانہ حل کو کہ جس پر تمام پارٹیاں متفق ہو چکی ہیں جلسوں اور اخبارات میں زبردست پروپیگنڈہ اور گاؤں گاؤں لیکچروں کے ذریعہ مقبول بنایا جائے۔
2- مدراس کانگریس اور دہلی یونٹی کانفرنس کے ریزولیوشنوں کی بھی اسی طرح تبلیغ کی جائے۔ اس سلسلہ میں قوم ورانہ مسئلہ پر کانگریس کی اصلاحوں اور دوسری کانفرنسوں کے ریزولیوشنوں کو زیر نظر رکھا جائے۔
3- اچھوتوں میں کام کیا جائے۔
4- صنعتی، زرعی اور مزدور انجمنوں کی تنظیم۔
5- دیگر دیہاتی تنظیمیں۔
6- بیرونی کپڑے کا بائیکاٹ اور دیسی کپڑے کو مقبول بنانا۔

7- ان مجلسی رسومات کے خلاف مہم کا آغاز جو مجلسی میل جول اور قومی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور بالخصوص پردہ اور عورتوں پر دیگر پابندیوں کے خلاف جہاد۔

8- افیم کی لعنت اور شراب نوشی کے خلاف زبردست مہم۔

9- پبلسٹی۔

یادرہے کہ یہ زیادہ تر مجلسی پروگرام ہے۔ مجھے اس بات کا کوئی دعویٰ نہیں کہ میں ان تنقیحات کا خود موجد ہوں۔ میں نے انھیں ماسوائے پہلی کے اس طویل فہرست سے چنا ہے جو کافی عرصہ سے ملک اور کانگریس کے سامنے تھی۔ آپ مجھے معاف کریں اگر میں یہ کہوں کہ ہم نے اب تک کوئی قابل ذکر تعمیری کام نہیں کیا۔ یہ پروگرام یوں تو سیدھا سادھا معلوم دیتا ہے۔ لیکن اصل میں یہی ایک ایسا پروگرام ہے جس پر مکمل آزادی کے اور درجہ نوآبادیات کے حامی اپنی امیدیں قائم کر سکتے ہیں۔ اوّل الذکر لوگوں کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ منزل مقصود کی طرف جو اوّل قدم انھیں اٹھانا پڑے گا اسے جانچنے کا اندازہ یہ ہے کہ وہ اس بظاہر معمولی سے کام کو کس حد تک کامیابی سے سرانجام دیتے ہیں۔ مؤخر الذکر لوگوں کو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر انھیں درجہ نوآبادیات حاصل کرنے کا کوئی موقع میسر ہو سکتا ہے تو صرف اس پروگرام کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنانے کی صورت میں۔

اگر ہم کو خلوص سے کام کرنا ہے تو بے بہا روپیہ اور منظم کام نہایت ضروری چیزیں ہیں۔ یہ کسی خاص تنظیم یا فرد کا کام نہیں۔ بلکہ ان تمام جماعتوں اور افراد کا فرض ہے جو اپنے دل میں آزادی کے لیے ذرا بھر بھی آرزو رکھتے ہیں۔ کنونشن میں تمام جماعتوں کے نمائندے موجود تھے۔ اس میں امراء، متوسط الحال اور غریب سبھی شامل تھے۔ امراء اپنی فالتو دولت کی قربانی دیں۔ متوسط الحال جمع کی ہوئی دولت کی اور غریب اپنے روزینہ کی۔ ہندستانی والیان ریاست کو بڑی بڑی رقوم دے کر اس بات کا ثبوت بہم

پہچانا چاہئے کہ واقعی انھیں ملک کے عوام الناس سے ہمدردی ہے جس کا وہ عموماً اعلان کرتے رہتے ہیں۔ پروگرام کے مجلسی حصہ میں سب لوگ یہاں تک کہ سرکاری ملازم بھی حصہ لے سکتے ہیں۔لیکن کیا حکومت انھیں اس بات کی اجازت دے گی؟ یہ کسوٹی ہے جس پر ہندستان اور انگلستان کے مدبرین کی ان نیک خواہشات کو پرکھا جاسکتا ہے جن کے وہ عام طور پر ڈھنڈورے پیٹتے رہتے ہیں۔حکومت کا یہ فرض ہے کہ اگر وہ اپنے دعوؤں میں سچی ہے تو اس بات کا برملا اعلان کردے کہ والیان ریاست، بڑے بڑے تاجر اور سرکاری ملازم مجلسی کام میں حصہ لے سکتے ہیں۔اس وقت حکومت کو اس کے برعکس مخفی ہدایات اور پس پردہ احکامات نہ جاری کرنے چاہئیں۔انگریزی بنکوں کو وعدہ کرنا چاہئے کہ وہ ہندستانی تجارتی اور صنعتی اداروں پر اپنے دروازے بند نہ کردیں گے۔ اور مجھے امید ہے کہ مجلسی کام کے لیے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک کثیر رقم جمع ہوجائے گی۔

مگر ہم کانگریسیوں کو برطانوی نوکرشاہی اور ان لوگوں کی نیک خواہشات پر تکیہ لگا کر نہیں بیٹھ رہنا چاہئے جو اس نوکرشاہی کو برسراقتدار رکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ حقیقی کام کانگریس کے ممبران نے ملک کی ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر خود سرانجام دینا ہے۔

اب میں کانگریس سے متعلق متعدد شقوں کی جانچ پڑتال شروع کرتا ہوں۔ شق 1 و 2 کسی تشریح کی محتاج نہیں۔آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے ان شقوں کو قوم ورانہ سفارشات تک محدود رکھا ہے۔ یہ ایسے نکات ہیں جن پر ہم میں کوئی اختلاف نہیں۔چنانچہ اس سے اس کام کی اہمیت بالکل واضح ہے۔

جہاں تک اچھوت پن کا تعلق ہے۔اس کے متعلق کہا تو بہت کچھ گیا ہے۔مگر کیا کچھ بھی نہیں گیا۔میری رائے میں ہر کانگریسی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تمام قابلیت کے

ساتھ اس کام میں نہایت سرگرمی سے حصہ لے۔ کانگریسیوں کو اچھوت پن کا بالکل قصہ پاک کر دینا چاہئے اور جو کانگریسی کسی اچھوت کو اپنے مساوی درجہ دینے کو تیار نہیں اسے کسی کانگریس جتھہ بندی کا ممبر ہونے کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔ آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن اس ضمن میں اچھا کام کر رہی ہے۔ لیکن اسے اور مدد کی ضرورت ہے۔ حفظانِ صحت پر تقریروں اور دیہاتوں میں باہمی تعاون کی روح پیدا کرنے کی خاطر دیہاتی کمیٹیوں کے قیام سے یہ کام اور آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

شق 6 و 7 صرف ہندستان کی عورتوں سے متعلق ہے۔ اور میں انہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ کانگریس کے لیے اپنی خدمات پیش کریں۔

کسی پروگرام کی کامیابی کے لیے ان مجلسی مہمات کے خلاف زبردست مہم جاری کرنے کی ضرورت ہے جنھوں نے ہماری قومی ترقی اور مجلسی میل جول کے راستہ میں دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ پردہ اور عورت پر دوسری پابندیاں ایسی لعنت ہے جسے ہمیں بلا تاخیر ختم کر دینا چاہئے۔ اگر عورتیں مردوں کا احسن حصہ ہیں تو مردوں کا فرض ہے کہ وہ قومی بھلائی کے کام میں ان کی پوری پوری مدد کریں۔ پردہ سے نجات پانے اور گھریلو زندگی کو منظم کرنے کے لیے روپیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں ہر فرد کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

اس خطبہ میں ان باتوں پر اور زیادہ تفاصیل میں جانا ممکن نہیں۔ البتہ میں اس بات کی سفارش کروں گا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے آپ کو کئی سب کمیٹیوں میں منقسم کر لے۔ ہر ایک کمیٹی کا صدر کانگریس کی مجلس عاملہ کا ممبر ہو۔ جس کے سپرد ان میں سے ایک آدھ شق کر دی جائے۔ اصلی کام اسی نوعیت کی سب کمیٹیاں سرانجام دیں گی جو آل انڈیا کانگریس کی سب کمیٹیوں کی ہدایات کے مطابق کام کریں گی۔ باقی تفصیلات پر غور و خوض کانگریس کی مجلس عامہ پر اٹھا رکھنا چاہئے۔

یہ تمام پارٹیوں کے لیے ایک عام پروگرام ہے۔ یہ ان کے نکتہ نظر سے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کانگریس کی نظروں میں۔ اور میرے پاس اس بات پر یقین کرنے کی کافی وجوہات موجود ہیں کہ وہ اس کی پوری پوری مدد کریں گی۔ اگر ہم سب نے دیانت داری سے اس کام کو سرانجام دیا تو منزل مقصود سامنے آجائے گی۔ کانگریسیوں کے لیے عدم تشدد و عدم تعاون کا کام ایک ایسا فریضہ ہے۔ جس سے وہ اس وقت تک دامن نہیں چھڑا سکتے جب تک کوئی اس سے زیادہ سرگرم پروگرام کانگریس کے سامنے نہیں آجاتا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور باردولی نے ہمیں دکھادیا ہے کہ وہ عملی کام ممکن ہے اور اسے کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ آپ نے ہمیں دکھادیا ہے کہ دیہاتیوں میں صبر سے کام کرنے کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ میں سردار موصوف اور آپ کے مرد و عورت بہادر رفیقوں کی خدمت میں ہدیہ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ہمیں اپنے سمندر پار بھائیوں کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ اگرچہ مسٹر وی۔ ایس شاستری کے اہم کام نے جنوبی افریقہ میں حالات قدرے سازگار بنادیے ہیں۔ مگر اب بھی وہاں حالت ایسی ہے کہ ہمیں ہر وقت خبردار رہنا چاہئے۔ کنیا کی حالت دن بدن زیادہ سنجیدہ ہو رہی ہے۔ اور اس سے وہاں کے آبادکار ہندستانیوں کی ہستی کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ یہ وہ ہندستانی آبادکار ہیں جو اس وقت افریقہ میں جا کر آباد ہوئے کہ جب ان یورپینوں کا وہاں وجود نہ تھا جنھیں آج افریقہ میں مسرت افزا زندگی حاصل ہے۔ دیگر مقامات پر بھی ہمارے ہم وطنوں پر برطانوی لوٹ کھسوٹ ویسے ہی اپنا رنگ دکھا رہی ہے جس طرح کہ وہاں کے آبائی باشندوں پر لیکن ان کو فراموش کیے بغیر جو بہترین مدد ہم ان کو دے سکتے ہیں وہ سر فیروز شاہ مہتہ کے الفاظ میں یہاں آزادی حاصل کرنا ہے۔

میں نے یہاں صرف ان باتوں کو آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے جو میری نظروں

میں اس وقت صورت حالات کا نچوڑ ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے میں نے ان فرائض کو سرانجام دینے کی کوشش کی ہے جن کو میرے ضمیر نے اس موقع پر ملک کے لیے ضروری تصور کیا ہے۔ میرے خیالات شاید آپ کو اور بالخصوص نوجوانوں کو قبول نہ ہوں۔ مجھے ان کی بے صبری کا پورا احساس ہے۔ ہمیں صبر اور بے صبری دونوں کی ضرورت ہے۔ صبر کی ان لوگوں کے لیے ضرورت ہے جن سے ہم اختلاف رکھتے ہیں۔ اور بے صبری کی خود اپنے لیے ضرورت ہے۔ مجھے نوجوانوں کے تصورات اور اس عملی کام سے کوئی جھگڑا نہیں جو انھوں نے اپنے لیے مرتب کر رکھا ہے۔ مجھے ان سے اتفاق ہے کہ ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ اور شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جانا چاہیے لیکن اس کام کو سرانجام دینے کا طریقہ لمبا اور خشک ہے۔ وہ خود اسے تسلیم کرتے ہیں اور انھوں نے خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بوڑھوں اور نوجوانوں کے سامنے ایک سا کام ہے۔ فرق صرف ذہنیت کا ہے۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ ہر طرح سے اپنی ذہنیت کو برقرار رکھیں۔ لیکن انھیں اس بات کا خیال رہے کہ اس مادر وطن کی خاطر جس کی وہ خدمت کرنا چاہتے ہیں اپنے آپ کو گروہوں اور پارٹیوں میں منتشر نہ ہونے دیں۔ بوڑھوں کو بھی میں یہی مشورہ دوں گا۔ انھیں مہاتما گاندھی اور دیش بندھو داس چیٹر جی کے ان دانش مندانہ الفاظ کو یاد رکھنا چاہیے کہ جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ عوام کو روٹی چاہیے۔ لیکن ان کے پاس نت نئے تجربات کے لیے کوئی وقت نہیں۔ اور باہر سے وارد شدہ نظریات سے انھیں کوئی فائدہ نہیں۔

میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ آپ نے صبر کا ثبوت دیا ہے۔ میری حقیر خدمات ان کی جو بھی کچھ قیمت ہو آپ کے سپرد ہیں۔ ہمیں اپنے اختلافات مٹا دینے چاہئیں۔ ہمیں شانہ بہ شانہ آگے بڑھنا چاہیے۔ اور فتح ہمارے قدم چومے گی۔

بندے ماترم

پنڈت جواہر لال نہرو

لاہور ——————— 1929ء

رفیقو! یہ نیشنل کانگریس جو چالیس سال سے ہندستان کی آزادی کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس نے اگر چہ بتدریج مگر نہایت پختہ طور پر قومی احساس کی اس روح کو جو اس سے پیشتر غفلت کی گہری نیند سو رہی تھی، بیدار کر دیا ہے اور قومی تحریک کی ایک عمارت کھڑی کر دی ہے۔ آج اگر ہم اپنی قسمت کے اس نازک مرحلہ پر اس جگہ اکٹھے ہوئے ہیں تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے دلوں میں اپنی کمزوریوں اور اپنی طاقت کا احساس کرتے اور مستقبل کو امید وبیم کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ان لوگوں کو یاد کریں جو آج ہم میں موجود نہیں۔ اور جنھوں نے اپنی زندگیاں کسی معاوضہ کی امید سے بے نیاز ہو کر قربان کر دیں۔ یہ اس لیے کہ جو ان کے بعد آئیں وہ کامیابی کے پھلوں سے لطف اندوز ہوں۔ وہ ہمارے پرانے جانباز آج ہم میں موجود نہیں۔ عین ممکن ہے۔ ہم ان سے بعد میں آنے والے ان کی شخصیتوں کی شہرت پر کھڑے ہو کر انھیں فراموش کر دیں۔ زمانہ کا یہی طور ہے۔ مگر تم میں سے کوئی بھی نہ تو انھیں بھول سکتا ہے اور نہ ہی ان کے اس کام سے آنکھیں بند کر سکتا ہے جو انھوں نے آزاد ہندستان کی بنیادیں استوار کرنے میں سرانجام دیا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ان عظیم الشان مردوں اور عورتوں کے گروہ کو فراموش نہیں کر سکتا جنھوں نے نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اجنبی اقتدار کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ جور وجبر کا مقابلہ

کیا۔ مصائب برداشت کیے اور احتجاج کرتے ہوئے اپنی پرشباب زندگیاں اور حسین جوانیاں وطن پر نثار کردیں۔ ان میں اکثر ایسے ہیں جن کے نام تک ہم کو معلوم نہیں وہ خاموش اپنے کام میں مصروف رہے۔ وہ لوگوں کی تحسین وتعریف سے بے نیاز تھے۔ مگر یہی وہ لوگ جنھوں نے اپنے خون جگر سے شجر آزادی کی آبیاری کی جب کہ ہم میں سے اکثر کی یہ کیفیت تھی کہ ہر طرح سے بیچ بچاؤ کرتے رہے اور صلح سمجھوتوں سے جانیں بچانے میں مصروف رہے۔ انھوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا کہ آزادی لوگوں کا حق ہے اور دنیا پر آشکارا کردیا کہ ہندستان اس گئی گزری حالت میں بھی زندگی کا شرر رکھتا ہے۔ اس لیے کہ ہندستان نے ظلم وغلامی کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا ہماری قومی تحریک کا گھر ایک ایک اینٹ جوڑ کر تعمیر ہوا ہے۔ اور اکثر تو ہندستان نے اپنے شہیدوں کے سرنگوں جسموں پر ترقی کی ہے۔ پرانے بہادر آج ہمارے ساتھ نہ ہوں مگر ان کا عزم اور ان کی ہمت آج بھی ہمارے ساتھ ہے اور ہندستان نے اب بھی جتندر ناتھ داس اور وجیا جیسے شہید پیدا کیے ہیں۔

یہ ہے ہماری شان دار میراث جو ہمیں ترکہ میں ملی ہے۔ آپ آج اس کی باگ ڈور میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے یہ عزت آپ کی سوچی سمجھی تجویز سے حاصل نہیں ہوئی۔ یہ تو محض اتفاق سے ایسا ہوگیا ہے۔ آپ کی خواہش تو کسی اور کو منتخب کرنے کی تھی۔ یعنی اس فرد کو جس کی شخصیت ہماری آج کی دنیا میں ہم سب سے بلند اور بالاتر ہے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو اس سے بہتر اور کوئی انتخاب نہ ہوتا۔ مگر قدرت اور اس نے مل کر سازش کی اور مجھے میری اور آپ کی مرضی کے خلاف اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ کیا میں آپ کا اس بات کے لیے شکریہ ادا کروں؟ کہ آپ نے مجھے اس معمہ میں پھنسا دیا ہے۔ البتہ میں آپ کے اس اعتماد کا ضرور شکر گزار ہوں جس کا اظہار آپ نے میری ذات میں کیا ہے۔ لیکن جس سے

آپ خود محروم ہیں۔

آپ کو بہت سے ایسے اہم قومی مسائل پر غور کرنا ہے جن سے آج ہمیں پالا پڑ رہا ہے۔ آپ کا فیصلہ شاید ملک کی قسمت بدل دے لیکن آپ ہی ایسے لوگ نہیں کہ جنہیں ان مسائل سے دو چار ہونا پڑ رہا ہے۔ آج تمام عالم ہمہ تن سوال بنا ہوا ہے۔ اور ہر ملک اور ہر فرد تغیرات کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ایمان و یقین کا دور دورہ ختم ہوا اور ان کی لازمی پیداوار آرام و ثبات بھی کل کی بات بن گئے۔ اب ہر چیز کے متعلق استفسارات اور سوالات کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ چیزیں ہمارے آبا و اجداد کو کتنی ہی مقدس اور مستقل معلوم ہوئی ہوں اب ہر جگہ ان کے متعلق شکوک اور بدگمانی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ریاست اور سماج کی بنیادیں تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہیں۔ آزادی، انصاف، ملکیت اور خاندانی روابط کے پرانے تصورات پر حملے ہو رہے ہیں۔ اور دنیا ابھی ان کے متعلق کسی دوٹوک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تاریخ کے تغیر پذیر دور سے گزر رہے ہیں۔ جب کہ دنیا ایک کوفت میں مبتلا ہے جس سے وہ ایک نئے نظام کو جنم دے گی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ مستقبل ہمارے لیے کیا لائے گا۔ البتہ ایک بات ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ایشیا اور بالخصوص ہندستان آنے والے وقت میں عالم گیر پالیسی کی تشکیل میں فیصلہ کن پارٹ ادا کرے گا۔ یورپی غلبہ کا مختصر دورانیہ زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے۔ یورپ کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا فاتحہ پڑھا جا چکا ہے۔ اور اب اسے اس اعتبار سے وہ مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ نامکمل اور جھوٹی تواریخی کتابوں سے متاثر ہو کر ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یورپ ہمیشہ باقی دنیا پر غالب رہا ہے اور یہ کہ ایشیا نے مغربی سیلاب کی یلغار سے نقصانات اٹھائے ہیں۔ ہم یہ بھی بھول چکے ہیں کہ ایشیائی افواج نے ہزارہا سال تک یورپ کو تہ و بالا کیا اور آج کا

یورپ بذاتہ ان حملہ آوروں کی اولاد ہے جنھوں نے ایشیا سے اٹھ کر یورپ پر حملے کیے۔ ہم یہ بھول چکے ہیں کہ سکندر اعظم کی عسکری طاقت کا آخری طور پر جنازہ اٹھانے والا ہندستان ہی تھا۔ بلاشبہ خیالات کی برتری ایشیا اور بالخصوص ہندستان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ عمل کے میدان میں بھی ایشیا کا ریکارڈ یورپ سے بھاری ہے۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اب ایشیا یا یورپ کی افواج ایک یا دوسرے براعظم کو تہ وبالا کریں۔ ہم سب اس کا خوب تماشا دیکھ چکے ہیں۔

آج ہندستان بین الاقوامی تحریک کا ایک جز ہے۔ چین، ترکی، ایران اور مصر پر ہی موقوف نہیں کہ وہ اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں بلکہ روس اور مغرب کے کئی اور ملک بھی اپنے آپ کو اس تحریک سے وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ ہندستان اپنی ذات کو اس سے علیٰحدہ نہیں رکھ سکتا۔ ہمارے سامنے اپنے مخصوص مسائل ہیں۔ وہ نہایت پیچیدہ اور دشوار ہیں۔ مگر ہم ان سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم دنیا کو نظر انداز کرتے ہیں تو خود ہی خسارے میں رہتے ہیں۔ تہذیب آج جس شکل میں کہ وہ ہے کسی ایک قوم یا ایک فرد کا اجارہ یا پیداوار نہیں۔ یہ ایک ایسی عمارت ہے جس کی تعمیر میں تمام دنیا نے ہاتھ بٹایا ہے۔ اور پھر ہر ایک ملک نے اسے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ آج اگر ہندستان نے دنیا کو کوئی پیغام دینا ہے تو اس نے دوسرے لوگوں سے بہت کچھ سیکھنا بھی ہے۔

آج جب کہ ہر چیز تبدیل ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی تواریخ کے طویل سلسلہ کو اپنے سامنے رکھیں۔ ہندستان کی مجلسی ساخت کی حیرت آمیز مضبوطی کی نسبت شاید ہی کوئی اور چیز زیادہ حیران کن ہو۔ یہ ایسا مجلسی ڈھانچہ ہے کہ جس نے ہزار سال تک اجنبی تصادمات اور تغیرات کا مقابلہ کیا۔ وہ ایسا کرنے میں اس لیے کامیاب رہا کہ اس نے ان اجنبی عناصر کو ہمیشہ برداشت کرنے اور اپنے اندر

جذب کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ انھیں برباد کردے یا انہیں ملک سے نکال کر دم لے۔ اس کے سامنے صرف یہ نصب العین تھا کہ مختلف تمدنوں میں توازن برقرار رہے۔ آرین اور غیر آرین اس سرزمین پر آکر آباد ہوئے انھوں نے ایک دوسرے کے تمدن کے حق کو تسلیم کیا۔ اسی طرح پارسی اور دوسرے اجنبی لوگ جو بھی ہندستان میں وارد ہوئے ہندستان نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں اپنے مجلسی نظام میں جگہ دی۔ مسلمانوں کی آمد سے اگرچہ یہ توازن قائم نہ رہ سکا پھر بھی ہندستان نے اسے برقرار رکھنے کی پوری پوری کوشش کی اور وہ اس مقصد میں کامیاب رہا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ پیشتر اس کے کہ ہم اپنے اختلافات کو دور کرسکتے ملک کی سیاسی ساخت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ انگریز وارد ہوئے اور ہم سر کے بل گر پڑے۔

ہندستان کی یہ بھاری کامیابی تھی کہ وہ ہمیشہ ایک مضبوط اور پختہ سماج برقرار رکھ سکا۔ لیکن تاریخ کے اس مرحلہ پر اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ وہ ناکام بھی ہوا تو نہایت اہم موقع پر آکر۔ وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ مساوات کے لیے کوئی حل نہ تلاش کیا گیا۔ ہندستان نے دانستہ طور پر اس بات کو نظر انداز کردیا۔ اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ نئے مجلسی نظام کی بنیادیں نابرابری پر رکھی گئیں۔ اس افسوس ناک طریق کار کا خمیازہ ہم اب ان لوگوں کے وجود میں بھگت رہے ہیں جنھیں کل تک ظلم وجبر کا شکار بنایا جاتا رہا اور جن کے ترقی پانے کے بہت کم امکانات ہیں۔

پھر بھی ایسے وقت میں جب کہ یورپ اپنی مذہبی لڑائیوں میں سرگرم تھا اور عیسائی اپنے نجات دہندہ کے نام پر ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگ رہے تھے ہندستان میں رواداری اور برداشت کا دور دورہ تھا جو آج بدقسمتی سے موجود نہیں۔ جب یورپ تھوڑی بہت آزادی حاصل کرچکا تو اس نے اپنی توجہ سیاسی وقانونی مساوات حاصل کرنے کی طرف مبذول کی۔ اور اب جب اسے سب کچھ حاصل ہوچکا ہے۔ تو وہ

اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اقتصادی آزادی کے بغیر یہ سب چیزیں بے کار ہیں۔ لہٰذا آج سیاسیات کی بھاری اہمیت فوت ہو چکی ہے اور یورپ کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اسے اقتصادی اور مجلسی مساوات کیوں کر حاصل ہو۔

ہندستان کو بھی اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ جب تک وہ ایسا نہیں کر لیتا اس کے سیاسی اور مجلسی ڈھانچے مضبوط نہیں ہو سکتے۔ یہ ضروری نہیں کہ حل کی تلاش میں ضرور کسی دوسرے ملک کی تقلید کی جائے۔ ہم یہ حل اس طرح تلاش کر سکتے ہیں کہ اس کی بنیادیں ہندستانیوں کی سمجھ اور عقل و شعور پر قائم کریں۔ ایسا حل ہندستان کے تمدن اور روایات کی پیداوار ہونا چاہئے۔ صرف اس طریقہ سے ہم اسے پختہ شکل دے سکیں گے۔ جب ایک بار ایسا حل ڈھونڈ لیا گیا تو مختلف اقوام کے وہ ناگوار اختلافات جنھوں نے آج ہمیں پریشان کر رکھا ہے اور جو ہمیں آزادی سے دور کیے ہوئے ہیں خود بخود دور ہو جائیں گے۔

حق بات تو یہ ہے کہ اختلافات تو پہلے ہی رفع ہو چکے ہیں۔ البتہ ایک دوسرے کا خوف، شکوک و شبہات اور بداعتمادی ضرور موجود ہے۔

یہی وہ عناصر ہیں جو جھگڑوں کا بیج بوتے ہیں۔ ان شکوک و شبہات کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے سال آل پارٹیز کمیٹی کے ذریعہ ایسا کرنے کا مخلصانہ اقدام اٹھایا گیا تھا۔ اور منزل مقصود کی طرف چند قدم بھی اٹھائے گئے۔ مگر افسوس کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان مساعی کو کامیابی کا سہرا نصیب نہیں ہوا۔ ہمارے بہت سے مسلمان اور سکھ دوستوں نے اس حل کی مخالفت کی اور وہ اعداد و شمار اور نسبت تناسب کے حساب کی رو میں بہہ گئے۔ منطق اور دلائل پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر شکوک و شبہات کا مقابلہ کرنے کے بہترین ہتھیار ہیں۔ اعتماد اور فیاضی سے ان پر غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ میں یہاں صرف اس امید کا اظہار کر سکتا ہوں کہ مختلف

اقوام کے راہ نما اس فیاضی اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ جب تک ہم سب غلام ہیں۔ ہم اپنی قوم یا اپنے لیے کیا حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہم ایک بار ہندستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر کے آزادی کا سانس لیں تو اس سے ہمیں کیا گھاٹا ہوگا۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ اجنبی لوگ ہمارے معمولی معمولی حقوق اور چھوٹی چھوٹی مراعات کے محافظ بن کر یہاں موجود رہیں۔ جب کہ وہ ہمیں ہمارا حق آزادی دینے سے منکر ہیں۔ کوئی اکثریت کسی ایسی اقلیت کو دبا نہیں سکتی جس میں زندگی کا حوصلہ موجود ہو۔ اور کوئی اقلیت آئین ساز اسمبلیوں میں چند ممبران کے اضافہ سے اپنے حقوق نہیں محفوظ رکھ سکتی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ آج تمام دنیا میں ایک چھوٹی سی اقلیت، دولت اور طاقت پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔

میں نہ تو مذہب میں تعصب اور رازعانی اصولات کا قائل ہوں اور نہ ہی فرقہ پرستی کو کسی ایک یا دوسری شکل میں پسند کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ کمزور ہو رہے ہیں۔ میرے لیے اس بات کی تعریف کرنا مشکل ہے کہ سیاسی و اقتصادی حقوق کا دارومدار کیوں کسی ایک قوم کے افراد یا گروہ پر ہو۔ مجھے مذہبی آزادی کا پورا اعتراف ہے۔ میں اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ افراد کو اپنے تمدن کے تحفظ کا حق حاصل ہے اور ہمارے ملک میں جس نے ہمیشہ ان حقوق کا احترام کیا۔ انھیں قائم رکھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ان شکوک وشبہات کے بنیادی اسباب معلوم کرنے کی سعی کریں۔ جنھوں نے آج کرۂ ہوائی کو مکدر بنا رکھا ہے۔ غلام افراد کی سیاسیات خوف ونفرت پر قائم ہوتی ہے۔ اور ہم اتنے عرصہ سے غلام ہیں کہ ان سے نجات پانا آسان کام نہیں۔

میں ہندو پیدا ہوا۔ لیکن میں کہہ نہیں سکتا کہ میں اپنے آپ کو ہندو یا یہ کہنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں کہ میں ہندوؤں کا نمائندہ ہوں۔ بااین ہمہ اس دیس

میں پیدائش کو بہت بڑی حد تک اہمیت حاصل ہے میں ہندوؤں کے رہنماؤں سے یہ گزارش کرنے کی کوشش کروں گا کہ فیاضی کے میدان میں سبقت لے جانے کا طرۂ امتیاز انھیں حاصل ہونا چاہئے۔ فیاضی نہ صرف اعلیٰ اخلاقی فرض ہے بلکہ عام طور پر اچھی سیاست اور معقول مصلحت وقت بھی ہے۔ میرے لیے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ آزاد ہندستان میں ہندو بے دست و پا ہوں گے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اپنے مسلمان اور سکھ دوستوں سے کہوں گا کہ جو کچھ وہ مجھ سے لینا چاہتے ہیں بلا احتجاج اور ہنسی خوشی لے لیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ وقت دور نہیں جب ان ناموں اور امتیازات کی کوئی اہمیت نہ رہے گی اور جب ہماری جدوجہد کی بنیادیں اقتصادی مطالبات ہوں گے اس لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس دوران میں ہم کون سی شرائط پر صلح کرتے ہیں۔ البتہ ایک بات بہت اہم ہے وہ یہ کہ ہم ایسی دیواریں نہ کھڑی کر دیں کہ جو ہماری آئندہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوں۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم آل پارٹیز رپورٹ پر امیدیں لگائے نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ ہم نے اس رپورٹ کو ایک طرف رکھ کر بلا روک ٹوک منزل مقصود کی طرف بڑھنا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ کانگریس نے ایک ریزرویشن کے ذریعہ حکومت کو ایک سال کا وقت دیا تھا کہ وہ اس دوران میں آل پارٹیز رپورٹ کو اپنا لے۔ وہ سال اب قریباً قریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب اس فیصلہ کی روشنی میں ہمارے سامنے ضروری مسئلہ یہ ہے کہ ہم آزادی کے حق میں اعلان کر دیں اور آپ اس بات کی اجازت دیں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے مناسب ذرائع اختیار کرنے کا کام شروع کر دیا جائے۔

حال ہی میں صلح کے لیے ایک پیش کش ہوئی ہے۔ وائسرائے صاحب نے برطانوی حکومت کی طرف سے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہندستانی راہ نماؤں کو اس امر کی دعوت دی جائے گی کہ وہ ہندستان کے آئندہ آئین سے متعلق حکومت کے

ساتھ بات چیت کریں۔ حضور وائسرائے کا مقصد نیک ہے اور اعلان کی زبان مصالحت آمیز ہے لیکن وائسرائے صاحب کی خلوص دلی اور مصالحانہ زبان ان کھلے حقائق کا بدل نہیں ہوسکتی جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ ہم برطانوی ڈپلومیسی کے گمراہ کن طریقوں کا بہت زیادہ تجربہ کر چکے ہیں۔ اب ہم ان کے دام فریب میں نہیں آسکتے۔ برطانوی سرکار کی پیش کش بہت مبہم ہے۔ اس میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی گئی اور نہ اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ہاں اگر ہم تصورات کی اونچی فضا میں اڑنے لگیں تو اس سے یہ مفہوم منسوب کر سکتے ہیں کہ یہ کلکتہ ریزولیشن کا ممکن جواب ہے۔

اس اعلان کے فوراً بعد مختلف سیاسی پارٹیوں کے راہ نما اکٹھے ہوئے اور انھوں نے اس اعلان پر غور وخوض کیا۔ انھوں نے اس کو زیادہ سے زیادہ کھلے معنوں میں لینے کی کوشش کی اس لیے کہ وہ امن وصلح کے آرزومند تھے اور وہ اسے اپنے مطالبات کا نصف حصہ بھی سمجھ کر قبول کر لینے کو تیار تھے۔ انھوں نے نہایت مصالحانہ الفاظ میں بتادیا کہ کیا باتیں ضروری ہیں جو اگر اس اعلان میں موجود ہوتیں تو اسے قبول کرلیا جاتا۔ ہم میں سے اکثر کو جو ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور جن کا یہ پختہ خیال ہے کہ یہ پیش کش ہمیں گمراہ کرنے اور ہماری صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے کی گئی تھی ان کے اس فیصلہ سے انتہائی دکھ ہوا۔ کیا ہم ایسے وقت میں کہ جب باعزت سمجھوتہ کا بظاہر ذرہ بھر بھی امکان موجود تھا اس خوف ناک قومی جدوجہد کو عجلت سے جاری کرنے میں حق بجانب ہوتے جس کی پیروی میں اکثر افراد کو اس کے ناگزیر نتائج کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہم نے اپنے دل کی اس طرح پوری کھوج کر لینے کے بعد اس منشور پر دستخط کیے اور آج میں نہیں جانتا کہ ہم نے ٹھیک کیا یا غلط۔ بعد ازاں برطانوی پارلیمنٹ میں اس کی مزید تشریح کی گئی۔ اس کے بعد اس پیش کش سے متعلق ہمارے

دلوں سے تمام شکوک (اگر کوئی تھے) رفع ہو گئے۔ پھر بھی آپ کی ورکنگ کمیٹی نے گفت وشنید کے دروازے کھلے رکھے اور آخری فیصلہ اس کانگریس پر چھوڑ دیا۔ کہ وہ جو مناسب سمجھے طریقے کار اختیا کرے۔

چند دن ہوئے برطانوی دارالعوام میں اس موضوع پر ایک اور بحث ہوئی جس میں سیکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے اس بات کی طرف توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی کہ تمام برطانوی حکومت نے قول وفعل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندستان سے متعلق ان کے ارادے نیک ہیں۔ ہمیں مسٹر وبج ڈربن کی اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ وہ ہندستان کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہایت بے صبری سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ انھیں ہندستانیوں کی ہمدردی حاصل ہو سکے اس کے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی اور دوسرے لوگوں کی پارلیمنٹ میں تقریریں ہمیں امید کی کوئی روشنی نہیں دکھا سکیں۔ ''درجہ نو آبادیات کا تدریجی عمل'' ہمارے لیے ایک پھندا تھا اور اس کے نفاذ کے باجود ہندستان کی اقتصادی لوٹ کا بالکل خاتمہ نہیں ہوا۔ اس برسرعمل درجہ نو آبادیات کے طفیل اور آج سے دس سال پیشتر کی نافذ شدہ اصلاحات کی بدولت ہندستانی عوام الناس کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ لندن میں ہائی کمشنر، جمعیت اقوام میں نمائندگی، اشیاء کی خرید، ہندستانی گورنروں اور افسران کا قیام ہمارے مطالبات کا کوئی جز نہیں ہیں۔ ہم ہندستانی غریب لوگوں کی اقتصادی لوٹ کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صحیح معنوں میں طاقت حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ دفاتر کی نوکریاں اور ملازمتیں ہمارا نصب العین نہیں۔ مسٹر ڈربن نے پچھلے دس سالوں کے کارہائے نمایاں کا ذکر کیا ہے۔ لارڈ موصوف اس میں پنجاب کے مارشل لا، جلیاں والا باغ کی گولہ باری اور ہندستان کی اس اقتصادی لوٹ سے اضافہ کر سکتے تھے جو اس برسرعمل درجہ نو آبادیات میں جاری ہے۔ انھوں نے ہمیں اصل حقیقت

سے آشنا کر دیا ہے کہ درجہ نوآبادیات کا مدعا کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے معدودے چندافراد کے ہاتھوں میں نام نہاد طاقت اور عوام پر ظلم، جور و جبر۔

یہ کانگریس جس کا اجلاس آج یہاں منعقد ہو رہا ہے، کس راہ پر گامزن ہوگی۔ تعاون کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ کیا ہم تعاون کر سکتے ہیں؟ جب تک ہمیں اس بات کی ضمانت نہ دی جائے کہ ہمیں حقیقی آزادی تفویض کی جائے گی۔ کیا ہم تعاون کر سکتے ہیں؟ جب کہ ہمارے ساتھی جیلوں میں بند ہیں اور تشدد بدستور جاری ہے۔ کیا ہم تعاون کر سکتے ہیں جب تک ہمیں اس بات کا یقین نہ دلایا جائے کہ برطانیہ سچے دل سے امن کا خواہاں ہے اور اس صلح کا مطلب ہم سے وقتی طور پر مطلب براری نہیں۔ صلح بنوکِ تلوار نہیں ہو سکتی۔ اگر اجنبی اقتدار ہم پر قائم رہنا ہے تو ایک بات صاف ہے کہ ہم اسے قبول نہیں کرتے۔ اگر کلکتہ ریزولیشن برقرار ہے تو ہمارے سامنے ایک ہی نصب العین ہے۔ وہ نصب العین ہے" آزادی"۔ آج آزادی حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں کیوں کہ اس کا مطلب ہے علیٰحدگی اور تنہائی۔ یہ تہذیب محدود قومیت پسندی کے خوب مزے چکھ چکی ہے اور اب وہ باہمی تعاون اور اعتماد کی طرف مائل ہے۔ ہم اگر آزادی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مقصد اس وسیع نصب العین سے جداگانہ نہیں۔ ہمارے لیے آزادی کا مطلب برطانوی اقتدار اور غلبہ سے نجات حاصل کرنا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندستان بلاشبہ بین الاقوامی تعاون اور فیڈریشن کے تمام اقدامات کو خوش آمدید کہے گا۔ اور یہاں تک کہ اسے اپنی آزادی کا ایک حصہ اس بڑے گروہ کے سپرد کرنے میں بالکل کوئی تامل نہ ہوگا۔ جس کا وہ خود ممبر ہوگا۔

آج برطانوی سلطنت ایسا گروہ نہیں ہے اور یہ اس وقت تک ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ وہ لاکھوں لوگوں پر غلبہ اور کرۂ ارض کے وسیع حصہ پر اس جگہ کے رہنے والوں

کی مرضی کے خلاف قبضہ قائم کیے ہوئے ہے ۔ یہ اس وقت تک صحیح معنوں میں کومنویلتھ نہیں ہوسکتی جب تک اس کی بنیادیں شہنشاہیت پر قائم ہیں اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوراک دوسروں کی لوٹ کھسوٹ ہے ۔ بلاشبہ آج برطانوی شہنشاہیت سیاسی طور پر زوال اختیار کر رہی ہے۔ اب اس کی حالت پختہ نہیں ۔ یونین آف ساؤتھ افریقہ اس گھر کا پسندیدہ رکن نہیں ۔ یہی حالت آئرش فری اسٹیٹ کی ہے۔ مصر اس سے اپنا پلہ چھڑا رہا ہے۔ ہندستان اس وقت تک اس کومنویلتھ کا مساوی حیثیت سے رکن نہیں بن سکتا جب تک شہنشاہیت اور اس کے لوازمات کا قلع قمع نہیں کر دیا جاتا۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا۔ ہندستان کی حالت اس سلطنت میں غلامانہ رہے گی اور اس کی اقتصادی لوٹ جاری رہے گی۔

آج دنیا میں عالمگیر امن کا چرچا ہے اور اقوام عالم صلح کے عہد ناموں پر دستخط کر چکی ہیں۔ مگر عہد ناموں کے باوجود ہتھیار بندی جاری ہے۔ البتہ خوبصورت الفاظ سے امن کے دیوتا کو ضرور خراج تحسین ادا کیا جا رہا ہے۔ جب تک ایک ملک کا دوسرے ملک پر غلبہ قائم ہے اور جب ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا رہے گا۔ برقرار نظام کو ختم کر دینے کی مساعی ہر وقت جاری رہیں گی۔ شہنشاہیت اور سرمایہ داری امن کی دشمن ہیں اور چونکہ برطانوی سلطنت انھیں چیزوں پر قائم ہے اور عوام الناس کی اقتصادی لوٹ اس کا جزو زندگی ہے ہم اپنی مرضی سے اس کے ممبر نہیں بن سکتے۔ ہمارے لیے کوئی رعایت اس وقت تک نفع بخش ثابت نہیں ہوسکتی جب تک اس سے عوام الناس کے کندھوں پر جاں گداز بوجھ دور کرنے میں مدد نہ مل سکے۔ بوجھ سے ان کی کمریں ٹیڑھی ہو چکی ہیں۔ اور ان کی ہمتیں جواب دے بیٹھی ہیں۔ اگر لوٹ کا بازار بدستور گرم رہے وہ اس کومنویلتھ میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے موجودہ اکثر مسئلے چند مخصوص افراد سے متعلق ہیں۔ یہ یا تو ایسے امور ہیں جنھیں دیدہ دانستہ ہوا

دی گئی ہے یا ایسی باتیں ہیں جن کی برطانوی سرکار نے خود حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہمیں والیان ریاست، برطانوی افسران، ہندستانی سرمایہ اور برطانوی سرمایہ اور جاگیرداروں کے مفادات کی دلدل میں پھنسا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے لیے تحفظات کا واویلا کر رہے ہیں۔ حالانکہ لاکھوں انسان جنھیں صحیح معنوں میں حفاظت کی ضرورت ہے بالکل بے یار و مددگار ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔

آزادی اور درجہ نوآبادیات کے نظریاتی پہلوؤں پر ہم کافی بحث کر چکے ہیں۔ اور اس کی لفظی تشریحات پر خوب بال کی کھال ادھیڑی جا چکی ہے۔ لیکن اصل چیز تو ڈنڈے کے زور سے حاصل کردہ طاقت ہے۔ آپ جو جی چاہے اس کا نام رکھ لیں اور جس نام سے چاہیں اسے پکار لیں۔ اس کی حقیقت نہیں فوت ہوتی۔ ہندستان کو تفویض کردہ کسی قسم کا درجہ نوآبادیات بھی ہمیں صحیح معنوں میں طاقت نہیں دے سکتا۔ اس طاقت کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ ہندستان پر قابض اجنبی فوج واپس بلالی جائے اور اسے اقتصادی کنٹرول سے نجات مل جائے۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ہم اپنی تمام توجہات اس ایک نکتہ پر مرکوز کر دیں۔ یہ بات ہوگئی تو باقی سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔

ہم آج ہندستان کے لیے مکمل آزادی کی حمایت کرتے ہیں۔ کانگریس نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ برطانوی پارلیمنٹ کو کسی رنگ میں بھی ہم پر حکم چلانے یا ہمیں ہدایات دینے کا حق حاصل ہے۔ ہم اس کے حضور میں کوئی گزارش نہیں کرتے۔ البتہ ہم پارلیمنٹ اور دنیا کے ضمیر کو ضرور اپیل کرتے ہیں اور ان کے سامنے ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہندستان کسی اجنبی طاقت کا حکم ماننے کو تیار نہیں۔ مجھے امید ہے کہ ملک اس اعلان پر پورا اترے گا۔ ممکن ہے ہم آج یا کل اپنی بات منوانے کے قابل نہ ہوں۔ ہمیں اپنی کمزوری کا پورا احساس ہے۔ ہمیں نہ تو کسی بات کا گھمنڈ ہے اور نہ ہی اپنی

طاقت کا غرور ہے۔ مگر کسی اور کو اور بالخصوص انگلستان کو ہماری طاقت سے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رہے اور نہ ہی وہ اس طاقت کا کم اندازہ لگائیں۔ میں سچے دل سے امید رکھتا ہوں کہ ہم آزادی حاصل کر کے رہیں گے اور اس کے حصول سے کبھی منہ نہ موڑیں گے۔ جب ایک بار ایک عظیم قوم کسی بات پر تل جائے اور اس کے متعلق اس کا ذہن صاف ہو تو زیادہ عرصہ کے لیے اس کے راستہ میں رکاوٹیں نہیں ڈالی جاسکتیں۔ اگر ہم آج ناکام ہوتے ہیں۔ کل کامیابی نہیں ہوتی۔ تو پرسوں ہم یقیناً کامیاب ہوں گے۔

ہم صلح کے لیے دوڑ دھوپ اور امن کی تڑپ سے اکتا چکے ہیں اور اس بات سے بھی ہمارا جی بھر چکا ہے کہ ملک کے لیے کوئی تعمیری کام کریں۔ کیا ہم اپنے گھروں کو برباد ہوتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں؟ یا یہ کہ نوجوانوں کو جیل جاتے دیکھ کر ہمیں مسرت ہوتی ہے؟ کیا ہمیں اپنے گلوں میں پھانسی کی رسیاں ڈالنے سے لطف حاصل ہوتا ہے؟ کیا مزدور اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ہڑتال کرے اور اس حقیر روزی اور فاقہ مستی سے بھی محروم ہو جائے جس کے سہارے وہ جیتا ہے۔ وہ ایسا مجبور ہو کر کرتا ہے اور صرف اس حالت میں جب وہ دیکھتا ہے کہ اب اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اب ہم جو قوی کش مکش کے تباہ کن راستہ پر گامزن ہونے لگے ہیں تو محض یہ دیکھ کر کہ اس کے بغیر باعزت سمجھوتہ کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کے باوجود ہم صلح و امن کے شیدائی ہیں۔ ہمارا صلح کا ہاتھ ہر وقت ان لوگوں کے لیے دراز رہے گا جو اس کے ساتھ اپنا ہاتھ ملانے کے خواہاں ہوں گے۔ مگر اس ہاتھ کے پیچھے جسم ہوگا جو ناانصافی کے سامنے کبھی نہ جھکے گا اور کسی اہم نکتہ پر کبھی شکست قبول نہ کرے گا۔

اس وقت جب کہ ہم لڑائی کے لیے تیار ہو رہے ہیں آئین مرتب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دو سال سے آئین تیار ہو رہا ہے۔ اور آخر کار آل پارٹیز کمیٹی نے

ایسی اسکیم تیار کر کے ان مسائی کو کامیابی کا سہرا پہنا دیا جسے کانگریس نے ایک سال سے اپنا لیا ہے۔ اس آئین کی تشکیل میں جو محنت صرف ہوئی رائیگاں نہیں گئی۔ ہندستان نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر سال گزر چکا ہے اور آج ہمیں نئے حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جو آئین سازی کی بجائے عمل کے متقاضی ہیں۔ بایں ہمہ ان مسائل سے پہلوتہی نہیں کر سکتے۔ جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ جو ہماری جدوجہد اور آئندہ آئین کی ترتیب وتخریب میں اہم پارٹ ادا کریں گے۔ ہمارے لیے اس وقت دو چیزیں بہت اہم ہیں۔ اولاً یہ کہ مجلسی مساوات کے لیے مساعی عمل میں لائی جائیں۔ ثانیاً یہ کہ ان تفرقہ پسند طاقتوں کا مقابلہ کیا جائے جو ہندستان کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہیں۔

مجھے بلا تامل تسلیم کرنا چاہیے کہ میں ایک سوشلسٹ اور جمہوریت پرست ہوں اور بادشاہیت اور مطلق العنانیت پر یقین نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی ایسے نظام پر ایمان رکھتا ہوں جو جدید صفت کے حکمرانوں کو جنم دیتا ہے۔ جو حکمران لوگوں کے جسموں اور قسمتوں پر پرانے زمانوں کے بادشاہوں سے زیادہ اقتدار رکھتے ہیں اور جن کے طور طریقے پرانے مطلق العنان نوابوں کی طرح نہایت غارت گرانہ ہیں۔ بایں ہمہ میں مانتا ہوں کہ نیشنل کانگریس کی وضع کی جماعت کے لیے (جیسا کہ آج اس کا وجود ہے) مکمل سوشلسٹ پروگرام کو اپنا لینا ممکن نہیں۔ مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ سوشلزم کا فلسفہ تمام سماج کے جسم وجان میں سرایت کر چکا ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ یہ کس رفتار اور کن ذرائع سے اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ ہندستان کو اس راستہ پر گامزن ہونا پڑے گا۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ نابرابری اور غربت کا قصہ تمام ہو۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے ایسے ذرائع اختیار کرے جو اس کی خاص ضروریات کے مطابق ہوں یا یہ کہ وہ اس نصب العین کو اپنی سمجھ اور فراست کے مطابق ڈھال لے۔

ہمارے سامنے تین بڑے مسئلے ہیں۔ اقلیتیں ، ہندستانی ریاستیں اور مزدور وکسان۔ اقلیتوں کے مسئلہ پر میں پیشتر ازیں اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں میں یہاں صرف یہ دہرانا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے قول وفعل سے اقلیتوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ ان کا کلچر اور ان کی روایات محفوظ رہیں گی۔

ہندستانی ریاستیں باقی ہندستان سے علیحدہ نہیں رہ سکتیں۔ اور والیان ریاست کو انھیں راستوں پر گامزن ہونا چاہئے جن پر ان کے ہم خیال چل رہے ہیں۔ ان ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف ریاستی لوگوں کو ہونا چاہئے۔ جن میں ریاستی حکمران بھی شامل ہیں۔ نیشنل کانگریس جو خود آزادی کی علم بردار ہے ریاستی لوگوں کو اس سے محروم نہیں کر سکتی۔ اس دوران میں کانگریس والیان ریاست کے ساتھ گفت وشنید اور ایسے ذرائع تلاش کرنے کو تیار ہے جن سے تبدیلی اچانک رونما نہ ہو۔

ہمارا تیسرا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ ہے کیوں کہ ہندستان کا مطلب کسان اور مزدور ہے۔ ہم جس قدر انھیں اونچا لے جائیں گے اور جس حد تک ان کی ضروریات پوری کریں گے اسی نسبت سے ہمیں کامیابی نصیب ہوگی۔ ہماری قومی جدوجہد کی مضبوطی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ کس قدر کسان اور مزدور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ ہم انھیں صرف اس طرح ساتھ لے سکتے ہیں کہ ہم ان کے مفاد کی ترجمانی کریں۔ ان کا مفاد دراصل ہمارا مفاد ہے۔ کانگریس اکثر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر چکی ہے۔ مگر اظہار ہمدردی سے آگے اس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ کانگریس سے متعلق اس رائے کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اسے سرمایہ دار اور مزدور، جاگیردار اور مزارع کے درمیان توازن برقرار رکھنا چاہئے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ اس ترازو کا ایک پلڑا بہت زیادہ جھک گیا ہے۔ اور پرانے حالات کو قائم رکھنے کا مطلب ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ کو قائم رکھنا ہے۔ حق وانصاف

کا راستہ صرف یہ ہے کہ ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے غلبہ کو ختم کر دیا جائے۔ آل انڈیا کانگریس نے اقتصادی اور مجلسی تبدیلی کے اس خیال کو اپنے ایک ریزولیشن میں جو آج سے چند ماہ پیشتر بمبئی میں منعقد ہوا قبول کر لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کانگریس اس ریزولیشن کو عمل کا جامہ پہنائے گی۔ اور ایسا پروگرام مرتب کرے گی جس کے ذریعہ تبدیلیوں کو فوری طور پر عملی شکل دی جا سکے۔

کانگریس بحیثیت مجموعی اس پروگرام کو اس وقت شاید زیادہ آگے نہ لے جا سکے۔ مگر اسے اپنے منتہائے نظر کو سامنے رکھنا چاہئے اور اس کے لیے مساعی عمل میں لانی چاہئیں۔ یہ مسئلہ صرف اجرتوں کا نہیں اور نہ ہی محض اس بات کا کہ کسی جاگیردار یا تاجر سے خیرات حاصل کی جائے۔ کارخانوں اور کھیتوں میں تاجروں اور زمینداروں کی مشفقانہ سرپرستی ایک طرح کی خیرات ہے اور اس میں وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو خیرات کا لازمی نتیجہ ہیں۔ یہ خیرات مرض کا حقیقی علاج نہیں۔

اب ٹرسٹی شپ کے نئے نظریہ کو لیجئے جس کی کئی لوگ ترجمانی کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس نظریہ کی اہمیت بھی اس بنجر زمین سی ہے جس سے کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ٹرسٹی شپ کا مدعا یہ ہے کہ اچھے یا برے کی طاقت خود منتخب کیے ہوئے امین کے پاس رہے گی اور وہ اسے جس طرح چاہے گا صرف کرے گا۔ ٹرسٹی شپ اگر کسی حالت میں جائز ہو سکتی ہے تو وہ ایک فرد یا افراد کے کسی گروہ کی بجائے قوم کی ٹرسٹی شپ ہے۔ بہت سے انگریز دیانت داری سے اپنے آپ کو ہندستان کا ٹرسٹی سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ہمارے ملک کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔

ہمیں اس بات کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ کارخانے کن لوگوں کے مفاد میں چلنے چاہئیں۔ اور زمین کن افراد کے لیے خوراک پیدا کرتی ہے۔ آج جس افراط سے زمین دولت پیدا کرتی ہے۔ کسان اور مزدور جو اسے پیدا کرنے میں جان جوکھوں

میں ڈالتے ہیں اس سے مستفید نہیں ہوتے۔ اور کارخانوں کا بڑا مقصد سرمایہ دار پیدا کرنا سمجھ لیا گیا ہے۔ فصلیں چاہے جتنی زرخیز ہوں اور کارخانوں کا شرح منافع کتنا زیادہ ہو ہندستانیوں کے برہنہ جسم مٹی کے کوٹھے اور دم گھٹنے والی تنگ رہائش گاہیں ہمارے موجودہ مجلسی نظام اور برطانوی سلطنت کی عظمت کی شاہد ہیں۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے اقتصادی پروگرام کو انسانی ہمدردی کے اصولوں پر قائم کریں اور انسان کو روپیہ پر قربان نہ کردیں۔ اگر کوئی صنعت مزدوروں کو فاقہ مستی کا شکار بنائے بغیر نہیں چل سکتی تو بہتر ہے کہ اس صنعت کو بند کردیا جائے۔ اگر زرعی مزدوروں کو جی بھر کر کھانے کو نہیں ملتا، تو بیچ کے دلالوں کا قصہ پاک ہو جانا چاہئے۔ جو انھیں ان کے پورے حصہ سے محروم رکھتے ہیں۔ مزدور اور کسان کم سے کم اس بات کے حق دار ہیں کہ انھیں اتنا ملتا رہے جس سے وہ تھوڑے بہت آرام میں رہ سکیں اور انھیں صرف اتنے گھنٹے محنت کرنا پڑے جس سے ان کی طاقت برقرار اور روح زندہ رہے۔ آل پارٹیز کمیٹی نے اس اصول کو تسلیم کر کے اپنی سفارشات میں شامل کرلیا۔ مجھے امید ہے کانگریس بھی ایسا ہی کرے گی۔ اس کے علاوہ وہ ان حالات سے عہدہ برا ہونا بھی منظور کرلے گی جو اس اصول کو اپنا لینے کی صورت میں قدرتی طور پر رونما ہوں گے۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ کانگریس مزدوروں کی بہتر زندگی کے لیے ان کے مشہور مطالبات کو بھی اپنا لے گی اور انھیں اپنی تنظیم اور اس دن کے لیے تیاری کے کام میں پوری طرح مدد دے گی جب امداد باہمی کی بنیادوں پر وہ صنعت پر اپنا کنٹرول قائم کرسکیں گے۔

لیکن صنعتی مزدور ہندستان کا ایک معمولی حصہ ہیں۔ اگرچہ وہ ایک ایسی طاقت بن رہے ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری فوری توجہ کے مستحق کسان ہیں جو امداد کے لیے نہایت دردناک اور اونچی آواز میں چلا رہے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم

اپنا پروگرام ان کی موجودہ حالت کو سامنے رکھ کر مرتب کریں۔ صحیح معنوں میں امداد تو صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ قوانین اراضی میں بھاری تبدیلیاں لائی جائیں۔ اور زمین کے موجودہ نظام ملکیت کو سر سے پاؤں تک بدل دیا جائے۔ کانگریس میں بہت سے جاگیردار ہیں۔ وہ ہمارے سر ماتھے پر ہیں۔ لیکن انھیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ بڑی بڑی جاگیروں پر افراد کی ملکیت کہ جو یورپ سے ملتے جلتے جاگیر دارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ ایک ایسا مظہر ہے جو تمام دنیا میں بڑی تیزی سے فنا ہو رہا ہے اور تو اور ان ممالک میں بھی کہ جو سرمایہ داری کے بڑے بڑے حصار ہیں۔ بڑے بڑے کھیتوں کو کئی حصوں میں منقسم کر کے کاشت کار کسانوں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ ہندستان کے کئی حصوں میں بھی کسان خود اراضی کے مالک ہیں۔ ہم اس نظام کو تمام ملک میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایسا کرنے میں چند بڑے بڑے زمیندار ضرور ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

اس کانگریس کے لیے اپنے سالانہ اجلاس میں کسانوں کے لیے کوئی مفصل پروگرام مرتب کرنا ممکن نہیں۔ وہ صرف چند عام اصول قائم کر سکتی ہے، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو کہہ سکتی ہے کہ وہ ٹریڈ یونین کانگریس اور دوسری ایسی انجمنوں کی مدد سے جو اس مسئلہ میں گہری دلچسپی رکھتی ہیں تفصیلات مکمل کر لیں۔ مجھے توقع ہے کہ کانگریس اور ٹریڈ یونین کانگریس میں باہمی تعاون فروغ پائے گا اور دونوں جماعتیں آئندہ جدوجہد میں شانہ بشانہ حصہ لیں گی۔

جب تک ہم طاقت حاصل نہیں کر لیتے۔ اس کی اہمیت اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو سکتی کہ یہ ہماری نیک خواہشات ہیں۔ اس لیے ہمارے سامنے حقیقی مسئلہ طاقت کا حاصل کرنا ہے۔ ہم یہ طاقت باریک موشگافیوں، پختہ دلائل اور وکلا کی سخن طرازی سے نہیں حاصل کر سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قوم کو اپنے عزائم کی آزمائش کی

اجازت دی جائے۔ کانگریس کو اپنی توجہ اس فریضہ کو پورا کرنے کی طرف مبذول کرنی چاہیے۔

گزشتہ سال ہمارے لیے تیاری کا سال تھا اور ہم نے کانگریس کو طاقت ور بنانے اور از سر نو تنظیم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کے بہت شان دار نتائج برآمد ہوئے۔ آج ہماری تنظیم بہت اچھی حالت میں ہے لیکن ہماری کمزوریاں بہت زیادہ اور کافی نمایاں ہیں۔ کانگریس کے اندر بد نصیبی سے باہمی جھگڑے بہت عام ہیں۔ اور انتخابی جھگڑے ہماری طاقت اور انرجی کو ضائع کر دیتے ہیں۔ ہم اتنی بڑی لڑائی کیوں کر لڑ سکتے ہیں اگر ہم اپنی اس پرانی کمزوری کو دور کر کے ذاتیات سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ملک کے سامنے جدوجہد کا مضبوط پروگرام ہونے کی صورت میں ہماری حالت بہتر ہو جائے گی اور ہم ان بے سود اور تباہ کن جھگڑوں کو برداشت نہ کریں گے۔

یہ پروگرام کیا ہو؟ اس کا فیصلہ ہماری مرضی پر موقوف نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارا اپنا آئین جسے ہم تبدیل کر سکتے ہیں اس کی راہ میں حائل ہے۔ بلکہ حقائق اور حالات ہی ایسے ہیں کہ انھوں نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ ہمارے آئین کی دفعہ اوّل اس بات کی متقاضی ہے کہ ہمارے ذرائع جائز اور پرامن ہونے چاہئیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ ہمیشہ جائز ہوں گے کیوں کہ اس مقصد کو جس کے ہم علم بردار ہیں۔ کسی ایسے فعل سے بدنام نہیں کرنا چاہیے جس کے لیے ہمیں بعدازاں شرمندہ ہونا پڑے۔ میں یہ بھی پسند کرتا ہوں کہ وہ پرامن ہوں۔ کیوں کہ امن کے طریقے متشددانہ ذرائع سے زیادہ دیرپا اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔ تشدد عموماً ردّعمل پیدا کرتا ہے۔ جس سے بددلی اور بداخلاقی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آج دنیا پر منظم تشدد کا تسلط قائم ہے، اور عین ممکن ہے ہم اس کے استعمال سے فائدہ حاصل

کر سکیں۔ لیکن منظم تشدد کے لیے نہ تو ہمارے پاس مصالحہ موجود ہے اور نہ ہی ہمیں تربیت حاصل ہے۔ رہا انفرادی تشدد یا اکے دکے حملے کا سوال۔ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ تو فقط اپنی مایوسی کا اقرار ہے۔ ہماری غالب اکثریت ان مسائل کو اخلاقی نظروں کی بجائے عملی پہلو سے دیکھتی ہے اور اگر ہم تشدد کے ذرائع ترک کرتے ہیں تو اس لیے کہ ہمیں ان سے ٹھوس نتائج برآمد ہونے کی امید نہیں۔

آج ہر اہم تحریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام الناس کی تحریک ہو اور عوامی تحریکات کا پرامن ہونا نہایت ضروری ہے۔ البتہ منظم بغاوت برپا ہو تو یہ قید نہیں لگائی جاسکتی۔ اگر بڑی تحریک پرامن ہے تو ہم عصر اکے دکے متشددانہ اقدامات کا مطلب صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی جانب سے توجہات ہٹا کر اسے کمزور کردیا جائے۔ ہم نے ان ذرائع سے ایک طریقہ کو پسند کرنا ہے۔ اور پھر جو راستہ اختیار کرلیں سختی سے اس پر قائم رہنا ہے۔ کانگریس کا انتخاب کیا ہوگا۔ مجھے اس کے متعلق کوئی شک وشبہ نہیں۔ وہ صرف پرامن عوامی تحریک کا انتخاب کرے گی۔

کیا ہم عدم تعاون کے پروگرام اور طریقہ کار کو پھر دہرائیں؟ یہ ضروری نہیں۔ لیکن اس کا بنیادی تصور برقرار رہنا چاہیے۔ پروگرام اور طریقہ کار وقت کی ضروریات کے مطابق اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ اس وقت اس اجلاس میں تمام تفصیلات طے کرلینا آسان اور پسندیدہ کام نہیں۔ یہ کام آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور کانگریس کی مجلس عاملہ کا ہے۔ البتہ مثبت اصولات کا ضروری فیصلہ ہو جانا چاہیے۔

پرانا پروگرام عدم تعاون کی تین شقوں پر مشتمل تھا۔ وہ مدیں یہ تھیں۔ اسکولوں، عدالتوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ جس میں فوجی ملازمتوں میں شمول اور ٹیکسوں کی ادائیگی سے انکار کا پروگرام بھی شامل تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسے وقت میں کہ جب قومی جدوجہد پورے عروج پر ہو، کسی ایسے فرد کے لیے جو اس میں حصہ لے رہا ہو اسکولوں

یا عدالتوں میں رہنا کیسے ممکن ہے؟ بااین ہمہ میری یہ رائے ہے کہ اس مرحلہ پر عدالتوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ کرنا قرین دانش مندی نہیں۔

اس سے پیشتر ماضی میں قانون ساز کونسلوں کے بائیکاٹ کرنے پر خوب گرم گفتاری ہو چکی ہے اور یہ کانگریس بذات خود اس جھگڑے پر دو ٹکڑوں میں کٹ گئی۔ ہمیں تو اس جھگڑے کو دہرانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آج حالات بالکل مختلف ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ آج سے چند سال پیشتر کانگریس کا یہ اقدام ناگزیر تھا۔ کہ اس نے اپنے ممبران کو کونسلوں میں جانے کی اجازت دے دی اور میں یہ کہنے کو تیار نہیں کہ اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ لیکن ہم اس سے اکتا چکے ہیں اور آج بائیکاٹ اور مکمل تعاون میں کوئی درمیانہ راستہ نہیں رہا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان نام نہاد قانون ساز جماعتوں نے ہمارے حوصلے کس قدر پست کر دیے اور اب ہمارے کئی اچھے اچھے افراد کو یہ کمیٹیاں اور کونسلیں پھسلا بیٹھی ہیں۔ ہمارے کارکنوں کی تعداد بہت محدود ہے اور ہم اس وقت تک کوئی عوامی تحریک نہیں پیدا کر سکتے۔ جب تک ہم ان اسمبلیوں کے شاندار کونسل ہالوں سے منہ موڑ کر اپنی تمام توجہات اس پر مرکوز نہ کر دیں۔ کوئی پروگرام یا پالیسی ہمیشہ کے لیے نہیں گھڑی جا سکتی اور نہ ہی یہ کانگریس غیر معین طور پر ملک اور اپنے آپ کو ایک ہی طریقہ عمل پر کاربند ہونے کو مجبور کر سکتی ہے البتہ آج میں نہایت ادب سے کانگریس کو کہوں گا کہ کونسلوں سے متعلق صرف ایک ہی پالیسی وضع کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔

بائیکاٹ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہوگا۔ اس سے ایسا عزم پیدا ہوگا جو حقیقی جدوجہد کی طرف توجہ منعطف کر دے گا۔ یہ جدوجہد جہاں کہیں ممکن ہوا عدم ادائیگی ٹیکس اور مزدور تحریکات کی مدد سے عام ہڑتالوں کی شکل میں جاری کی جائے گی۔ عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم مخصوص علاقوں میں نہایت منظم ہونی چاہیے اور اس مقصد کے لیے

کانگریس آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیارات سونپ دے کہ وہ جہاں اور جس طرح مناسب سمجھے ضروری اقدامات اٹھائے۔

میں نے ابھی تک کانگریس کے تعمیری پروگرام کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کام بدستور جاری رہنا چاہئے۔ لیکن گذشتہ سالوں کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس نے ہمارے آئندہ عمل کے لیے زمین تیار کر دی۔ مجھے امید ہے کہ ہم بیرونی کپڑے اور برطانوی مال کا بائیکاٹ خاص سرگری کے ساتھ جاری رکھیں گے۔

لہٰذا ہمارا پروگرام سیاسی اور اقتصادی بائیکاٹ کا ہونا چاہئے۔ جب تک ہم صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو جاتے۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی دوسرے ملک کا مکمل بائیکاٹ کر سکیں۔ یا اس کے ساتھ تمام تعلقات منقطع کر لیں۔ آزاد ہو کر بھی مکمل طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ برطانوی سرکار کے ساتھ ہم اپنے تعلقات زیادہ سے زیادہ حد تک کم کر لیں، اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھیں۔ ہمیں یہ بات بھی صاف کر دینی چاہئے کہ ہندستان ان قرضوں کی ذمہ داری ہرگز نہ اٹھائے گا جو انگلستان نے اس کے کندھوں پر لاد رکھے ہیں۔ گیا کانگریس نے اس ذمہ داری سے انکار کر دیا تھا۔ ہم آج اس انکار کا پھر اعادہ کرتے ہیں، اور اس فیصلہ پر قائم ہیں۔ ہم ہندستان کی بھلائی کے لیے صرف کی گئی رقوم کا قرضہ ادا کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہم قرضہ کے ان انباروں کو بے باک کرنے سے پرزور الفاظ میں انکار کرتے ہیں جو محض اس لیے اکٹھے کیے گئے ہیں کہ ہندستان کو غلام رکھا جا سکے اور اس کے سر پر اور بوجھ کا اضافہ ہو۔ ہندستان کے فاقہ مست لوگ بالخصوص ان جنگوں کا بوجھ برداشت کرنا کبھی نہیں تسلیم کر سکتے جو انگلستان نے اپنی سلطنت کی توسیع اور ہندستان میں اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لیے لڑی ہیں۔

میں نے ابھی تک سمندر پار رہنے والے ہندستانیوں کا ذکر نہیں کیا۔ میرا ان سے متعلق کچھ زیادہ کہنے کا خیال بھی نہیں۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ میرا دل مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ یا دوسرے ممالک میں رہنے والے اپنے بھائیوں کی محبت سے خالی ہے۔ جو بڑی بہادری سے ناانصافیوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ان کی قسمت کا فیصلہ ہندستان کے میدانوں میں ہوگا اور جس جدو جہد کا ہم آج آغاز کر رہے ہیں اتنی ہی ان کے لیے ہے جس قدر خود ہمارے لیے۔

اس جدوجہد کے لیے ہمیں بہتر شیرازہ بندی کی ضرورت ہے۔ ہمارا کانگریس آئین فرسودہ اور ہماری تنظیم نہایت سست رفتار ہو چکی ہے۔ اس میں حالات کی نزاکتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود نہیں رہی۔ بڑے بڑے مظاہروں کے وقت بیت چکے۔ اب ہم خاموش اور ناقابل مقابلہ عمل چاہتے ہیں، اور یہ ہم اپنی صفوں میں شدید قسم کے نظم وضبط سے ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمارے ریزولیشن ان پر عمل کرنے کے لیے پاس ہونے چاہئیں۔ کانگریس کے ممبران کی تعداد خواہ کتنی قلیل ہو۔ نظم وضبط سے اس کی طاقت بڑھے گی۔ چھوٹی سی باعزم اقلیتوں نے اقوام کی قسمت بدل دی ہے۔ ہجوم اور لوگوں کے جم غفیر بہت کم کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ آزادی بذات خود ضبط اور ڈسپلن کی متقاضی ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو بڑے نفع اور مقصد کی خاطر دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کو ترک کرنا ہوگا۔

کانگریس ہندستان میں چھوٹی سی اقلیت کی نمائندہ نہیں۔ بہت سے لوگ اگرچہ اپنے آپ میں اس میں شمولیت یا اس کے لیے کام کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ مگر ان کی اشتیاق اور امید کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہیں کہ یہ انھیں نجات دلائے گی۔ کلکتہ ریزولیشن سے لے کر ملک بے تاب امیدوں کے ساتھ اس عظیم دن کا انتظار کر رہا ہے کہ کب کانگریس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہم کیا اور

کس وقت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ کامیابی ہمارے بس میں نہیں۔ لیکن کامیابی کا سہرا عموماً ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو جرأت آمیزی دکھاتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ بزدل جو ہمیشہ نتائج کے خوف سے گھبرائے رہتے ہیں اسے نہیں پا سکتے۔ ہم بڑی چیزوں کا جوا لگار ہے ہیں اور یہ بڑی چیزیں ہم صرف قربانی سے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم جلد کامیاب ہوں یا دیر سے۔ اس بھاری جدوجہد اور اپنے ملک کی طویل وشاندار تاریخ میں ایک نفیس صفحہ لکھنے سے ہمیں صرف اپنی ذات ہی روک سکتی ہے۔

اس وقت ملک کے اکثر حصوں میں سازش کے مقدمات چل رہے ہیں۔ یہ ہتھیار ہر وقت ہمارے پاس ہیں۔ لیکن پوشیدہ سازشوں کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ہم اپنے ملک کو اجنبی اقتدار کے جواء سے نجات دلانے کے لیے ڈنکے کی چوٹ پر سازش کر رہے ہیں اور آپ سب ساتھیوں اور ہم وطن مرد و عورتوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ لیکن اس کا جو آپ کو معاوضہ ملے گا وہ مصائب و جیلیں ہیں۔ ممکن ہے موت بھی ہو۔ البتہ ہمیں اس بات کا اطمینان ہوگا کہ تم نے کچھ نہ کچھ ملک کی خدمت سرانجام دی ہے۔ وہ ملک کہ جو قدیم مگر سرسبز و شاداب ہے۔ تمہیں اس کا بھی اطمینان ہوگا کہ تم نے انسانیت کو موجودہ غلامی سے بچانے کے لیے اپنا فرض ادا کیا ہے۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل

کراچی ——————1931ء

دوستو! میں اپنا مختصر ایڈریس شریمتی سروپ رانی نہرو، پنڈت جواہر لال اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد سے مؤدبانہ طور پر پنڈت موتی لال جی کے سورگ باش ہونے پر اظہار افسوس کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کو بہت حد تک اس امر سے دھیر بندھی ہے کہ ان کے اس دکھ سے ساری قوم کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس مرحلہ پر جب کہ دہلی میں لارڈ ارون سے گفت وشنید جاری تھی، شری موتی لال نہرو جی کی ضرورت ہم سب کو اور سب سے بڑھ کر گاندھی جی کو بہت ہی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی قوم کی غم ناک آنکھوں سے مولانا محمد علی کے ماتم کے آنسو خشک نہ ہونے پائے تھے کہ یہ صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ گو بدقسمتی سے مرحوم مولانا صاحب کے ہم سے اختلافات تھے۔ لیکن بحیثیت ایک بہت بڑے قوم پرست کے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ بہت بہادر انسان تھے۔ انھوں نے اپنے اعتقادات وخیالات کو کبھی چھپا کر نہیں رکھا تھا۔ میں بیگم صاحبہ، مولانا شوکت علی اور ان کے سارے خاندان کو اپنی گہری عقیدت بھری ہمدردی پیش کرتا ہوں۔ اسی زمرہ میں ان بے شمار گمنام بہادروں کو بھی میں شامل کرتا ہوں جن کو شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ نہ ہی وہ اس کی پرواہ کرتے تھے اور جنھوں نے پچھلے ایک برس میں عدم تشدد کی جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کی ہیں پرماتما ان کی روحوں کو شانتی بخشے۔ ان کی زندگیاں ہمیں

پاکیزہ بنا کر اس مقصد کے حصول کے لیے زیادہ قربانیاں اور بے حد کوششیں کرنے پر آمادہ کریں جس کے لیے ان اصحاب نے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔

آپ نے ایک سیدھے سادے کسان کو ایسا سب سے بڑا اعزاز بخشا ہے۔ جس کی کوئی ہندستانی تمنا کر سکتا ہے۔ میں اس بات سے اچھی طرح باخبر ہوں کہ آپ نے مجھے جو سب سے بڑا سیوک منتخب کیا ہے۔ اس کی وجہ وہ خدمات نہیں ہیں جو تھوڑی بہت میں کر پایا ہوں۔ بلکہ اس کی وجہ ان شاندار قربانیوں کو خراج تحسین ادا کرنا ہے جو صوبہ گجرات نے کی ہیں۔ آپ نے اپنی فیاضی سے گجرات کو اس اعزاز کے لیے منتخب کیا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ زمانہ حال کی سب سے بڑی قومی بیداری کے اس سال میں ہر ایک صوبہ نے اپنی بساط بھر بہترین خدمات سرانجام دی ہیں۔ پرماتما کا شکر ہے کہ یہ بیداری آتم پوترتا کی آواز پر پیدا ہوئی ہے۔ گو کچھ خامیاں ضرور رہی ہیں۔ لیکن بلاشبہ یہ حقیقت ہے اور ہندستان نے دنیا کو بے مثل طور پر ثابت کر دیا ہے کہ عوام کی تحریک عدم تشدد محض ایک خیالی آدمی کا بے معنی خواب یا محض انسانی خوش فہمی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جو آتم وشواس کی کمی سے گوشت پوست کھا جانے والے تشدد کے نیچے دب کر چلاتی ہوئی انسانیت کے لیے بے انتہا ممکنات پیدا کرنے کے قابل ہے۔ ہماری تحریک کے عدم تشدد پر مبنی اور پرامن ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کسانوں نے ہمارے بدترین شکی مزاج لوگوں کے اندیشوں کو بھی جھٹلا دیا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ کسانوں کو عدم تشدد تحریک کے لیے منظم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن ان ہی لوگوں نے اس آزمائش کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور تمام امیدوں سے بڑھ کر صبر و تحمل سے مصیبتوں کو برداشت کیا۔ اس جدوجہد میں عورتوں اور بچوں نے بھی اپنا بہت بڑا حصہ ادا کیا۔ وہ اپنی دلی خواہش سے اس تحریک میں شامل ہوئے اور نمایاں پارٹ ادا کیا۔ میرے خیال میں عدم تشدد پر کاربند رہ کر اس تحریک کو کامیاب بنانے کا سہرا ان

کسانوں کے سر چڑھانا غلط نہ ہوگا۔

عدم تشدد کی روشنی میں ہماری تحریک ایک عالم گیر تحریک ہے اور یہ بہت تسلی بخش امر ہے کہ اقوام عالم اور خاص کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنی ہمدردی سے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔

قومی زندگی کے اس تاریخی موقع پر تازہ سمجھوتہ ہو جانے کی وجہ سے تفاصیل میں جانا غیر ضروری ہو گیا ہے۔ آپ کی منظوری کی امید پر آپ کی ورکنگ کمیٹی نے یہ سمجھوتہ کیا ہے۔ اب آپ کو آخری منظوری دینے کے لیے یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے آپ لوگوں کے معزز اور مستند نمائندوں کی حیثیت میں اسے منظور کیا ہے۔ اگر ہم نے اس سمجھوتہ کو منظور نہ کیا ہوتا۔ تو ہم نے غلط راستہ اختیار کیا ہوتا۔ اس طرح پچھلے برس کی قربانیوں کو ضائع کر دیا ہوتا۔ بلکہ دراصل ستیہ گرہی کی حیثیت میں ہم نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ ہم صلح کے ہر وقت خواہش مند ہیں اور اس کے لیے تیار ہیں۔ ایسا ہمیں کرنا ہی چاہئے۔ چنانچہ جب صلح کے لیے دروازہ کھلا نظر آیا تو ہم نے اس میں قدم رکھا۔ گول میز کانفرنس کے برٹش انڈین ڈیلی گیشن کی طرف سے مکمل ذمہ داری کے واضح مطالبہ اور برطانوی پارٹیوں کے اسے تسلیم کر لینے کے پیش نظر نیز اس اپیل کو مد نظر رکھتے ہوئے جو برطانوی وزیر اعظم، وائسرائے ہند اور ہمارے بہت سے معزز ہم وطنوں نے کانگریس کو کی تھی۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ خیال کیا کہ اگر ایک باعزت عارضی صلح کا انتظام ہو سکے اور کانگریس کو اس بات کی آزادی ہو کہ وہ ان امور پر زور دے سکے جو وہ ملک کے لیے بہتر تصور کرتی ہے تو اس صورت میں مدعو کیے جانے پر کانگریس گول میز کانفرنس میں شمولیت کر کے آئینی مسئلہ کو رضامندانہ طور پر حل کرے۔

اگر ہم ناکام رہے تو قربانی کرنے کے سوائے کوئی دوسرا راستہ ہمارے لیے باقی نہیں رہتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس سہولیت سے محروم نہیں کر سکتی ہے۔

سمجھوتہ کی کانسٹی ٹیوشنل دفعہ کے ماتحت ہمیں آزادی ہے کہ ہم پورن سوراج کا مطالبہ کریں۔ اپنے ڈیفنس، غیر ملکی تعلقات، مالیات خزانہ کی پالیسی اور دیگر ایسے ہی امور پر مکمل کنٹرول کی مانگ کریں۔ کچھ تحفظات یا پنڈت موتی لال نہرو کے الفاظ میں ہمارے اپنے مفاد کے انتظامات ضرور ہوں گے۔ جب کبھی باہمی رضامندی سے ایک حریف کے ہاتھ سے طاقت دوسرے فریق کو منتقل ہوتی ہے تو ہمیشہ ضرورت مند فریق یا امداد کی خواہاں پارٹی کے مفاد کے لیے تحفظات ضرور ہوتے ہیں۔ قریب قریب دو سو برس کی مسلسل لوٹ کھسوٹ نے ہمیں لازی طور پر بعض باتوں کے لیے بیرونی ذرائع سے امداد حاصل کرنے کا محتاج بنا دیا ہے۔ اگر برطانیہ ہمیں امداد دینے پر رضامند ہو، تو ہم خوشی سے اس سے یہ امداد لیں گے۔ ہمیں فوجی طاقت کی ضرورت ہوگی۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہے کہ ہم اس بارے میں انگریزوں سے مدد کیوں نہ لیں۔ میں نے دوسری بہت سی باتوں میں سے صرف ایک نمایاں مثال پیش کی ہے۔ ڈیفنس کے تحفظ کے لیے برطانوی افسروں یا کئی اصحاب کے نظریہ کے مطابق دوسرے انگریزوں کو ہندستان میں رہنے دیا جائے گا لیکن ہم برطانوی لوگوں کو اپنے ڈیفنس پر کنٹرول کرنے کی اجازت ہرگز نہ دیں گے۔ ہمیں غلط یا صحیح طور پر جیسے بھی ہم چاہیں کام کرنے کے لیے مکمل اختیارات ہونے چاہئیں۔ ہم برطانوی مشورہ کو شکریہ سے قبول کریں یا نہ کریں لیکن ہمیں حکم کبھی نہ دیا جا سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندستان میں برطانوی فوج صرف اس ملک پر قبضہ رکھنے کے لیے ہی موجود ہے۔ ورنہ ڈیفنس تو محض بہانہ ہے یا زیادہ صاف گوئی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فوج ہندستان میں برطانوی مفاد اور انگریز مردوں اور عورتوں کو اندرونی بغاوت سے بچانے کے لیے ہی رکھی گئی ہے۔ میں تو ایک بھی ایسی مثال یاد میں نہیں لا سکتا ہوں جب کسی غیر ملکی طاقت سے ہندستان کو بچانے کے لیے ہندستانی فوج کی ضرورت پڑی ہو۔ یہ سچ ہے کہ سرحد

پر کچھ ہمیں پیش آئیں اور افغانستان سے لڑائیاں ہوئیں۔ لیکن انگریز تاریخ دانوں نے ہمیں یہ پڑھایا ہے کہ یہ لڑائیاں ڈیفنس کی اغراض کی بجائے حملوں کی نوعیت کی تھیں۔ اس لیے ہمیں ہندستان پر غیر ملکی حملوں کے فرضی خطرہ سے خوف زدہ نہ ہونا چاہیئے۔ میری رائے میں اگر ہمیں فوج کی ضرورت ہے بھی تو کم از کم ہمیں ایسی بے ہنگم فوج کی ضرورت ہرگز نہیں ہے جسے پالنے کے لیے ہم روزانہ اپنا خون بہا رہے ہیں۔ اگر کانگریس کو طاقت حاصل ہوئی تو فوج میں فوراً بھاری تخفیف کرنی پڑے گی۔ صرف مناسب حصہ ہی باقی رکھا جائے گا۔

اسی طرح ہم مالی کنٹرول بھی برطانیہ کے ساتھ مشترکہ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ کوئی قوم پوری بلندی تک ترقی ہی نہیں کرسکتی ہے جس کے مالیات پر اس کا اپنا کنٹرول نہ ہو۔ اس کے علاوہ ہمیں ایسا سکھایا گیا ہے کہ ہم یہ خیال کرنے لگ گئے ہیں کہ اگر بڑی بڑی تنخواہوں والے قابل برطانوی سول افسروں کی امداد ترک کر دی گئی تو ہمارا سول نظم ونسق خراب اور غیر مستحکم ہوگا۔ گزشتہ کئی سالوں میں کانگریس نے جس انتظامیہ قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس کو ملک کے بہترین نوجوان مردوں اور عورتوں کی ہر روز بڑھتی ہوئی تعداد کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی ہوتی رہی ہے۔ جو یا تو بغیر کسی تنخواہ یا محض گزارہ پر کام کر رہے ہیں۔ رشوت خوری یا نااہلیت کا کوئی خطرہ باقی ہی نہیں رہتا ہے۔ رشوت اور بدانتظامی کے خلاف تحفظ کے لیے غریب ہندستان کے سر پر اس قدر بھاری بوجھ ڈالنا جو ممکن بے ایمانی کے زیادہ سے زیادہ اندازہ سے بھی بہت بڑھا ہوا ہو۔ ناقابل برداشت ہوگا۔ اس لیے اگر ہندستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ تو یہ ضروری ہے کہ وہ سول سروس کے اخراجات میں بہت زیادہ تخفیف کا مطالبہ کرے اور اس طرح سروس کے فوائد میں بھی تخفیف ہوگی۔

ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندستان پر تھوپے گئے قرضہ جات میں سے بہت سے بالکل غیر منصفانہ ہیں۔ ہم نے کبھی ایک بھی قرضہ کو منسوخ کیے جانے کی تجویز نہیں کی ہے۔ بلکہ ہم نے مطالبہ کیا ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ ہمارے سر پر جو قرضے ہیں۔ ان میں سے جس کو منظور کرنے پر ہم اتفاق نہیں کرتے۔ اس کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کی جانی چاہئے۔

لاہور کے مکمل آزادی والے ریزولیوشن سے پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں۔ نہ ہی یہ اس ارادہ سے مرتب کیا گیا تھا کہ اس کے یہ معنی لیے جائیں کہ برطانیہ یا کسی دیگر ملک سے تعلق رکھنے سے بالکل انکار کردیا جائے۔ آزادی ہمیں باہمی مفاد کے لیے کسی دوسرے سے مساوی حصہ دار بننے سے نہیں روکتی ہے۔ خاص کر جب یہ حصہ داری کسی ایک پارٹی کی مرضی سے ختم کی جاسکتی ہو۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی ایک کافی طاقت ور جماعت ہے۔ جو یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر ہندستان کو گفت وشنید اور سمجھوتہ سے آزادی حاصل کرنی ہے تو کسی طرح کی حصہ داری میں شامل ہونے کا خیال کرنے سے پہلے کچھ عرصہ تک تعلقات کا مکمل انقطاع بہت ضروری ہے۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں یہ کمزوری اور انسانی فطرت پر بے اعتباری کا نشان ہے۔

فیڈریشن ایک پرکشش نظریہ ہے۔ لیکن یہ نئی مشکلات بھی پیدا کرتا ہے۔ دیسی راجے اور نواب برطانیہ سے علیحدگی منظور نہ کریں گے۔ لیکن اگر وہ سچے دل سے فیڈریشن میں شامل ہوجائیں گے تو یہ بہت فائدہ مند ہوگا۔ ان کی شمولیت جمہوریت کی ترقی میں روڑہ اٹکانے کا موجب نہ بننی چاہئے۔ اس لیے میں توقع کرتا ہوں کہ وہ لوگ کوئی ایسا غیر مصالحانہ رویہ اختیار نہ کریں گے جو آزادی کے ماحصل کے ہی کلیتاً خلاف ہو۔ میری تمنا ہے کہ دیسی راجے بغیر کسی دباؤ کے اپنی دلی خواہش سے ہوائے

زمانہ کے ساتھ ساتھ چھاتی ٹھوک کر چلنا منظور کرلیں گے یقیناً ان کی رعایا کو بھی وہی بنیادی حقوق حاصل ہونے کی گارنٹی دینی ہوگی جو باقی ہندستان کے لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ ہندستانی فیڈریشن کے تمام باشندوں کو کچھ مساوی مشترکہ ابتدائی حقوق حاصل ہونے ضروری ہیں۔ جن کی حفاظت کے لیے لازمی طور پر ایک مشترکہ عدالت بھی ہونی چاہئے جو ان حقوق کی پامالی کی صورت میں دادرسی کرکے ریلیف دے سکے۔ یہ توقع کرنا بھی کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ ریاستی پرجا کو کسی حد تک فیڈرل لیجسلیچر میں براہ راست نمائندگی حاصل ہوگی۔

پریس پر سنسر شپ کی وجہ سے ہم برما کے بارہ میں صحیح حالات نہیں جان سکتے ہیں۔ آیا برما ہندستان سے الگ ہو یا ہندستان کا ایک حصہ رہ سکے۔ یہ فیصلہ کرنا صرف برمیوں کا ہی کام ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے۔ بلکہ ساری دنیا کا یہ فرض ہے کہ ہم خیال رکھیں کہ تمام فریقوں کے دلائل ٹھیک طرح سے سنے جائیں۔ سب جانتے ہیں کہ برما میں ایک پارٹی اتحاد کے حق میں ہے۔ اس کو بھی اظہار رائے کی وہی آزادی ہونی چاہئے جو الگ ہونے کی حمایت کرنے والی پارٹی کو حاصل ہے۔ کانگریس کو بتایا گیا ہے کہ اتحاد کی حامی پارٹی کا گلا دبایا جارہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس بے انصافی کی مزاحمت ضرور ہونی چاہئے۔ مجھے یہ تجویز بہت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ برما کے لوگوں کی اس سوال پر رائے حاصل کرلی جائے۔

ان سب سے بڑھ کر ہندو مسلم یا فرقہ وارانہ اتحاد کا مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ کانگریس کی پوزیشن لاہور اجلاس کے وقت واضح کردی گئی تھی۔ میں اس ریزولیوشن کو یہاں دہرانا چاہتا ہوں۔

''نہرو رپورٹ کے ختم ہو جانے کے پیش نظر اب کانگریس کی فرقہ وارانہ پالیسی کا اعلان کرنا غیر ضروری ہوگیا ہے۔ کانگریس کا

اعتقاد ہے کہ آزاد ہندستان میں فرقہ وارانہ مسائل صرف قومی اصولوں پر ہی حل کیے جا سکتے ہیں لیکن سکھوں نے خاص کر اور مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں نے عام طور پر نہرو رپورٹ میں مجوزہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل پر بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے کانگریس کا یہ اجلاس سکھوں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتا ہے کہ کانگریس کسی آئندہ کانسٹی ٹیوشن میں کسی قسم کا کوئی حل اس مسئلہ کا اس وقت تک منظور نہ کرے گی جب تک وہ متعلقہ فریقین کی پوری تسکین کا باعث نہ ہوگا۔''

پس کانگریس کسی ایسی کانسٹی ٹیوشن کو منظور نہیں کر سکتی ہے جس میں فرقہ وارانہ مسئلہ کا ایسا حل شامل نہ ہو جو متعلقہ فریقین کے لیے قابل قبول ہو۔ ایک ہندو کی حیثیت میں اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میں اقلیتوں کو ایک سودیسی فاؤنٹین پن اور سفید کاغذ پیش کروں گا کہ وہ اپنے مطالبات تحریر کر دیں اور میں ان کو جوں کے توں منظور کر لوں گا۔ میں اس طریقہ کو اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے سب سے زیادہ مختصر راستہ سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ راہ اختیار کرنے کے لیے ہندوؤں کو بڑے حوصلہ سے کام لینا پڑے گا۔ ہم دلی اتحاد چاہتے ہیں۔ ہمیں ایسا بناوٹی کاغذی اتحاد نہیں چاہئے جو ذرا سے دباؤ سے ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ایسا اتحاد تب ہی ہو سکتا ہے جب اکثریت عالی حوصلگی سے کام لیتے ہوئے اقلیتوں کو اپنی جگہ دینے کے لیے تیار ہو۔ یہی سب سے بڑی دانائی ہوگی۔ خواہ اتحاد اس طریقہ سے حاصل کیا جائے یا کسی اور طریق کار سے۔ لیکن روز بروز ایک بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ تا وقتیکہ فرقہ وارانہ اتحاد نہ پیدا کر لیا جائے۔ کانفرنسیں بلانے اور ان میں شامل ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ایسی کانفرنسیں ہمیں برطانیہ سے کوئی سمجھوتہ کرنے یا شاید دیسی راجوں کے

قریب آجانے میں تو معاون ہوسکتی ہیں۔ لیکن وہ ہمیں کبھی متحد نہیں کرسکتی ہیں۔ ہمیں خود اپنی کوششوں سے ہی عملی شکل میں اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔ کانگریس اس بہت ہی ضروری مطالبہ کو حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گی۔

ہم سب کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کانگریس اسی قدر زیادہ مکمل سوراج حاصل کر سکے گی جس قدر زیادہ اس نے طاقت حاصل کی ہوگی۔ پچھلے بارہ مہینوں میں بلاشبہ کانگریس نے بہت طاقت حاصل کر لی ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے اور کسی جلد بازی یا مغروری کے جذبہ کی وجہ سے یہ منتشر ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی طاقت بڑھانی چاہئے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم گاندھی اروِن سمجھوتہ کی شرائط کو لفظ بہ لفظ پورا کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں حاصل ہوا ہے اس کو سنبھال لیں۔ اس لیے میں چند الفاظ اپنی سرگرمیوں کے اس حصہ کے متعلق عرض کروں گا۔

ہم نے غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کافی کامیابی سے کیا ہے۔ ایسا کرنا ہمارے حق کے علاوہ ہمارا فرض بھی ہے۔ غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کے بغیر غربت کے مارے ہوئے کروڑوں ہندستانی بھوکے مرتے رہیں گے کیوں کہ جب تک سستا بدیسی کپڑا ہندستان کے دیہات میں دھڑا دھڑ گھسیڑا جاتا رہے گا تب تک چرخہ ترقی نہ کر سکے گا اور سودیسی کپڑا نہ بک سکے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ بدیسی کپڑا ہمارے ملک سے نکال دیا جائے۔ اگر یہ مفت بھی ملے تو بھی ہمارے لیے بہت مہنگا ہے۔ کروڑوں ہندستانی اس لیے بھوکے نہیں مرتے ہیں کہ ملک میں کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس لیے فاقہ کشی کرتے ہیں کہ ان کو خالی وقت میں کام کرنے کے لیے کام نہیں ملتا ہے۔ دیہاتیوں کو اپنے گھروں میں کام نہ ملنے کی وجہ سے غربت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس بے روزگاری کو جو ہمارے ملک کے کسانوں کی عادت ثانی بن چکی ہے، دور کرنے کے لیے مسلسل پروپیگنڈہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بہترین پروپیگنڈہ کرنے کا طریقہ

یہ ہے کہ ہم قربانی کے جذبہ سے چرخہ کاتیں اور کھدر پہنیں۔ آل انڈیا چرخہ سنگ نے بہت قیمتی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن یہ کانگریس کا کام ہے کہ چرخہ کاتنے اور کھدر پہننے کو اپنا کر اس کے حق میں فضا پیدا کرے۔ میری رائے میں بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کا یہ سب سے زیادہ بہتر اور موٴثر طریقہ ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ جو دلیل بدیسی کپڑے کے خلاف دی جاتی ہے۔ وہی سودیسی ملوں کے کپڑے کے خلاف بھی لاگو ہوتی ہے۔ بہت حد تک یہ ٹھیک ہے۔ ہمارے ملک کے کپڑے کے کارخانے ہماری ضرورت کا تمام کپڑا تیار نہیں کرتے ہیں اور آئندہ کئی برسوں تک بھی وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے سے بچی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے کپڑا ابناتے رہیں گے۔ لیکن اگر وہ کھدر کا مقابلہ کرنا یا تیار کردہ مال کی کھپت کے لیے نئے نئے ڈھنگ اختیار کرنا شروع کردیں تو ہماری ملیں بھی ہمارے راستہ میں رکاوٹ ثابت ہوں گی۔ خوش قسمتی سے بہت سی ملیں حب الوطنی کے جذبہ سے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے کام کر رہی ہیں اور انھوں نے لاکھوں محنت کش عوام کے مفاد کے لیے کھدر کے فوائد کو پسند کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک کی ملوں نے کھدر کی حمایت کرنے کے برعکس غیر محبانہ طور پر کھدر کو نقصان پہنچایا تو ان کی مخالفت بھی ویسی ہی ہوگی جیسی بدیسی کپڑے کی ہو رہی ہے۔

بدیسی کپڑے کے تاجروں کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس بارے میں کانگریس کے رویہ کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ ایک مستقل چیز ہے جو سیاسی ہتھیار کے طور پر اختیار نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ یہ عوام کے فائدہ کے لیے بطور ایک مستقل اقتصادی اور سوشل حربہ کے اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے ان تاجروں کو چاہئے کہ وہ اپنے مستقبل اور اپنے ملک کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے اپنی غیر ملکی کپڑے کی

تجارت کو بند کردیں۔ ان کی امداد کے لیے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن یہ بہت بڑی قربانی کرنی ضروری ہے۔

مجھے امید ہے کہ انگریزی، جاپانی اور دوسرے غیر ملکی تاجروں کو کانگریس کے رویہ سے غلط فہمی نہ ہوگی۔ اگر وہ ہندستان کی امداد کرنا چاہیں تو ان کو خود ہی بدیسی کپڑے کی تجارت ترک کردینی پڑے گی۔ ان کے لیے دوسری منڈیاں اور کئی دیگر کام پڑے ہیں۔

اب میں پکٹنگ کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ حق ہم نے ترک نہیں کیا ہے اور نہ ہم اسے ترک کر سکتے ہیں۔ میں سمجھوتہ کی شرائط میں سے متعلقہ دفعہ پیش کرتا ہوں۔

> ''پکٹنگ غیر متشددانہ ہونی چاہیے۔ اس میں جبر، خوف زدہ کرنا، زبردستی روکنا، مخالفانہ مظاہرے کرنا، پبلک کا راستہ روکنا یا کوئی ایسا فعل جو عام قانون کے ماتحت جرم ہو، شامل نہ ہوگا۔ اگر یا جس وقت ان میں سے کوئی طریقہ کسی جگہ اختیار کیا جائے گا تو اس جگہ پکٹنگ کرنا ملتوی کردیا جائے گا۔''

پکٹنگ کرنا عام قانونی حق ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ مذکورہ بالا مقررہ حدود کے اندر پکٹنگ کرنا نہ صرف بے ضرر ہوگا بلکہ حد درجہ سبق آموز ہوگا۔ یہ شریفانہ ترغیب دینا ہوگا۔ کبھی جبر یا کسی کی آزادی کو زبردستی روکنا نہ ہوگا۔ میں نے زبردستی کا لفظ صحیح طور پر استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ رائے عامہ کی مزاحمت کرنے والی طاقت تو ہر وقت موجود رہے گی۔ یہ طریقہ بہت اچھا، بلند اخلاق، آزادی کو اجازت سے ممتاز کرکے اس کی ترقی میں مددگار ہوگا۔ عدم تشدد پکٹنگ کا مقصد رائے عامہ پیدا کرنا ہے۔ یعنی ایسی فضاء پیدا کردی جائے کہ جس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ یہ کام سب سے بہتر طور پر عورتیں کرسکتی ہیں۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس شاندار کام کو جو انھوں نے شروع کر رکھا ہے، جاری رکھیں گی اور اس طرح قوم کا خراج تحسین حاصل کریں گی۔

اس سے بڑھ کر وہ کروڑوں فاقہ کشوں کی دعائیں لیں گی۔

اسی ضمن میں برطانوی مال کے بائیکاٹ کے بارے میں بھی چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال اتنا ہی پرانا ہے جتنی کانگریس۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سیاسی پلیٹ فارم پر گاندھی جی کے آنے کے بعد برطانوی مال کے بائیکاٹ کی جگہ تمام بدیسی صرف برطانوی نہیں۔ کپڑے کا بائیکاٹ شروع کر دیا گیا۔ گاندھی جی کے الفاظ میں بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ اقتصادی اور مجلسی ترقی کے لیے ہے۔ جب کہ برطانوی مال کا بائیکاٹ ایک سیاسی اور انتقامی حربہ ہے۔ حال کی طوفانی تحریک میں اس کو موثر طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اب چونکہ عارضی صلح ہو گئی ہے اور ہم بات چیت اور صلاح ومشورہ سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں سیاسی حربہ کو واپس لے لینا چاہئے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے ہیں کہ ایک طرف تو کانفرنس کے اندر بیٹھ کر دوستانہ بات چیت کریں اور دوسری طرف باہر برطانوی مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں۔ پس ہمیں اس اثنا میں برطانوی مال کا بائیکاٹ بند کر دینا چاہئے۔ لیکن ہمیں سودیسی کے استعمال کو زیادہ تقویت دینی چاہئے۔ جو ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔ جو چیزیں ہم اپنے ملک میں پیدا کرتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی ہمیں ضرور کرنی ہے۔ خواہ برطانوی یا کسی دوسرے ملک کی ان اشیاء کو میدان سے نکلنا ہی کیوں نہ پڑے۔ قومی ترقی کے لیے یہ ایک ضروری شرط ہے۔ اس طرح ہمیں سودیسی انشورنس کمپنیوں، بنکوں، جہازوں اور دیگر ایسے ہی کاموں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈہ جاری رکھنا چاہئے۔ ہمیں کمتری یا مہنگے پن کی بنا پر ان کی اہمیت کم نہ کرنی چاہئے۔ وسیع استعمال اور ہمدردانہ تنقید سے ہم اپنی چیزوں کو سستی اور بہتر بنا سکتے ہیں۔

مساوی سلوک کے بارے میں بہت باتیں کی جاتی ہیں۔ کمزور اور طاقت ور

میں، دیو اور ٹھگنے میں، ہاتھی اور چیونٹی میں، مساویانہ سلوک کیسا؟ اگر لارڈ انچکیپ اپنی بے انتہا دولت اور اثر ورسوخ کے باوجود مرحوم سیٹھ نروتم مرارجی سے مساوی حقوق کا دعویٰ کرے تو اسے مساوات کا الٹ کہا جائے گا۔ جب سیٹھ نروتم داس کے پس ماندگان نے لارڈ انچکیپ کے برابر دولت اور ذرائع حاصل کر لیے ہوں اس وقت مساوی سلوک کی بات کرنے کا وقت ہوگا۔ بالکل ہی غیر متوازی لوگوں کے بارے میں مساوی سلوک کے معنی یہ ہونے چاہئیں کہ پس ماندہ کو اونچے لوگوں کے درجہ کے برابر اونچا اٹھایا جائے پس غلام لوگوں کے ساتھ مبینہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے مساوی سلوک کے یہ معنی ہونے چاہئیں کہ پس ماندہ لوگوں کو اعلیٰ طبقہ کے معیار کے برابر اونچا اٹھایا جائے۔ جس میں اعلیٰ طبقہ کے لوگ اپنی پونجی کو قربان کر دیں اور مزید فتوحات حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ برطانیہ کا جو سلوک اب تک ہم سے رہا ہے۔ وہ بعض حالتوں میں تو غلاموں سے بھی بدتر رہا ہے۔ اس لیے خواہ ہم برطانیہ کے ساتھ رہنا بھی تسلیم کر لیں۔ ہماری قومی زندگی کے لیے ہندستانی صنعتوں کا تحفظ اور برطانوی یا غیر ملکی اشیاء کا مکمل اخراج ایک لازمی شرط ہوگی۔ برٹش کومنویلتھ کے اندر رہتے ہوئے ایسا تحفظ طلب کرنا کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ بلکہ نوآبادیات میں بھی ان کی ضروری ترقی کے لیے اس کا رواج موجود ہے۔

جس طرح غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کروڑوں فاقہ کشوں کے لیے اقتصادی ضرورت ہے۔ اسی طرح قوم کی اخلاقی بہبودی کے لیے شراب اور منشیات کا بائیکاٹ بھی بہت ضروری ہے۔ کانگریس نے منشیات اور شراب کی بندش کو آتم پوترتا کے خیال سے اپنانے کا ارادہ کیا ہے۔ اگر حکومت نے شراب اور منشیات کے محصول کی آمدنی ان کی بندش کے مقاصد کے لیے مخصوص بھی کر دی تو بھی ہمارا شراب کی دکانوں پر پکٹنگ جاری رہے گا اور بلاشبہ یہ پکٹنگ ان سخت شرائط کا پابند ہوگا جو بدیسی کپڑے

کے پکٹنگ پر عائد ہیں۔ میں حکومت کو دعوت دیتا ہوں کہ انتقال اختیارات کے دوران میں بدیشی کپڑے، شراب اور منشیات کی دکانوں پر پکٹنگ کو برداشت کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ وہ ان دونوں کے بارے میں قومی لیجسلیچر کا فتوے حاصل کرلے۔ اگر قوم ان کے بائیکاٹ کا فیصلہ کردے تو حکومت ہندستانیوں سے اس ضمن میں تعاون کرنے کو تیار رہے۔ لیکن حکومت پسند کرے یا نہ۔ ہم اس وقت تک چین نہیں لے سکتے جب تک ایک گز بدیسی کپڑا ابھی ہمارے ملک میں آتا رہے گا۔ یا جب تک ایک بھی شراب کی دکان ہمارے گمراہ ہم وطنوں کو بدچلن بناتی رہے گی۔

کچھ نمک کے بارے میں بھی۔ نمک بنانے پر سرکاری چھاپے بند ہونے چاہئیں۔ سول نافرمانی کی خاطر نمک قوانین کو توڑنا بند ہونا چاہئے۔ لیکن نمک تیار کرنے والے علاقوں کے قرب جوار میں رہنے والے غریب لوگوں کو نمک بنانے اور اپنے گردونواح میں اسے بیچنے کی اجازت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ محصول نمک منسوخ نہیں ہوا ہے۔ کانگریس کے گول میز کانفرنس میں شمولیت کرنے کے امکان کے پیش نظر ہم اس محصول کے فوراً منسوخ کیے جانے پر زور نہ دیں گے۔ کیوں کہ یہ محصول بہت جلد منسوخ کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن جن غرباء کی خاطر درحقیقت نمک کی مہم شروع کی گئی تھی وہ اب اصلیت میں اس محصول سے آزاد ہوگئے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ کوئی بیوپاری اس رعایت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھائے گا۔

متذکرہ بالا گزارشات سے آپ کو پتہ مل گیا ہوگا کہ بہت سی چیزیں جن میں باقی پڑھے لکھے لوگ خاص دل چسپی لیتے ہیں۔ ان سے مجھے لگاؤ نہیں ہے۔ ملازمتیں اور منصب یا ممبریاں میرے لیے کوئی دل چسپی نہیں رکھتی ہیں۔ کسان لوگ ان کو جانتے نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ گاندھی جی کے گیارہ نکات سوراج کا مفہوم ہیں۔ جو سوراج ان گیارہ نکات کو پورا نہیں کرتا ہے وہ

سوراج ہی نہیں ہے ۔ میں زمینداروں ، راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور اسی قسم کے دیگر لوگوں کے حقوق کا اس حد تک احترام کرتا ہوں۔ جس حد تک وہ لکھوکھ ہا محنت کش عوام کو نقصان نہیں پہنچاتے ہیں۔ میری دلچسپی پاؤں تلے روندے ہوئے لوگوں کو اونچا اٹھانے اور ان کو ملک کے سب سے بڑے آدمی کے برابر اونچا کرنے میں ہے۔ پرماتما کا شکر ہے کہ ستیہ اور اہنسا کے اپدیش نے ان عوام کو اپنی خودداری اور آتم شکتی کا احساس کرادیا ہے۔ ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ لیکن ہمیں آج یہ تہیہ کر لینا چاہیۓ کہ ہماری زندگی عوام کے لیے وقف ہے۔ عوام کی زندگی ہمارے لیے نہیں ہے۔ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی رقابتیں، حسد اور مذہبی اختلافات کو بھول جانا چاہیۓ۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہو جانا چاہیۓ کہ کانگریس کروڑ ہا محنت کشوں کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ ایک ایسی ناقابل مزاحمت طاقت بننے والی ہے جو کسی لالچ یا طاقت کے لیے سرگرم عمل نہیں ہے۔ بلکہ وہ مشترکہ انسانی مقصد کے لیے کام کر رہی ہے۔

تعمیری پروگرام کا ایک حصہ باقی ہے جس کا میں نے ذکر نہیں کیا ہے اور وہ چھوت چھات کو دور کرنے کا سب سے اہم کام ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں نیم دلانہ کارروائی کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ قوم کی گزشتہ تاریخی جدوجہد زیادہ شاندار ہوتی اگر ہندوؤں نے اپنے اندر سے اور ہندوازم سے اس لعنت کو دور کر دیا ہوتا۔ بہادری اور شان کو چھوڑ یئے۔ آتم پوترتا کے اس بڑے کام کے بغیر کوئی سوراج بھی حاصل کرنے کے قابل نہ ہوگا۔ بلکہ ہندوازم کے دامن پر اس سیاہ داغ کے رہتے ہوئے اگر سوراج حاصل بھی کرلیا جائے ۔ وہ اسی طرح غیر محفوظ ہوگا جس طرح بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کے بغیر خودمختاری۔

اپنا ایڈریس ختم کرنے سے پہلے مجھے سمندر پار ممالک میں اپنے ہم وطن بھائیوں کو فراموش نہ کرنا چاہیۓ۔ جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ اور دنیا کے دیگر حصوں

میں ان کی حالت غیر یقینی ہے۔ خوشی ہے کہ دیش بندھو اینڈریوز جنوبی افریقہ میں ہمارے ہم وطنوں کی امداد کر رہے ہیں۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کے مسائل کے ماہر ہیں۔ کانگریس سمندر پار ممالک کے ہندستانیوں کو صرف یہ یقین دلا سکتی ہے کہ کانگریس کو ان سے گہری ہمدردی ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ جوں جوں ہم اپنے منتہائے مقصود کے قریب پہنچتے جائیں گے ان کی حالت بھی خود بخود بدلتی جائے گی۔ میں ہندستان کے لوگوں کی طرف سے متعلقہ حکومتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس قوم کے لوگوں سے اچھے سلوک سے پیش آئیں جو بہت جلد آزادی کی وراثت حاصل کرنے والی ہے، اور روئے زمین پر کسی دیگر قوم سے عداوت نہیں رکھتی ہے۔ ہم ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے لوگوں سے وہ وہی سلوک کریں جو ہمارے آزاد ہو جانے پر اپنے ملک کے لوگوں سے ہمیں کرنا پسند کریں گے۔ یہ مطالبہ یقیناً مبالغہ آمیز نہیں ہے۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کانگریس کی کارروائی جس کی صدارت کرنے کے لیے آپ نے مجھے کہا ہے اس انداز سے کریں جو اس نازک موقع جس میں ہم اکٹھے ہوئے ہیں، کے مطابق ہو، اختلافات رائے تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن میں بھروسہ کرتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک ہمارے بحث مباحثوں کو باعزت اور ہمارے مقصد کے حصول کے لیے مؤثر بنانے میں تعاون کرے گا۔

بندے ماترم

ڈاکٹر راجندر پرشاد

بمبئی——————1934ء

بھائیو اور بہنو!

ہم ساڑھے تین برس کی محنت شاقہ اور قربانی کے بعد آج پھر جمع ہوئے ہیں۔اس دوران میں ہمارا ملک بد قسمتی سے ڈاکٹر اینی بینٹ ایسی تجربہ کار اور صائب الرائے قومی کارکن کی رہنمائی سے محروم ہو گیا۔ان کی زندگی اور کام سے ہزاروں لوگ سبق حاصل کرتے تھے۔ان کے بعد ایک اور آزمودہ کار، محب وطن، اور بہادر قومی کارکن سید حسن امام بھی ہم سے جدا ہو گئے۔انھوں نے سولہ برس ہوئے اسی شہر میں کانگریس کے ایک خاص اجلاس میں نمایاں حصہ لیا۔پھر ہماری آزادی کے وہ ناقابل تسخیر علم بردار—— وٹھل بھائی پٹیل—— ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ہم میں سے اکثر کے لیے دیس پریا جتندر موہن کی بے وقت موت بھی ایک ذاتی صدمہ ہے۔رنگا سوامی آئنگر کی وفات سے ملک نہ صرف ایک ممتاز اخبار نویس سے بلکہ ایک آئینی قانون داں سے بھی محروم ہو گیا جن کی معلومات سے ہم اکثر فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس کے بعد میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایک اور شخص بھی ہے جو گلستان وطن کے نوجوانوں میں 'پھول' کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کا جوش وخروش قومی محرومیوں اور خانگی تفکرات سے بھی فرو نہیں ہوتا۔میری مراد جواہر

لال نہرو سے ہے۔ جو ہماری ہمدردی اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اسی طرح ہمیں سبھاش چندر بوس بھی بہت یاد آتے ہیں جو آج کل جلاوطن ہیں۔ پھر ہم ان لوگوں کو بھی فراموش نہیں کر سکتے جو گمنام ہیں۔ لیکن انھوں نے ملک وقوم کی خاطر قربانی کی ہے اور ان میں سے بعض اب بھی مصائب جھیل رہے ہیں۔

ہم قوم کے ان تمام خادموں کو — خواہ وہ گمنام ہیں یا نامور۔ لیکن وفات پا چکے ہیں اپنی عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آپ نے مجھے صدارت کی دعوت ایک ایسے زمانے میں دی ہے جو حددرجہ نازک ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر آپ کی خواہش ہوگی کہ میں کانگریس کے آئندہ اجلاس تک اپنے فرائض ادا کرتا رہوں۔

مجھے اعتراف ہے کہ جب میں صدارت کی ذمہ داریوں کا خیال کرتا ہوں تو مجھے ہَول آتا ہے۔ کاش مجھے اپنے وطن کے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنے طرز پر قومی کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن قوم کے حکم کو ٹالنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کی خدمت کے لیے یہاں حاضر ہوگیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری صلاحیتیں محدود ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اعتماد کا جو اعزاز مجھے بخشا گیا ہے وہ کسی ذاتی جوہر کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ ان حقیر خدمات کا صلہ ہے جو میرے غریب سے صوبے نے موجودہ جدوجہد کے دوران میں انجام دی ہیں اور ان ہمدردیوں کا عملی ثبوت ہے جو گذشتہ دنوں ناقابل بیان مصائب کے سلسلے میں میرے صوبے کو حاصل ہوتی رہی ہیں۔ تاہم یہ اب آپ کا فرض ہے کہ ان اہم ترین ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مجھ سے تعاون کریں جو آپ نے میرے سپرد کی ہیں۔

میں چونکہ ایک ایسے صوبے سے آرہا ہوں جس کو گذشتہ دس ماہ سے قدرت نے اپنے غیظ وغضب کے اظہار کے لیے منتخب کرلیا ہے اس لیے میں ان اہل ملک کا تہہ

دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ان آفت رسیدہ لوگوں سے عملی ہمدردی کی جو پہلے زلزلے اور اس کے بعد سیلاب کے باعث بے خانماں و برباد ہوگئے۔ اس وسیع و عریض ملک کے کونے کونے سے ہر طبقہ کے لوگوں نے اور غیر ممالک کے ہندستانیوں اور غیر ملکیوں نے جس رنگ میں اپنی عملی ہمدردی اور تعاون کا ثبوت دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ تباہی بے مثال تھی تو اسے دیکھ کر ہمدردی اور تعاون کا جو جذبہ اٹھا ہے وہ بھی بے مثال ہے۔ طوفان اور زلزلے تو پہلے بھی آتے رہے ہیں اور ان کی وسعت اتنی نہ سہی تاہم تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوفناک ضرور تھے لیکن ملک نے عملی ہمدردی کا اتنا اچھا ثبوت پہلے کبھی نہیں دیا جتنا اب دیا ہے۔ جس طرح قومی جذبہ ملک کے طول و عرض میں پھیل چکا ہے اسی طرح شمالی ہند کے ایک کونے سے لوگوں کی دردناک آواز اٹھی اور دوسرے کونے تک گونجتی رہی اور اس کے جواب میں نہ صرف سیم و زر کی بارش ہوئی بلکہ آنسوؤں کا خراج بھی ملا اور لوگوں نے ذاتی خدمات بھی پیش کیں۔ جیسا کہ بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی نے اپنے ایک اوّلیں بیان میں کہا— ''بہار کو ایک ہولناک مصیبت کا سامنا ہوا اور اس نے تباہی و بربادی مچائی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قوم کو ایک مشترک غم میں حصہ لینے کا موقع مل گیا۔ لوگوں نے اسے مل کر دور کرنے کی کوشش کی اس طرح انھوں نے ایک دوسرے پر اعتماد کیا اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھول گئے۔''

گزشتہ پچاس برس کی زندگی میں کانگریس کی تحریک کئی ادوار سے گزری ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تاکہ اس زمانے کی امیدوں اور توقعات، ناکامیوں اور کمزوریوں، کامیابیوں اور فتوحات کا ایک حد تک اندازہ ہو سکے۔ لیکن میں اپنی دلی آرزو کو دبانے کی کوشش کروں گا اور صرف ایسے واقعات کی طرف اشارہ کروں گا جو موجودہ حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوں یا جن سے

مستقبل کا پروگرام بنانے میں امداد ملے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ کانگریس کا گذشتہ اجلاس کراچی میں گاندھی ارون پیکٹ کے معاً بعد منعقد ہوا تھا۔ اس وقت امید کی جاتی تھی کہ اس معاہدے سے برطانیہ اور ہندستان کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہوسکی۔ اب چونکہ سول نافرمانی ملتوی کردی گئی ہے اس لیے ان حالات کا تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت نہیں جن کے ماتحت گول میز کانفرنس سے مہاتما گاندھی کی واپسی کے بعد سول نافرمانی کو دوبارہ شروع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ معاہدہ کرنے والوں کے راستے میں ان افسروں نے ہر قدم پر رکاوٹ ڈالی جن کے سپرد یہ معاملہ کیا گیا تھا اور جو اس کے نفاذ کے ذمہ دار تھے۔ لارڈ ارون ریٹائر ہو چکے تھے اور ان کی جگہ لارڈ ولنگڈن لے چکے تھے۔ سرکاری حلقوں میں اس پیکٹ کو لارڈ ارون کی شکست پر محمول کیا گیا اور اس کے خلاف کھلم کھلا اظہار ناراضگی دیکھا گیا۔ لارڈ ارون کے ہندستان سے چلے جانے کے فوراً بعد ہی حکومت کی پالیسی میں مکمل تبدیلی آچکی تھی اور اس قسم کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں کہ گول میز کانفرنس کے خاتمہ کے فوراً بعد ہی کانگریس کو اچانک دبوچ لیا جائے۔ آثار وشواہد صاف کہہ رہے تھے کہ حکومت کانگریس کے مطالبات کو تسلیم نہیں کرسکتی اور نہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ انگلستان میں لیبر گورنمنٹ کا مستعفی ہوجانا حکومت کی اس اسکیم کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ بہت بڑی اکثریت کے ساتھ نیشنل گورنمنٹ قائم ہوگئی۔ جس کے ساتھ ہی لارڈ ارون اور مسٹر ویجوڈ بین کی ساری پالیسی بھی الٹ دی گئی۔ جب مہاتما گاندھی انگلستان سے واپس آئے تو انھوں نے اپنے آپ کو کچھ ایسی صورتِ حالات سے دوچار پایا جو بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے تیار کیے گئے تھے۔ ان دنوں یو پی میں مالیہ کی ادائیگی عارضی طور پر ملتوی کردی گئی تھی۔ تا کہ کانگریس لیڈروں

اور حکومت کے درمیان گفت وشنید کے ذریعہ مساوی بنیادوں پر ایک سمجھوتہ طے کیا جائے ۔ جو بے مثل اقتصادی گراوٹ کی وجہ سے پیدا شدہ لازمی اقتصادی وجوہات کے پیش نظر مالیہ دوبارہ ادا کرنے یا ملتوی رکھنے کے سوال کا فیصلہ کر سکے۔ لیکن حکومت نے اس کی آڑ لینے کے لیے اس کو عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک مشہور کر دیا۔ مہاتما گاندھی کے ہندستان واپس پہنچنے سے دو ہی یوم پہلے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر شیروانی اور مسٹر ٹنڈن کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ایک پرانے ریگولیشن کے ماتحت خان عبدالغفار خاں اور ان کے کچھ ساتھیوں کو قیدی بنالیا گیا تھا۔ بنگال پر تو پہلے ہی خاص سلوک کے لیے نظر انتخاب گر چکی تھی اور متعدد وسیع اختیارات والے آرڈیننس نافذ کر دیے گئے تھے۔ اسی قسم کے آرڈیننس بعد میں یو پی اور سرحد میں بھی نافذ کیے گئے۔ مہاتما گاندھی انگلستان سے واپس آرہے تھے تو سفر ہی میں حکومت سے تعاون کرنے کے لیے بیانات جاری کیے۔ لیکن جہاز سے اترنے پر آپ کو معلوم ہوا کہ ان کے بہترین ساتھیوں کو گرفتار اور قید کرلیا گیا ہے اور یو پی و سرحد میں آرڈیننس نافذ کر دیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود گاندھی جی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے مداخلت کرنے اور اگر ممکن ہو سکے تو کوئی تصفیہ کرانے کی پیش کش کی۔ آپ نے وائسرائے سے ملاقات کے لیے درخواست کی۔ جسے غیر رسمی طور پر نامنظور کر دیا گیا اور پابندی لگادی گئی کہ اگر بنگال، یو پی اور سرحد سے متعلقہ امور زیر بحث لانے مقصود نہ ہوں تو ملاقات کی اجازت مل سکتی ہے۔ ملاقات کی اجازت نہ ملنے کے بعد مہاتما گاندھی کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کو مشورہ دیں کہ سول نافرمانی کو پھر شروع کرنے کے لیے تیاری کر لے۔ لیکن آپ نے آخری کوشش کو ضروری سمجھا اور طویل تار وائسرائے کو بھیجا جس میں غیر مشروط ملاقات کی اجازت طلب کی گئی۔ جس کے نامنظور کیے جانے کی صورت میں گاندھی جی نے اپنا فرض خیال

کیا کہ وہ وائسرائے کو مطلع کردیں کہ ورکنگ کمیٹی کو پھر سے سول نافرمانی شروع کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اس آخری کوشش کا جواب مہاتما گاندھی، صدر کانگریس سردار ولبھ بھائی پٹیل اور ملک بھر کے دیگر مشہور کانگریس لیڈروں کی گرفتاری وارنٹوں کی صورت میں دیا گیا۔

کانگریس پر اچانک لاعلمی میں حملہ کیا گیا تھا اور حکومت کا خیال تھا کہ وہ چودہ روز کے اندر اندر ساری تحریک کو کچل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کانگریس کی کوئی تیاری نہ تھی۔ سارے ملک میں چند روز کے اندر تمام کانگریس کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا اور رہنماؤں کو یہ موقع ہی نہ ملا کہ وہ اپنے پیروکاران کو سول نافرمانی کی مہم کی تنظیم کے لیے مناسب ہدایات دے سکتے۔ لیکن قوم کے حق میں فخر کی بات ہے کہ جو رہنمائی ورکنگ کمیٹی نے ملک کی کی تھی اس پر آنا فاناً وفاداری سے عمل کیا گیا۔ ہزارہا لوگوں نے جیل جانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ وسیع پیمانہ پر لاٹھی چارج، فائرنگ، جرمانے، جائیدادوں کی ضبطیاں اور مار پیٹ لوگوں نے رضا کارانہ طور پر برداشت کیں۔ جن سرکاری افسروں نے تحریک کو چند روز کے اندر کچل دینے کی امیدیں باندھ رکھی تھیں ان کو بڑی پریشانی ہوئی۔ کانگریس کے خاص اجلاس دہلی اور کلکتہ میں گرفتاریوں کی بھرمار اور لاٹھیوں کی بارش کے درمیان منعقد ہوئے۔ پولیس نے اپنی تمام طاقتیں ان اجلاسوں کے روکنے کے لیے صرف کیں۔ لیکن اس تشدد کے باوجود یہ اجلاس منعقد ہوتے ہی رہے۔ اب میں مختلف آرڈیننسوں کی دفعات کا اختصار سے بیان کروں گا۔ جن میں سے کئی آرڈیننس تو بعد میں حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے والی مجالس قانون ساز نے قانون کی شکل میں بدل دیے تھے۔ تا کہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ وہ نوعیت کے لحاظ سے کس قدر سخت اور اختیارات کے لحاظ سے کس قدر مکمل تھے۔ عدالتوں کو اختیارات سے محروم کر کے ایگزیکیٹو افسروں کو وسیع

اختیارات سے مسلح کر دیا گیا تھا۔ اخبارات کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ نئے جرائم پیدا کیے گئے تھے اور بعض حالات میں اجتماعی اور انتظامی سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ بنگال کے لیے خاص طور پر بے شمار قوانین نافذ کیے گئے تھے۔ جن کا ظاہری مقصد تو بیان کردہ دہشت پسندوں کے خطرہ کا مقابلہ کرنا بیان کیا گیا تھا۔ لیکن جن کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ سارے صوبہ میں ہر قسم کی ترقی پسندانہ سیاسی سرگرمیوں کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ مبادا ان کے موید لوگ کلی اختیارات کی مالک سی آئی ڈی کے غصہ کو بھڑکانے کا موجب بن کر سزا کے مستوجب نہ بن جائیں۔ کانگریس نے دہشت پسند تحریک کے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ کبھی چھپا کر نہیں رکھا ہے۔ اس لیے بلا جھجک اور غیر مبہم الفاظ میں تمام دہشت پسندانہ حملوں کی مذمت کی ہے۔ مہاتما گاندھی کے عظیم اثر کے ماتحت کانگریس نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ دہشت پسندی کے اصولوں اور خیالات کے خلاف زبردست فضا پیدا کی جائے۔ لیکن کانگریس نے محسوس کیا ہے کہ ہر قدم پر اس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی ہے۔ حکومت کا رویہ بہت سخت رہا ہے اور جو لوگ اس بارے میں حکومت کے حمایتی اور مددگار بھی تھے ان کے ارادوں کے خلاف بھی حکومت کی شبہ کرنے کی پالیسی حاوی رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ان بے صبر جوشیلے اشخاص تک جو اس غلط طریق کار کو اختیار کر لیتے تھے زبردست اور مؤثر رائے عامہ کے ذریعہ رسائی حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ علاوہ دوسرے خیالات کے کانگریس اس لیے بھی دہشت پسندی کی مذمت کرتی ہے کہ یہ ملک کی ترقی کو روکنے اور ایسی طاقتوں کو ابھارنے کا موجب بنتی ہے۔ جو مزید بدامنی اور مصیبت پیدا کرتی ہے۔ نیز یہ طریقہ لازمی طور پر غلط اور غیر ہندستانی ہے۔ لیکن حکومت کی سخت گیری اور ناقابل مدافعت طریقوں کے ہوتے ہوئے ان نوجوانوں کو تشدد ترک کرنے پر کیسے راغب کیا جا سکتا ہے۔

ہمارا ملک ایک سخت اقتصادی تنزل کے دور میں سے گزرتا رہا ہے۔ جس کو حکومت کی اس پالیسی نے سخت تر بنا دیا ہے جو اس نے ہندستانی معاملات کا انتظام کرنے کے لیے ہندستان کے مفاد کی بجائے برطانیہ کے مفاد کو مدنظر رکھنے کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں کسانوں پر بڑی مصیبت نازل رہی ہے۔ وہ محصول اور مالیۂ زمین کا بھاری بوجھ برداشت کرنے کے ناقابل تھے اور ان کی کئی قسم کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں۔ ان برسوں میں قومی تعمیر کے کاموں پر اخراجات کو بالکل گھٹا دیا گیا۔ صنعت اور تجارت سرد بازاری سے برباد ہوگئی۔ بتیس ارب روپیہ کا سونا ملک سے باہر بھیجا گیا۔ بے روزگاری میں بھیانک اضافہ ہوا۔ برطانوی حکومت نے عام حالات میں بھی بے روزگاری کی بے حد وسعت کے پیش نظر اس کا اندازہ کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی ہے۔ ان برسوں میں ہندستان پر مبینہ پبلک قرضہ میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ پہلے سے ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ٹیکس دہندوں کا بوجھ اور بڑھایا گیا۔ غربت زدہ باشندگان ملک کو ایک ایسی فضول خرچ اور بھاری تنخواہوں والے بالائی افسروں کی حکومت کا بوجھ اٹھانے پر مجبور کیا گیا جو زیادہ تر آزادی کی تحریک کو سختی سے دبانے اور کچلنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ سب باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ملک کے بہترین واقف حال لوگوں نے بیک آواز اوٹاوہ پیکٹ کو ہندستان کے مفاد کے لیے اور خاص کر زراعت پیشہ عوام کے لیے ضرر رساں قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تصدیق کر دی گئی۔ اس پر عمل ہونے کے بعد یہ ثابت ہوگیا کہ اس پیکٹ کے معترضوں کے خدشات بے بنیاد نہ تھے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ سے ہندستان کو کامیابی سے برطانیہ کی امپیریل ترجیحی پالیسی کے رتھ کے پہیہ سے باندھ دیا گیا ہے۔

سمندر پار ممالک میں ہمارے ہم وطنوں کی حالت بھی غیر تسلی بخش ہے۔ برطانوی سلطنت کی نوآبادیات میں ان سے جو سلوک کیا جاتا رہا ہے وہ کافی دیر سے ایک جائز شکایت بنا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے بھی ہمارے کامل آزادی کے نظریہ میں رتی بھر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یکے بعد دیگرے ان نوآبادیات اور زیر سایہ ممالک میں آباد ہندستانیوں کو ان کے حقوق وراثت سے محروم کیا جارہا ہے۔ جو ان کو طویل تعلقات، خدمت اور ان نوآبادیوں کو خوشحال بنانے میں حصہ داری کی وجہ سے حاصل ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض حالات میں ہندستانی ان نوآبادیوں کو آباد کرنے کا باعث بنے ہیں۔ بہت سے تو وہیں پیدا ہوئے ہیں اور ان کا سوائے ان نوآبادیوں کے دنیا بھر میں کہیں اپنا گھر نہیں ہے۔ ایک کے بعد دوسری اسکیم گھڑی جارہی ہے کہ جوں جوں ہندستانیوں کی ضرورت باقی نہ رہے ان سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ گو یہ امر کچھ حد تک تسلی کا باعث ہے کہ نوآبادیات سے ہندستانیوں کو واپس ہندستان بھیجنے کی جبری اسکیم ترک کردی گئی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ساری سلطنت برطانیہ میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں ہندستانی لوگ زمین اور شہریت کے متعلق ایسے مکمل مساوی حقوق کے ماتحت رہ سکیں اور آباد ہوسکیں۔ جیسے کہ دوسرے لوگوں کو ہندستان میں حاصل ہیں۔ ہندستانیوں کے اخراج کی اس پالیسی کے تازہ ترین اطلاق کی خبر زنجبار سے آئی ہے۔ جہاں کئی نسلوں سے سلطان اور اس کی رعایا سے ہندستانیوں کے بہترین تعلقات چلے آنے کے باوجود بڑی عجلت سے آرڈیننس جاری کیے گئے ہیں جو ہندستانیوں کو زمین حاصل کرنے کے حقوق سے محروم کردیتے ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عرب سے نئے آنے والے لوگوں پر یہ پابندی عائد نہیں کی گئی ہے تو ہندستانیوں کے خلاف نفرت آمیز امتیاز واضح ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندستانیوں کو اپنے ہی ملک میں بھی ابتدائی شہری حقوق حاصل

نہیں ہیں اور نہ ہی مجوزہ آئینی اصلاحات میں ایسے حقوق ان کو دیے جائیں گے۔ ہم سمندر پار ممالک میں اپنے ہم وطنوں کو یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ جب ہماری حالت اس ملک میں بہتر ہو جائے گی تو خود بخود ان کی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں دیش بندھوسی ایف اینڈ ریوز کا نام نامی شکریہ کے ساتھ نہ لینا میرے لیے ناممکن ہے۔ جس نے کئی بار افریقہ جا کر ہر ممکن امداد بہم پہنچائی ہے۔

1929ء کے آخر میں لارڈ ارون نے حکومت کی جس پالیسی کا آغاز کیا تھا اور جس کی رو سے گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تھا۔ ہمیشہ سے دو رنگی چلی آرہی ہے۔ لارڈ ولنگٹن کی حکومت نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس کو نمایاں کیا ہے۔ حکومت نے دعویٰ کیا ہے کہ اس دوہری پالیسی سے ایک طرف تو آئینی اصلاحات کو ترقی دینا اور دوسری طرف ان تحریکوں کو جنھیں حکومت انقلابی خیال کرتی ہے، دبا دینا مقصود ہے۔ پہلے مقصد کے لیے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندستانیوں سے صلاح ومشورہ کے بعد ایک گول میز کانفرنس کی تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔ جن پر مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی غور کر رہی ہے۔ یہ تجاویز وائٹ پیپر کے نام سے مشہور ہیں۔ دوسرے مقصد کے حصول کے لیے حکومت نے سول نافرمانی کی تحریک کو سخت ہاتھوں سے دبا دینا ضروری خیال کیا ہے۔ ہندستانی لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ دوسری پالیسی نہ صرف بہت زوروں پر رہی ہے بلکہ بے شمار لوگوں پر ناقابل بیان مصیبتیں نازل کرنے کا باعث بنی ہے۔ آرڈیننسوں کے اجرا اور ان قانونوں کی تشکیل کی ذمہ دار ہے، جنھوں نے نہ صرف لوگوں کے معمولی شہری حقوق چھین لیے، سخت سزائیں مقرر کیں اور انقلابی تصور کی جانے والی تحریکوں کو سختی سے دبایا بلکہ خالص آئینی جدوجہد کو بھی مؤثر طور پر روک دیا ہے۔ اس پالیسی کے اصلاحی پہلو نے بے اصولی لوگوں کے دلوں میں وہ امیدیں پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جو کبھی پوری نہ ہوں گی۔ بلاشبہ تین گول میز

کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں کا لامتناہی سلسلہ اور مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی طویل تحقیقات کسی نہ کسی شکل میں گزشتہ چھ سات برس سے اپنی تحقیقات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس ساری محنت سے کوئی ایسی چیز بھی پیدا ہوتی ہے یا نہیں جو اس ملک کے سب سے زیادہ اعتدال پسند طبقہ کے لیے بھی قابل قبول ہو سکتی ہو۔

ہندستان کے لوگوں نے متفقہ طور پر وائٹ پیپر کو بے حد غیر تسلی بخش اور مایوس کن قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ بلاشبہ یہ کسی صورت میں بھی کانگریس کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا ہے۔ کانگریس نے ایسی آزادی حاصل کرنے کا اعلان کر رکھا ہے جس میں فوج، مالیات، غیر ملکی تعلقات اور ملک کے اندرونی انتظام پر مکمل قبضہ حاصل کرنا شامل ہے۔ اگر وائٹ پیپر ان تمام امور کو پورا نہیں کرتا ہے، اور ان میں کسی ایک کی طرف بتدریج ترقی کا راستہ بھی نہیں پیدا کرتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انگلستان میں بہت بڑی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ اس وائٹ پیپر کی تجاویز کو بھی نکما کر دیا جائے اور مسٹر آرتھر ہینڈرسن (لیبر پارٹی کا لیڈر) جیسے اشخاص بھی ہندستان کو لنگڑی خودمختاری دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لیے میرے لیے یہ بالکل موزوں نہ ہوگا کہ میں اپنا وقت اس وائٹ پیپر پر مفصل نکتہ چینی کرنے کے لیے ضائع کروں۔ چونکہ یہ وائٹ پیپر کی تجاویز بہت طویل اور بھاری اخراجات والے بحث مباحثوں کے بعد تیار کی گئی ہیں۔ اور جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی ان کا تفصیل وار معائنہ کر رہی ہے۔ نیز ان تجاویز کو حکومت کی آئینی اصلاحات نافذ کرنے کی پالیسی کے جواز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے میں یہ ظاہر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ وائٹ پیپر کی یہ تجاویز کانگریس کے منتہائے مقصود مکمل آزادی تو کجا ملک کے ماڈریٹ طبقہ کے مطالبہ درجہ نو آبادیات کے قریب بھی ہمیں نہیں لے جاتی ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تجاویز بعض پہلوؤں

سے ملک کو الٹی سمت میں لے جا کر اسے اس آئینی پوزیشن جو ملک کو آج کل مانٹیگو چیمسفورڈ، اصلاحات کے ماتحت حاصل ہے، سے بھی بدتر حالت کو پہنچانے والی ہیں۔

میں ان تجاویز کی چار نظریوں سے جانچ کروں گا۔

1- مجوزہ نئی مجلس آئین ساز کہاں تک ملک کی نمائندہ ہوں گی؟

2- مرکز اور صوبجات میں کس قدر حقیقی اختیارات عوام کے مقبول کنٹرول میں منتقل کیے جائیں گے؟

3- منتقل کیے جانے والے مجوزہ مالی اختیارات کون سے ہیں اور ملک پر نئی اصلاحات کی وجہ سے کیا بوجھ پڑے گا۔

4- کیا مجوزہ کانسٹی ٹیوشن اپنے اندر مزید ترقی اور آگے بڑھنے کے اجزا رکھتا ہے۔

نامزد کردہ سرکاری اور غیر سرکاری افسروں کے بلاک کی بجائے فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاستوں کے نامزدہ ممبران مقرر کیے جانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ برطانوی ہند کے نامزدہ سرکاری اور غیر سرکاری افسران کو رائے عامہ کے موافق نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یقیناً ان کا نقطۂ نگاہ زیادہ وسیع ہوتا ہے اور وہ کسی ریاست کے نامزدہ شخص کی نسبت لوگوں کی رائے سے زیادہ گہرے تعلقات رکھتے ہیں۔ وہ لوگ ہندستان کے لوگوں کے سامنے نہ سہی لیکن برطانوی حکومت کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داری ضرور محسوس کرتے ہیں۔ ریاستوں کو برطانوی ہندستان سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے۔ کیا ریاستی نامزد کردہ لوگوں کو برطانوی ہندستان کے واقعات سے کوئی تعلق یا واقفیت ہوگی؟ سرکاری نامزد ممبروں کی بجائے ریاستی نامزد ممبر مقرر کرنے کا ایک ہی نتیجہ ہوگا کہ برطانوی گرفت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ کیوں کہ ریاستی نامزد لوگ اپنے ہمراہ ایک خود مختار حکمران اور عوام کی ان خواہشات جن کے ہم برطانوی ہند میں

عادی ہو چکے ہیں سے زیادہ غفلت کا برتاؤ کرنے کے رواجات لائیں گے جو اس سختی میں اضافہ کرنے کا موجب ہوں گے۔

مانٹیگو اصلاحات کے ماتحت اسمبلی کے 145 ممبران میں سے چالیس یعنی کل تعداد کا 27.5 فی صدی ممبران نامزد ہوتے ہیں۔ ان میں برار کا نمائندہ شامل نہیں ہے۔ جو عملی طور پر ایک منتخب شدہ ممبر ہوتا ہے۔ لیکن وائٹ پیپر تجاویز کے مطابق 375 کے ہاؤس میں سے 125 یعنی 33.3 فی صدی ممبران ریاستوں کے نامزد ہوں گے۔ یعنی نامزدگیوں میں 6 فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا۔ جب ہم فیڈرل اسمبلی میں منتخب شدہ عناصر کی ترکیب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف جداگانہ طریق انتخاب کو قائم رکھا گیا ہے بلکہ اس میں کافی توسیع کی گئی اور اس تعداد میں جو عام طور پر برطانوی حکومت اور گورنر جنرل کا ساتھ دینے والی تصور کی جاتی ہے اضافہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ 104 میں سے 41 یعنی 39 فی صدی ممبر آج کل موجودہ آئین کے ماتحت جداگانہ حلقہ ہائے نیابت سے منتخب ہوتے ہیں۔

وائٹ پیپر اسکیم کے مطابق 250 میں سے 108 یعنی 43 فی صدی ممبر جداگانہ نیابت کے حلقوں سے منتخب ہو کر آئیں گے۔ پس اس امر میں بمشکل کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ مجوزہ فیڈرل اسمبلی موجودہ اسمبلی کی نسبت زیادہ مطلق العنان خیالات کی طرف جھکنے والی اور کم ترقی پسند جماعت ہوگی۔ بالائی چیمبر کی کانسٹی ٹیوشن کا تذکرہ کرنا غیر ضروری ہے کیوں کہ یہ لازمی طور پر فیڈرل اسمبلی سے کم ترقی پسند ہوگا۔ دونوں ہاؤسوں کے مشترکہ اجلاس (جیسا کہ تجویز کیا گیا ہے) میں نامزدہ ممبروں کی تعداد 631 کے ہاؤس میں 235 کے قریب ہوگی۔ یعنی 37 فی صدی۔ برطانوی ہند کے کسی معاملہ پر کسی برطانوی ہند کے وزیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کسی حالت میں بھی دو تہائی ووٹ حاصل نہ کر سکے گی۔ بشرطیکہ ریاستی نامزد کردہ ممبران وزارت کی

حمایت کرنا پسند نہ کریں۔

صوبجات میں نامزد ممبران کا بلاک اڑا دیا گیا ہے۔لیکن بنگال، بہار، اڑیسہ اور یوپی وغیرہ کئی صوبوں میں بالائی کونسل کو گدی نشین کر دیا گیا ہے اور اگر انگلستان میں بڑھتے ہوئے رجحانات کسی بات کے مظہر ہیں تو جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے مشورہ کے ماتحت دوسرے صوبوں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔فیڈرل لیجسلیچر میں دوسرے چیمبر کے لیے کوئی بھی دلیل اسے جائز قرار دینے کے لیے کیوں نہ ہو۔لیکن صوبجات کی ماتحت مجالس قانون ساز کے لیے دوسرے چیمبر کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہوسکتی ہے۔اس کے علاوہ ان بالائی کونسلوں کو قائم کرنے اور ان کو جاری رکھنے پر جو بھاری اخراجات ہوں گے ان کے لیے کوئی وجہ جواز پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔نہ ہی مانٹیگو اصلاحات کے عمل درآمد سے صوبجات میں دوسرے چیمبر بنانے کی حمایت حاصل ہوئی ہے۔حالانکہ ان اصلاحات کو ریڈیکل اور بہت ترقی پسند کہا جاتا ہے۔

مکمل آزادی سے قطع نظر کوئی بھی کانسٹی ٹیوشن سیلف گورنمنٹ ذمہ دار حکومت یا درجہ نوآبادیات دینے والی نہیں کہی جاسکتی ہے۔جو ڈیفنس، غیر ملکی معاملات اور مذہبی معاملات کے محکمے پاپولر لیجسلیچر کے قبضہ میں دینے سے انکار کر کے ان کو گورنر جنرل کے لیے مخصوص کر دیتا ہے۔وائٹ پیپر صاف طور پر یہ محکمے گورنر جنرل کے لیے مخصوص قرار دیتا ہے۔لیکن اسے الگ چھوڑ کر ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ جو محکمے وہ عوام کے نمائندوں کو منتقل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے ان کی حقیقت کیا ہے۔ان کے بارے میں یہ وضاحت موجود ہے کہ گورنر جنرل وزیروں کے مشورہ کو قبول کرنے کا پابند نہ ہوگا۔ کیوں کہ اگر وائسرائے کی اس طرح رہنمائی کی گئی تو اس کی خاص ذمہ داریوں اور مخصوص محکمہ جات پر ضرب پڑے گی۔بلکہ میں اس میں اور اضافہ کروں گا کہ اس کے مطلق العنانی اختیارات پر چوٹ لگے گی۔خاص ذمہ داریاں اس قدر وسیع ہیں کہ کوئی

قانون مشکل سے ایسا ہوگا جس کو گورنر جنرل اپنی عقل کے مطابق جو اس بارے میں آخری فیصلہ کن طاقت ہوگی روکنے یا ممنوع قرار دینے کا اختیار نہ رکھتا ہو۔ یہ خاص ذمہ داریاں ایسی وسیع اور غیر محدود ہیں کہ وہ تمام شعبہ جات پر حاوی ہوسکتی ہیں۔ گورنر اور گورنر جنرل دونوں کو عملی اغراض کے لیے اپنے اپنے حلقہ میں بہت وسیع اختیارات دیے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے کسی وزیر کی کوئی معمولی سی کارروائی بھی جو ان کو پسند نہ ہو نہایت آسانی سے ان خاص ذمہ داریوں کی سات مقرر شدہ مدات میں سے کسی ایک نہ ایک کے منافی قرار دی جاسکتی ہے۔ صوبائی خودمختاری جس کا بہت چرچا کیا گیا ہے۔ لوگوں یا ان کے وزیروں کی نسبت گورنروں کو زیادہ خودمختار بناتی ہے۔ اس کے ساتھ گورنر جنرل کو بھی یہ اختیار حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ وزیروں کی بجائے خود احکام کی تعمیل کروا سکے۔ خواہ یہ احکام کسی وزیر کے فرائض کے دائرہ میں ہی کیوں نہ آتے ہوں۔ کیوں کہ گورنر یا گورنر جنرل اسے کسی نہ کسی خاص ذمہ داری کے منافی قرار دے سکتا ہے۔ گورنر جنرل کی خاص ذمہ داریوں کو مندرجہ ذیل سات مدات میں منقسم کیا گیا ہے:

1- ہندستان یا اس کے کسی حصہ میں امن عامہ کو خطرہ کا انسداد۔
2- فیڈریشن کی ساکھ اور مالی ذمہ داری کا تحفظ۔
3- اقلیتوں کے جائز حقوق کی حفاظت۔
4- پبلک سروسز کے ممبران کو کانسٹی ٹیوشن ایکٹ کی رو سے حاصل شدہ حقوق دلانا اور ان کے جائز حقوق کا تحفظ کرنا۔
5- تجارتی امتیازات کا انسداد۔
6- ہندستانی ریاستوں کی حفاظت کرنا۔
7- گورنر جنرل کی زیر ہدایت اور اس کے ماتحت کسی محکمہ کی ایڈمنسٹریشن پر اثر انداز

ہونے والے دیگر معاملات۔

گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرے کہ آیا خاص ذمہ داریوں کی مخالفت پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ بعینہٖ یہی اختیارات جہاں تک صوبائی معاملات کا تعلق ہے۔ صوبوں کے گورنروں کو حاصل ہیں۔ عملی طور سے جو کچھ ایک ہاتھ سے دیا گیا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہی چھین لیا گیا۔ گو امن وقانون کا محکمہ صوبائی حکومتوں کو منتقل کیا گیا بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے بھی گورنر اور گورنر جنرل کی خاص ذمہ داریوں کے دوہرے پہرہ میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس ملک کے لوگ خوب جانتے ہیں کہ اس دفعہ کو کس طرح ہر طرف موڑا جاسکتا ہے۔ میں کوئی مبالغہ نہیں کر رہا ہوں۔ اگر وائٹ پیپر تجاویز کے ماتحت قیام امن کی خاص ذمہ داری کو اس کی وسیع اور ہمہ گیر نوعیت میں محفوظ رکھا گیا ہے تو یہ کہنا ایک دھوکہ اور فریب ہے کہ امن وقانون کا محکمہ ہندستانیوں کو منتقل کیا گیا ہے۔ اس ذمہ داری کی دوسری تسلیم شدہ تشریح کی وسیع طاقت گورنر جنرل کو یہ اختیار دے دیتی ہے کہ جب کبھی کوئی وزیر کوئی ایسے اخراجات یا قرضہ لینے کی تجویز کرے جو دنیا کی مالی منڈی میں ہندستان کے حق پر اثر انداز ہونے والی ہو تو گورنر جنرل اس کو مداخلت کر کے روک سکتا ہے۔ گزشتہ تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندستان کا مالی استحکام اور کریڈٹ کا انحصار ہندستان کے خرچ پر برطانوی منافع کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ ہندستان کی مالی ساکھ کو قائم کرنے کے نام پر اتنی کثرت سے اور بڑی دیدہ دلیری سے برطانوی مفاد کو فیض پہنچایا گیا ہے کہ اب اغلب نہیں ہے کہ کوئی ہندستانی ان الفاظ کے ظاہری معنوں سے دھوکہ کھا جائے۔

حکومت کی تمام تر کرنسی اور تبادلہ کی پالیسی ان نظریوں کے ماتحت چلائی جاتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کس طرح کئی مرتبہ بیک جنبش قلم یا کسی بظاہر بالکل معصومانہ سرکاری اعلان سے کروڑوں روپیہ چپ چاپ ہندستانیوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کی

جیب میں چلا جاتا رہا ہے اور ہندستانیوں کو اس کا علم بھی نہ ہونے پاتا تھا۔ تیسری ذمہ داری بھی بلاشبہ کئی بے ڈول جوڑ توڑ کرنے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ ہمارے مسلمان بھائی اور دوسرے لوگ جو اقلیت میں ہیں ان کا اس خیال سے گمراہ ہو جانا بہت ممکن ہے کہ برطانوی حکومت نے ان کے حقوق کی نگہداشت کی خاص ذمہ داری اپنے پاس محفوظ رکھی ہے۔ حقیقت میں تمام فرقوں کو ایک دوسرے سے برسرپیکار رکھنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی کارآمد تجویز نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال کرنا کہ یہ تحفظ ہندستانی اقلیتوں کے مفاد کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ محض خودفریبی ہے۔ کیوں کہ عملی کارروائی کے وقت اقلیتوں کو پتہ لگ جائے گا کہ ان تحفظات سے ان کی حفاظت مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس بہت ہی مختصر اقلیت کے سفری پرندوں کے مفاد کا تحفظ کرنا مقصود ہے جو ہزارہا میل سے اڑ کر آتے ہیں۔ دن کی روشنی میں مال و زر جمع کرتے ہیں اور جب ان کی زندگی کی شام قریب آتی ہے تو پھر اپنی کوششوں کے پھل سے لذت اندوز ہونے کے لیے واپس اپنے وطن کو اڑ جاتے ہیں۔

چوتھی ذمہ داری صوبائی خودمختاری کی بچی کھچی طاقت کو بھی بہا و کر دیتی ہے۔ دراصل ہم اپنے گھر کے ایسے مالک ہوں گے جو اپنے نوکروں کو کوئی کام کرنے کا حکم دینے کا اختیار تو نہیں رکھتے۔ لیکن ان کو ناقابل برداشت بھاری تنخواہیں ادا کرنے، ان کو پنشن، رخصت اور ترقی وغیرہ کی گارنٹی دینے پر مجبور ہیں۔ ان نام نہاد پبلک سرونٹس کے لیے اپنے مبینہ اعلیٰ افسروں کے احکام۔ فیصلوں اور ان کی پالیسی کو الٹ کر رکھ دینا ایک ادنیٰ سی بات ہوگی۔ وہ ایسے ڈیڈ لاک پیدا کر سکیں گے جن کو ہندستانیوں کے خلاف استعمال کر کے وزیروں کو نااہل اور ناتجربہ کار بتایا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا جائے گا کہ ان کو اختیارات منتقل کرنا بڑی غلطی تھی۔

انگریزوں کے خلاف تجارتی امتیازات کو روکنے کے نام پر دراصل اس بات کی

پختہ تسلی کی گئی ہے کہ ہندستانیوں سے ماضی کی طرح آئندہ بھی امتیازی سلوک روا رکھا جا سکے گا۔ تمام کاروباری اشخاص کو جن کا حکومت سے کچھ بھی واسطہ پڑا اس بات کا بخوبی تجربہ ہو چکا ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں حکومت کے محتاج ہوئے بغیر وہ ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے ہیں اور کس طرح ان کو متعدد بار ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کا ایک انگریز بیوپاری کو کبھی نہیں کرنا پڑتا۔ کوئلہ کی کانوں کو ہی لے لیجیے۔ وہاں کام کرنے والے لوگ اچھی طرح بتا سکتے ہیں کہ کوئلہ کی کان کے کسی ہندستانی مالک کے لیے ریلوے سائیڈنگ حاصل کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ کتنی دقت اس کو ریلوے ویگن حاصل کرنے میں پیش آتی ہے اور کس طرح ہر روز عملی طور پر ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ میں یہ ذکر نہیں چھیڑنا چاہتا کہ کس طرح چند انگریزی فرموں نے عملی طور پر تمام اعلیٰ قسم کے کوئلہ کی کانوں کا ٹھیکہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور ہندستانیوں کو بڑی مشکل سے دوسرے اور تیسرے درجہ کی کانوں پر ہی اکتفا کرنی پڑی۔ مجھے یہ بھی علم ہے اور میں اسے نظر انداز نہیں کر رہا ہوں کہ کوئلہ کی کانوں کے زمین کے مالک زیادہ ہندستانی ہی ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسی کارروائیوں کا انتظام کس طرح کیا جاتا ہے اور خاص کر جب مالک زمین اتفاق سے بوجہ نابالغی عدالت کے زیر پناہ ہو۔ ریلوے کی کرایہ کی تشخیص بھی ایک آسان چابی کا کام دیتا ہے۔ میں اپنے صوبہ میں آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن کے معاملات کا نگراں ہوں۔ چند برس پیشتر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ سیوان ضلع سارن سے جہاں زیادہ تر روئی کی کاشت ہوتی ہے۔ مدھوبنی ضلع دربھنگہ تک جہاں ہم بہترین اور بڑی مقدار میں کھادی تیار کرتے ہیں۔ روئی کی ٹرانسپورٹ کا خرچ اتنا ہی پڑتا ہے جتنا بمبئی سے جاپان روئی لے جانے اور وہاں سے روئی کا تیار شدہ کپڑا واپس بمبئی لانے پر آتا ہے۔ یاد رہے کہ دونوں اضلاع ایک ہی ڈویژن میں واقع ہیں اور ترہٹ کمشنر کے ماتحت

ہیں۔ حال ہی اس میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں اس کا مجھے ٹھیک علم نہیں ہے۔ اسی طرح مجھے بتایا گیا ہے کہ جنوبی افریقہ سے ہندستانی کپڑے کے کارخانوں میں کوئلہ لانے پر اسی قدر خرچ آتا ہے جس قدر بہار کی کانوں سے ان کارخانوں میں کوئلہ بہم پہنچانے پر خرچ آتا ہے۔ میں نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں گو اس قسم کی بے شمار مثالیں اور بھی ایسی پیش کی جا سکتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں ساری حکومت ہند کی پالیسی ایسے انداز سے منظم کی گئی تھی کہ وہ ہندستانیوں کی بجائے غیر ملکیوں کو فائدہ پہنچانے والی بنی رہی ہے۔ اگر کوئی وزیر کسی موقع پر منصفانہ برتاؤ کرنے کی کوشش کرے تو اس کو فوراً انگریزوں سے امتیازی سلوک کرنے کی بنا پر روک دیا جائے گا۔ گورنر جنرل یا گورنر کو کوئی تکلیف نہ ہوگی کہ وہ اپنی خاص ذمہ داری کو بجالا کر اس بے انصافی کو بدستور جاری رکھ سکے۔

ہندستانی ریاستوں کے بارے میں ہمیں پہلے ہی کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ ریاستی رعایا کی آئینی اصلاحات حاصل کرنے کی کوششوں کو کس طرح پامال کیا جاتا رہا ہے۔ گورنر یا گورنر جنرل کی اس بارے میں خاص ذمہ داری کو ان ریاستوں میں جمہوری خیالات کی اشاعت کی روک تھام کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

گورنر جنرل اور گورنروں کے خاص اختیارات بہت زیادہ ہمہ گیر قسم کے ہیں۔ موجودہ کانسٹی ٹیوشن کے ماتحت تو گورنر کو کسی کارروائی کی تصدیق کرنے یا اس کو روک دینے کے اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن وائٹ تجاویز میں اس کو یہ بھی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مجلس قانون ساز کو حکماً خاص کارروائی کرنے یا خاص قانون بنانے سے روک سکتا ہے۔ نیز کوئی اور خاص قانون پاس کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ بلکہ وہ یہ بھی حکم دے سکتا ہے کہ فلاں قانون فلاں تاریخ تک پاس کر دیا جائے اور لیجسلیچر کے انکار کرنے یا گورنر کے احکام کی تعمیل نہ کر سکنے کی صورت میں وہ قانون گورنر جنرل یا گورنر

کا قانون بن جائے گا۔ جسے وہی پوری طاقت حاصل ہوگی جو مجلس قانون ساز کے پاس کردہ قانون کی ہوتی ہے اور اس قانون کو آرڈیننس کا نام دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ نہ ہی اس قانون پر کسی آرڈیننس کی طرح خاص وقت تک لاگو رہنے کی پابندی ہی ہوگی۔ ان تجاویز کے ذریعہ ہندستان کو دراصل ڈکٹیٹر نظام کے ماتحت کر دیا گیا ہے مسٹر چرچل نے اس صورت حالات کو بڑی خوبی سے ایک اور ہی انداز میں بیان کیا ہے۔

> ''وائسرائے یا گورنر جنرل کو ایک ہٹلر یا مسولینی کے تمام اختیارات سے مسلح کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی قلم کی نوک سے ساری کانسٹی ٹیوشن کو درہم برہم کر سکتا تھا۔ وہ کوئی قانون پاس کیے جانے کا فرمان جاری کر سکتا تھا۔ ان تمام معاملات کا وہ خود واحد مصنف تھا۔ اس قسم کے اختیارات کا مالک ڈکٹیٹر ہی تھا۔ جس کے پاس بڑی طاقتور فوج تھی۔''

یہ تمام اختیارات صرف گورنر جنرل کو ہی حاصل نہیں ہیں۔ بلکہ سارے صوبائی گورنروں کو بھی یہی اختیارات حاصل ہیں۔ گورنروں کو پہلی بار آرڈیننس اور گورنری قانون پاس کرنے اور اپنے حلقہ میں گورنر جنرل کے تمام اختیارات جو اسے سارے ملک کے لیے مجموعی طور پر حاصل ہیں بھی دے دیے گئے ہیں۔ وائٹ پیپر کی تجاویز تو وہ معمولی اختیارات بھی جو آج اسمبلی کو حاصل ہیں چھین لیتی ہیں۔ آج تو ریلوے بجٹ پر بحث کے وقت ریلوے ایڈمنسٹریشن کے خلاف شکایات بیان کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مرکزی اسمبلی ریلوے کے اخراجات اور آمدنی پر بحث کر کے اس پر اپنی رائے ظاہر کر سکتی ہے۔ لیکن نئی تجاویز میں ایک شاہی ریلوے اتھارٹی کی تجویز سے آئندہ حکومت اور لیجسلیچر پر پابندی لگا دی گئی ہے کہ وہ ایسے معاملات پر کوئی موثر نکتہ چینی نہ

کر سکے جو اس شاہی اتھارٹی کو منتقل کیے گئے ہوں۔ ریلوں پر 800 کروڑ روپیہ لگایا گیا ہے اور وہ زیادہ تر قومی ادارہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو چند ایک ریلیں ابھی سرکاری جائیدادنہیں بنی ہیں وہ بھی بہت جلد سرکاری ملکیت میں آنے والی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ریلوں کا مسئلہ معمولی اور نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

جب ہم مالیات کے سوال پر غور کرتے ہیں تو ہمیں بعینہ اصلاحات کی جھوٹی نوعیت اور مکاری کا صاف پتہ لگتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کے مالیات کی کل آمدنی کا 80 فی صدی حصہ فوجی اخراجات کھا جائیں گے۔ قرضہ، گارنٹی شدہ تنخواہیں، پنشن اور الاؤنسوں کی رقوم پر اسمبلی کی رائے نہ لی جائے گی۔ باقی کا 20 فی صدی حصہ ایسا ہوگا جس کی تفاصیل لیجسلیچر کے سامنے جواب دہ وزیر تیار کر سکے گا۔ لیکن یہ بھی اپر ہاؤس کے سامنے غور کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اس کے بعد دونوں ہاؤسوں کے مشترکہ اجلاس میں آخری بحث کے لیے پیش کیا جائے گا۔ مزید برآں اگر گورنر جنرل کسی وزیر کی طرف سے پیش کردہ کسی خاص مد کے لیے مطالبہ زر کو اپنی خاص ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے پیش نظر ناکافی خیال کرے تو اسے اختیار ہوگا کہ وہ جس قدر رقم ان خاص ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ضروری خیال کرے اس مطالبہ میں ریزرو کر دے۔ اس ریزرو شدہ رقم پر مجلس قانون ساز کو ووٹ کرنے کا حق نہ ہوگا۔ پس یہ ظاہر ہے کہ مرکز میں پبلک روپیہ پر وزیروں کا کنٹرول عملی طور پر صفر کے برابر ہے۔

اب تجاویز پر عمل درآمد کرنے سے جو بوجھ ملک پر آپڑے گا اس کا اندازہ لگائیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ صوبجاتی خودمختاری کے نفاذ سے 6-1/2 سے لے کر 8 کروڑ روپیہ تک کا سالانہ خرچ اور مرکز کی ذمہ داریوں پر دو کروڑ روپیہ سالانہ کا مزید خرچ ملک پر پڑے گا۔ ایسے ملک میں جو بلاشبہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ غریب ملک ہے۔ جہاں حکومت کے نظم ونسق کے اخراجات سب سے زیادہ اور جو یقیناً ساری

آبادی کی اوسط آمدنی سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ روپے کے ناقابل برداشت بوجھ میں کوئی اضافہ زبردست غلط فہمی پیدا کرنے کے سوا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ کرے گا۔ ان مبہم اور رجعت پسندانہ تجاویز جو ملک کی غلامی کے بندھنوں کو قائم رکھنے اور مزید کسنے کے لیے تیار کی گئی ہیں کی قیمت کے طور پر یہ فالتو بوجھ برداشت کرنے کی رضا مندی کوئی سمجھدار آدمی کیسے دے سکتا ہے؟

اس نئے کانسٹی ٹیوشن میں ترقی اور خود بخود آگے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر ایک بات برطانوی پارلیمنٹ کی مرضی اور خواہش مشفقانہ پر منحصر رہی ہے اور آئندہ بھی ایسے ہی رہے گی۔ فیڈریشن جو اتنی زیادہ شرائط کو پورے کرنے کے بعد دو مرتبہ پارلیمنٹ برطانیہ میں پاس ہو جانے پر رائج ہوگی وہ کیا ہوگی؟ یہ اسی قسم کی فیڈریشن ہوگی جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی ہے۔ اس فیڈریشن میں ہندستان کی ایک تہائی کے نامزد ممبران کو باقی دو تہائی کے ترقی پسند منتخب نمائندوں کی مخالفت کرنے اور ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ کسی معاملہ میں بھی آپس میں باہمی میل جول نہیں پایا جاتا ہے۔ راجوں اور نوابوں کے نامزدوں کو برطانوی ہندستان کے نظم و نسق میں مداخلت کرنے کے لیے برٹش انڈیا کے منتخب شدہ نمائندوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔ لیکن برٹش انڈیا کے نمائندوں کو ریاستوں کے انتظام میں رتی بھر بھی دخل دینے کی اجازت نہ ہوگی۔ ریاستوں میں وہی مطلق العنان حکومت جاری رہے گی۔ بنیادی شہری حقوق جو کسی حکومت اور اس کے لوگوں کے درمیان اتحاد کی پہلی شرط ہونی چاہئے، ان ریاستوں میں ان کی گارنٹی دینے کا اعلان بھی نہ کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایسی قسم کی فیڈریشن ہوگی۔ جس میں ہندستان کے ایک تہائی حصہ میں عریاں مطلق العنانی محفوظ بیٹھی ہوئی باقی دو تہائی ہندستان کی ہر مقبول عام خواہش میں وقتاً فوقتاً مداخلت کرتی رہے گی۔ لیکن راجے اور

نواب خود زیادہ بے بس ہو جائیں گے اور بہت جلد ان کو احساس ہو جائے گا کہ گوان کو آزاد ہندستان کی دست اندازی سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن وہ وائسرائے کی مرضی کے زیادہ غلام بن گئے ہیں۔

میں نے حکومت کی دوعملی پالیسی پر مفصل بحث کی ہے۔ اب میں ہماری اپنی پالیسی اور تجاویز کی طرف توجہ دیتا ہوں۔ 1932ء میں عارضی صلح کے ٹوٹ جانے کے بعد کچھ اس قسم کے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ ہمیں حکومت کی پالیسی کو بالائے طاق رکھ کر اپنا طریق کار بنانا پڑا ہے۔ سول نافرمانی کے التوا کا اعلان حکومت کی کسی پالیسی کی وجہ سے نہیں کرنا پڑا ہے۔ بلکہ اس کا باعث ہماری جدوجہد کی مخصوص اخلاقی اور روحانی نوعیت ہے۔ میں مئی 1939ء کے تاریخی پٹنہ ریزولیوشن کی تفاصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اس وقت حکومت نے وزیراعظم برطانیہ کے کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ ہندو فرقہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس کا گاندھی جی نے جیل کے اندر سے کامیاب مقابلہ کیا۔ گاندھی جی نے چھوت چھات کی تنسیخ کی تحریک کو کس طرح تیز کر دیا تھا۔ ان کا تاریخی مرن برت، ان کی رہائی، پونہ کانفرنس اور مہاتما گاندھی کا ہریجن ادھار کے لیے وسیع دورہ اور اس کے دوران میں حالات کے مطالعہ کے نتیجہ کے طور پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں سول نافرمانی کے التوا اور اسے صرف اپنی ذات تک محدود کر دینے کی سفارش کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ میں یہ ہندستان کے لوگوں پر چھوڑتا ہوں کہ وہ ان واقعات کا گاندھی جی کے ان بیانات کی روشنی میں مطالعہ کریں جو آپ اس ضمن میں وقتاً فوقتاً دیتے رہے ہیں۔ جن عناصر کے دباؤ کے ماتحت گاندھی جی نے سول نافرمانی کی عوامی تحریک کو ملتوی کرنے کی سفارش کی تھی۔ وہ اتفاقیہ مبصرین کی نگاہ سے بھی چھپ نہ سکے ہوں گے۔ میرے خیال میں دو کمزوریوں نے ہمارے پاؤں ڈگمگا دیے تھے۔ اوّل یہ کہ کانگریس کارکنان

آہستہ آہستہ غالباً غیر ارادی طور پر خفیہ طریقوں کو اپنانے لگ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے کھلم کھلا مزاحمت کرنے کی جدوجہد، چالاکی اور ہوشیاری کی لڑائی بن کر رہ گئی تھی۔ یہ احساس نہیں رہا تھا کہ ستیہ گرہ لازمی طور پر ایسا طریق جنگ ہے جو بلند اخلاق کی سطح پر قائم ہے اور جس میں مصیبت کو کھلے بندوں خود دعوت دی جاتی ہے اور ہنستے ہوئے اسے برداشت کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد مخالف کے اخلاقی احساس کو اپیل کرکے اسے مغلوب کرنا ہوتا ہے، اور اس طریق کار میں مخالف پر اچانک فوقیت حاصل کرنا خود ستیہ گرہی کے لیے مہلک نتائج پیدا کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

دوسرے یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ حکومت کا ہمارے کمزور پہلو پر حملہ کامیاب ثابت ہوا۔ لوگ جس طرح قید ہونے اور اپنی جانیں قربان کرنے پر آمادہ تھے اس طرح وہ جائدادوں کو قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب حکومت نے بھاری جرمانے کرکے ان کی وصولی کے لیے جائدادوں کی ضبطی وسیع پیمانہ پر شروع کردی تو آہستہ آہستہ لوگوں میں گراوٹ پیدا ہوگئی جس سے تحریک کی پشت پناہ ہی ٹوٹ گئی۔ کوشش کی گئی کہ اس تحریک کو ان لوگوں تک محدود کردیا جائے جن کو اس پر پورا اعتماد ہے اور اس تحریک کو خفیہ طریقوں سے پاک کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ میں نے پونا اور پٹنہ کے فیصلوں کی یہ جزوی تشریح کی ہے۔ بالآخر ملک اور اس تحریک کے مفاد کے پیش نظر اسے معطل کرنا ہی پڑا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ ہماری اپنی کمزوری ہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں دل شکستہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا ہوں۔ ہمارا بلند مقصد ایک براعظم کے برابر وسیع ملک کی آزادی حاصل کرنے سے کم نہیں ہے۔ اس ملک میں بہت سے فرقوں اور عقائد کے پیروکار اور کئی مختلف زبانیں بولنے والے لوگ آباد ہیں لیکن کانگریس کی آواز پر ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جس طرح لوگوں نے لبیک کہا ہے وہ بہت شاندار ہے اور ہمیں اس پر ناز کرنے کا بجا

طور پر حق حاصل ہے۔ چونکہ ہمارا مقصد بہت بلند ہے۔ ہمارے سامنے بہت بڑا اور مشکل کام ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی کمزوریوں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے نقائص پر غور کرنا چاہئے۔ مہاتما گاندھی کے بعض بیانات پر کڑی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ان ریزولیوشنوں اور مہاتما جی کے بیانات کی اہمیت اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ان کی وجہ سے کچھ بنیادی غور طلب امور اب سامنے آگئے ہیں۔ مہاتما جی نے 7 راپریل گزشتہ کو پٹنہ سے پہلا بیان جاری کیا تھا۔ اسی وقت آپ نے ڈاکٹر انصاری سے بھی خط وکتابت کی تھی۔ اس بیان میں آپ نے کانگریس اور کانگریس کارکنوں کو مشورہ دیا تھا کہ عام سول نافرمانی پر تعطل کر کے صرف مجھے یہ حق دیا جائے کہ میں اسے ذاتی طور پر چلا سکوں۔ جو لوگ کونسلوں میں جانے پر یقین رکھتے تھے ان کو آپ نے کونسلوں میں جانے کا پروگرام ہاتھ میں لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے بعد ماہ مئی میں پٹنہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ان دونوں نکات پر مفصل بحث کی گئی اور ان کو منظور کرلیا گیا۔ قدرتی طور پر کونسلوں میں داخلہ کے پروگرام کو چلانے کے لیے کانگریس پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا۔ جس کے سپرد فی الحال کانگریسیوں کو اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب بنانے کے لیے پروپیگنڈہ کی تنظیم، رہنمائی اور اس پر کنٹرول کرنے کا کام کیا گیا ہے۔ اب ہم ایسے جدوجہد کے دور میں سے گزر رہے ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر قانون ساز انجمنوں میں وائٹ پیپر اور حکومت کی بے رحمانہ تشدد کی پالیسی کے بارے میں کانگریس کی پالیسی جن پر اسمبلیوں کی تمام دوسری پارٹیاں متفق ہیں اور کمیونل ایوارڈ کے بارے میں کانگریس پالیسی جس پر اسمبلی کی تمام پارٹیاں متفق نہیں ہیں، مرتب کی گئی ہے۔

آپ لوگوں کو یاد ہوگا کہ دوسری گول میز کانفرنس کے بعد حکومت برطانیہ نے اصلاح شدہ آئین کے ماتحت لیجسلیچروں میں فرقہ وارانہ نیابت رائج کرنے کے

بارے میں اپنے فیصلہ کا اعلان کیا تھا۔ کیوں کہ گول میز کانفرنس کے ہندستانی ممبران ہندستان کے مختلف فرقوں کے آئین کے مسئلہ پر واضح اختلافات کے بارے میں خود کوئی سمجھوتہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ بدقسمتی سے اس فیصلہ نے ایسی پوزیشن پیدا کر دی ہے کہ ایک طرف تو ہم آپس میں متفق نہیں ہو سکے ہیں دوسری طرف اس فرقہ وارانہ فیصلہ کو بھی قبول کرنا ناممکن ہے۔ جو کئی پہلوؤں سے خلاف قومیت ہے اور ملک میں مشترکہ قومی نظریہ کی ترقی کو روکنے کا موجب بننے والا ہے۔ کئی اقلیتیں اور خاص کر مسلمان اس فیصلہ کو مسترد کرنے کے خلاف ہیں۔ یا یوں کہئے کہ وہ اس کو اپنے مفاد کا محافظ خیال کرتے ہیں۔ اس لیے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو فیصلہ کرنا تھا کہ اس سوال پر ایک طرف تو ہندوؤں کا بہت بڑا حصہ اور سکھ ہیں دوسری طرف چند سرکردہ شخصیتوں کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمان ہیں اور شاید باقی اقلیتوں کے افراد تیسری طرف ہیں۔ پہلا فریق اس فیصلہ کو غیر مشروط طور پر مسترد کرنے کے حق میں ہے دوسرا فریق اس کی اتنے ہی زور سے سرگرم حمایت کرتا ہے۔ تاوقتیکہ اس کی بجائے کوئی متفقہ طور پر طے شدہ سمجھوتہ رائج نہ کیا جائے۔ ان حالات کے ماتحت کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لیے کوئی دوسرا راستہ اس کے سوا باقی نہیں رہا ہے کہ وہ کمیونل ایوارڈ کی غیر تسلی بخش اور خلاف قومیت نوعیت کا اظہار کرنے اور کچھ وقت گزرنے پر اس کی بجائے کوئی متفقہ سمجھوتہ پیش کرنے کے قابل ہونے کی امید پر ملک کی توجہ اس فیصلہ کے خلاف یا حق میں ایجی ٹیشن جاری کرنے پر مبذول نہ کرے۔

پچھلے چند ہفتوں میں واقعات کی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ مہاتما جی نے حال میں دو اہم بیانات جاری کیے ہیں۔ جن میں آپ نے گزشتہ پندرہ برس کی تاریخ کے مطالعہ کے نتائج تحریر کیے ہیں اور درست طور پر ہمارے دلوں کے اندرونی پردوں پر دستک دی ہے۔ ہمیں آئندہ کے لیے متنبہ کیا ہے۔ ان کے بدترین نکتہ چینوں نے

بھی ان کے استدلال کی مخالفت نہیں کی ہے۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کی تائید کی ہے۔ اگر ہم پندرہ برس کی اپنی جدوجہد کے بعد حالات کو صحیح طور پر محسوس کرلیں تو یہ ہمارے لیے اور ہمارے ملک کے لیے بہت ہی بہتر ہوگا۔ ان کا پہلا بیان تو ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا بیان ملک بھر کی طرف سے پہلے بیان کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ پہلے بیان میں مہاتما جی نے سچائی، عدم تشدد اور کھدر جوان کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہیں، کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہے کہ اصلاحی اور انقلابی حالات تبدیلی قلب سے پیدا ہونے چاہئیں نہ کہ زبردستی لائے جائیں۔ آپ نے اعلان کیا ہے کہ ملک کا ایک گروہ تو ان اعتقادات سے بالکل دور نکلتا جارہا ہے اور دوسرا گروہ بھی ان پر عمل درآمد کرنے کی کوشش نہیں کررہا ہے۔

لہٰذا مہاتما جی کے لیے سوائے کانگریس سے کنارہ کش ہوجانے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ دوسرے بیان میں گاندھی جی نے اپنے اس اعتقاد کا اعلان کیا ہے کہ کانگریس سے ان کی کنارہ کشی ناگزیر ہے۔ لیکن وہ صرف اس لیے کانگریس سے الگ ہورہے ہیں کہ وہ کانگریس اور ملک کی پہلے سے زیادہ خدمت کرنے کے قابل ہوسکیں۔

لہٰذا آپ نے کانگریس کے آئین میں ایک ایسی اصلاح تجویز کی ہے جو کانگریس کو ابتری سے بچانے والی ہوسکتی ہے۔ چونکہ سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر انصاری اور خان بھائیوں جیسے مقتدر لیڈروں نے بڑی خوشی سے گاندھی جی کے فیصلہ کو صحیح تسلیم کرلیا ہے اس لیے میرے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ان کی کانگریس سے علیحدگی کے سود وزیاں پر بحث کرنے کے لیے آپ کا وقت ضائع کروں۔ اگر میرا اپنا خیال ان دوستوں کے برعکس ہوتا تو میں بھی یقیناً ایسا ہی کرتا۔ لیکن میں اپنے ساتھیوں سے بالکل متفق ہوں۔ گو میرا دل و دماغ مہاتما جی کے کانگریس سے الگ ہونے کے خیال سے بے چین ہو اٹھتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے آپ کو یہ یاد دلاتا ہوں کہ مہاتما جی نے

یہ فیصلہ سچائی اور عدم تشدد پر گہرے وشواس اور شردھا کی وجہ سے کیا ہے اور اس فیصلہ سے ان آدرشوں کو مزید ترقی وتقویت ملے گی تو مجھے تسکین ہو جاتی ہے۔

مہاتما جی نے پختہ ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ ان امور پر کانگریس کا فیصلہ لینے کی کوشش نہ کریں گے جو ان کی زندگی کا اصل جوہر ہیں۔ میں آپ سے مطالبہ کروں گا کہ آپ ان امور کو یونہی نظر انداز نہ کر دیں۔ میں آپ پر زور دوں گا کہ آپ ان کے تاثرات کو محسوس کریں اور اپنی پالیسی اور اپنے پروگرام میں کم از کم ان کو کوئی جگہ دیں۔ گو میں دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ ان چیزوں پر میرا مہاتما گاندھی کی طرح مضبوط اعتقاد ہے۔ لیکن انھوں نے ہم میں سے کچھ لوگوں کو ان چیزوں سے پیار کرنا سکھایا ہے۔ اس لیے میں اپنا عقیدہ اور اعتقاد بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

کانگریس کے عقیدہ میں ترمیم کے متعلق میں آپ سے ایک سوال کروں گا۔ کہ کیا آپ اب تک درحقیقت ''پرامن اور جائز ذرائع'' کا مطلب ''سچائی اور عدم تشدد پر مبنی ذرائع'' سمجھتے رہے ہیں یا نہیں؟ کیا بیرونی دنیا ہمارے عقیدہ کو کسی اور معنوں میں سمجھتی رہی ہے؟

آج جو عزت ہمیں حاصل ہے اور جو کچھ مخالفین ہمارے خلاف کہتے ہیں۔ یا جو کچھ ہمارے اپنے آئینے کی طرح شفاف دل سے ہم پر واضح ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس بلند عقیدہ ہی کی بدولت ہے جس کو ہم نے اپنا آدرش بنائے رکھا ہے۔ گزشتہ برسوں میں اگر ہمارے عقیدہ کے معنی سچائی اور عدم تشدد سے کچھ بھی کم ہوتے تو دنیا ہماری جدوجہد کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھنا بند کر دیتی۔ اگر ہم نے اس اونچے آدرش کا اعلان نہ کیا ہوتا، تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس بربریت کا ہم اب تک شکار ہوتے رہے ہیں وہ حد درجہ عریاں اور زیادہ سخت شکل میں ہم پر نازل ہوئی ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنے حکمرانوں کو مہذب بنانے کے لیے جو کچھ بھی شریفانہ مزاحمت کرتے

رہے ہیں وہ اب تک ناکام رہی ہے۔

اب میں حق رائے دہندگی کے لیے سوت اور کھادی کی شرطوں جن پر کافی بحث مباحثہ ہو چکا ہے، کی طرف آتا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ دنیا بھر میں کوئی دوسرا ایسا جھنڈا نہیں ہے جو ہمارے اس جھنڈے سے زیادہ اخلاص اور بلند آدرشوں کا مظہر ہو تو کوئی قومی غرور کا مجرم نہ سمجھا جاؤں گا۔ یہ جھنڈا ایک ہی ریلے میں زمانہ حال کی انسانیت کی چار لعنتوں کو یک قلم خارج کر دیتا ہے۔ میرا مطلب ملوکیت پرستی، فوجی راج، سرمایہ داری اور صنعتی اجارہ داری سے ہے۔ چرخہ اور کھادی عوام اور خاص جماعتوں کے درمیان ایک زندہ رشتہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ ملک کے اس عہد کا نشان ہے جو عدم تشدد پر مبنی ذرائع سے لوٹ کھسوٹ کی تمام قسموں کی مزاحمت کا ہم نے لے رکھا ہے۔ یہ دونوں پرائیویٹ زندگی اور سیاسیات کی پاکیزگی کے دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر کھادی کی شرط اڑا دی جائے تو شہروں اور دیہات کے مابین جو زندہ کڑی ہے وہ فوراً ہی ٹوٹ جاتی ہے۔

میرے خیال میں سچائی، عدم تشدد اور کھادی ہی وہ سہ گونہ طاقت ہے جس کے بل پر ہم کراچی پروگرام بلکہ اس سے زیادہ کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہم وطنوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ہمارے کراچی کے عہد کے پورے ہونے کا انتظار نہ کرتا ہوا اپنے مطالبہ کو بڑھانے پر اصرار کرتا ہے۔ جہاں مجھے کراچی پروگرام کو زیادہ وسیع کرنے اور جہاں کہیں اس کو غلط سمجھنے کا خدشہ ہو، وہاں اس کی وضاحت کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن میں اس بات پر ضرور زور دوں گا کہ ہمیں کوئی ایسی کارروائی نہ کرنی چاہئے جو ہمارے عدم تشدد کے اس عقیدہ کی کسی ایک مد کو بھی ضرر پہنچانے والی ہو۔ باوجود کئی ناکامیوں کے ہم نے بڑی تیزی سے لمبی مسافت طے کی ہے۔ ہمیں اپنی بے صبری کی وجہ سے گزشتہ پندرہ برسوں کی محنت کے پھل کو ضائع نہیں

کر لینا چاہئے۔ میرے سوشلسٹ دوست زیادہ جوشیلے اصولوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ لوٹ کھسوٹ کے ہر نشان کو جلد ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ میں نہایت عاجزی سے لیکن اس تمام تر طاقت سے جو میرے قبضۂ اختیار میں ہے ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ سچائی اور عدم تشدد سے بڑھ کر اور کوئی دوسرا بہتر آدرش نہیں ہے۔ نہ ہی ملک کے اس عہد سے بڑا کوئی دوسرا عہد ہے کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے اشخاص کی بجائے لوٹ کھسوٹ کرنے والی طاقتوں کو ختم کر دیا جائے۔ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے نہ کہ گناہ گار سے۔ جبر و تشدد ہم پر دوگنی طاقت سے الٹا اثر کرے گا۔ لیکن تبدیلیٔ دل خواہ کتنی بھی آہستہ رفتار میں نظر کیوں نہ آئے سب سے زیادہ مختصر راستہ ہوگا۔ جس کا مطلب تاریخ اور تہذیب میں نیا اضافہ کرنا ہوگا۔

یہ بیان کرنے کے بعد میں اس اصلاح کے بارے میں کچھ کہوں گا جو مہاتما جی نے اپنے دوسرے بیان میں کانگریس میں کرنے کی تجویز کی ہے۔ مہاتما جی نے سفارش کی ہے کہ کانگریس کو ایک موثر غور و خوض کرنے والی جماعت بنانے کے لیے اس کے ڈیلی گیٹوں کی تعداد 6000 سے گھٹا کر 1000 کر دی جائے۔ ہر ایک ڈیلی گیٹ کسی ایک علاقہ میں رہنے والے لوگوں کی تعداد کا نمائندہ ہی نہ ہو بلکہ وہ حقیقت میں کانگریس ممبروں کی تعداد کا نمائندہ ہو۔ جن علاقوں یا صوبوں میں کانگریس کے ممبروں کی تعداد زیادہ ہو یا جو کانگریس کے پروگرام کو چلانے میں زیادہ سرگرم رہے ہوں، ان کو زیادہ نمائندگی دی جائے۔ آیا وہ کانگریس کے ممبر ساری قوم کی نمائندگی کرتے ہیں یا نہیں۔ اس کا انحصار اس خدمت کی مقدار اور خاصیت پر ہوگا جو وہ بجا لائیں گے۔ لوگوں میں کانگریس کی مقبولیت کبھی بھی رجسٹر میں درج تعداد پر منحصر نہیں رہی ہے۔ بلکہ اس کا انحصار اس کے آدرش پر اور اس قربانی پر رہا ہے جو کانگریس کے ممبروں نے اپنے منتہائے مقصود کو حاصل کرنے کے لیے کی ہیں۔ آخر میں آپ

سے یہی کہوں گا کہ مہاتما جی کے بیانات پر غور کرتے وقت آپ کو اپنے دل سے یہ خدشہ دور کر دینا چاہئے کہ وہ پبلک زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں۔ یا ان کے جسمانی طور پر کانگریس سے وابستہ نہ رہنے کی وجہ سے کانگریس کے ساتھ ان کی دلچسپی ختم ہو جائے گی یا کانگریس کو ان کی حمایت حاصل نہ ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی علیٰحدگی کا مقصد کسی طرح بھی ہمیں کمزور کرنا یا ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد ہمیں زیادہ طاقت ور بنانا اور ہماری امداد کرنا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جو کانگریس مہاتما گاندھی کے پروگرام کو تہہ دل سے قبول نہیں کرتی ہے۔ اس سے ان کا باہر رہنا بہ نسبت اس کے کہ وہ کانگریس کے اندر رہیں اور ان کی پشت پر ایسی اکثریت کا بوجھ ہو، جو ان پر پورا اعتماد نہیں رکھتی ہے۔ ملک اور قوم کے لیے زیادہ مددگار اور فائدہ مند ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں مہاتما جی متوقع علیٰحدگی سے کوئی صدمہ محسوس نہیں کرتا ہوں۔ اگر مہاتما جی نے ایسا کیا ہے تو میں اس کے اثر کو کم کرنے کی کوشش نہ کرتا ہوا آپ سے مطالبہ کروں گا کہ آپ ان پر بھروسہ رکھیں۔ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ خواہ وہ کانگریس کے اندر رہ کر یا کانگریس سے باہر رہ کر کام کرنے کا فیصلہ کریں۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔

جو کام ہمارے سامنے ہے۔ اس کو سرانجام دینے کے لیے ہمیں صاف دل سے قدم اٹھانا چاہئے۔ وقت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے سامنے بہت بڑا اور جوشیلا پروگرام رکھیں۔ بلکہ ضرورت اس پختہ عہد کی ہے کہ جو کوئی تھوڑا کام ہم کرنے کا ارادہ کریں اس کو ضرور مکمل کریں گے۔ کام بہت بڑا ہے۔ آج ہمارے حکمرانوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ طاقت کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔ ان کو ہماری صفوں میں انتشار پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آزادی کی تحریک کو دبانے کے لیے حکومت کس حد تک جانے کو تیار ہے۔ خواہ یہ تحریک عدم تشدد پر مبنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا مظاہرہ

پچھلے چار برس کے آرڈیننس راج سے ہو چکا ہے۔ بنگال اور صوبہ سرحد پر جو مظالم ڈھائے گئے ہیں ان کی تلافی بظاہر ناممکن ہے۔ اگر ایک صوبہ میں آزادی کا سانس لینا مشکل ہے تو دوسرے صوبہ میں حالات کو سمجھنا ہی ناممکن ہے۔ بنگال میں دہشت زدگی کے قابل مذمت واقعات ہوئے ہیں لیکن وسیع علاقوں کے تمام نوجوانوں کو بے ہمت کرنا اس کا تدارک نہیں ہے۔ صوبہ سرحد جہاں سخت تشدد کیا گیا ہے، جو وہاں کے بہادر پٹھانوں نے خان عبدالغفار خاں جیسے بے غرض دلیر، بھگت سیوک کی زیر سرکردگی بے مثل صبر و استقلال سے برداشت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں خان بھائیوں کو اس ملک سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ کام کرنے کے خواہش مند ہیں ان کے لیے کافی زیادہ تعمیری کام موجود ہے۔ سوفی صدی سودیسی کے استعمال کا وہ ریزولیوشن جو مہاتما جی نے اپنے دوسرے بیان میں قلم بند کیا ہے، بہت اہم ہے۔ اگر بلند بانگ نعروں کی بھرمار نے ہماری عقل و ہوش ضائع نہیں کر دی ہے تو ہمیں صاف نظر آنا چاہئے کہ کھدر اور سوفی صدی سودیسی اشیاء کے استعمال کا پروگرام ہمیں اپنی مکمل آزادی کی منزل مقصود پر لے جانے کے لیے کافی ہے۔ مہاتما جی کہتے ہیں کہ مکمل آزادی کا حصول ایک ناممکن خواب ہوگا۔ اگر اونچی ذاتوں کے لوگ ان لوگوں میں گھل مل نہ جائیں گے جن کو نیچی ذات کے لوگ سمجھا جاتا ہے۔

سب سے آخر میں کونسلوں کا پروگرام ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ ملک وائٹ پیپر اور حکومت کی پالیسی کے خلاف اپنا فتویٰ صادر کر سکے۔ مجھے امید ہے کہ ووٹر لوگ غیر مبہم طور پر اپنے عمل سے ظاہر کر دیں گے کہ کانگریس کو ملک کا پورا اعتماد حاصل ہے۔ لیکن ہمیں کوئی غلط فہمی نہ رہنی چاہئے کہ اسمبلیوں میں اپنی کسی کارگزاری سے ہم سوراج حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ آزادی حاصل کرنے سے پہلے ہمیں اس کی پوری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ جو کچھ کام اس وقت تک ہو چکا ہے اور ملک نے جو قربانی کی ہے اس پر ہم ہر طرح فخر کر سکتے ہیں۔لیکن غافل نہ ہونا چاہیئے کہ یہ سب کچھ ہمارے اس بلند مقصد کے پیش نظر کافی نہیں ہے جس کام کا ہم نے بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ وہ بہت عظیم اور جلیل القدر ہے۔ اس کے حصول کے لیے نہ ختم ہونے والے صبر، نہ جھکنے والا ارادہ اور مسلسل قربانی کی ضرورت ہے۔ وقت اور دنیا کے حالات کی طاقتیں ہماری مدد کر رہی ہیں، اور سب سے بڑھ کر غیر مسلح لوگوں کی ستیہ گرہ، سچائی اور عدم تشدد کے ہتھیاروں کے مقابلہ میں بہت زبردست طاقتور اور پوری طرح مسلح حکومت کے خلاف اس تاریخی جنگ میں پرماتما ہمارے ساتھ ہے۔اس حکومت کے پاس سائنس اور انسانی عقل کی ایجاد کردہ تازہ ترین تباہی کرنے والی مشینیں بھی ہیں ہمارے لیے منہ موڑنے یا پیچھے ہٹنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمارا منتہائے مقصود واضح ہے۔آزادی اور اس سے کم کچھ نہیں۔

آزادی۔ اس کے معنی محدود ہونا نہیں ہو سکتے ہیں۔ خاص کر جب ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم نے اسے عدم تشدد کے ذریعہ حاصل کرنا ہے۔ اس کے معنی ہیں ایک ملک کی دوسرے ملک اور اسی ملک کے ایک حصہ ہی کی دوسرے حصہ کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کر دینا۔ اس کا منشا ہے کہ سب کی باہمی بھلائی کے لیے دنیا کی دوسری اقوام سے آزاد اور دوستانہ تعلقات عدم تشدد کسی کے خلاف برے ارادے یا دشمنی نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ جو لوگ ہمیں لوٹتے ہیں ان کے خلاف بھی کوئی برائی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ سوائے اس وقت تک جب کہ وہ بجائے نیک خواہشات کے لوٹ کھسوٹ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ہماری اس آزادی کی جدوجہد کی پشت پر عدم تشدد کی وہ طاقت ہے جس کا ٹھوس اور متحرک نظریہ بھلائی اور سب کی بھلائی ہے۔ ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا ہے کہ دنیا کی

رائے عامہ کو خاص حد تک اس طریق کار نے اپیل کرنا شروع کر دیا۔ یہ اپیل آئندہ زبردست ناقابل مزاحمت بننے والی ہے۔ جوں جوں بے اعتمادی اور شبہات جو خوف سے پیدا ہوتے ہیں دور ہوتے جائیں گے اور ان کی جگہ ہندستان کے نیک ارادوں پر وشواس کرنے سے امن واطمینان کا جذبہ بڑھتا جائے گا۔ اس طریق کار کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوجائے گا۔ ہندستان دوسرے ملکوں پر کوئی غلبہ نہیں چاہتا۔ اس لیے اس کو غیر ممالک سے اپنی حفاظت کرنے کے لیے اور اپنے اندرونی امن کو قائم رکھنے کے لیے بہت بڑی فوج کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیوں کہ ہندستان کے لوگوں کے نیک ارادے اس کے محافظ ہوں گے چونکہ ہندستان دوسرے ملکوں سے کسی چیز کا طلب گار نہ ہوگا۔ اس لیے وہ دوسرے ملکوں کے برے ارادوں سے بچا رہنے کا دعویٰ کرنے کے قابل ہوگا اور ساری دنیا کی نیک خواہشات اس کی سلامتی کے لیے قلعہ بند ہوکر اس کی حفاظت کریں گی۔ برطانیہ اگر ہماری آزادی کو اس رنگ میں دیکھے تو اس کو خوف زدہ نہ ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ وہ موجودہ غیر قدرتی حالات کو ہمیشہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔

ہمارا طریق کار آئینہ کی طرف صاف ہے۔ یہ سرگرم، متحرک، عدم تشدد اور اجتماعی تحریک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم ایک مرتبہ ناکامیاب ہوں۔ دوسری بار پھر ناکام رہیں۔ لیکن ایک نہ ایک دن ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ بے شمار لوگوں نے اپنی آزادی کی جدوجہد میں اپنے آپ کو قربان کردیا ہے۔ ہمیں ان مشکلات سے جو ہمارے سامنے ہیں، گھبرانا نہیں چاہئے۔ نہ ہی کسی خوف یا لالچ سے ہمیں اپنے راہ راست سے اِدھر اُدھر ہونا چاہئے۔ ہماری لڑائی کے ہتھیار دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔ تمام دنیا بڑی دلچسپی سے اس عظیم تجربہ کی رفتار کا مطالعہ کررہی ہے اور اس پر بڑی امیدیں لگائے بیٹھی ہے۔ آؤ! ہم اپنے مقصد اور عہد پر سچے اور مستحکم ثابت ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ستیہ

گرہ اپنی عملی شکل میں عارضی طور پر دبایا جا سکے۔ لیکن اسے شکست نہیں ہو سکتی ہے۔ ستیہ گرہ بذات خود ہی ایک بہت بڑی فتح ہے۔ جیسا کہ مسٹر جیمز لاول نے کہا ہے:

سچے ہمیشہ پھانسی کے تختہ پر۔
جھوٹے ہمیشہ تخت شاہی پر۔
لیکن پھانسی ہی آئندہ حکمرانی کرتی ہے۔
نامعلوم دھندے اندھیرے کے پیچھے۔
سایہ میں چھپا ہوا خدا کھڑا ہے۔
جو اپنے بندوں پر نظر رکھتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

فیض پور ــــــــــ دسمبر 1936ء

بھائیو اور بہنو — ! ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے میں نے اسی حیثیت سے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا آج پھر آپ کے بلانے سے میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے دوبارہ مجھ میں جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت اور ارادت کا ممنون احسان ہوں۔ اس بڑے مرتبہ اور عزت کی جگہ کا بار آپ کے حکم کے بموجب میں دوبارہ اٹھا رہا ہوں۔

آج دنیا میں ان لوگوں کی حالت قابل رشک نہیں ہے جو ذمہ دار عہدوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں ان میں بہت سے تو ایسے ہیں جو اپنے فرائض پوری طرح انجام نہیں دے سکتے۔ ہندستان میں بھی وہ کام اتنا ہی بھاری ہے جتنا اور دوسری جگہوں میں اور اگر حال مشکلات سے بھرا ہوا ہے تو غالباً مستقبل کا نقاب اپنے پیچھے بہت بڑے اور الجھے ہوئے مسائل کو چھپائے ہوئے ہے اس لیے کیا یہ اچنبھے کی بات ہے کہ میں آپ کے اس محبت سے بھرے ہوئے ہدیے کو کسی قدر تامل کے ساتھ قبول کر رہا ہوں؟

اس سے پہلے کہ ہم ان مسئلوں پر غور کریں جو ہمارے سامنے ہیں، ہمیں اپنا کچھ وقت ان رفقائے کار کے لیے دینا چاہئے جنھوں نے پچھلے چند مہینوں میں ہمیں چھوڑ دیا ہے اور انھیں بھی نہ بھولنا چاہئے جو سالہا سال سے اپنے انجام سے بے خبر،

جیلوں اور نظر بندی کی کال کوٹھریوں میں اپنی جانیں ضائع کر رہے ہیں۔ ہمارے دو عزیز ساتھی، مختار احمد انصاری اور عباس طیب جی اب ہم میں نہیں ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کا نام کانگریس کی تاریخ میں ایک باعزت جگہ رکھتا ہے، جو ہم سب کو دوست اور رفیق کار کی حیثیت سے عزیز تھے اور جو کٹھن وقتوں میں باہمت اور سمجھ دار مشیر کار تھے۔

ہمارے جیل کے ساتھیوں اور نظر بند رفیقوں کو ہمارا اسلام پہنچے ان کی مصیبتوں کا سلسلہ جاری ہے اور برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہم نے تین نظر بندوں کی خودکشی کا حال بڑے دکھ اور درد سے پڑھا۔ انھوں نے بنگال کے خوبصورت صوبہ میں زندگی کو اپنے لیے ناقابل برداشت پایا جس صوبہ کے نوجوان مردوں اور عورتوں کی ایک بہت بڑی جماعت اپنے انجام سے بے خبر نظر بند ہے۔ ایسی ہی ایک مثال ہمیں نازی جرمنی میں ملتی ہے جہاں سیاسی نظر بندی کے کیمپ (Concantration Camps) بھرے ہوئے ہیں اور خودکشی کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔

پچھلی کانگریس کے ختم ہوتے ہی میں نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کیے اور اس میں ہمارے رفیق سبھاش چندر بوس کا نام بھی رکھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں پہنچتے ہی کس طرح ہم سے چھین لیے گئے اور اس وقت سے وہ اپنی دن بدن خراب ہوتی ہوئی صحت کے باوجود آج تک قید و بند میں ہیں۔ ہماری کمیٹی ان کے مشوروں سے فائدہ نہ اٹھا سکی اور تمام سال میں نے اس بہادر رفیق کار کی کمی محسوس کی جس سے ہمیں بڑی امیدیں تھیں۔ ہم بے بسی سے اپنے ملک کی عورتوں اور مردوں کا کچلا جانا دیکھ رہے ہیں لیکن ہماری یہ بے چارگی اور بے بسی ہمارے اس ارادہ میں فولادی سختی پیدا کر رہی ہے جس سے کہ ہم اپنے ملک کی ناقابل برداشت حالت کا خاتمہ کر دیں گے۔

ہمارا ایک رفیق جو لکھنؤ میں ہمارے ساتھ نہ تھا، ایک طویل قید کی مصیبتیں جھیل کر

واپس آیا ہے۔ ہم خان عبدالغفار خاں کا دلی خیر مقدم نہ صرف ان کی بہادر ذات کی وجہ سے کرتے ہیں بلکہ سرحدی صوبہ کے ان باہمت لوگوں کی وجہ سے بھی کرتے ہیں جنھیں انھوں نے اس مؤثر اور جری طریقہ پر ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھایا ہے۔ اگرچہ وہ آج ہمارے ساتھ ہیں۔ لیکن برطانوی حکومت کے فرمان کے بموجب اپنے وطن یا اپنے صوبہ میں قدم نہیں رکھ سکتے یہاں تک کہ انھیں پنجاب میں بھی جانے کی اجازت نہیں۔ ان کے صوبہ میں کانگریس آج بھی ایک خلاف قانون جماعت ہے اور اکثر سیاسی کام روک دیے گئے ہیں۔

مجھے آپ کی طرف سے اس شخص کا بھی پرجوش خیر مقدم کرنا چاہئے جو جوان ہونے کے باوجود ہندستان کی جنگ آزادی کا ایک تجربہ کار اور آزمودہ سپاہی ہے۔ کامریڈ ایم۔ این۔ رائے ابھی ایک طویل قید کی تکلیف دہ مدت کاٹ کر آئے ہیں۔ اور اگرچہ ان کی صحت خراب ہوگئی ہے لیکن دل و دماغ میں ایک نئی تازگی لائے ہیں اور اس پرانی لڑائی میں حصہ لینے کا اشتیاق ہے جو اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ کامیابی حاصل نہ ہو جائے۔

گزشتہ چند مہینوں میں ہم پر آفات ارضی و سماوی کی غیر معمولی بوچھاڑ رہی ہے۔ قحط اور طغیانیوں اور سوکھا پڑ جانے سے ہمارے مختلف صوبوں کے کروڑوں انسان مصیبت اور تکلیف میں پڑ گئے ہیں۔ حال ہی میں دکن کے ضلع گنٹور میں ایک زبردست بھونچال آیا جس کی وجہ سے ہزاروں آدمیوں کے گھر برباد ہو گئے اور ان کی ساری ملکیت تباہ ہوگئی۔ ہم اس کی کسی سے شکایت نہیں کرتے کیوں کہ قدرت کی ان طاقتوں پر ہم نے ابھی تک قابو نہیں پایا ہے۔ لیکن انسانی عقل نے ایسی بار بار آنے والی طغیانیوں کا علاج تو دریافت کرلیا ہے جو جانی ہوئی وجھوں سے آتی ہیں اور یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ قحط سالی، سوکھا اور قدرتی آفتوں کے مصیبت زدوں کی مدد کا کافی

انتظام کیا جائے۔لیکن ان لوگوں میں جن کے ہاتھ میں ہمارے ملک کی باگ ڈور ہے اس قسم کی عقل کی کمی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم پر جو ہمیشہ تنگی اور تکلیف میں بسراوقات کرتی ہے جب اس قسم کی کوئی آفت یکبارگی نازل ہوتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرنے سے بالکل قاصر ہوتی ہے۔

آج کل ہم سب صوبہ دارانہ انتخابات میں لگے ہوئے ہیں جو جلد ہی ہونے والے ہیں۔کانگریس نے ایک ہزار سے زیادہ امیدوار کھڑے کیے ہیں اور ہم اس مہم میں کئی طرح سے الجھے ہوئے ہیں لیکن میں پھر بھی آپ کو دنیا کے خوفناک دلچسپ ڈرامے کی طرف اسی طرح متوجہ کروں گا جس طرح میں نے لکھنؤ میں کیا تھا۔ ہمارا مقدر اسی سے وابستہ ہے اور تمام دوسرے ملکوں کی قسمت کی طرح ہماری قسمت کا فیصلہ بھی انھیں متضاد خیالات اور قوتوں کے ٹکرانے پر منحصر ہے جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو پھر یاد دلاتا ہوں کہ ہماری سیاسی اور سماجی آزادی کے مسائل دنیا کے بڑے مسئلہ کا جز ہیں۔اپنی حالت کو سمجھنے کے لیے ہمیں دوسروں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

اس آٹھ مہینے میں بھی بین الاقوامی حالات میں بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ وقت نازک ہوتا جاتا ہے، ترقی اور رجعت پسندی کی متضاد قوتیں اور زیادہ دست وگریباں ہوگئی ہیں اور ہم بڑی خطرناک تیزی سے جنگ کے غار کی طرف جارہے ہیں۔یورپ میں فاشسزم فاتحانہ انداز میں چل رہی ہے۔اس کی آواز کی تیزی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اور اس نے بین الاقوامی معاملات میں ایک کھلا ہوا غنڈا پن (Gangstaism) رائج کر دیا ہے۔چونکہ اس کی بنیاد ہی نفرت، تشدد اور لڑائی کے خواب دیکھنے پر ہے اس لیے اگر اس کی روک تھام وقت پر نہ ہوئی تو یہ یقیناً ایک عالمگیر لڑائی کی جانب لے جائے گی۔ہم نے ابی سینیا کو اس کا شکار ہوتے دیکھا اور آج اسپین کا دردناک نقشہ

ہمارے سامنے ہے۔

فاشسزم کس طرح اتنی تیزی سے اس قدر ترقی کرگئی کہ آج سارا یورپ کیا ساری دنیا پراس کے چھا جانے کا خطرہ ہے۔اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے برطانیہ کی غیر ملکی پالیسی پر گہری نظر ڈالنی چاہئے۔یہ پالیسی ظاہری تبدیلیوں اور ہچکچاہٹوں کے باوجود مستقل طور پر نازی جرمنی کی معاون رہی ہے۔برطانیہ اور جرمنی کے بحری معاہدہ نے فرانس کو اٹلی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا اور ابی سینیا پر ڈاکوؤں کی طرح ٹوٹ پڑنے کی راہ دکھائی اور بعد میں اٹلی کے خلاف جو تعزیری پابندیاں عائد کرنے پر گفت وشنید ہوئی اس میں کوئی مؤثر طریق کار اختیار کرنے پر برطانیہ کی جانب سے انکار ہوا۔یہاں تک کہ جب امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ نے پٹرول پر پابندی عائد کرکے اس مہم میں ساتھ دینا چاہا تو حکومت برطانیہ نے منظور نہ کیا اور ابی سینیا کے لوگوں پر گولہ باری ہوتے ہوئے اور لیگ اقوام(League of Nations) کی تحفظ اجتماعی Collective Security قائم رکھنے والی پالیسی کو ختم ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔یہ سچ ہے کہ حکومت برطانیہ نے ہمیشہ لیگ اور تحفظ اجتماعی ہی کی زبان میں بات کی۔لیکن اس کا عمل اس کے قول کو جھٹلا رہا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ میدان فاشسزم کی جارحانہ ترقی کے لیے کھلا ہوا چھوڑ دیں۔نازی جرمنی لیگ کی توہین کرنے اور یورپ میں بدامنی پھیلانے میں قدم بڑھائے جاتا تھا اور برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ بھی خاموشی سے اسی راہ پر چل کر دبی زبان سے اسے دعائیں دے رہی تھی۔

آخر میں اسپین کا سوال اٹھا۔ایک جمہوری حکومت پر فاشستی فوجی باغیوں کی چڑھائی ہوئی جن کو غیر ملکی زرخرید سپاہیوں کی مدد مل رہی تھی۔یہاں بھی ایک طرف تو فاشستی قوتیں باغیوں کی مددگار تھیں دوسری طرف لیگ اقوام ایک عدم مداخلت کی

ناکارہ پالیسی کا اعلان کررہی تھی۔ جس کا صاف مقصد یہ تھا کہ اسپین کی جمہوری حکومت اپنی پوری طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ نہ کرے۔

اس طرح ہم برطانوی سامراج کو دن بدن فاشستی طاقتوں کی طرف جھکتا ہوا پاتے ہیں۔ اگرچہ اپنی پرانی عادت کے مطابق جو زبان وہ استعمال کرتا ہے اس کی بناوٹ جمہوری اور لہجہ پاک ہے۔ قول و فعل میں اس ظاہری تضاد کی وجہ سے برطانیہ کا اقتدار یورپ اور ساری دنیا میں جتنا آج گھٹ گیا ہے اتنا گزشتہ زمانے میں عرصے سے نہ گھٹا تھا۔

موجودہ دنیا میں یہی دو بڑی قوتیں برتری کی کوشش کررہی ہیں۔ ایک تو وہ جو سیاسی اور معاشرتی آزادی کے لیے کوشش کرتی ہیں اور دوسرے وہ جو اس آزادی کو سامراج اور فاشسزم کے ذریعے سے کچل دینا چاہتی ہیں۔ اس جدوجہد میں برطانیہ لازمی طور پر رجعت پسندوں کی صف میں ہے۔ اگرچہ وہاں کے عام لوگ یقیناً اس میں شامل نہیں ہیں۔ یہ لڑائی اس وقت اسپین میں سب سے زیادہ گھمسان اور سب سے زیادہ واضح طور پر ہورہی ہے۔ اسی کے نتیجے پر دنیا میں ''امن اور جنگ'' فاشسزم'' اور سامراج'' ترقی یا بربادی کا انحصار ہے۔ اس جدوجہد میں ہمارے لیے بہت سے سبق پوشیدہ ہیں اور غالباً ان میں سب سے زیادہ قابل غور جمہوری طریق کار کی وہ ناکامیابی ہے جو بنیادی اختلافات کے حل اور سماجی، یا اقتصادی حالت کو دنیا کی حالت سے ہم آہنگ بنانے کے سلسلے میں ضروری تبدیلیاں کرنے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس ناکامی کا سبب وہ لوگ نہیں ہیں جو تبدیلیاں چاہتے ہیں وہ تو جمہوری طریقے کے قائل ہیں۔ لیکن جب یہ جمہوری طرز عمل بڑے بڑے ذاتی مفاد رکھنے والی اور رعایت پائی ہوئی جماعتوں پر اثر ڈالنے کی دھمکیاں دیتا ہے تو یہ طبقے جمہوری طریق کار پر عمل پیرا ہونے سے انکار کرکے اس کے خلاف بغاوت کردیتے ہیں۔ ان کے لیے جمہوریت کا

مطلب یہ ہے کہ وہی برسراقتدارر ہیں اور ان کے مفاد کی حفاظت ہو۔ جب وہ جمہوریت سے یہ کام نہیں لے سکتے تو ان کے لیے اس کا کوئی مصرف نہیں رہ جاتا اور وہ اس کو درہم برہم کر دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں وہ خراب سے خراب تدبیر استعمال کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ غیر ملکی اور غیر قومی طاقتوں سے بھی سازش کرتے ہیں۔ اپنے کو قومی اور وطن پرست ظاہر کر کے وہ غیر ملکی زر خرید فوجوں کو اپنے ہی عزیز واقارب کی جان لینے اور اپنے ہی بھائی بندوں کو غلام بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

آج اسپین میں ہماری ہی لڑائیاں لڑی جارہی ہیں۔ ہم اس جدوجہد کو صرف غیر ملکی دوستوں کی ہمدردی کی حیثیت سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ ہم اس کو ایک ایسی پریشانی اور تکلیف سے دیکھتے ہیں گویا ہم خود اس میں مبتلا ہیں۔ ہم نے اپنی امیدوں کو مرجھاتے ہوئے دیکھا ہے کبھی کبھی اسپین کے مردوں اور عورتوں کی افسوسناک تباہی دیکھ کر ہم پر مایوسی کے بادل چھا جاتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اندھیرے لمحوں میں وہ شعلہ جو اسپین کی آزادی کی امیدوں کا نشان ہے اور زیادہ چمک اٹھا ہے۔ اس نے دنیا میں اپنی ہونے والی فتح کا اعلان کر دیا ہے۔ اتنے مرد اور عورت، لڑکے اور لڑکیوں نے اس لیے جان دی ہے کہ اسپین کی جمہوریت زندہ اور آزادی قائم رہے۔ ہم اکثر دوسری جگہوں کی طرح اسپین میں بھی آزادی کے قلعے کی دیواروں کی افسوسناک تباہی دیکھتے ہیں۔ کتنی دفعہ وہ دشمن کے قبضے میں جا کر پھر واپس لی گئی ہیں اور کتنی دفعہ برباد ہونے کے بعد پھر بنائی گئی ہیں۔

میری خواہش ہے، اور غالباً میرے ساتھ آپ میں سے بہت سے لوگ یہی خواہش کریں گے کہ ہم کسی طرح اسپین میں اپنے رفیقوں کی مدد موثر طریقے پر کر سکتے۔ ہمدردی کتنی ہی دل سے محسوس کی جارہی ہو مگر اس سے کچھ زیادہ ہونا چاہئے۔ ہمارے

پاس ان مصیبت زدہ لوگوں کی جانب سے مدد کی آواز آتی ہے اور ہم اس اپیل پر خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ پھر بھی میں نہیں جانتا کہ ہم اپنی بے بسی کی حالت میں ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں جب کہ ہم خود ایک ایسے سامراج کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہیں جو ہمیں زنجیروں میں جکڑ کر پیسے ڈالتا ہے۔

جس طرح میں نے پہلے کہا، اسی طرح پھر اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ہمیں دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے بنیادی تعلق اور ان کے ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل پر نظر رکھنی چاہئے۔ اس طرح ہم موجودہ دنیا کی پیچیدہ تصویر کو کچھ سمجھ سکیں گے جس میں حیرت خیز اختلافات اور تصادم کے باوجود ایک طرح کی ایکتا ہے۔ جس طرح مشرق بعید میں مسلسل شورشیں ہیں اسی طرح یورپ میں بھی ہیں۔ ہر جگہ ایک طرح کا ہنگامہ ہے۔ برطانوی سامراج کے خلاف فلسطین میں عربوں کی جدوجہد دنیا کے اس بڑے ہنگامے کا اسی طرح ایک حصہ ہے جیسے ہندستان کی جنگ آزادی۔ جمہوریت اور فاشسزم، قومیت اور سامراج، اشتراکیت اور مٹتی ہوئی سرمایہ داری خیالات کی دنیا میں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں اور یہی لڑائی مادی میدان میں ترقی کر جاتی ہے جہاں قوت حاصل کرنے کی کوشش میں تلوار اور بم ووٹ کی جگہ لے لیتے ہیں۔

دنیا کی بدلتی ہوئی حالت کا یہ تقاضا ہے کہ سیاسی اور اقتصادی نظام میں بھی تبدیلی ہو۔ اگر یہ جلدی نہیں ہوتی تو کش مکش اور الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں رفتہ رفتہ انقلاب ہوتا ہے جو مادی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ اس تبدیلی کے ہونے میں جتنی دیر لگتی ہے لڑائی جھگڑا اتنا ہی بڑھتا ہے۔ جب سماج کا پہلا توازن باقی نہیں رہا اور اس کی جگہ کسی دوسرے توازن نے نہیں لی۔ ایسی حالت میں لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج پستی، رجعت پسندی اور بربادی کی طرف جانے لگتا ہے۔ یہی وہ بڑی مصیبت ہے جو آج دنیا میں ہمارے سامنے ہے ایک بہت

بڑے پیمانے پر عالمگیر جنگ ہو جانا ہر وقت ممکن ہے۔ فاشستی طاقتوں کے علاوہ ہر قوم اور ہر ملک کو اس جنگ کا ڈر ہے۔ پھر بھی ان میں سے ہر ایک اس کے لیے بڑی تن دہی سے تیار ہو رہا ہے اور ایسا کر کے ایک صف یا دوسری صف میں شامل ہو رہا ہے۔ اوسط طبقے مٹتے جا رہے ہیں یا بھوتوں کی طرح غیر حقیقی، ہر بات پر شک رکھنے والے، خود سے تباہ ادھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ قدیم لبرلزم (Liberal ism) کا حشر ہر جگہ یہی ہوا ہے۔ اگر چہ ہندستان میں شاید وہ لوگ جو اپنے کو لبرل کہتے ہیں، یا وہ جو انھیں کی طرح سوچتے ہیں ابھی اس طمینان کے کہرے سے باہر نہیں نکلے ہیں جو انھیں گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن ہم نئی خواہشات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اب تک ہم نے جس جگہ اپنی دنیا بسائی وہ جگہ ویران ہے۔

یہ نئی خواہشیں کیا ہیں؟ ہماری تمنا یہ ہے کہ اس دیوانی دنیا کے ان طریقوں کا خاتمہ کر دیں جو ایسی جنگ کا باعث ہوتے ہیں جس میں لاکھوں انسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ غریبی اور بے روزگاری کو ختم کر کے کروڑوں انسانوں کی قوتوں کو آزاد کر دیں اور ان قوتوں سے انسانیت کی ترقی اور بہتری کا کام لیں۔ جہاں اب تک ہم نے برباد کیا تھا وہاں تعمیر کریں، گذشتہ آٹھ مہینوں میں میں اپنے اس وسیع ملک میں بہت پھرا ہوں اور میں نے پھر ہندستان کے عام لوگوں کی دردناک بے چینی دیکھی ہے۔ ان کی آنکھوں کا وہ پیغام پڑھا ہے جو اپنے بھاری بوجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ دے رہی ہیں۔ ہمارا اصل مسئلہ یہی ہے دوسرے مسئلوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہمیں سامراج کے اقتدار اور ہندستان کی اقتصادی لوٹ کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ آج کل کا سامراج کیا ہے؟ یہ صرف ایک ملک کی زمین پر دوسرے ملک کا قبضہ نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں دور تک جاتی ہیں۔ موجودہ دور کا سامراج سرمایہ داری کا نتیجہ اور اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے مسائل کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ سامراج اور سوشلزم کے مطلب کو نہ سمجھ لیں۔ مرض پرانا ہے اس لیے ایک بنیادی اور انقلابی علاج ضروری ہے اور یہ علاج سماج کا سوشلسٹ نظام ہے ہم آج ہندستان میں اشتراکیت کے لیے جدوجہد نہیں کر رہے ہیں کیوں کہ اس دن کے آنے سے پہلے کہ ہم اس اصطلاح میں بات چیت کرسکیں ابھی ہمیں بہت آگے جانا ہے لیکن سوشلزم کا سمجھنا اس وقت بھی اس لیے ضروری ہے کہ ہمیں اپنے مسئلہ کے سمجھنے، اس کا حل ڈھونڈنے اور سوراج کے اصلی معنی پہنانے میں مدد مل سکے اور جب تک کہ ہم اپنے مسائل کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں گے ہمارا عمل بے قاعدہ، بے معنی اور بے اثر ہوگا۔

اس وقت کانگریس ہندستان میں عوام کی حکومت کا مطالبہ کرتی ہے اور اشتراکی نہیں بلکہ جمہوری نظام کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ سامراج کی دشمن ہے اور سیاسی واقتصادی نظام میں بڑی تبدیلیوں کے لیے کوشاں ہے۔ مجھے امید ہے کہ واقعات کے اسباب اور نتائج اسے سوشلزم کی طرف لے جائیں گے کیوں کہ ہندستان کی بری حالت کا مجھے صرف یہی علاج نظر آرہا ہے۔ لیکن ہمارے لیے آج سب سے ضروری اور اہم مسئلہ ہندستان کی مکمل آزادی اور عوام کی حکومت کا قیام ہے۔ اس لیے کانگریس کو تمام دنیا کی آگے بڑھنے والی قوتوں کے ساتھ ہو کر دنیا میں امن قائم رکھنے کی حمایت کرنا چاہیے۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے یورپ میں امن پسندی کی تحریک میں ایک قابل ذکر تبدیلی ہوئی ہے۔ ورلڈ پیس کانگریس (The world peace congress) جس کا جلسہ گزشتہ ستمبر میں برسلز (Brussels) میں ہوا۔ عوام کے متعدد اداروں کو مشترک پلیٹ فارم پر لائی اور اس نے امن وصلح کی باا ثر رہنمائی کی۔ یہ رہنمائی لڑائیوں کے روکنے میں کامیاب ہوگی یا نہیں؟ اس کی خبر تو کسی

کونہیں لیکن تمام صلح پسند لوگ اس کا دل سے خیر مقدم اور اس کی کامیابی کی خواہش کریں گے۔ برسلز میں کانگریس کی نمائندگی شری وی کرشنا مینن (Shri V.K. Menon) نے نہایت خوبی سے کی اور وہ رپورٹ جو انھوں نے بھیجی آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کانگریس پوری طرح اس مستقل صلح کے ادارے سے تعاون کرے گی جو قائم ہوا ہے اور اپنی پوری قوت سے اس بڑے کام میں اس کی مدد کرے گی۔ ایسا کرنے میں ہمیں اپنی پوزیشن اچھی طرح صاف کردینی چاہیے ہمارے لیے اور ہماری رائے میں دنیا بھر کے لیے امن وصلح کا مسئلہ سامراج سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا اور جنگ کے اسباب کا جڑ سے خاتمہ کرنے کے لیے سامراج کا ختم ہونا ضروری ہے۔ ہم صلح ناموں اور معاہدوں کا احترام کرتے ہیں لیکن جن کے بنانے میں ہندستان کا ہاتھ شریک نہیں ہے ان عہدناموں کے ہم پابند نہیں ہوسکتے جب تک کہ ہم خود آنے والے زمانہ میں انھیں قبول نہ کرلیں۔ امن قائم رکھنے کے مسئلہ کو ہم اپنی موجودہ حالت میں جنگ کی مخالفت سے الگ نہیں کرسکتے۔ کانگریس اس کا اعلان کرچکی ہے کہ ہم سامراج کی کسی لڑائی میں اس کے ساتھ نہ ہوں گے اور ہم ہندستان کے آدمیوں اور دولت کو ایسی لڑائی میں بری طرح لٹنے اور تباہ ہونے نہ دیں گے۔ ہر اس طرح کی کوشش کی ہم مخالفت کریں گے۔

لیگ اقوام کا مرتبہ تو اب بالکل ہی گر گیا ہے۔ ایسے لوگ اب شاید ہی ملیں گے جو اسے واقعی ایک امن قائم رکھنے والی جماعت سمجھتے ہوں۔ ہندستان کو اس میں حصہ لینے کے لیے بالکل جوش خروش نہیں ہے اور اس جماعت میں ہندستان کی ممبری بھی بالکل کھیل تماشہ ہے۔ کیوں کہ برٹش گورنمنٹ ہی اس کے ڈیلی گیٹس کا انتخاب کرتی ہے۔ ہم لوگوں کو ایک اصلی لیگ آف نیشنز قائم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے جو کہ جمہوری طور پر بنی ہو اور جو کہ اصلیت میں عوام کی لیگ ہو۔ اگر اسی موجودہ لیگ کو گو کہ وہ بالکل

ہی بے کار اور کمزور ہے دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تو ہم اس بات کا بھی خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اس بین الاقوامی حالت کو دیکھتے ہوئے اب ہم کو اپنے ملکی مسئلوں پر غور کرنا چاہیے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کا نیا دستور العمل ہمارے لیے باعث توہین ہے۔ یہ نیا غلامی کا فرمان جو ہم لوگوں پر زبردستی صادر کیا گیا ہے، ہماری مرضی کے بالکل خلاف ہے اور ہم اسی کے سلسلے میں الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں۔ ہم لوگ اس الیکشن کی کش مکش میں کیوں شریک ہو رہے ہیں اور پھر کس طرح سے اس کے بعد چلیں گے؟ یہ سب باتیں بہت اچھی طرح آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے الیکشن مینفیسٹو میں درج ہیں جسے میں آپ لوگوں کی منظوری کے لیے پیش کرتا ہوں۔ ہم لوگ مجالس قانون ساز میں برطانوی سامراج کے اس نظام سے تعاون کرنے کے لیے نہیں جا رہے ہیں بلکہ اس ایکٹ کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے اور اسے ختم کرنے کے لیے اور اس لیے جا رہے ہیں تاکہ انگریزی سامراج کا ہندستان پر قبضہ نہ جم سکے اور ہندستانیوں کا استحصال نہ ہو سکے۔ یہی کانگریس کی بنیادی پالیسی ہے اور یہ بات کسی کانگریسی آدمی کو، کسی الیکشن کے امیدوار کو نہ بھولنا چاہیے۔ جو کچھ بھی ہم کریں اس پالیسی کی چاردیواری کے باہر نہ ہو۔ ہم ایوانات میں آئینی جدوجہد کے لیے اور روکھی پھیکی اصلاحوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔

بعض لوگوں میں سمجھوتہ کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے تاکہ وہ الیکشن میں اکثریت حاصل کریں چاہے وہ کسی قیمت پر بھی ہو۔ یہ ایک خطرناک چال ہے فوراً اس کی روک تھام ہونی چاہیے۔ اس الیکشن کا کام جنتا کو کانگریس کے جھنڈے کے نیچے لانا ہے اور کانگریس کا پیغام ان تمام کروڑوں آدمیوں تک پہنچانا ہے۔ چاہے وہ ووٹر ہوں یا نہ ہوں تاکہ وہ عوام کی جدوجہد کو بڑھائیں۔ ایوانات میں بڑی سے بڑی اکثریت بھی

ہمارے لیے اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ ہم لوگوں کی پشت پر عوام کی آواز نہ ہو ایسی اکثریت جو کہ چند رجعت پسند جماعتوں اور افراد کے سمجھوتے پر مشتمل ہو کانگریس کے اصلی مقصد کو شکست دے دے گی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے مقابلہ کی جدوجہد کے ساتھ ہی ساتھ کانگریس کے اس مطالبے پر بھی زور دینا ہے کہ ہمیں ایک ایسی کانسٹیٹو ینٹ اسمبلی (Constituent Assembly) چاہئے جس کے رائے دہندگان وہ تمام لوگ ہوں جو بالغ ہیں۔ کانگریس کی موجودہ پالیسی کی بنیاد اسی بات پر ہے اور ہمارے الیکشن کی جدوجہد اسی بات پر منحصر ہونا چاہئے۔ اس اسمبلی کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ برٹش حکومت کا شاخسانہ ہے یا یہ برطانوی سامراج کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتہ کا نتیجہ ہے۔ اگر کانسٹیو ینٹ اسمبلی میں ہم کچھ اصلیت چاہتے ہیں تو اس کی پشت پر رائے عامہ اور عوام کی منظم طاقت کی مدد لازی ہے۔ یہ طاقت اتنی زیادہ ہونی چاہئے کہ اس کے بل پر ہم آزاد ہندستان کا دستور العمل بنا سکیں۔ ہم کو فی الحال ان الیکشنوں کے ذریعہ سے جنتا میں اسی قسم کی بیداری پیدا کرنا ہے اور پھر بعد میں یہ جذبہ اپنی دوسری تحریکوں کے ذریعہ سے جاری رکھنا ہے۔

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اس اجلاس کے لیے تجویز کیا ہے کہ تمام مجالس قانون ساز کے کانگریسی ممبروں کی اور دیگر افراد کی جن کو یہ لوگ شریک کرنا چاہیں الیکشن کے بعد ہی ایک سبھا (Convention) بلائیں تا کہ وہ کانسٹیٹو نیٹ اسمبلی کے مطالبہ پر زور دیں اور یہ طے کریں کہ کس طرح ہر ممکن طریقے سے فیڈریشن کی مخالفت کی جائے۔ ایسی مجلس جس میں کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبران کا ہونا لازمی ہے۔ ہماری جدوجہد کو ایک مرکز پر لانے اور اس کو صحیح راستے پر لے جانے میں اسمبلی کے اندر اور اس کے باہر دونوں صورتوں میں بہت مدد دے گی۔ یہ اسمبلی کے

کانگریسی ممبران کو صوبہ وارانہ تعصب اور صوبجاتی جزئیات میں الجھنے سے روکے گی۔ جس کی وجہ سے ان میں وسعت نظر اور صحیح آل انڈیا ڈسپلن کا احساس پیدا ہوگا۔ اس سے عوام کی تحریک بڑے پیانے پر پھیلے گی۔ یہ خیال اپنے دامن میں بڑے امکانات لیے ہوئے ہے، اور مجھے یقین ہے کہ کانگریس اس سے موافقت کرے گی۔

کونسٹیٹیوینٹ اسمبلی کے مطالبے کے بعد ہی ہمارا دوسرا ضروری کام فیڈریشن کی مخالفت کرنا ہے۔ حالانکہ سرے سے یہ ایکٹ بہت ہی برا اور خراب ہے۔ لیکن فیڈریشن سے بدتر اس میں کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم لوگوں کو اپنی انتہائی کوشش اس کو ختم کر دینے کے لیے صرف کرنا ہے اور اس طرح سے پورے ایکٹ کا خاتمہ کرنا ہے۔ ہمارے لیے برطانوی سامراج شاہی کا استحصال ہی کیا کم تھا اب ہندستانی جاگیرداری کا عمل بھی ہم پر ہوگا جس کو کہ ہم ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ ہندستان میں طویل برطانوی دور کا یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز نتیجہ ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ اس کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی جاتی ہے وہ اس کوشش میں ہے کہ ہندستان کے تمام رجعت پسندوں اور تاریک خیال لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرے اور ہندستانی حکومت کی باگ ڈور پر جاگیروں کو بھی کچھ قابو دے دے۔

فیڈریشن کی اسکیم کی یہ نشوونما قابل غور ہے۔ ہم لوگ فیڈریشن کے تخیل کے خلاف نہیں ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آزاد ہندستان میں فیڈرل طرز حکومت ہو۔ مگر پھر بھی ہر صورت میں ایک متحدہ مرکزی طاقت کا ہونا لازمی ہوگا۔ لیکن موجودہ فیڈریشن جو ہمارے اوپر زبردستی نازل کیا جا رہا ہے یہ غلامی کا فیڈریشن ہے اس کی باگ ڈور اس طبقے کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے جو سیاسی اور سماجی حیثیت سے سب سے زیادہ رجعت پسند ہے۔ موجودہ ہندستانی ریاستوں کا وجود انیسویں صدی کے شروع میں ہوا جب کہ برطانوی حکومت یہاں اچھی طرح جمی نہیں تھی۔ ہندستانی ریاستوں کے مطلق

العنان حکمرانوں کے ساتھ انگریزی حکومت کے یہ صلح نامے جو کہ آج اتنے متبرک خیال کیے جاتے ہیں۔ جن کو چھونے کی بھی ہمیں ممانعت ہے اسی زمانے کے ہیں۔

یہ بے جا نہ ہوگا اگر یورپ کے اس زمانے کے حالات کا مقابلہ ہندستان سے کیا جائے۔ وہاں اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی بہت سی سلطنتیں اور خودمختار ریاستیں تھیں۔ حکمران بالکل مطلق العنان تھے جہاں متبرک معاہدہ Mdg Alliance اور بادشاہوں کے خاص حقوق کا دور دورہ تھا۔ غلامی قانوناً جائز تھی۔ اس ایک صدی یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ میں یورپ اس قدر بدل گیا کہ پہچاننا مشکل ہے۔ متعدد انقلابوں اور تبدیلیوں کی وجہ سے ریاستیں غائب ہوگئیں، چند ہی بادشاہ رہ گئے۔ غلامی ختم ہوگئی۔ جدید صنعتیں پھیل گئیں اور جمہوری ادارے بڑھتے ہوئے حقوق رائے دہندگی کے ساتھ قائم ہو گئے۔ بعض ممالک میں ان کی جگہ فاشستی ڈکٹیٹرشپ نے لے لی ہے۔ پچھڑے ہوئے روس نے ایک ہی عظیم الشان جست میں ایک سوویٹ سوشلسٹ حکومت کی بناڈالی اور ایک ایسا اقتصادی نظام قائم کیا جس سے ہر قسم کی زبردست ترقی ہوئی۔ دنیا بدلتی جارہی ہے اور ایک دوسرے زبردست تغیر کے قریب ہے۔ لیکن ہندستانی ریاستیں اپنی اسی حالت پر قائم ہیں اور ہم کو اب تک شروع انیسویں صدی کی عینک لگا کر گھورتی ہیں پرانے صلح نامے اب تک متبرک خیال کیے جاتے ہیں۔ یہ ایسے صلح نامے ہیں جو کہ عوام یا ان کے نمائندوں سے نہیں کیے گئے بلکہ مطلق العنان حکمرانوں نے کیے۔

ان معاملات کا اس حد تک پہنچانا نہ تو کوئی ملک برداشت کرسکتا ہے اور نہ قوم۔ ہم ان سو برس سے زیادہ پرانے معاہدوں کو مستقل اور غیر مبدل نہیں تسلیم کرسکتے۔ ہندستانی ریاستوں کو مجبوراً آزاد ہندستان کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا اور ان کی رعایا کو کانگریس کے اعلان کے مطابق وہی انفرادی، شہری اور جمہوری آزادیاں حاصل

ہوں گی جیسا کہ دوسرے ہندستانیوں کو۔

چند سال پہلے نہ تو ریاستوں کے عہدناموں کا اور نہ برطانوی سیادت Paramountency کا زیادہ ذکر سننے میں آتا تھا۔ والیان ریاست اپنے آپ شہنشاہی نظام میں جانتے تھے اور برطانوی حکومت کا زبردست ہاتھ ہر وقت نمایاں تھا لیکن ہندستان میں قومی تحریک کی ترقی نے ان لوگوں کو جھوٹی اہمیت دے دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت وطن پرستی کی تحریک کو شکست دینے کے لیے ان عناصر پر رفتہ رفتہ اپنا اعتماد بڑھانے لگی۔ اس لیے والیان ریاست اور ان کے وزیروں نے برطانوی حکومت کے اس رخ کو فوراً ہی بھانپ لیا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے انگریزی حکومت اور ہندستانیوں کے اختلافات سے دوطرفہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس معاملہ میں انھیں بہت کامیابی حاصل ہوئی اور انھیں فیڈریشن کی اسکیم میں غیر معمولی اختیارات حاصل ہوگئے۔ اپنی مطلق العنانی کو قائم رکھتے ہوئے جو کہ بقیہ ہندستان کے اثر سے باہر ہے انھوں نے ہندستان کے دوسرے حصوں پر بھی قابو حاصل کرلیا ہے۔ آج کل ہم انھیں اس طرح گفت وشنید کرتے ہوئے پاتے ہیں گویا کہ وہ بالکل ہی آزاد ہیں اور اسی حیثیت سے فیڈریشن میں شریک ہونے کے لیے ایسی شرائط پیش کررہے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ برطانوی حکومت کی نگرانی سے بھی آزاد ہونا چاہتے ہیں تاکہ یہ ریاستیں تمام دنیا سے جداگانہ بالکل مطلق العنان اور غیر ذمہ دار رہیں یہاں تک کہ کسی آئینی ذرائع سے ان میں کوئی تبدیلی نہ کی جاسکے ایک خطرناک ڈھونگ یہ بھی رچایا جارہا ہے کہ چند بڑی ریاستوں کی فوجی طاقت زبردست اور اعلیٰ پیمانہ پر بڑھائی جائے۔

لہٰذا نئے ایکٹ میں فیڈریشن سے ہماری مخالفت محض زبانی ہی نہیں ہے بلکہ یہ نہایت اہم مسئلہ ہے جس کا اثر ہماری آزادی کی جدوجہد اور ملک کے مستقبل پر پڑتا

ہے۔اس ایکٹ کی مخالفت کرتے وقت ہمارے خیالات کا مرکز یہی ہونا چاہئے کہ اس فیڈریشن کوتوڑنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم اس ایکٹ کا خاتمہ کردیں اور پھر ہر چیز کو نئے سرے سے شروع کریں۔ جو لوگ کہ صرف کونسلوں اور اسمبلیوں کی حدود میں رہ کر عمل کرنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک اس ایکٹ کا توڑنا ممکن نہیں کیوں کہ اس ایکٹ میں سرکار کے تحفظ کے لیے کافی دفعات موجود ہیں اور مخالف اکثریت کے باوجود بھی گورنمنٹ معطل نہ ہو سکے گی۔ہم ان تحفظات کو خوب سمجھتے ہیں یہی ان چند خاص وجوہ میں سے ہیں جن کے سبب سے ہم اس ایکٹ کو مسترد کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایوانات بالا (Second Chamber) ہمیں روکنے ہی کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ہم کونسلوں اور اسمبلیوں میں آئینی دشواریاں پیدا کر سکتے ہیں۔ہم روڑے اٹکا کر کام روک سکتے ہیں۔سامراج شاہی میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔لیکن ان باتوں کے باوجود بھی وہ لوگ کام چلا سکیں گے۔ یہ ایکٹ کونسلوں اور اسمبلیوں کے اندر ہی کی جدوجہد سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔اس کے لیے عوام کا اسمبلیوں کے باہر عمل کرنا ضروری ہے اور اسی لیے ہمیں ہمیشہ یادرکھنا چاہئے کہ آزادی کی جنگ کا بہترین طریقہ عوام کی تنظیم اور ان کا عمل ہے۔

کونسلوں اور اسمبلیوں کے متعلق کانگریس کی پالیسی بالکل صاف ہے۔صرف ایک بات اب تک طے نہیں ہوئی ہے اور وہ وزارتوں کا قبول کرنا یا نہ کرنا ہے غالباً اس بات کے فیصلہ کو الیکشن کے بعد تک ٹالنا پڑے گا۔لکھنؤ میں میں نے آپ لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ میری رائے میں عہدوں کا قبول کرنا ایکٹ کے مسترد کرنے والی پالیسی کے بالکل خلاف ہے۔یہ اس پالیسی کے بھی بالکل برعکس ہے جو کہ ہم نے 1920ء میں شروع کی اور اب تک جاری رکھی۔لکھنؤ کے اجلاس کے بعد سے کانگریس نے اپنی

پالیسی کو اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اور واضح کر دیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ ہم کونسلوں میں اس لیے نہیں جا رہے ہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی کسی طرح حمایت کریں بلکہ اس سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں۔ وزارتوں کے قبول کرنے کا فیصلہ انھیں حدود میں ہونا چاہئے اور جو لوگ کہ عہدوں کے قبول کرنے کی طرف مائل ہیں انھیں چاہئے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں کہ ایکٹ کی مخالفت اور اس کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔

کانگریس کی تجاویز اور اس کے ایکشن مینی فیسٹو سے یہ صریحی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں وزارتوں اور عہدوں سے کوئی سروکار نہیں ہے اور اس راستہ سے ذرا بھی ہٹنے کا مطلب یہی ہے کہ ہم اس پالیسی کو بالکل چھوڑ رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ عہدوں کو قبول کر کے ہم برطانوی سامراج کے مددگار ہو کر ہندستانیوں کے خون چوسنے میں مدد دیں گے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے اصلی مقصد کے سامنے سر جھکائیں گے چاہے وہ زیر احتجاج ہی کیوں نہ ہو اور برطانوی سامراج سے تعاون کر کے ملک کے روشن خیال اور ترقی پسند عناصر کو دبانے کے قابل نفرت کام میں کسی قدر شریک ہوں گے اس کے علاوہ کسی دوسری شرط پر وزارتوں کا ملنا قریب قریب ناممکن ہے اور اگر ممکن ہے تو اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ یعنی کونسلوں کا کام رک جانا اور لڑائی جھگڑا ہونا۔ مگر اس قسم کی رکاوٹوں اور جھگڑوں سے ہم ڈرنے والے نہیں بلکہ ہم تو اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں چاہئے کہ نئے کانسٹیٹوشن میں ایسی ہی رکاوٹیں ڈالنے کا تہیہ کریں نہ کہ عہدہ قبول کر کے گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کرنے کا۔

کچھ لوگوں کو یہ خوف ہے کہ اگر ہم عہدے قبول نہیں کرتے تو دوسرے اسے قبول کر لیں گے اور ہماری آزادی کی تحریک میں روڑے اٹکائیں گے۔ لیکن اگر ہم اکثریت میں پہنچ جائیں گے تو ہم ان کو اس بے عنوانی سے روک سکتے ہیں بلکہ ہم

ہر وزارت کو قائم ہونے سے روک سکتے ہیں۔ اگر ہماری اکثریت مشتبہ ہے تو ایسی حالت میں ہمارا عہدے قبول کرنا غیر کانگریسی جماعتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے ہی سے ہوسکتا ہے مگر یہ ایک ایسی پالیسی ہوگی جس میں ہمارا نصب العین خطرہ میں پڑ جائے گا اور جس پر عمل کر کے ہم کانگریس کی نافرمانی کریں گے جو ہمیں ایکٹ کو مسترد کرنے کا حکم دیتی ہے۔ چاہے ہم اکثریت میں پہنچیں یا اقلیت میں مگر اصل چیز ہماری پشت پر عوام کی منظم طاقت ہے جس کے بغیر ہماری اکثریت بھی کونسلوں کے اندر کچھ نہیں کرسکتی۔ برخلاف اس کے ایک زوردار اقلیت جس کی تائید میں بیدار اور منظم رائے عامہ ہو، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو ایک قدم چلنا بھی دوبھر کردے گی۔

ہم نے کونسٹیٹیوینٹ اسمبلی کو اپنے پروگرام میں سب سے آگے رکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ فیڈریشن کی اسکیم کے خلاف جنگ کرنا بھی طے کیا ہے۔ لیکن اگر ہم عہدوں کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے جنجال میں پھنس گئے تو پھر ہم پوری قوت کے ساتھ ان دونوں باتوں پر زور نہیں دے سکتے اور نہ تو ان کے لیے عوام میں ہل چل مچا سکتے ہیں۔ ہمارے سر پر بڑی بڑی مہمیں ہیں، بڑے بڑے مسائل کا سلجھانا ہے جن کا تعلق ہندستان اور بین الاقوامی معاملات سے ہے۔ اپنی اس زبردست عوام کی تنظیم کے ذریعہ سے جس نے اپنی پچاس سال کی کوششوں اور قربانیوں کی وجہ سے ہندستان کے کروڑوں باشندوں کی نمائندگی کا حق حاصل کیا ہے، ہم ان مسائل کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور انھیں حل بھی کرسکتے ہیں۔ کیا یہ کانگریس کروڑوں ہندستانیوں کی امیدوں اور خواہشوں کی آئینہ دار نہیں ہے؟ کیا یہ ان کے جذبۂ آزادی کی علم بردار نہیں ہے؟ اور کیا کانگریس کے قوی ہیکل بازو مد مقابل کو مجبور کر کے ملک کے لیے آزادی حاصل نہ کرلیں گے؟ ان سوالات کا کون سامنا کرسکتا ہے؟

اس کی ابتدا بہت معمولی طریقہ پر چند باہمت رہنماؤں نے کی تھی۔ مگر اس وقت

بھی اس کی طاقت ایک تاریخی اہمیت رکھتی تھی اور ہندستانیوں کے اعتماد کی آئینہ دار تھی جب سے آج تک یہ برابر پھیلتی رہی۔ مگر جب کبھی اس نے آگے قدم بڑھانا چاہا اس کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا اور چند ممبروں نے اس کو پیچھے رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن آگے بڑھنے کا تقاضا زبردست تھا۔ جنتا نے اسے آگے دھکیلا۔ چند نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا یہ وہ تھے جو اپنے کو تبدیلیوں کے دوش بدوش نہیں رکھ سکے۔ دوسرے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کانگریس میں شامل ہوگئی۔ کانگریس بہت بڑی پرچارک سبھا بن گئی اور ہندستان کے پبلک پلیٹ فارم پر اسی کا قبضہ ہو گیا مگر یہ ایک بے ڈھنگے قسم کا مجمع تھا اور اس میں تنظیم کی ضرورت تھی۔ بڑے پیمانے پر کوئی کارگر عمل اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ گاندھی جی کسانوں کو کانگریس میں لائے اور اس کے نئے دستور العمل سے جو 1920ء میں ناگپور میں ان کی رائے سے بنایا گیا، اس ادارہ کو منظم کیا گیا۔ اس کے ڈیلی گیٹوں کی تعداد مردم شماری کی بنا پر مقرر کی گئی اور اس میں متحدہ اور کارگر طریقے پر عمل کرنے کی قوت اور صلاحیت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ہی سارے ملک میں ایسا عمل ہوا اور بعد میں کئی بار یہی عمل پھر کیا گیا۔ لیکن کانگریس کی اس کامیابی پر اور اس کی وقعت کی وجہ سے بہت سے ناخوش گوار عناصر بھی اس کے دامن میں آ گئے اور اس کے دستور العمل کی خامیوں کو نمایاں کرنے لگے۔ یہ ادارہ اتنا بھاری بھر کم ہو گیا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس کی رفتار سست ہوگئی اور خدشہ یہ پیدا ہو گیا کہ بعض مقامات پر چھوٹے چھوٹے گروہ اس سے بے جا فائدہ نہ اٹھائیں۔ دو برس ہوئے گاندھی جی کی رائے سے اس کے دستور العمل میں بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ ان میں سے ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ ڈیلی گیٹوں کی تعداد ممبروں کی تعداد کی بنا پر ہونا چاہئے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی کہ جس کی وجہ سے کانگریس کے ڈیلی گیٹوں کے انتخابات میں اصلیت آ گئی اور ہماری طاقت زیادہ منظم ہوگئی۔ لیکن پھر بھی کانگریس کے بڑے وقار کی

مناسبت سے ہماری تنظیمی حیثیت کمزور ہے۔ ہماری کمیٹیاں کبھی کبھی یوں کام کرتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کارروائیاں ٹھوس نہیں۔ عام ممبروں سے ان کو تعلق نہیں ہوتا۔ انھیں باتوں کو درست کرنے کی غرض سے لکھنؤ کانگریس نے ایک ریزولیوشن عوام کو کانگریس کے قریب لانے کی تدابیر پر غور کرنے کے لیے پاس کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ جس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا اس نے ابھی اپنی رپورٹ پیش نہیں کی ہے۔ یہ مسئلہ دراصل اس ریزولیوشن سے زیادہ بڑا ہے کیوں کہ کانگریس کے دستورالعمل کی ترمیم کا سوال اس سے وابستہ ہے۔ یہ ترمیم کچھ اس طرح کی ہونی چاہیے جس سے کہ کانگریس ایک ایسی منظم جماعت ہو جائے جو باقاعدہ اور مؤثر طور پر کام کر سکے۔ ہمارے عمل میں اثر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ وہ عوام کا عمل ہو۔ (Man Action) اور کانگریس کی طاقت کا راز یہی ہے کہ اس ادارہ کی بنیاد عوام پر ہے لیکن منظم شکل میں کانگریس پر ان کا زیادہ اثر نہیں ہے۔ ہمارے کاموں میں ایک اندرونی کمزوری اسی وجہ سے آجاتی ہے۔ کانگریس پہلے اوپر کے طبقہ کے لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی رفتہ رفتہ اس نے چھوٹی حیثیت کے لوگوں کی نمائندگی کی اور اس کے بعد اس ملک کے عوام بھی اس میں داخل ہونے لگے۔ جیسے جیسے یہ عوام کے قریب آتی گئی اسی نسبت سے اس ادارہ کا سیاسی رنگ بھی بدلتا گیا اور بدلتا جارہا ہے۔ سیاست کی جڑ دراصل اقتصادی حالات میں ملتی ہے۔ جب کانگریس کی اقتصادی نیو بدل گئی تو اس کا سیاسی منصب بھی تبدیل ہو گیا۔

ہماری تحریک کی بنیاد لامحالہ عوام پر پڑ چکی ہے۔ بغیر اس کے ہماری طاقت اور ہمارا زور باقی نہیں رہتا۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس طاقت کو منظم کریں تاکہ ہمارے معمولی ممبروں کو خود سے کام کرنے کا موقع ملے اور وہ ہمارے روز مرہ کے کام میں حصہ لے کر کانگریس کی پالیسی پر اثر ڈالیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں

کہئے کہ ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم کانگریس کو اور زیادہ جمہوری بنائیں۔

اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس پر پرسال کافی بحث بھی ہو چکی ہے وہ کسانوں اور مزدوروں کے اداروں اور دوسرے ایسے اداروں کا بھی کانگریس سے الحاق ہے جن کا مقصد ہندستانی قوم کی آزادی ہے۔ اس طریقہ سے کانگریس میں ملک کی تمام سامراج دشمن طاقتوں کا وسیع ترین متحدہ مورچہ قائم کیا جاسکتا ہے اس وقت بھی اوپر بیان کیے ہوئے گروہوں کے بہت سے ممبر کانگریس میں ہیں۔ غالباً 75 فی صدی کانگریس کے ممبر کسان ہیں۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اگر نمائندگی پیشہ کی بنیاد پر ہو تو کسانوں اور مزدوروں کو کانگریس میں زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔ اس تجویز کی مخالفت اس خوف کی بنا پر کی جاتی ہے کہ کہیں یہ نئے عنصر کانگریس پر بالکل حاوی نہ ہو جائیں۔ بعض حالات میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ نئے عنصر سیاسی طور پر پیچھے ہوں۔ گوکہ یہ سوال ہمارے لیے اہمیت رکھتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی فیصلہ کریں اس کی وجہ سے موجودہ حالات پر کسی خاص تبدیلی کے ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس وقت تو یہ تبدیلی صرف ہماری نیک نیتی کی دلیل ہوگی۔ بات یہ ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی ایسی مضبوط سبھائیں ابھی ملک میں کم ہیں جو کانگریس سے مل کر فائدہ اٹھاسکیں گی۔ ان نئے عناصر میں ڈوب جانے کا امکان کانگریس میں بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ بہرحال اگر ایسی صورت پیدا ہونے بھی لگے تو بآسانی اس کی روک کی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں پیشہ کی بنیاد پر نمائندگی کانگریس میں اب یا کچھ دنوں بعد ہونا لازمی ہے اور یہ بات پسند کے لائق بھی ہے۔ کانگریس آسانی کے ساتھ اس قسم کے الحاق کے لیے ایسے قاعدے مقرر کرسکتی ہے تاکہ جھوٹی اور بے کار جماعتیں اور سبھائیں اس الحاق سے فائدہ نہ اٹھاسکیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسی جماعتیں جو اپنے نمائندے بھیجیں ان کی ایک خاص تعداد مقرر کردی جائے۔ غالباً صوبہ متحدہ کی

کانگریس کمیٹی نے اسی قسم کی کوئی تجویز پیش کی ہے۔

ہمارا اصل مقصد ملک کی تمام سامراج دشمن طاقتوں کا ایک مضبوط مشترکہ مورچہ قائم کرنا ہے۔ کانگریس ایک متحدہ قومی محاذ پہلے بھی رہی ہے اور اب بھی ہے اس لیے لازمی طور پر کانگریس کے اندر ہی متحدہ عمل کی بنیاد بھی پڑنی چاہئے اور ایسے محاذ میں منظم کسان اور مزدور جماعتیں جب عملی طور سے حصہ لیں گی تو کانگریس کی طاقت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس بات کو ہمیں اچھی نظر سے دیکھنا چاہئے کہ ہمارا کسان اور مزدور جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ گزشتہ سالوں کی کارروائیوں میں یہ رجحان خاص طور پر ہمیں نظر آتا ہے اس رجحان کو ہمیں اور زیادہ آگے بڑھانا چاہئے۔ آج ہندستان کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ ان تمام طاقتوں اور عناصر کو جو سامراج کے خلاف ہیں ایک جگہ جمع کر کے ہمارا متحدہ قومی مورچہ قائم کیا جائے ان میں سے اکثر طاقتیں کانگریس میں موجود ہیں اور باوجود اس کے کہ ان میں اندرونی اختلافات ہیں اور ان کا نقطہ نظر ایک نہیں ہے ان تمام طاقتوں نے ہمارے مشترک مفاد کے لیے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ یہ ہماری عظیم الشان تحریک کی قوت اور ہمارے اتحاد کی خوشگوار نشانی ہے۔ اس اتحاد کی بنیاد سامراج سے دشمنی اور آزادی کی خواہش پر ہے۔ اس کا سب سے پہلا مطالبہ کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی ہے جو کہ ایک ایسی جمہوری حکومت کی تشکیل دے جس میں سیاسی طاقت عوام کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔ اس کا لامحالہ نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ غیر ملکی فوجیں جو ہمارے ملک پر قبضہ کیے ہوئے ہیں یہاں سے ہٹادی جائیں۔

ہمارے سامنے یہ مقاصد ہیں لیکن ہم اس ملک کے لوگوں کے روزمرہ کے مسائل اور آج کل کی حقیقتوں کو بھلا نہیں سکتے۔ یہ حقیقتیں جن کا ہمیشہ سامنا ہم کو کرنا پڑتا ہے وہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی غربت اور بے روزگاری کی حقیقتیں ہیں، سخت غریبی اور

ایسی بے روزگاری جس کے پنجہ میں متوسط طبقہ کے لوگ بھی پھنسے ہوئے ہیں اور جو مہلک فالج کی طرح دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ آج دنیا میں دردناک تفاوت کی بہت سی تصویریں ملتی ہیں لیکن یقیناً ہندستان میں اس تفاوت کا نقشہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور پر ان بھوکے ہندستانی کسانوں کے جھونپڑے ہیں جن کی ناچیز گاڑھی کمائی سے یہ اونچے اونچے محل بنے ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں اور وظیفے دیے جاتے ہیں۔ ایک ریاست کا حکمران اپنے محلوں اور سامان عیش کو بڑے کروفر کے ساتھ اپنی غریب اور مصیبت زدہ رعایا کے روبرو پیش کرتا ہے اور پھر اپنے عہد ناموں اور حق استبدادیت کی باتیں کرتا ہے۔ نیا ایکٹ اور دستور العمل اس اونچ نیچ کو محفوظ اور مستحکم کرنے کے لیے ہم پر عائد کیا جارہا ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ ہندستان پر شخصی جابرانہ حکومت اور سامراجی استحصال ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔

اس وقت جب کہ میں ان الفاظ کو لکھ رہا ہوں ایک زبردست ریلوے ہڑتال جاری ہے۔ ایک عرصہ سے ریلوے مزدوروں کی دنیا میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدور برخاست کیے جارہے ہیں اور ان کی مزدوری گھٹائی جارہی ہے۔ ان کے خلاف حکومت کی پوری طاقت ہے۔ تھوڑے دن ہوئے بمبئی کے قریب ''امبرناتھ میچ فیکٹری'' کے مزدوروں کی ایک بہادرانہ ہڑتال ہوئی تھی۔ اس فیکٹری کا مالک ایک زبردست غیر ملکی ٹرسٹ ہے۔ لیکن اس ٹرسٹ کے پیچھے اس کی مدد کرنے کے لیے حکومت کا ہاتھ ہمیں صاف صاف دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے دیس میں مزدوروں کو ابتدائی حقوق تک ابھی حاصل کرنا باقی ہیں۔ صرف آٹھ گھنٹہ روزانہ کام کرنا، بے روزگاری کا بیمہ اور معینہ اجرت جو بسر اوقات کے لیے کافی ہو یہ تینوں حقوق بھی مزدوروں کو حاصل کرنے ہیں۔

لیکن اس مسئلہ سے بھی زیادہ بڑا اور زیادہ فوری سوال کسانوں کا ہے، اس وجہ

سے کہ ہندستان دراصل کسانوں ہی کا ملک ہے۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے اور کانگریس کو ہندستان کے لاکھوں کروڑوں کسانوں کے قریب لانے کے لیے ہم نے آج اپنا جلسہ ایک گاؤں فیض پور میں کیا ہے پہلے کی طرح کسی بڑے شہر میں نہیں کیا۔ لکھنؤ کانگریس نے زمین کے مسئلہ پر بہت زور دیا تھا اور صوبہ کی کانگریس کمیٹیوں سے کہا تھا کہ وہ اپنے اپنے صوبے کا ایک زراعتی پروگرام بنائیں۔ یہ کام اتنا بڑا اور پیچیدہ ہے کہ اس میں ابھی تک پوری طرح تفتیش ختم نہیں ہوئی ہے اور وہ ابھی تک پورا نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن مسئلہ کی اہمیت ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اس کا کوئی فوری حل پیش کریں۔ لگان اور مال گزاری کے معاملہ میں بنیادی اصلاح کا مطالبہ اور ساختی (Teudal) محصولوں کی پوری موقوفی کی مانگ تقریباً تمام صوبوں سے کی جاچکی ہے۔ زراعت پیشہ طبقوں پر قرض کے بھاری بوجھ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرض کی ادائیگی کو ملتوی کرنے اور قرض کے مقدار میں کافی کمی کرنے کے لیے ملک کے ہر حصہ میں آواز اٹھ رہی ہے۔ پنجاب میں کسانوں کے تحفظ کے لیے قرضہ کمیٹیاں قائم ہوگئی ہیں۔ یہ سب اور بہت سے دوسرے مطالبات بار بار پیش کیے جارہے ہیں۔ کسانوں کی بڑی بڑی سبھائیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنی موجودہ زیر باری برداشت کرنے سے قاصر ہیں تاہم اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ یہ مسئلہ تھوڑا تھوڑا کر کے بلا زمین کے نظام کی پوری تبدیلی کیے ہوئے حل کیا جاسکتا ہے۔ زمین کا موجودہ نظام زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا۔ ظاہراً تدبیر تو یہ ہے کہ حکومت اور کسانوں کے درمیان جو طبقے ہیں انھیں ہٹادیا جائے۔ اس کے بعد یہ لازمی ہے کہ کواپریٹو اور مشترکہ کھیتی شروع کی جائے۔

زمین کے نظام کی اصلاح بڑے پیمانے کی، گھریلو صنعتی ترقی سے وابستہ ہے۔ ہمارے وطن کے کروڑوں بے روزگاروں کو روزی دینا اور ان کے قابل رحم معیار

زندگی کو بلند کرنے کے لیے یہ باتیں ضروری ہیں اور ان سب چیزوں کا تعلق بہت سی دوسری چیزوں سے بھی ہے۔ مثلاً تعلیم، رہنے کے لیے گھر، سڑکیں اور سواری، حفظان صحت اور صفائی وغیرہ۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی اقتصادی اور مالی پالیسی جو امپیریل پریفرنس(Imperial preference) کے نام سے انگریزی مال کو ہندستان میں مدد پہنچاتی ہے جو شہر لندن کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہے اور اس کے ماتحت ہماری صنعت کی مناسب ترقی ممکن نہیں۔ ہندستانیوں کی لگاتار مخالفت کے باوجود روپیہ اور پاؤنڈ کا موجودہ تناسب Current Ratio بدستور قائم ہے۔ گو کہ تمام ہندستان نے زور کے ساتھ سونے کی کثیر برآمد کی مخالفت کی لیکن پانچ برس سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور نئے ایکٹ کی رو سے ہم کسی ایسے معاملہ میں بالکل دخل نہیں دے سکتے جو وائسرائے یا گورنر کے خیال میں اس قسم کی مداخلت برطانوی تجارت کے مفاد کے خلاف ہو۔ پرانے دستور چاہے بدلے جائیں مگر برطانوی مفاد مستقل طور پر محفوظ رہیں گے۔

اسی طرح ایک مسئلہ دوسرے مسئلے سے وابستہ ہے اور یہ سب مجموعی طور پر موجودہ ہندستان کی پیچیدہ تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کیا ہم ان پیچیدگیوں کو معمولی کتر بیونت سے درست کر سکتے ہیں جب کہ ہر قسم کے بے جا تحفظات اور رعایتیں Vested Interest ہمارے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں؟ صرف ایک ایسی زبردست قسم کی باقاعدہ سوچی ہوئی اسکیم جو کہ تمام ہندستان کے لیے ہو اور جو تمام قومی تحریکوں کو اس طرح منسلک کر دے کہ ہر ایک تحریک بہتر سے بہتر طور پر جتنا کو فائدہ پہنچا سکے۔ صرف ایسی ہی اسکیم اگر ہمت اور دور اندیشی سے چلائی جائے تو موجودہ گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔ مگر ایسی باقاعدہ اسکیمیں اجارہ داری اور مخصوص تحفظات و نیز سامراجی استحصال کے زیر سایہ کبھی پنپ نہیں سکتیں۔ انھیں سرسبز ہونے کے لیے

سیاسی اور سماجی آزادی کی خوش گوار فضا ضروری ہے۔

مگر ہمارے لیے وہ منزل بھی دور ہے۔ گو کہ ممکن ہے کہ زمانے کی تیز رفتاری ہمیں اس منزل سے بعید از قیاس سرعت کے ساتھ قریب پہنچا دے۔ ہمارا فوری مقصد یعنی آزادی قریب تر اور واضح ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ان نا امیدیوں اور مایوسیوں سے بچے ہوئے ہیں جو یورپ میں بہتیروں کو اپنا شکار بنائے ہوئے ہیں۔

صرف دیکھنے ہی میں ہم کمزور معلوم ہوتے ہیں دراصل ہم کمزور نہیں۔ ہماری طاقت دن بدن بڑھتی ہے۔ برطانیہ کی سلطنت رفتہ رفتہ غائب ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ ہم سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے بسے ہوئے ہیں۔ ہمارے شخصی حقوق چھنے ہوئے ہیں۔ ہماری سینکڑوں انجمنیں خلاف قانون قرار دی جا چکی ہیں۔ ہمارے ہزاروں نوجوان ہمیشہ مقید اور نظر بند رہتے ہیں ہماری نقل وحرکت پر رات دن سینکڑوں جاسوسوں کی نظر رہتی ہے۔ ہمارا ہر لفظ قلم بند کیا جاتا ہے۔ تا کہ وہ قانون بغاوت کے خلاف نہ ٹھہرے۔ ان تمام پابندیوں کے باوجود ہم میں کمزور ہونے کے بجائے طاقت آتی جا رہی ہے۔ ہمارے دبانے کا یہ زبردست انتظام ہماری بڑھتی ہوئی قومی طاقت کی دلیل ہے۔ جنگ اور انقلاب کا دنیا میں دور دورہ ہے اور قومیں بدحواسی سے مسلح ہو رہی ہیں۔ اگر لڑائی چھڑ گئی یا کوئی اور دوسرا نازک موقع آیا تو اس بارے میں ہندستان کی رائے نہایت اہم ہوگی اور سلطنت پر اس کا اثر ہوگا۔ ہمارے ہی ہاتھوں میں کامیابی کی کنجیاں ہیں۔ کاش کہ ہم ان کو صحیح طور پر گھمائیں۔ اسی بات کے بڑھتے ہوئے احساس نے ہماری قوم کی شکست پذیر ذہنیت کو یکسر بدل دیا ہے۔

فی الحال الیکشن ہی کی طرف ہماری ساری توجہ مبذول ہے اور ہماری ساری طاقتیں اسی پر صرف ہو رہی ہیں۔ یہاں بھی سرکاری مداخلت سے ہماری مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ باوجود انکار کے کھلی ہوئی کوششیں ان پڑھ ووٹ دینے والوں کے ووٹ کو راز

میں رکھنے سے روکنے کے لیے جاری ہیں۔صوبۂ متحدہ اس بات میں سب سے آگے ہے۔ جہاں رنگے ہوئے بکسوں کے استعمال کی اجازت نہیں ملی ۔ حالانکہ دوسرے صوبوں میں ایسے بکس استعمال ہوں گے۔مگر باوجود ان تمام روک تھام کے چاہے وہ حکومت کے دباؤ سے ہو یا روپیوں کے اثر سے، ہم الیکشن کی جدوجہد میں کامیاب رہیں گے۔

یہ کامیابی آزادی کے لمبے سفر میں صرف ایک چھوٹا سا قدم ہے مگر ہم آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔خطرات اور مصیبتیں ہمارے ساتھ ہوں گی۔ یہ مدتوں ہمارے ہم سفر رہ چکے ہیں اور ہم ان سے مانوس ہو گئے ہیں۔ جب ہم ان پر پورے طور سے قابو پانا سیکھ جائیں گے تو ہم کامیابی پر فتح پانا بھی جان جائیں گے۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس

ہری پورہ ——————— فروری1938ء

جناب صدر اور دوستو!

میں تہہ دل سے اس اعزاز کا احساس رکھتا ہوں جو آپ نے آیندہ سال کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کر کے مجھے بخشا ہے۔ایک لمحہ کے لیے بھی میں تصور نہیں کر سکتا کہ اس اعزاز کا اہل ہوں۔ میں اس اعزاز کو اس امر پر محمول کرتا ہوں کہ یہ آپ کی طرف سے ہمارے لیے فیاضی اور انعام ہے،جن کی قومی جنگ میں مجموعی خدمات ایسی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو ہم بھی وہاں نہ ہوتے جہاں آج ہیں۔ایک احساس خوف اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ صدارت کے اس چبوترے پر استوار ہوتا ہے جسے اب تک مادر وطن کے معزز سپوت اور محترم خاتونیں سرفراز کرتی رہی ہیں۔ اپنی کثیر کوتاہیوں کا احساس رکھتے ہوئے امید وآرزو کرتا ہوں کہ آپ کی ہمدردی اور تائید سے ایک حد تک اس جلیل القدر منصب کا اہل ثابت ہوسکوں گا جس پر آپ نے مجھے مقرر فرمایا ہے۔

سب سے پہلے مجھے اس جذبۂ افسوس وحسرت کو ظاہر کرنا چاہئے جو شریمتی سروپ رانی نہرو، سر جگدیش چندر بوس اور ڈاکٹر سرت چند چٹرجی کی وفات پر آپ کے دلوں میں موجود ہے۔شریمتی سروپ رانی ہماری نگاہ میں صرف پنڈت موتی لال نہرو کی محترم رفیقۂ حیات اور پنڈت جواہر لال نہرو کی والدہ ماجدہ ہی نہ تھیں، بلکہ ہندستان

کی آزادی کے راستہ میں ان کے مصائب، قربانیاں اور خدمتیں ایسی تھیں کہ ہر شخص ان پر فخر کرسکتا ہے۔ بحثیت ہم وطن ہونے کے ہم ان کی وفات کا ماتم کرتے ہیں اور ہمارے دل پنڈت نہرو اور ان کے غمزدہ خاندان کے لیے ہمدردی سے لبریز ہیں۔

سر جگدیش چندر بوس کا ہندستان ہمیشہ احسان مند رہے گا کیوں کہ وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے ہندستان کے لیے موجودہ سائنس کی دنیا میں معزز مقام نکالا۔ سر جگدیش دل کی گہرائی سے وطن پرور تھے اور انھوں نے نہ صرف سائنس بلکہ ہندستان کے لیے اپنی زندگی ختم کردی ہندستان اس حقیقت سے باخبر ہے اور احسان مانتا ہے۔ ہم لیڈی بوس کے سامنے تہہ دل سے اپنی تعزیت پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سرت چندر چٹرجی کی قبل از وقت موت کی وجہ سے ہندستان نے اپنے آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ کھودیا۔ ان کا نام مدتوں سے بنگال کے باشندوں کی زبان پر تھا۔ مگر وہ ہندستان کی ادبی دنیا میں بھی کم مشہور نہ تھے۔ سرت بابو بہت بڑے ادیب تھے مگر اس سے بھی زیادہ اپنی وطن پروری میں بڑے تھے۔ ان کی وفات کے سبب بنگال میں کانگریس آج صاف طور پر گھاٹے میں ہے۔ ہم ان کے خاندان کے سامنے اپنی دلی تعزیت پیش کرتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں احترام کے ساتھ ان لوگوں کی یاد کے سامنے سر جھکاتا ہوں جنھوں نے ملک کی خدمات میں فیض پور کانگریس کے اجلاس کے بعد اپنی جانیں دی ہیں، میں خصوصیت سے ان لوگوں کا ذکر کرتا ہوں جو قید خانوں میں یا نظر بندی میں یا رہائی کے بعد ہی مرے ہیں۔ علی الخصوص سر یجت ہر ندرا منشی کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو ڈھاکہ سنٹرل جیل میں سیاسی قیدی تھے اور جنھوں نے حال ہی میں بھوک ہڑتال کی وجہ سے اپنی جان دی ہے۔ میرے جذبات ہنوز اس قدر زخمی ہیں کہ اس موضوع پر مجھے زیادہ کہنے کا یارا نہیں۔ میں صرف یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ

''ڈنمارک کے اسٹیٹ میں کوئی خرابی'' ضرور ہے جس سے مجبور ہو کر جتن داس، سردار مہابیر سنگھ، رام کرشنا ناداس، موہیت موہن موئترا، ہرندرا نشی وغیرہ جیسے درخشاں اور ہونہار نوجوانوں نے زندہ رہنے پر مرجانے کو ترجیح دی۔

پوری انسانی تاریخ پر جب ہم سرسری نظر ڈالتے ہیں تو پہلی چیز جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ سلطنتوں کا اٹھنا اور گرنا ہے۔ مغرب کی طرح مشرق میں بھی سلطنتیں اکثر وسعت حاصل کرتی رہی ہیں اور بام عروج پر پہنچنے کے بعد بتدریج حقیر بن جایا کی ہیں اور کبھی کبھی موت کے گھاٹ بھی اتر گئی ہیں۔ قدیم زمانے کی رومن سلطنت اور موجودہ زمانے کی ترکی اور آسٹرو ہنگرین سلطنتیں اس قانون قدرت کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ہندستان کی سلطنتیں موریا، گپتا اور مغل سلطنتیں اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ تاریخ کے ان نمایاں واقعات کی موجودگی میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ برطانی سلطنت کی قسمت میں کچھ اور لکھا ہے؟ یہ سلطنت آج تاریخ کے ایک چوراہے پر کھڑی ہے۔ یہ سلطنت بھی یا تو دوسری سلطنتوں کی راہ پر جائے گی اور یا پھر اسے اپنے آپ میں تبدیلی کر کے آزاد قوموں کا فیڈریشن بن جانا پڑے گا۔ یہ دونوں راستے اس کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ زار کی سلطنت کو 1917ء میں شکست ہو گئی، مگر اس کے ملبے سے سوویٹ سوشلسٹ جمہوریتوں کا اتحاد برآمد ہوا برطانیہ عظمیٰ کے لیے ہنوز موقع ہے کہ روسی تاریخ کا ایک صفحہ لے لے۔ کیا وہ ایسا کرے گا؟

برطانی سلطنت سیاسیات میں ایک بے میل عجوبہ ہے۔ یہ سلطنت حکومت خود اختیاری رکھنے والے ملکوں، نیم خود مختار مقبوضات اور ان نوآبادیوں کے عجیب مجموعہ سے بنی ہے جن پر مطلق العنان طریقہ سے حکومت کی جاتی ہے۔ دستوری چالاکیوں اور انسانی جدت طرازیوں سے یہ مجموعہ کچھ مدت ٹھہر سکتا ہے۔ مگر ہمیشہ کے لیے رک نہیں سکتا۔ اگر اندرونی خلفشار کو مناسب وقت کے اندر دور نہ کر دیا گیا تو بیرونی دباؤ

سے بالکل قطع نظر خود اپنے بوجھ سے یہ سلطنت پارہ پارہ ہو جائے گی۔مگر کیا برطانی سلطنت ایک ہی تیز جھونکے میں اپنے آپ کو آزاد قوموں کے فیڈریشن کی شکل میں تبدیل کرسکتی ہے؟ اس کا جواب برطانی لوگوں ہی کو دینا چاہئے۔ بہرحال ایک بات بالکل یقینی ہے۔ یہ تبدیلی صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ برطانی باشندے خود اپنے ملک میں آزاد ہو جائیں۔یعنی برطانیہ عظمیٰ سوشلسٹ ریاست بن جائے ۔ برطانیہ کے سرمایہ دار حاکم طبقے اور باہر کی آبادیوں میں نہ ٹوٹنے والا رشتہ موجود ہے۔ جیسا کہ لینن نے بہت پہلے کہا تھا'' برطانیہ عظمیٰ میں رجعت پسندی کو چند قوموں کی غلامی سے تقویت وغذا ملتی ہے۔'' برطانی امیر و متوسط طبقے صرف اس وجہ سے موجود ہیں کہ نوآبادیاں اور سمندر پار مقبوضات لوٹ کھسوٹ کے لیے موجود ہیں۔ آخر الذکر کی نجات برطانیہ کے سرمایہ دار حاکم طبقہ کے خود وجود پر ضرب ہوگی اور اس ملک میں سوشلسٹ ریاست کے قیام کو آسان بنا دے گی۔لہٰذا یہ بات صاف ہے کہ برطانیہ عظمیٰ میں سوشلسٹ ریاست کا قیام ممکن نہیں جب تک نوآبادیاں رکھنے کا سلسلہ ختم نہ ہو جائے۔ یہ بات بھی صاف ہے کہ ہم جو ہندستان کی اور برطانی سلطنت کے دوسرے غلام ملکوں کی سیاسی آزادی کے لیے جنگ کر رہے ہیں،تو اتفاقی طور پر ہماری یہ جنگ خود برطانی باشندوں کی اقتصادی نجات کے لیے بھی ہے۔

یہ مشہور حقیقت ہے کہ ہر سلطنت کی بنیاد اس پالیسی پر ہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔لیکن مجھے شبہ ہے کہ دنیا کی کسی سلطنت نے بھی اس پالیسی پر ویسی مہارت، باضابطگی اور ظالمانہ طریقہ سے عمل کیا ہو جیسا برطانیہ نے کیا ہے۔ اس پالیسی کے مطابق آئرش باشندوں کو اقتدار سپرد کرنے سے پہلے السٹر کو باقی آئرلینڈ سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح فلسطینی باشندوں کو کوئی اقتدار سونپنے سے پہلے ہی یہودیوں کو عربوں سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ اقتدار حوالہ کرنے کو بے اثر بنانے کے لیے اندرونی

تقسیم ضروری ہے۔ تقسیم کا یہی اصول ایک دوسرے روپ میں ہندستان کے نئے آئین میں ظاہر ہورہا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف جماعتوں کو الگ الگ کرنے اور بالکل علیحدہ خانوں میں بند رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فیڈرل اسکیم میں مطلق العنان والیان ریاست اور برطانی ہند کے جمہوری طریقہ سے منتخب ہونے والے نمائندے جمع کردیے گئے ہیں۔ نیا آئین اگر قطعی طور پر مسترد کردیا گیا، برطانی ہند کے دباؤ کی وجہ سے یا اس میں شرکت سے والیان ریاست کے انکار کی وجہ سے تو بھی مجھے شبہ نہیں کہ برطانی جدت پسندی ہندستان تقسیم کرنے کے لیے کوئی اور دستوری چال تلاش کرے گی اور اس طرح ہندستانی باشندوں کو جو اقتدار حوالہ کرے گی اسے بے اثر بنادے گی۔ لہٰذا ہندستان کے لیے جو آئین بھی وہائٹ ہال سے صادر ہو، اسے انتہائی ہوشیاری اور احتیاط سے جانچنے کی ضرورت ہے۔

لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کھلے فوائد تو ضرور رکھتی ہے، مگر حکمران طاقت کے لیے بے میل برکت ہرگز نہیں ہے۔ یہ پالیسی لازی طور پر نئے مسائل اور نئی پریشانیاں پیدا کردیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ اپنی تفریق کی پالیسی سے پیدا ہونے والی سیاسی دورنگی کے جالوں میں پھنس رہا ہے۔ وہ ہندستان میں مسلمان کو خوش کرے یا ہندو کو؟ فلسطین میں عربوں کو نوازے یا یہود کو؟ مصر میں پادشاہ کی طرف ہو یا وفد کی طرف؟ اس کی یہی دورنگی سلطنت کے باہر بھی نمایاں ہے۔ اسپین کے معاملہ میں برطانی مدبر حیران ہیں کہ فرانکو کا ساتھ دیں یا قانونی حکومت کا — اور یورپین سیاست کے وسیع میدان میں وہ فرانس اور جرمنی کے بیچ میں پڑے بھٹک رہے ہیں۔ برطانیہ کی خارجی پالیسی میں جو تضاد وتناقض نظر آتا ہے، وہ اس کی سلطنت کی غیر موزوں ترکیب اور بناوٹ کا براہ راست نتیجہ ہے۔ برطانی وزارت یہودیوں کو خوش کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ وہ یہودیوں کی بلند مالیات سے قطع نظر نہیں

کر سکتی۔ دوسری طرف وزارت ہند اور وزارت خارجیہ، مشرق قریب اور ہندستان میں شہنشاہانہ مفاد کی وجہ سے عربوں کے خوش کرنے پر مجبور ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ صرف ایک ہی ذریعہ سے اپنے آپ کو ان تناقضات سے نکال سکتا ہے اور وہ ذریعہ یہ ہے کہ سلطنت کو آزاد قوموں کے فیڈریشن کی صورت میں تبدیل کردے۔ اگر وہ ایسا کر سکے تو تاریخ میں ایک معجزہ کر دکھائے گا۔ لیکن اگر نہ کر سکا تو اسے وسیع سلطنت کی تدریجی شکست وریخت کو قبول کرنا پڑے گا۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ برطانی باشندوں کو آسٹرو ہنگرین سلطنت کا سبق بھولنا نہیں چاہئے۔

سلطنت برطانیہ موجودہ وقت میں کئی پہلوؤں پر کمزوری محسوس کر رہی ہے۔ خود سلطنت کے اندر مغرب بعید میں آئرستان ہے اور مشرق بعید میں ہندستان وسط میں فلسطین اپنے ہمسایہ ملکوں مصر اور عراق کے ساتھ موجود ہے۔ سلطنت کے باہر بحر متوسط میں اٹلی دباؤ ڈال رہا ہے اور مشرق بعید میں جاپان پریشان کیے ہوئے ہے۔ دونوں ملک جنگ جو ہیں، جارحانہ پالیسی رکھتے ہیں اور سامریت پسند ہیں۔ اس ہل چل کے پس پشت سوویٹ روس موجود ہے۔ جس کی موجودگی ہی سے ہر شہنشاہیت پسند ملک کے بااقتدار طبقہ کے دلوں میں خوف بھرا ہوا ہے۔ سلطنت برطانیہ اس چہار دباؤ کے اثر کو کہاں تک زائل کرتی رہے گی؟

آج برطانیہ مشکل سے خود کو سمندروں کی ملکہ کہہ سکتی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اس کی یہ نادر ترقی اس کی سمندری طاقت کی وجہ سے تھی اور بیسویں صدی میں اس کا سلطنتی زوال دنیا کی تاریخ میں ایک نیا عنصر پیدا ہونے سے ہوگا — یعنی ہوائی طاقت — ہوائی طاقت کے اس نئے عنصر کی وجہ ہی تھی کہ گستاخ اٹلی بحر متوسط میں برطانیہ کی رواں دواں کل بحری طاقت کو چیلنج دے سکا۔

برطانیہ زمین، سمندر اور ہوا میں اپنی آخر حدود تک مسلح ہو لے۔ جنگی جہاز فضائی

بم باری کا مقابلہ کرلیں لیکن موجودہ جنگ کے طریقوں میں ہوائی طاقت کا یہ نیا مضبوط عنصر اپنی جگہ پر موجود ہے۔ فاصلوں کی اب وقعت ہی نہیں رہی ہے اور خلاف فضائی حملوں کی محافظتوں کے باوجود لندن، براعظم کے ہر کسی مرکز کے بم بار ہوائی دستہ کے سامنے بے کسی سے حملوں کے لیے کھلا پڑا ہے۔ مختصر یہ کہ ہوائی طاقت نے موجودہ جنگ میں انقلاب عظیم پیدا کردیا ہے۔ برطانیہ کی تخصیصی پوزیشن کو ختم کردیا ہے اور دنیا کی سیاست میں توازنِ طاقت کو برہم کردیا ہے۔ اس زبردست عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ہی ایسی کھلی ہوئی پڑی ہے کہ اس سے پہلے کبھی افشانہ ہوئی ہوگی۔

دنیا کی طاقتوں کی ایسی گتھی میں ہندستان آج پہلے سے کہیں مضبوط نظر آتا ہے۔ ہمارا ملک بہت وسیع ہے جس کی آبادی تین سو پچاس ملین ہے۔ ہماری وسعت بلحاظ رقبہ اور بلحاظ آبادی ہماری کمزوری کا سبب رہی ہے۔ اگر ہم صرف متحد رہیں اور مردانہ وار اپنے حکمرانوں کا مقابلہ کریں تو یہی وسعت آج ہماری مضبوطی کا باعث بن جاتی ہے۔ ہندستانی اتحاد کے مدنظر پہلی بات جو ہمیں یاد رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی ہند اور ہندستانی ریاستوں کے مابین جو تفریق کردی گئی ہے وہ بالکل مصنوعی ہے۔ ہندستان ایک ہے اور برطانوی ہند کے باشندوں اور ہندستانی ریاستوں کے باشندوں کی امیدیں اور توقعات بھی یکساں ہیں۔ ہماری منزل مقصود آزاد ہندستان ہے اور میرے خیال سے یہ مقصد صرف فیڈرل جمہوریت سے حاصل ہوسکتا ہے جس میں صوبے اور ریاستیں رضامندی سے شریک ہوں۔ کانگریس نے وقتاً فوقتاً ریاستی باشندوں کو ان کی اس جدوجہد میں جو وہ جمہوری حکومتیں اس جگہ جسے عام طور پر ہندستانی ہندستان کہتے ہیں قائم کرانے کے لیے کررہے ہیں، اپنی ہمدردی اور اخلاقی معاونت سے نوازا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہمارے ہاتھ اس قدر بھرے ہوتے ہیں کہ کانگریس اپنے ریاستی محبان وطن کے ساتھ اس وقت زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتی۔ لیکن

پھر بھی آج کسی کانگریسی کو شخصی طور پر ممانعت نہیں کہ وہ ریاستی باشندوں کی حقوق طلبی میں یا ان کی جدوجہد میں سرگرمی سے حصہ لے۔ کانگریس میں بعض اشخاص ایسے موجود ہیں جیسا کہ میں خود ہوں جو چاہتے ہیں کہ کانگریس ریاستی باشندوں کی تحریکات میں زیادہ سرگرم حصہ لے۔ میری ذاتی توقع ہے کہ مستقبل قریب میں انڈین نیشنل کانگریس کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ ایک قدم اور آگے بڑھائے اور اپنی ساتھی ریاستی جنگجوؤں کو اعانت پہنچائے۔ ہم کو یہ امر فردگذاشت نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ہماری ہمدردی اور امداد چاہتے ہیں۔

ہندستان کے اتحاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے دوسری بات جو اس لحاظ سے قابل غور ہے وہ اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ کانگریس نے کئی بار اس مسئلہ پر اپنی پالیسی کا اعلان کردیا ہے۔ حال کا تازہ ترین اعلان جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کلکتہ کے اجلاس اکتوبر 37ء میں کیا تھا حسب ذیل ہے:

''کانگریس نے پوری ذمہ داری سے اور متعدد بار ہندستان میں اقلیتوں کے حقوق پر اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ کانگریس اپنا یہ فرض سمجھتی ہے کہ ان حقوق کی محافظت کرے اور اقلیتوں کے نشوونما، ان کی قوم کی سیاسیات، اقتصادیات اور معاشرت میں شریک ہونے کے وسیع سے وسیع مواقع بہم پہنچانے کا ذمہ لے۔ کانگریس کا مقصود یہ ہے کہ آزاد اور متحد ہندستان حاصل کرے۔ جہاں کوئی طبقہ یا گروہ اکثریت یا اقلیت اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو نہ کچلے اور جہاں قوم کے تمام عناصر مفاد عامہ اور ہندستان کے لوگوں کی ترقی کے لیے متحد ہوں۔ عام آزادی میں اتحاد اور متفقہ معاونت کے اس مقصود

سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندستانی زندگی کی مختلف النوع معاشرت کو کسی طرح بھی دبایا جائے جس کو اس لیے باقی رکھنا ہے کہ افراد کو آزادی اور مواقع حاصل ہوں اور اسی طرح ہر گروہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی استعداد اور رجحان کے مطابق نشوونما پا سکے۔ بہرکیف اس خیال کے تحت کہ کانگریس کی اس پالیسی کو غلط معنی بنانے کی کوششیں کی گئی ہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنی اس پالیسی کو پھر دہراتی ہے جسے کانگریس نے اپنے بنیادی حقوق والے ریزولیشن میں شامل کی ہے:

1- ہندستان کے ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ آزادانہ رائے کا اظہار کرے۔ اسے حق حاصل ہے کہ آزادانہ اداروں اور جماعتوں میں شریک ہو۔ کسی ایک مقصد کے لیے جو خلاف قانون یا اخلاق نہ ہو وہ امن پسندانہ بغیر ہتھیاروں کے جمع ہو۔

2- ہر شہری کو آزادئ ضمیر کا حق حاصل ہوگا اور حق ہوگا کہ آزادی سے اپنے مذہب کا اقرار کرے اور اس پر عمل پیرا ہو بشرطیکہ امن عام اور اخلاق اس سے خراب نہ ہو۔

3- اقلیتوں کی معاشرت، زبان، رسم الخط اور مختلف زبانوں کے رقبہ کی حفاظت کی جائے گی۔

4- قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہوں گے۔ خواہ ان کا مذہب، ذات، فرقہ یا جنس کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

5- سرکاری نوکریوں، ذمہ دار عہدوں، اعزاز اور پیشوں یا کاموں کے لیے کسی شہری کو بوجہ اس کے جنس مذہب فرقہ یا ذات محروم نہ

رکھا جائے گا۔

6- کنوئیں، تالاب، سڑکیں، اسکول اور منظر گاہیں خواہ وہ سرکاری طور پر جاری کی گئی ہوں یا مقامی فنڈ سے ان کی اپنی ہو یا کسی شخص نے مفاد عامہ کے لیے انھیں وقف کیا ہو، سب پر تمام شہریوں کو برابر کے حقوق اور فرائض حاصل ہوں گے۔

7- تمام مذاہب کے متعلق حکومت غیر جانبدار رہے گی۔

8- ووٹ دینے کا حق تمام بالغ باشندوں کے ووٹ دینے کے حق کے اصول پر قائم ہوگا۔

9- ہر شہری کو آزادی ہوگی کہ ہندستان بھر میں جہاں چاہے پھرے، ٹھہرے ان کے کسی حصہ میں بس جائے یا ملکیت حاصل کرے یا کوئی پیشہ یا کام اختیار کرے۔ ہندستان کے تمام حصوں میں اس پر قانونی چارہ جوئی اور محافظت یکساں ہوگی۔

بنیادی حقوق والے ریزولیشن کے ان فقروں سے یہ صاف ہوجاتا ہے کہ ضمیر، مذہب اور معاشرت کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہونا چاہئے اور ہر اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے قانون کو اکثریت کی تبدیلیاں منظور کیے بغیر قائم رکھے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق کانگریس کی پوزیشن کئی مرتبہ کانگریس کی قراردادوں میں صاف کردی گئی ہے اور مختصر طور پر سال گذشتہ کے انتخابی اعلان میں اس کے متعلق کہہ دیا گیا ہے۔ کانگریس اس فیصلہ کی یوں مخالفت کرتی ہے کہ یہ غیر قومی اور غیر جمہوری ہے اور ہندستان کی آزادی کی راہ میں اور اس کی اتحادی ترقی میں

رکاوٹ ہے۔ باوجود اس کے کانگریس نے ظاہر کر دیا ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ کی تبدیلی یا منسوخی متعلقہ پارٹیوں کے باہمی معاہدے سے ہوسکتی ہے۔ کانگریس نے ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے اور اب بھی ہر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے جس سے باہمی معاہدے سے اس قسم کی کوئی تبدیلی ہو جائے۔ ان تمام معاملات میں جو اقلیتوں سے تعلق رکھتے ہیں کانگریس ان کی معاونت اور نیک نیتی سے ایک عام فرض اور مطمح نظر کے لیے یعنی ہندستان کے باشندوں کی آزادی اور اصلاح کے لیے چلنا چاہتی ہے۔"

اس مسئلہ کے قطعی حل کے لیے مناسب موقع آ گیا ہے کہ ہم اپنی کوششوں کی تجدید کریں۔ مجھے یقین ہے کہ میں تمام کانگریسیوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ جب میں کہتا ہوں کہ ایک متفقہ حل جو قومیت کے بنیادی اصول کے مطابق ہو حاصل کرنے کے لیے ہم پوری پوری کوششوں کے لیے ہمہ تن شوق ہیں۔ میرے لیے کسی تفصیل میں پڑنا کہ کن اصول پر یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے غیر ضروری ہے۔ گزشتہ کانفرنسوں اور مباحثوں میں اس کے متعلق بہت کچھ مفید باتیں کہی جا چکی ہیں۔ میں صرف یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مشترکہ مفاد پر زور دینے سے یعنی اقتصادیات اور سیاسیات کو آگے رکھنے سے ہی ہم فرقہ وارانہ تفریق اور نفاق سے نجات پا سکتے ہیں مذہبی معاملات میں "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کی پالیسی اور اقتصادی اور سیاسی معاملات میں سمجھوتہ رکھنا ہمارا مقصود ہونا چاہیے۔

جب ہم اقلیتوں کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو مسلمانوں کا مسئلہ اگرچہ دور سے بڑا دکھائی دیتا ہے اور ہم اس مسئلہ کو قطعی طور پر طے کرنے کے لیے تیار بھی ہیں، تاہم میں

کہتا ہوں کہ کانگریس دوسری اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے اتنی ہی خواہش مند ہے اور بالخصوص نیچ ذاتوں سے جن کی تعداد بہت بڑی ہے۔ میں اقلیتوں کے افراد کے سامنے یہ بات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر کانگریسی پروگرام کو چلایا جائے تو ان کے خوف کا کوئی باعث ہوسکتا ہے۔ کانگریس ہندستان کے باشندوں کے مجموعی طور پر اقتصادی اور سیاسی حقوق کے لیے کھڑی ہے۔ اگر اس کو اپنے پروگرام چلانے میں کامیابی ہوتو اقلیت والے فرقے بھی اسی قدر مستفید ہوں گے۔ جس قدر ہندستانی آبادی کا کوئی اور طبقہ مستفید ہو سکے گا۔ علاوہ بریں سیاسی طاقت حاصل کرنے کے بعد جب تعمیری کام شروع ہوگا تو وہ سوشلسٹ اصول پر ہوگا۔ مجھے شبہ نہیں کہ یہ تعمیر سوشلسٹ اصول ہی پر ہوگی اور اسے محروم طبقے، مالدار طبقوں کے حساب میں فائدہ اٹھائیں گے۔ ہندستانی عوام کو محروموں ہی کے طبقے میں رکھنا چاہئے۔ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے جو اقلیتوں کے لیے اضطراب کا سرچشمہ ہے۔ یعنی مذہب اور معاشرت کا وہ حصہ جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ پر کانگریس کی پالیسی یہ ہے کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہندستان کی آزادی حاصل ہونے کی صورت میں کسی خوف کا موقع نہیں ہے۔ اس کے برعکس انھیں بہت کچھ حاصل ہوگا۔ جہاں تک نیچ اقوام کی مذہبی اور معاشرتی کمزوریوں کا تعلق ہے تو یہ سب پر روشن ہے کہ کانگریس نے گذشتہ سترہ سال میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی جس سے یہ کمزوریاں دور ہوتیں۔ اس دن کے دور ہونے میں شبہ نہیں جب یہ کمزوریاں زمانہ سابق کی باتیں شمار ہوں گی۔

میں ان طریقوں کو بیان کروں گا جنھیں کانگریس آئندہ برسوں میں اختیار کرے گی اور یہ کہ قومی جدوجہد میں کانگریس کا کیا عمل ہونا چاہئے۔ میں پہلے سے کہیں زیادہ اب یہ یقین رکھتا ہوں کہ طریقوں میں ''ستیہ گرہ یا عدم تشدد یا عدم تعاون اپنے وسیع

ترین مفہوم میں استعمال کرنا چاہئے۔ جس میں سول نافرمانی بھی شامل ہو۔ ہمارے اس طریقہ کو بے کسی کی مدافعت کہنا صحیح نہیں۔ ستیہ گرہ جیسا کہ میرا خیال ہے، بے کسانہ مدافعت نہیں بلکہ سرگرم مدافعت بھی اس کو کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کی سرگرم تحریک کو عدم تشدد کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اپنے ہم وطنوں کو یہ یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ستیہ گرہ یا عدم تشدد یا عدم تعاون کو پھر کام میں لانا ہوگا۔ تجربہ کے طور پر صوبجات میں عہدے قبول کر لینے سے ہمیں یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری آئندہ تحریکیں دستور کی چہار دیواری میں بند ہو جائیں گی اس امر کے بہت زیادہ امکانات ہیں کہ فیڈریشن کو جبراً ٹھونسنے پر ہم اس کی پختہ طور پر مخالفت کریں اور اس طریق پر ہم سول نافرمانی کا ایک اور بڑا حملہ شروع کر دیں۔ آزادی کی جدوجہد میں ہم دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی جنگ کو اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ ہمیں مکمل آزادی حاصل نہ ہو جائے اور اس دوران میں جو کچھ ہمیں طاقت حاصل ہو اس کو استعمال کرنے سے انکار کر دیں۔ یا پھر ہم اپنی مکمل آزادی یا پورن سوراج کے حاصل کرنے میں جو کچھ طاقتیں ہمیں ملتی رہیں ان کو لیتے جائیں اور اپنی پوزیشن کو مضبوط تر بناتے جائیں۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے دونوں طریقے یکساں طور پر قابل قبول ہیں اور ترجیح دینے کا خیال ہمیں پریشان نہ کرے۔ لیکن ہم کو ہر مقام پر نہایت احتیاط سے غور کرنا چاہئے کہ قومی ترقی کے لیے کون سا طریقہ زیادہ موزوں ہوگا۔ دونوں صورتوں میں ہماری ترقی کی آخری حدود یہ ہوں گی کہ برطانیہ سے تعلقات قطع کر لیے جائیں۔ جب یہ قطع تعلق ہو جائے گا اور برطانی اقتدار کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے گا تو اس وقت ہم یہ سوچنے کے لائق ہوں گے کہ برطانیہ عظمٰی سے ہمارے آئندہ تعلقات دوستانہ معاہدہ کی روسے، جس میں فریقین برضا ورغبت داخل ہوں، کیسے ہوں؟ ہمارے آئندہ روابط برطانیہ عظمٰی سے کیا ہوں گے یا کیا ہونے

چاہئیں؟ اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ یہ امر زیادہ تر خود برطانیہ کے لوگوں کے رویہ پر منحصر ہوگا۔ اس مسئلہ پر میں پریذیڈنٹ ڈی ولیرا کے رویہ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ آئر کے صدر کی طرح مجھے بھی یہ کہنا چاہئے کہ ہم کو برطانوی قوم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم برطانیہ عظمیٰ سے اس لیے لڑ رہے ہیں کہ اس سے اپنے آئندہ تعلقات رکھنے پر پوری آزادی سے غور کریں۔ جب ہم کو حقیقی خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تو کوئی سبب نہیں کہ ہم برطانیہ سے خوشگوار تعلقات قائم نہ رکھیں۔

ہماری قومی جدوجہد کی تاریخ میں کانگریس نے کون سا پارٹ ادا کیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق بہت سے کانگریسیوں کے خیالات صاف نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے دوست یہ خیال رکھتے ہیں کہ جب آزادی حاصل ہو جائے گی تو کانگریس پارٹی کا چونکہ مقصود پورا ہو جائے گا اس لیے وہ فنا ہو جائے گی یہ خیال سراسر غلط ہے۔ جو پارٹی ہندستان کے لیے آزادی حاصل کرے اسے حق ہوگا کہ جنگ کے بعد کا پورا تعمیری پروگرام بھی وہی چلائے۔ جنھوں نے طاقت حاصل کی ہے صحیح طور پر اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر دوسرے اشخاص کو با اختیار جگہوں پر بٹھا دیا گیا جنھوں نے اسے حاصل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی، تو ان کے اندر نہ طاقت ہوگی نہ اعتماد اور نہ وہ بلند نظری جو انقلابی تعمیر کے لیے ازبس ضروری ہے۔ یہی فرق صوبجاتی خود اختیاری کے تنگ میدان میں کانگریسی اور غیر کانگریسی وزارتوں کے کاموں میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔

نہیں۔ سیاسی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد کانگریس پارٹی کے فنا ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس پارٹی کو اختیارات حاصل کرنا ہوں گے اور نظم ونسق اور تعمیری کام کے پروگرام کو چلانے کے لیے ذمہ داری لینا ہوگی۔ اتنا کرنے ہی پر اس کے فرائض ادا ہوں گے۔ اگر اس کو مجبوراً فنا ہونا پڑا تو ایک عام گڑبڑ

بچ جائے گی۔ اگر ہم جنگ کے بعد کے یورپ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ صرف ان ملکوں میں تنظیم اور ترقی جاری رہی ہے جہاں جس پارٹی نے طاقت حاصل کی ہے اس نے ہی تعمیری کام بھی شروع کیا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ دلیل پیش کی جائے گی کہ ایسے حالات میں حکومت کے پیچھے کسی پارٹی کا قائم رہنا اس حکومت کو حکومت کلی بنا دے گا۔ لیکن میں اس الزام کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ حکومت اسی وقت حکومت کلی بن سکتی ہے جب کسی ملک میں صرف ایک پارٹی ہو مثلاً روس، جرمنی اور اٹلی میں۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ دوسری پارٹیوں کو کیوں روکا جائے۔ علاوہ ازیں پارٹی کی بنیاد ہی جمہوری ہوگی۔ مثال کے طور پر لیجئے کہ وہ نازی پارٹی کی طرح نہ ہوگی جس کا بنیادی اصول ہی ''لیڈری کے اصول'' پر ہے۔ ایک سے زیادہ پارٹیوں کا قیام اور کانگریس پارٹی کی جمہوری بنیاد یہ دونوں مل کر ہندستان کی آئندہ حکومت کو حکومت کلی بن جانے میں روک ہوں گے۔ اس کے علاوہ پارٹی کی جمہوری بنیاد اس بات کی اجازت نہ دے گی کہ باشندوں پر لیڈروں کو اوپر سے لا بٹھایا جائے۔ بلکہ ان کا انتخاب نیچے حلقوں سے ہی ہوگا۔

اگر چہ تعمیری کام کی کوئی تفصیل دینا فی الحال قبل از وقت ہوگا تاہم چند اصول کو ہم زیر بحث لا سکتے ہیں جن کے مطابق ہماری آئندہ سماجی تعمیر شروع ہوگی۔ مجھے ذرہ برابر شک نہیں کہ ہماری خاص قومی مشکلات جن کا تعلق افلاس، جہل اور بیماریوں کو کھودینے سے ہے اور سائنس کے اصول پر پیداوار اور اس کی تقسیم صرف سوشلسٹ اصول ہی پر کامیابی سے حل ہو سکتی ہیں۔ پہلی بات جسے ہماری آئندہ قومی حکومت انجام دے گی یہ ہوگی کہ ایک کمیشن مقرر کرے جو ایک مفصل تعمیری کام کا خاکہ تیار کرے۔ اس خاکہ کے دو حصے ہوں گے۔ ایک تو فوری پروگرام اور دوسرا طویل عرصہ کا پروگرام۔ پہلے حصہ میں جن فوری مقاصد پر نظر رکھنا ہوگا وہ تین ہوں گے۔ اوّل یہ

کہ ملک کو اپنی حفاظت کے لیے تیار کرنا۔ دوم ہندستان کو متحد بنانا اور سوم مقامی اور معاشرتی خود اختیاری کو جگہ دینا۔ دوم اور سوم مقاصد بظاہر متضاد معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں۔ ہم بحیثیت ایک قوم کے چاہے جو کچھ سیاسی قابلیتوں اور ادراک کے مالک کیوں نہ ہوں ہمیں ان دونوں مقاصد کو آپس میں ملانے کے لیے انھیں استعمال کرنا پڑے گا۔ ہمیں ملک کو متحد کرنا ہوگا تا کہ ہندستان کو بیرونی حملے سے بچا سکیں۔ ہم اگر چہ ملک کو ایک مضبوط مرکزی حکومت سے متحد کریں گے تاہم تمام اقلیتوں کو اور صوبوں کو معاشرتی دور حکومت کے معاملات میں بہت زیادہ خود اختیاری دے کر مطمئن کر دیں گے۔ جب بیرونی اقتدار کا بوجھ ہمارے سر سے اٹھ جائے گا تو ہمیں باشندوں کو متحد رکھنے کے لیے خاص کوششیں کرنا پڑیں گی۔ کیوں کہ بیرونی حکومت نے ہمیں کس قدر خراب اور غیر منظم بنا دیا ہے۔ قومی اتحاد کو بڑھانے کے لیے ہمیں ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ رسم الخط اختیار کرنا پڑے گا۔ علاوہ بریں سائنس کے ایسے آلات سے جیسے کہ ہوائی جہاز، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ سے ہندستان کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لائیں گے اور ایک مشترکہ تعلیمی پالیسی سے پوری آبادی کے لیے ایک مشترک رسم الخط بنائیں گے۔ جہاں تک ہماری مشترک زبان کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ ہندی اردو کا امتیاز ایک مصنوعی امتیاز ہے۔ سب سے قدرتی مشترک زبان دونوں زبانوں کی وہ آمیزش ہے جو ہماری روزانہ زندگی میں ملک کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہے اور یہ عام زبان دونوں رسم الخطوں، اردو یا ناگری میں لکھی جا سکتی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ ہندستان میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دونوں رسم الخطوں میں سے کسی ایک خط کو اختیار کرنے اور دوسرے خط کو نکال دینے میں بہت زیادہ راغب ہیں۔ بہرکیف ہماری پالیسی کسی رسم الخط کو نکال دینے کی نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں

چاہئے کہ دونوں رسم الخطوں کو استعمال کرنے کی پوری پوری اجازت دیں۔ ساتھ ہی میں خیال کرتا ہوں کہ آخری اور بہترین حل اس مسئلہ کا یہ ہوگا کہ ہم ایسا رسم الخط اختیار کریں جو ہمیں باقی دنیا سے ملا دے۔ شاید ہمارے بعض ہم وطن جب لاطینی رسم الخط کو اختیار کرنے کا خیال سنیں تو خوف سے تھرا اٹھیں۔ لیکن میں ان سے استدعا کروں گا کہ وہ اس مسئلہ پر تاریخی اور سائنٹفک پہلوؤں سے غور کریں۔ اگر ہم ان پہلوؤں سے غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ رسم الخط کے متعلق ہمیں کوئی پیشگی خوف نہ کرنا چاہئے اگر رسم الخط جس سے ہم آج واقف ہیں تدریجی ترقی کے کئی مراحل طے کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں ہندستان کے اکثر بڑے بڑے صوبے اپنا الگ رسم الخط اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اردو رسم الخط موجود ہے جس کو اردو بولنے والے اشخاص پورے ہندستان میں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ مثلاً پنجاب اور سندھ میں استعمال کرتے ہیں۔ ان مختلف حالات میں ہندستان کے لیے ایک ہی رسم الخط کا انتخاب بالکل غیر جانبدارانہ اور سائنٹفک اسپرٹ میں ہونا چاہئے جو ہر قسم کی علت سے آزاد ہو۔ مجھے اقرار ہے کہ میری زندگی میں ایک وہ وقت بھی تھا کہ جب میں بیرونی رسم الخط کو اختیار کرنا قومیت کے خلاف سمجھتا تھا۔ لیکن 34ء میں جب میں نے ٹرکی میں سیاحت کی تو مجھے اپنا اعتقاد بدلنا پڑا۔ میں نے وہاں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ دنیا کے یکساں رسم الخط کو اختیار کرنے میں کیا کیا فوائد ہیں۔ جہاں تک ہمارے عوام کا تعلق ہے اور چونکہ ان میں نوے فی صدی ان پڑھ اور کسی رسم الخط سے واقف نہیں ہیں تو ان کے لیے یہ کوئی تکلیف کا باعث نہ ہوگا کہ ہم ان کو تعلیم دیتے وقت کون سا رسم الخط استعمال کر رہے ہیں۔ لاطینی رسم الخط سے انھیں کسی یورپین زبان کو حاصل کرنے میں سہولت بھی حاصل ہو جائے گی۔ بہر نوع میں اپنے ہم وطنوں سے التجا کرتا ہوں کہ آخر میں کون سا حل بہترین ہوگا۔ وہ اس پر غور فرمائیں۔

آزاد ہندستان کے لیے جہاں تک طویل عرصہ کے پروگرام کا تعلق ہے ہماری پہلی شکل جسے ہمیں حل کرنا ہے وہ ہماری روز افزوں آبادی ہے۔ میں اس مسئلہ کی نظری بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ ہندستان میں کثیر آبادی ہے بھی یا نہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس سرزمین میں افلاس، فاقہ کشی اور بیماریاں گھر بنا چکی ہوں، وہاں ہمیں آبادی کو صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں تیس ملین نہیں بڑھانا چاہئے۔ اگر آبادی کا یہی حال رہا جیسا کہ ماضی قریب میں ہوتا رہا ہے تو ہماری ساری تجاویز خاک میں مل جائیں گی۔ لہٰذا ہمیں اپنی آبادی کو بڑھنے سے روکنا پڑے گا۔ تاوقتیکہ ہم موجودہ آبادی کے کھانے، کپڑے اور تعلیم کا بندوبست نہ کرلیں۔ اس موقع پر وہ طریقے بتلانا ضروری نہیں جن سے ہماری روز افزوں آبادی روکی جائے تاہم میں پبلک کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

تعمیری کام کے متعلق ہماری خاص مشکل یہ ہوگی کہ ہمارے ملک سے افلاس کو کیوں کر دور کیا جائے، اس سلسلہ میں بندوبست اراضی میں بڑی بڑی تبدیلیاں عمل میں لانا پڑیں گی جن میں زمینداری کا خاتمہ بھی شامل ہوگا۔ دیہی قرضہ کو مٹایا جائے گا اور دیہی آبادی کے لیے سستا سرمایہ حاصل کرنے کی شرائط رکھی جائیں گی۔ پیدا کرنے والوں اور کھانے والوں دونوں کے مفاد کی خاطر کوآپریٹو تحریک کو عام کرنا اور بڑھانا ضروری سمجھا جائے گا۔ زراعت کو بھی سائنٹفک اصول پر کیا جائے گا تاکہ زمین کی پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔

اقتصادی مشکلات کو حل کرنے کے لیے زراعت کو ترقی دینا ہی کافی نہ ہوگا۔ ایک مکمل صنعتی ترقی کی اسکیم کو جو حکومت کے کنٹرول اور حکومت کی ہی ملکیت میں ہو عمل میں لانا ازبس ضروری ہوگا۔ قدیم صنعتی نظام کے بجائے ایک جدید صنعتی نظام کھڑا کیا جائے گا۔ اس لیے قدیم نظام، ملک کے اندر بیرونی حکومت ہونے سے اور ملک کے

باہر عام لوگوں کی پیداوار کرنے سے بالکل بیٹھ گیا ہے۔ مجوزہ کمیشن کو بہت غور سے یہ سوچنا اور طے کرنا پڑے گا کہ کون سی گھریلو صنعتوں کو باوجود موجودہ فیکٹریوں کے مقابلہ کے ابھارنا چاہیے اور کس میدان میں بڑے پیمانہ پر پیداوار کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ خواہ ہم کتنا ہی موجودہ صنعت کو ناپسند کریں اور ان برائیوں کو لعنت ملامت کریں جو اس کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں پھر بھی ہم ماسبق صنعتی زمانہ میں واپس نہیں جاسکتے، خواہ ہماری خواہش اس جانب کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ پس ہمارے لیے مناسب ہے کہ ہم صنعت گری کے خوگر ہو جائیں اور ایسے ذرائع اختیار کریں جن سے اس کی برائیاں کم ہو جائیں اور ساتھ ہی ساتھ گھریلو صنعتوں کو قائم رکھنے اور ان کو فیکٹریوں کے لازمی مقابلہ سے بچانے کے لیے ذرائع تلاش کریں۔ ہندستان جیسے ملک میں گھریلو صنعتوں دستی بنائی اور کتائی کے لیے بہت زیادہ مواقع حاصل ہیں اور بالخصوص ان صنعتوں میں جو زراعت سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ آخر میں ایک ضروری بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ مجوزہ کمیشن کے مشورے پر حکومت کو ایک ایسی وسیع اسکیم قبول کرنا پڑے گی جس کی رو سے زراعت اور صنعت کا پورا نظام پیداوار تخصیص کے دونوں میدانوں میں سماجی اصول میں ڈھل جائے اس کے لیے زیادہ سرمایہ بہم پہنچانا پڑے گا خواہ سرمایہ کو اندرونی یا بیرونی قرضہ سے حاصل کیا جائے خواہ کرنسی میں اضافہ کرنے سے۔

دستور کے صوبجاتی حصہ کی مخالفت یا مدافعت کرنا اب قطعی غیر ممکن ہے۔ کانگریس پارٹی نے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں عہدے قبول کر لیے ہیں اب جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ کانگریس کو مضبوط اور منظم کیا جائے۔ میں ان اشخاص میں کا ایک فرد ہوں جو عہدے قبول کرنے کے مخالف تھا، اس لیے نہیں کہ عہدے قبول کرنے میں کسی غلطی کا ارتکاب تھا اور نہ اس لیے کہ اس پالیسی کو اختیار

کرنے سے کچھ اچھائی رونما نہ ہوگی بلکہ اس لیے کہ یہ اندیشہ کیا گیا تھا کہ عہدے قبول کرنے کے برے اثرات اس کی اچھائیوں سے بڑھ جائیں گے۔ آج میں یہی توقع کرسکتا ہوں کہ میرے پہلے اندیشے بے بنیاد تھے۔

ہم کانگریس کو اپنے وزیروں کو عہدوں پر مامور ہوتے ہوتے کیوں کر مضبوط اور منظم کرسکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نوکر شاہی کی بناوٹ اور رنگ کو ہی بدل دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو کانگریس پارٹی کو صدمہ اٹھانا پڑے گا۔ ہر ملک میں وزیر آتے جاتے رہتے ہیں لیکن مستقل ملازمتوں کا فولادی سانچہ برابر قائم رہتا ہے۔ اگر اس سانچے کی بناوٹ اور رنگ کو تبدیل نہ کیا گیا تو برسر اقتدار پارٹی اور اس کی وزارت اپنے اصول کو عملی جامہ پہنانے میں بے کار ثابت ہوں گی۔ جنگ کے بعد والی جرمنی میں سوشیل ڈیموکریٹ پارٹی کے ساتھ ٹھیک یہی ہوا اور غالباً برطانیہ کی لیبر پارٹی 24 تا29ء کے ساتھ بھی یہی بات پیش آئی۔ مستقل آسامیاں ہی ہر ملک میں درحقیقت حکمران ہوتی ہیں۔ ہندستان میں یہ مستقل ملازمتیں برطانیہ نے داخل کی ہیں اور اونچے عہدوں پر تو بناوٹ میں وہ بالکل برطانوی ہیں۔ ان کا نظریہ اور دماغی حالت بہت سے حالات میں نہ تو ہندستانی ہوتا ہے اور نہ قومی۔ ایک قومی پالیسی اس وقت تک عمل میں نہیں لائی جاسکتی جب تک کہ ملازم مستقل اپنے نظریوں اور دماغوں کو قومی نہ بنالیں۔ بہرحال دقت یہ ہوگی کہ مستقل ملازمتوں کے اونچے عہدے دستور کے مطابق وزیر ہند کی نگرانی میں رکھے گئے ہیں اور وہ صوبجاتی حکومتوں کے زیر نگرانی نہیں ہیں پس ان کی بناوٹ میں تبدیلی کرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔

دوسرے یہ کہ مختلف صوبوں میں کانگریسی وزارتیں جب تک عہدوں پر مامور ہیں، انھیں چاہئے کہ تعمیری اسکیم میں تعلیم ،تندرستی ، منشیات کی ممانعت، جیل کی اصلاحات، آب پاشی ،صنعت، اراضی کی اصلاحات اور مزدوروں کی رفاہ کو شامل

کریں۔ اس معاملہ میں کوشش اس بات کی ہونا چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے پورے ہندستان کے لیے یکساں پالیسی اختیار کی جائے۔ یہ یکسانیت دو طریقوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مختلف صوبوں کے کانگریسی وزیر ایک جگہ جمع ہوں جیسا کہ لیبر وزیر کلکتہ میں 37ء میں جمع ہوئے تھے۔ تاکہ یکساں پروگرام کو اختیار کریں۔ اس کے علاوہ کانگریس کی مجلس عاملہ، جو کانگریس کی اعلیٰ ترین عاملہ جماعت ہے، اپنے ماہرین کے تجربوں کی روشنی میں کانگریسی صوبوں کے محکموں کو امداد پہنچائے۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ کانگریس مجلس عاملہ کے ممبران تمام مسائل سے واقف ہوں جو کانگریسی صوبوں میں حکومت کے پیش نظر آتے رہتے ہوں اس سے یہ مقصد نہیں کہ وہ نظام کی تفصیلات میں پڑیں۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ مختلف مسائل پر انھیں ایک عام فہمید حاصل ہو۔ تاکہ وہ پالیسی کا عام خاکہ بنا سکیں۔ اس سلسلہ میں کانگریس مجلس عاملہ کو اس سے زیادہ کرنا چاہئے جتنا وہ اب تک کرتی آئی ہے اور اگر مجلس عاملہ ایسا نہ کرے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کانگریسی وزارتوں پر کیوں کر با اثر اقتدار رکھ سکتی ہے۔

اس موقعہ پر میں کانگریس مجلس عاملہ کے کاموں پر کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ یہ کمیٹی میرے تصور میں آزادی کی جنگ جو قومی فوج کا رہبر دماغ ہی نہیں ہے بلکہ یہ آزاد ہندستان کی عکس کا پتہ بھی ہے۔ پس اسی کے موافق کام بھی کرنا چاہئے۔ یہ میری کوئی جدت طرازی نہیں ہے۔ یہ ایسی ہی ان جماعتوں کا فرض رہا ہے جو دوسرے ملکوں میں قومی آزادی کے لیے لڑتی رہی ہیں۔ میں ان اشخاص میں سے ایک فرد ہوں جو آزاد ہندستان کا تصور کرتے ہیں۔ جو ہماری زندگی کے مختصر پیمانہ ہی میں اس ملک میں قومی حکومت کی جھلک دیکھتے ہیں۔ پس فطری طور پر یہ موزوں ہے کہ مجلس عاملہ خود کو آزاد ہندستان کے عکس کا پتہ ہونے کا احساس کرے اور ایسے ہی کام بھی انجام دے۔ ٹھیک یہی پریذیڈنٹ ڈی ولیرا کی حکومت جمہوریہ نے اس وقت کیا جب وہ حکومت برطانیہ

سے لڑ رہی تھی اور بہت عجلت میں تھی۔ مصر میں وفد پارٹی کی مجلس عاملہ نے بھی عہدوں پر مامور ہونے سے پہلے یہی کیا۔ مجلس عاملہ کے ممبر اپنے روزانہ فرائض انجام دینے کے علاوہ ان مسائل کو مطالعہ کرتے رہیں جنھیں سیاسی قوت حاصل ہونے کے بعد حل کرنا پڑے۔

کانگریسی حکومتوں کو موزوں طور پر چلانے سے کہیں اہم فوری مسئلہ یہ ہے کہ دستور کے فیڈرل حصہ کی مخالفت کیوں کر کی جائے؟ مجوزہ فیڈرل اسکیم کے متعلق کانگریس نے اپنے رویہ کو صاف صاف الفاظ میں مجلس عاملہ کے 4رفروری 1938 والے وار دھا ریزولیشن میں بیان کر دیا ہے اور جس کو سبجکٹ کمیٹی کے غور کر لینے کے بعد کانگریس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس ریزولیشن میں کہا گیا ہے:

''کانگریس نے نئے دستور کو نامنظور کر دیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ ایسا آئین جو لوگوں کے لیے قابل قبول ہو اس کو آزادی پر منحصر ہونا چاہئے اور جس کو حلقہ وار اسمبلی Constituent کے ذریعہ خود ہی لوگ تیار کریں اور جس میں بیرونی اقتدار کی کوئی مداخلت نہ ہو۔ اس نامنظوری کی پالیسی پر قائم رہتے ہوئے بہرکیف کانگریس نے صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے تاکہ آزادی کی جدوجہد میں قوم کو مضبوط بنایا جاسکے۔ مجوزہ فیڈریشن کے متعلق کس عرصہ کے لیے یا کس شرط کے ساتھ؟ ایسا کوئی خیال نہیں کیا جاسکتا۔ فیڈریشن کے نفاذ سے ہندستان کو سخت نقصان پہنچے گا اور ان بندھنوں کو اور مضبوط بنا دے گا جن سے ہندستان شہنشاہی اقتدار میں جکڑا ہوا ہے۔ فیڈریشن کی اس اسکیم میں حکومت کے ضروری فرائض کی

ذمہ داری کو نکال دیا گیا ہے۔

کانگریس فیڈریشن کے نظریہ کے خلاف نہیں ہے لیکن حقیقی فیڈریشن کو اپنی ذمہ داریوں کے علاوہ ایسے آزاد حصوں پر مشتمل ہونا چاہیے جن میں کم وبیش جمہوری انتخابات کے طریق پر یکساں آزادی سول لبرٹی اور نمائندگی حاصل ہو۔ ایک نمائندہ ادارہ کے قیام میں، ذمہ دار حکومت میں، سول لبرٹی میں اور فیڈرل ایوان کے لیے انتخاب میں ہندستانی ریاستوں کو فیڈریشن میں صوبوں کے برابر ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجوزہ فیڈریشن کی طرح بجائے ہندستان کو متحد کرنے کے علیحدگی کے رجحانات بڑھ جائیں گے اور حکومت کو اندرونی اور بیرونی خلفشار میں مبتلا کردیں گے۔

لہٰذا کانگریس مجوزہ اسکیم کی مذمت کرتی ہے اور صوبجاتی اور مقامی کانگریس کمیٹیوں پر اور باشندوں پر بالعموم ساتھ ہی صوبجاتی حکومتوں اور وزارتوں پر یہ امر عائد کرتی ہے کہ فیڈریشن کے نفاذ کو روکیں۔

اگر اس امر کی کوشش کی گئی کہ باشندوں کی مرضی کے خلاف اس کو ہمارے سر تھوپ دیا جائے تو ایسی کوشش کا ہر ممکن مقابلہ کیا جائے گا۔ صوبجاتی حکومتوں اور وزارتوں کو اس بارے میں اتحادِ عمل کرنے سے انکار کردینا ہوگا۔

اگر ایسی حالت پیش آئی تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی مجاز ہوگی کہ ایسی صورت میں جس لائحہ عمل کو مناسب سمجھے اس کی رہبری کرے۔"

اس رویہ کی تشریح میں میں چند اور دلائل پیش کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں ہم مجوزہ فیڈریشن کی سخت مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ فیڈرل اسکیم کا سب سے قابل اعتراض پہلو نئے آئین میں تجارتی اور مالی تحفظات ہیں۔ باشندے نہ صرف مدافعت اور بیرونی پالیسی پر قابض ہونے سے محروم رہیں گے بلکہ سرکاری خرچ کا بہت بڑا حصہ بھی ان کے اختیار سے باہر ہوگا۔ مرکزی حکومت کے 37و38ء کے بجٹ کے مطابق فوج کے مصارف ہی صرف 77.90 کروڑ کے کل اخراجات میں سے 44.61 کروڑ روپیہ ہوتے ہیں یعنی مرکزی حکومت کے کل اخراجات کا تقریباً 57 فی صدی۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فیڈرل حکومت کے محکمات مخصوصہ جن پر گورنر جنرل کا اقتدار ہوگا۔ ان پر فیڈرل مصارف کا اس فی صدی صرفہ آئے گا۔ علاوہ ازیں ریزرو بنک اور فیڈرل ریلوے کی طرح علیٰحدہ حکومتیں قائم کردی گئی ہیں اور قائم کردی جائیں گی جو شہنشاہیت میں شہنشاہیت کے اصول پر فیڈرل مجلس قانون ساز کی طاقت سے باہر کام کریں گی۔ مجلس قانون ساز کو جو طاقتیں اب حاصل ہیں کہ ریلوے پالیسی کی رہبری کرے اور اسے اپنے زیر اثر رکھے۔ کرنسی اور تبادلہ کی پالیسی میں جو اسے مداخلت حاصل ہے اور جو ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے از بس ضروری ہے اس کو ان تمام طاقتوں سے محروم کردیا جائے گا۔

یہ امر بھی کہ بیرونی معاملات فیڈرل حکومت میں محکمات خاص میں رکھے گئے ہیں۔ تجارتی معاہدوں کے کرنے میں ہندستانی مجلس قانون ساز کی آزادی پر بے جا اثر ڈالے گا۔ نتیجہ میں مالی خوداختیاری میں سخت بندشیں پیدا کرے گا۔ فیڈرل حکومت کسی دستوری فرائض کے تحت اس بات پر مجبور نہ ہوگی کہ منظوری کے لیے تجارتی معاہدوں کو ہندستانی مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری سے انکار کردے۔ یہ بناوٹی مالی خوداختیاری کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ تاوقتیکہ یہ طے نہ کرلیا

جائے کہ کسی تجارتی معاہدہ پر ہندستان کی طرف سے دستخط ثبت نہ ہوں گے جب تک اس پر ہندستانی مجلس قانون ساز کی منظوری نہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میری ٹھیک یہ رائے ہے کہ ہندستان دوسرے تجارتی معاہدوں میں داخل ہو۔ خصوصاً ایسے ملکوں سے جیسے کہ جرمنی، زیکوسلاویا، اٹلی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ جن سے گزشتہ زمانہ میں اس کے قریبی تجارتی تعلقات تھے۔ لیکن نئے دستور کے مطابق فیڈرل مجلس قانون ساز کے اختیار میں یہ نہ ہوگا کہ وہ ایسے دوہرے تجارتی معاہدوں میں داخل ہونے پر مجبور کرے۔

غیر منصفانہ اور غیر مساویانہ تجارتی تحفظات جن کو ایکٹ میں داخل کر دیا گیا ہے ان کے ہوتے ہوئے کسی صورت سے بھی ہندستانی قومی صنعتوں کی نہ تو حفاظت ہوسکتی ہے نہ ان کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ بالخصوص ایسے مواقع پر جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے، وہ برطانوی تجارتی اور صنعتی مفاد سے ٹکرا نہ جائیں۔ گورنر جنرل کی خاص ذمہ داریوں کے علاوہ کہ امتیاز کی شرائط جن کو قانون میں درج کر دیا گیا ہے ان کے استعمال ہونے پر نگہداشت رکھے۔ یہ بات بھی اس کے فرائض میں داخل کر دی گئی ہے کہ برطانوی مال جو ہندستان میں درآمد ہو اس پر کسی قسم کا تفریقی یا تعزیری اقدام ہونے سے روکے۔ ان وسیع اور سخت شرائط کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہندستان برطانی مقابلہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتا جسے گورنر جنرل قانونی حلقہ میں یا نظم ونسق میں ممنوع یا زائل قرار نہ دے سکتا ہو۔ حقیقت میں یہ بالکل بے جا ہے کہ غیر ملکیوں کو وطن پروروں سے مقابلہ کے لیے اس ملک میں برابر کے حقوق دیئے جائیں، اور اصلی معنوں میں سوراج نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ہندستان کو اپنی قومی اقتصادی پالیسی بنانے اور اختیار کرنے میں جن میں یہ حق بھی شامل ہو کہ اپنے مفاد کی خاطر قوم پروروں اور غیر قوم پروروں میں امتیاز کرے اسے انکار کر دیا جائے۔ ''ینگ انڈیا''

کے مشہور مضمون ''زبردست اور کوتاہ'' میں جو 31ء میں گاندھی ارون معاہدہ کے فوراً اختتام پر لکھا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔'' ہندستانی اور انگریزی یا یورپین مفاد میں تفریق کو زیر بحث لانا ہی ہندستانی غلامی کو ہمیشہ برقرار رکھنا ہے۔ ایک زبردست اور کوتاہ میں مساویانہ حقوق ہی کیا معنی رکھتے ہیں؟''موجودہ وقت میں مرکزی مجلس قانون ساز کو جو تھوڑے بہت اختیارات حاصل ہیں کہ ہندستانی ساحلی تجارت کو ہندستانی جہازوں کے مالکوں اور ہندستانی نظام کے لیے مخصوص کردیا جائے۔ اس تھوڑے سے اختیار کو بھی نام نہاد اصلاحی دستور کے تحت چھین لیا گیا۔ جہاز رانی ایک ایسی ضروری صنعت ہے جو مدافعت اور اقتصادی مقاصد دونوں کے لیے یکساں لازمی ہے لیکن اس خاص صنعت کو ترقی دینے کے تمام منظور شدہ اور جائز طریقے جن کو کئی برطانوی نوآبادیات نے اختیار کرلیا ہے، ہندستان کے حق میں بے کار اور معطل کردیے گئے ہیں۔ ہماری آزادی پر ان قیود کو'' باہمی تعلقات'' اور ''باہمی حصہ داری'' کے اسباب پر جائز قرار دینا حقیقت میں ضرب پر ضرب لگانا ہے۔ ہندستان کی آئندہ پارلیمنٹ کا یہ حق کہ وہ قوم پروروں اور غیر قوم پروروں میں تفریق یا امتیاز کرے، جب کبھی ہندستان کو اس امتیاز کی ضرورت پیش آئے برابر قائم رہے اور اس حق کو ہم کسی بنا پر بھی قربان نہیں کرسکتے۔ میں اس سلسلہ میں آئرستان کی نظیر دوں گا۔ آئرستان کی قومیت اور شہریت کا قانون 35ء انتخابات کے معاملات میں آئرستان کی شہریت کے لیے خاص امتیازی شرائط رکھتا ہے کہ کیوں کر کوئی فرد پبلک زندگی میں داخل ہو؟ تجارتی جہاز رانی کیسے کرے؟ ہوائی جہاز رانی کیسے کرسکے؟ اس کے ساتھ ہی وہ خاص رعایتیں بھی اس قانون میں قلم بند ہیں جن کو آئرش قوم پروروں کے لیے تخصیص کرنا موزوں سمجھا گیا۔ مثلاً قانوناً آئرستان کی صنعت کو امداد دیا جانا۔ بالفاظ دیگر آئرستان کی شہریت برطانوی شہریت سے امتیاز رکھتی ہے۔ برطانوی شہری

حکومت آئر میں برطانوی شہری ہونے کی بنا پر مساویانہ حق طلبی کا دعویٰ نہیں کر سکتے جسے آئرستان میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندستان بھی ایسی ہی خاص قومیت پیدا کرے اور اپنی شہریت کو خود بنائے۔

مالی خود اختیاری اور تجارتی تحفظات کے مسئلہ پر میں مختصراً ہندستان کی بیرونی تجارتی پالیسی کی ضرورت پر کچھ کہوں گا۔ ہندستان کی بیرونی تجارت کو بے پروائی اور بے اعتنائی سے نہ دیکھنا چاہئے۔ جیسا کہ برطانوی صنعت کو فوری یا عارضی نفع پہنچانے کے لیے اکثر کیا جاتا ہے۔ اس کو پوری تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہئے تاکہ ہندستان کی اقتصادی ترقی کو بیرونی تجارت سے ایک طرف گہرا تعلق ہو اور دوسری طرف بیرونی فرائض کی ادائیگی سے۔ ہندستان کی بیرونی تجارت کی فطرت ہی اس قسم کی ہے کہ انگلستان سے پابندی کا عہد نامہ اس سے نہیں ہوسکتا اور خصوصاً ایسا عہد نامہ جو برطانوی سلطنت کے غیر ممالک سے اس کی تجارت کو خطرے میں ڈال دے جب کہ یہ ممالک کئی لحاظ سے اس کے لیے بہترین گاہک ہوں۔ یا ایسے عہد نامہ کو بھی ہندستان قبول نہیں کرے گا جس سے اس کے تجارتی تعلقات دوسرے ملکوں سے کمزور پڑ جائیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہندی برطانوی تجارتی عہد نامہ کی طویل گفت وشنید اب بھی جاری ہے اور طرۂ یہ کہ عہد نامہ اٹاوہ نوٹس کا وقفہ گزر جانے پر بھی اور لیجسلیٹو اسمبلی کے اس کو ختم کر دینے کے فیصلہ کے باوجود اب بھی جاری ہے۔ ساتھ ہی برطانوی آہنی اور سوتی اشیاء پر امتیازی ٹیکس ہونے کے متذکرہ بالا اٹاوہ عہد نامہ برطانوی صنعت کے لیے منفعت بخش فوائد حاصل کیے ہوئے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ سیاسی حالات میں کوئی عہد نامہ ہندستان اور انگلستان کے درمیان ہوگا وہ یقیناً غیر مساویانہ طرز کا ہوگا۔ کیوں کہ ہمارے سیاسی تعلقات کی وجہ سے انگلستان کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ کا یہ امتیازی نظام اصل میں سیاسی ہے۔ اور

قبل اس کے کہ ہم غیر ہندستانی نفع پرستوں کو تجارتی معاہدہ کے سایہ میں اس ملک میں قائم یا پھلنے پھولنے دیں، ہمیں اس کے سیاسی اور اقتصادی نتائج پر نظر ڈال لینا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ ہندی برطانی تجارتی گفت وشنید سے دوسرے ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کو نہ روکا جائے گا اور یہ کہ کسی ایسے عہد نامہ پر حکومت ہند دستخط نہ کرے گی تاوقتیکہ اس کو ہندستانی مجلس قانون ساز نے منظور نہ کرلیا ہو۔

متذکرہ بالا بیان سے یہ بالکل صاف ہے کہ صوبجاتی وزارتوں اور مجوزہ فیڈرل وزارت کے اختیارات میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ علاوہ بریں فیڈرل مجلس قانون ساز کی بناوٹ ہی کسی حدتک رجعت پسندانہ ہے۔ ہندستانی ریاستوں کی آبادی برطانوی ہند کی کل آبادی کی تقریباً 24 فی صدی ہے۔ پھر بھی ریاستوں کے حکمرانوں کو (ان کی رعایا کو نہیں) ایوان عام میں 33 فی صدی نشستیں دی گئی ہیں اور 40 فی صدی فیڈرل مجلس قانون ساز کے ایوان خاص میں۔ ان حالات کے پیش نظر میری رائے میں کانگریس فیڈرل اسکیم کے متعلق کسی وقت بھی اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کرسکتی۔ ہماری اس کامیابی پر کہ ہم برطانوی حکومت کی فیڈرل اسکیم کو نہ ہونے پر سختی سے مدافعت کریں ہمارے فوری سیاسی مستقبل کا انحصار ہوگا۔ ہم کو ہر جائز اور صلح کن طریقوں سے فیڈریشن کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ نہ صرف آئینی طریقوں ہی سے بلکہ آخر میں ہمیں عام سول نافرمانی بھی کرنا پڑے جو ہمارے ہاتھوں میں آخری حربہ ہے۔ اگر مستقبل میں اس قسم کا کوئی بڑا حملہ جاری کردیا گیا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تحریک صرف برطانوی ہند ہی میں جاری نہیں رہے گی بلکہ ریاستی باشندوں میں بھی پھیل جائے گی۔

مستقبل قریب میں مؤثر جنگ کے لیے ضروری ہے ہم اپنے گھر کو درست کرلیں۔ گزشتہ چند سالوں میں عوام کے اندر اس قدر تیزی سے بیداری ہوئی ہے

کہ ہماری پارٹی کے نظام کے متعلق کئی نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جلسوں میں پچاس ہزار مردوں اور عورتوں کی شرکت آئے دن کی بات ہو گئی ہے۔ بعض مرتبہ یہ معلوم ہوا ہے کہ اتنے بڑے جلسوں اور مظاہروں کی تنظیم کے لیے ہماری مشنری ناکافی ہے۔ ان مظاہروں کی تنظیم کے علاوہ ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عوام کی اس قوت اور جوش کی کیوں کر صحیح اصولوں پر رہبری کی جائے لیکن اس مقصد کے لیے کیا ہمارے پاس تربیت یافتہ رضا کاروں کی کوئی جماعت موجود ہے؟ کیا ہمارے پاس آفیسروں کی کوئی جماعت قومی کام کے لیے موجود ہے؟ کیا ہم اپنے نوخیز لیڈروں کو کوئی تربیت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے نوجوان کام کرنے والوں کی رہبری کریں؟ ان سوالات کے جواب میں یہاں کسی تشریح کی ضرورت نہیں کیوں کہ جواب سب کو خوب معلوم ہے۔ ہم نے ایک موجودہ سیاسی پارٹی کے ان تمام حوائج کو مہیا نہیں کیا ہے لیکن اب بھی موقع ہے کہ ہم ان حوائج کو مہیا کریں۔ رضا کاروں کی ایک ڈسپلن یافتہ جماعت جس میں تربیت یافتہ آفیسر موجود ہوں نہایت لازمی ہے۔ علاوہ بریں ہمارے سیاسی کام کرنے والوں کی تعلیم اور تربیت کا انتظام ہونا چاہیے تا کہ ہم مستقبل میں زیادہ اچھے لیڈر پیدا کر سکیں۔ برطانیہ میں اس قسم کی تعلیم و تربیت سیاسی پارٹیاں موسم گرما کے اسکولوں اور دوسرے اداروں کے ذریعہ پہنچاتی رہتی ہیں اور کلی حکومتوں میں تو یہ خصوصیت مابہ الامتیاز بن گئی ہے۔ ان تمام کام کرنے والوں کی عزت کرتے ہوئے جنھوں نے ہماری جدوجہد میں شاندار حصہ لیا ہے، مجھے اقرار ہے کہ ہماری پارٹی میں بہتر قابلیتوں کے لیے ابھی جگہ خالی ہے۔ اس نقص کو کچھ تو یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ قابل نوجوانوں کو کانگریس میں بھرتی کیا جائے اور کچھ اس طرح کہ ہمارے موجودہ آدمیوں کو تعلیم اور تربیت دی جائے۔ ہر شخص نے دیکھا ہوگا کہ کیوں کر چند یورپین ممالک اس مشکل کو حل کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہماری تربیت کے طریقے اور نظریے ان

کے طریقوں اور نظریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ تاہم اس بات کو سب تسلیم کریں گے کہ ہمارے کام کرنے والوں کے لیے ایک مکمل سائنٹفک تربیت کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ نازیوں کے لیبر سروس کورس کے مانند ایک ایسا ادارہ ہندستان کے لیے مفید ثابت ہوگا جس میں مناسب ترمیم اور تبدیلی کر دی گئی ہو۔

ہمارے ملک میں ڈسپلن کو جاری کرنے کے سلسلہ میں ہم کو ایک ایسے مسئلہ پر غور کرنا ہے جو ہمارے آدمیوں میں بہتوں کو پریشان اور مضطرب کیے ہوئے ہے۔ میرا اشارہ ان اداروں کی طرف ہے جیسے کہ ٹریڈ یونین کانگریس اور کسان سبھائیں اور انڈین نیشنل کانگریس سے ان کے تعلقات۔ اس مسئلہ پر لوگ دو خیالات میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو کانگریس سے باہر اداروں کو ملامت کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ان کی حمایت کرتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہم ان اداروں کی طرف سے بے پروائی کر کے یا ملامت کر کے ختم نہیں کر سکتے۔ وہ واقعات کی روشنی میں موجود ہیں اور چونکہ ان کا قیام ہو چکا ہے اور مٹنے کے ان میں کوئی آثار نمایاں نہیں ہیں تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پس پشت کوئی تاریخی ضرورت کارفرما ہے۔ علاوہ بریں اس قسم کے ادارے دوسرے ملکوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ خواہ ہم اس کو پسند کریں یا نہ کریں ہم کو ان کے وجود پر متفق ہونا پڑے گا۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کانگریس کے لیے چیلینج نہ ہونا چاہئے کیوں کہ کانگریس ہی عوام کے لیے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ پس ان کو کانگریس کے طریقوں اور نظریوں سے ہمت افزائی حاصل کرنا چاہئے اور کانگریس کے دوش بدوش کام کرنا چاہئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کانگریس کے کام کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ ٹریڈ یونین اور کسانوں کے اداروں میں بڑی تعداد میں شرکت کریں۔ میں ٹریڈ یونین کے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ ہر کوئی شخص بغیر کسی تضاد یا خلفشار کے

دونوں اداروں میں شرکت کرسکتا ہے۔کانگریس اور دوسرے دونوں اداروں میں اتحادیوں بھی بڑھ سکتا ہے کہ اگر مؤخر الذکر مزدوروں اور کسانوں کی صرف اقتصادی تکالیف کو اپنا میدان عمل رکھیں اور کانگریس کو اپنا مشترک پلیٹ فارم تصور کریں جہاں آکر ہر شخص سیاسی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اس طریق پر ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ کسانوں اور مزدوروں کے اداروں کو مجموعی طور پر کانگریس سے ملحق کرلیا جائے۔ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ وہ دن آنے والا ہے جب تمام ترقی پسند اور مخالف شہنشاہیت ادارے کانگریس کے زیراثر اور زیر اقتدار ہمیں ان کو الحاق بخشنا ہوگا۔بہرکیف اختلاف آراء اس مسئلہ پر ضرور ہوگا کہ کہاں تک اور کس صورت میں یہ الحاق دیا جائے اور الحاق دیئے جانے کی رضامندی سے قبل ایسے اداروں کے طرز اور قیام پر غور کرلیا جائے گا۔روس میں سوویٹ کے مزدوروں ،کسانوں اور سپاہیوں کے متحدہ محاذ نے اکتوبر والے انقلاب میں بہت زبردست پارٹ لیا۔لیکن اس کے برعکس برطانیہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی ٹریڈ یونین کانگریس لیبر پارٹی کی قومی مجلس عاملہ میں اعتدال پیدا کرتی ہے۔ہندستان میں ہم بغور اس بات کا مطالعہ کریں گے کہ ٹریڈ یونین کانگریس اور کسان سبھاؤں جیسے اداروں کو اگر الحاق دے دیا گیا تو وہ انڈین نیشنل کانگریس پر کیا اثر مرتب کریں گے۔ اور ہمیں اس امر کو بھی فرد گذاشت نہ کرنا چاہئے کہ یہ امکانات ہیں کہ اول الذکر کو فوری اقتصادی الجھنیں نہ ہوں تو ان کی یہ تیز نظری بھی جاتی رہے۔بہرنوع مجموعی الحاق کے سوال سے بالکل علیحدہ کانگریس اور دوسرے مخالف شہنشاہیت اداروں میں بالکل قریبی تعلقات قائم رہیں گے اور اس مقصد کو سہولت یوں بھی ہو جائے گی کہ مؤخر الذکر، اول الذکر کے اصول اور طریقوں کو قبول کریں گے۔پارٹی بنانے کے مسئلہ پر بہت زیادہ اختلاف رہا ہے۔جیسے کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو کانگریس کے اندر ہی

بنایا گیا ہے۔ میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کوئی طرف داری نہیں کررہا ہوں اور میں اس کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ تاہم مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ شروع ہی سے میں اس کے عام اصول اور پالیسی سے متفق رہا ہوں۔ پہلے تو بائیں عنصر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک پارٹی میں منتقل ہو جائے۔ دوسرے بائیں بلاک کو اس وقت تک قائم رہنے کا حق ہے جب تک وہ سوشلسٹ ہو۔ ایسے دوست بھی ہیں جو اس بلاک کو پارٹی کہنے پر اعتراض کرتے ہیں لیکن میرے خیال سے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس بلاک کو کیا کہا جائے۔ گروہ، لیگ یا پارٹی؟ انڈین نیشنل کانگریس کے آئین کی حدود کے اندر بائیں بلاک کے لیے یہ قطعی ممکن ہے کہ وہ سوشلسٹ پروگرام رکھے تو ایسی صورت میں اچھی طرح اس کو گروہ، لیگ یا پارٹی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا فرض یا ایسی ہی کسی دوسری پارٹی کا فرض بائیں بازو کے گروہ جیسا ہونا چاہئے۔ سوشلزم ہمارے لیے کوئی فوری مسئلہ نہیں ہے۔ تاہم سوشلسٹ پروپیگنڈہ اس لیے ضروری ہے کہ جب سیاسی آزادی حاصل ہو جائے تو ملک کو سوشلزم کے لیے تیار کرے۔ اس قسم کا پروپیگنڈہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی ہی کر سکتی ہے جو سوشلزم پر اعتقاد رکھتی ہے اور اسی مقصد کے لیے قائم ہے۔

ایک اور مسئلہ بھی ہے جس میں چند سال سے ذاتی طور پر گہری دلچسپی لے رہا ہوں اور اس کے بارے میں میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہندستان کی بیرونی پالیسی اور بین الاقوامی روابط قائم کرنے کا مسئلہ۔ میں اس کو اس قدر اہمیت اس لیے دے رہا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ آئندہ سالوں میں بین الاقوامی روابط ہماری ہندستانی جدوجہد کے لیے مفید ہوں گے۔ لیکن ہر موقع پر ہم کو دنیا کے حالات کا صحیح اندازہ ہونا چاہئے اور معلوم ہونا چاہئے کہ ان سے کیوں کر فائدہ اٹھایا جائے۔ مصر کا سبق ہمارے لیے ایک مثال ہے۔ مصر نے برطانیہ سے عہد نامہ اتحاد بغیر ایک فائر

کیسے جیتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ مصر خوب جانتا تھا کہ بحر متوسط میں انگریزی اطالوی تصادم سے کیوں کر فائدہ حاصل کیا جائے۔

ہماری بیرونی پالیسی کے متعلق میری پہلی تجویز یہ ہے کہ ہم کسی ملک کی اندرونی سیاست سے متاثر نہ ہوں اور نہ اس بات سے کہ ملک کا طرز حکومت کیا ہے۔ ہم ہر ملک میں ایسے مرد اور عورتیں پائیں گے جو ہندستان کی آزادی کی تحریک سے ہمدردی رکھتے ہوں گے۔ خواہ ان کے سیاسی عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس معاملہ میں ہمیں سوویٹ ڈپلومیسی کا ایک ورق لینا چاہئے۔ اگرچہ سوویٹ روس، کمیونسٹ ریاست ہے تاہم اس کے ڈپلومیٹ نے غیر سوشلسٹ ریاستوں سے اتحاد کرنے میں پس وپیش نہیں کیا اور کسی گوشہ سے بھی ہمدردی یا اعانت کو لینے سے انکار نہیں کیا۔ ہمیں چاہئے کہ ہر ملک میں ایسے مرکزی مرد اور عورتیں دوست بنائیں جن کو ہندستان سے ہمدردی ہو۔ اس قسم کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بیرونی پریس میں پروپیگنڈہ کرنا، ہندستانی فلموں کو بھیجنا اور آرٹ نمائش قائم کرانا ہمارے مقصد کے لیے مفید ہوگا۔ مثال کے طور پر چینیوں کو لو کہ انھوں نے خود کو یورپ میں بے حد مقبول بنا رکھا ہے اور اس کا سبب آرٹ نمایشوں کا دکھلانا ہے۔ سب سے زیادہ ذاتی تعلقات ضروری ہیں۔ بغیر ان ذاتی تعلقات کے ہندستان کو غیر ممالک میں مقبول عام بنانا بہت دقت طلب ہوگا۔ اگر ہم ان ضروریات اور حوائج پر غور رکھیں تو ہندستانی طالب علم غیر ممالک میں بہت کچھ اس کام میں سہولت پیدا کر سکتے ہیں۔ بیرونی ممالک میں ہندستانی طلباء اور کانگریس کے گہرے تعلقات آپس میں ہونا چاہئے۔ اگر ہم ہندستان میں تیار کردہ معاشرتی اور تعلیمی فلموں کو باہر بھیج سکیں تو مجھے یقین ہے کہ ہندستان کی معاشرت سے باہر کے لوگ واقف ہو جائیں گے اور اس کو پسند بھی کریں گے۔ اس قسم کی فلمیں ہندستانی طلبا اور ہندستانی باشندوں کے لیے غیر ممالک

میں بے حد مفید ثابت ہوں گی جو کہ موجودہ وقت میں ہمارے غیر سرکاری سفیر ہیں۔ میں لفظ ''پروپیگنڈہ'' کو پسند نہیں کرتا کیوں کہ اس میں کسی قدر جھوٹ کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ لیکن میں اس بات پر مصر ہوں کہ ہم ہندستان اور اس کی معاشرت کو پوری دنیا میں ظاہر کردیں۔ میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ اس قسم کی کوششوں کو امریکہ اور یورپ کے ہر ملک میں خوش آمدید کہا جائے گا۔ اگر ہم اس کام کو جاری رکھیں تو ہم اپنے آئندہ سفارتوں اور ایلچی خانوں کے لیے غیر ممالک میں بنیادیں قائم کررہے ہوں گے۔ ہمیں جزائر برطانیہ کی طرف سے غفلت نہ کرنا چاہیے۔ ہم اس ملک میں بھی مرد اور عورتوں کا با اثر چھوٹا سا حلقہ اپنا ہمدرد رکھتے ہیں جو ہندستانی خواہشوں سے حقیقی دلچسپی اور معاونت رکھتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی نسلوں میں خصوصاً طلبا میں ہندستان کی طرف دلچسپی اور ہمدردی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس امر کی تصدیق کے لیے کسی شخص کو جزائر برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں ہی گشت کر لینا کافی ہوگا۔

اس کام کو باقاعدہ انجام دینے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کو اپنے معتبر ایجنٹ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں قائم کرنا ہوں گے۔ شمالی وسطی اور جنوبی امریکہ میں بھی ایجنٹوں کی ضرورت ہوگا۔ یہ حقیقت میں قابل افسوس بات ہے کہ ہم نے اس وقت تک جنوبی اور وسطی امریکہ کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کررکھی ہیں۔ جہاں ہندستان کے لیے گہری دلچسپی لی جاتی ہے۔ بین الاقوامی اتحاد قائم کرنے کے کام میں کانگریس کی امداد معاشرتی اداروں کو کرنا چاہیے جو بین الاقوامی معاشرت کے میدان میں عمل پیرا ہوں اور ہندستانی چیمبر آف کامرس بھی بین الاقوامی تجارتی تعلقات میں امداد دے۔ علاوہ بریں ہندستانی اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ وہ ہر بین الاقوامی کانگریس یا کانفرنس میں شرکت کریں اس قسم کی کانفرنسوں میں شرکت کرنے سے ہندستان کے لیے بے حد مفید پروپیگنڈہ ہوسکتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات پر بات چیت کرتے ہوئے میں بعض شبہات رفع کرنا چاہتا ہوں جو چند دماغوں میں موجود ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات بڑھانے سے یہ مطلب نہیں کہ حکومت برطانیہ کے خلاف سازش کی جارہی ہے۔ ہم کو ایسی سازشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور ہمارے تمام طریقوں کو صاف اور ظاہر ہونا چاہئے۔ تمام دنیا میں ہندستان کے متعلق جو پروپیگنڈہ مچا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہندستان غیر مہذب ملک ہے اور اسی سے یہ بات اخذ کی جاتی ہے کہ حکومت برطانیہ کی یہاں اس لیے ضرورت ہے کہ وہ ہم کو مہذب بنائے۔ اس کے جواب میں ہم دنیا کو صرف یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور ہماری تہذیب کیسی ہے؟ اگر ہم ایسا کر سکیں تو نہایت زبردست بین الاقوامی ہمدردی ہمیں حاصل ہو جائے گی اور دنیا کی عام رائے میں ہندستان کہیں بلند تر ہو جائے گا۔ مجھے ان مشکلات کا حوالہ دینے سے گریز نہیں کرنا چاہئے وہ دقتیں اور آزمایشیں بھی قابل تذکرہ ہیں جن کا ہمارے ہم وطن ایشیا اور افریقہ میں مقابلہ کر رہے ہیں اور بالخصوص زنجبار، کینیا، جنوبی افریقہ، ملایا اور سیلون میں کانگریس نے ہمیشہ ان کے معاملات میں گہری دلچسپی لی ہے اور آئندہ بھی ایسی ہی دلچسپی لیتی رہے گی۔ اگر ہم ان کے کچھ زیادہ کام نہ آسکے تو اس کا باعث یہ ہے کہ اپنے گھر ہی میں غلام ہیں۔ آزاد ہندستان دنیا کی سیاسیات میں تندرست اور مضبوط عضو ہوگا اور اس قابل ہوگا کہ باہر اپنے وطن پروروں کے مفاد کی نگہداشت رکھ سکے۔

اس سلسلہ میں مجھے اس امر پر زور دینا ہے کہ ہماری خواہش ہے اور ضرورت بھی ہے کہ ہم اپنے پڑوسی ملکوں سے گہرے معاشرتی تعلقات بڑھائیں۔ مثلاً ایران افغانستان، نیپال، چین، برہما، سیام، ملایا، ایسٹ انڈیز اور سیلون سے۔ یہ دونوں فریق کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم ان کو اچھی طرح جانیں اور وہ ہم کو اچھی طرح سمجھیں برہما اور سیلون سے ہمیں بہت ہی گہرے تعلقات اس لیے رکھنا ہے کہ برسہا برس سے

ہمارے اوران کے تعلقات قائم رہے ہیں۔

دوستو! مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے ارادہ سے زیادہ آپ کا وقت لے لیا ہے لیکن اب میں اپنے ایڈریس کے اختتام پر ہوں۔ ایک اہم معاملہ اور رہا جاتا ہے جو موجودہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور جس پر میں آپ کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ نظر بندوں اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کا ہے۔ حال کی بھوک ہڑتالوں نے اس سوال کو سب سے آگے کر دیا ہے اور وہ پبلک کی توجہات کا مرکز بن گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں کانگریس کے ہر طبقہ کے احساسات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ رہائی کو جلد حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ جہاں تک کانگریس کی وزارتوں کا تعلق ہے یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان میں سے بعض وزارتوں کا ریکارڈ پبلک کی توقعات تک نہیں پہنچ سکا۔ جس قدر جلد وہ پبلک کے مطالبہ کو پورا کریں گی اتنا ہی کانگریس کے لیے بہتر ہوگا اور ان صوبوں کے حق میں بھی بہتر ثابت ہوگا جہاں کانگریس کی وزارتیں نہیں ہیں۔ میں اس نقطہ پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتا مجھے کافی توقع ہے کہ مستقبل قریب میں پبلک کو جہاں تک کانگریسی وزارتوں کا تعلق ہے، اس معاملہ میں شکایت کا کوئی سبب باقی نہ رہے گا۔ نظر بند اور سیاسی قیدی ہی جیلوں اور کیمپوں میں اپنا دردانگیز قصہ نہیں سنا رہے ہیں بلکہ رہا شدہ قیدیوں کی حالت بھی بعض مرتبہ نہایت ابتر ہے وہ اکثر گھروں کو اس وقت آتے ہیں جب ان کی صحت جواب دے چکی ہوتی ہے۔ امراض کا شکار ہوتے ہیں اور اکثر تپ دق میں مبتلا ہوتے ہیں چہرہ پر فاقہ کشی کی ہوائیاں اڑتی ہوتی ہیں۔ ان کے رشتہ داروں اور محبوبوں کے آنسو ان کا استقبال کرتے ہیں۔ کیا ہمارا فرض ان کے لیے کچھ نہیں ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات ملک کی خدمت میں قربان کر دیے ہوں اور اس کے معاوضے میں انھیں سوائے فاقہ کشی اور رنج وآرام کے کچھ نہ ملا ہو؟ ہمیں چاہئے کہ

اپنے دلوں کی گہری ہمدردی ان کے حق میں ظاہر کریں جنھیں اپنے ملک سے محبت کرنے کے جرم میں مصیبتیں اٹھانا پڑی ہیں اور ہم سب کو پوری کوشش کرنا چاہئے کہ ان کے مصائب اور تکالیف کو کم کریں۔

دوستو! ایک لفظ اور، اور بس ہم آج ایک سخت حالت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ کانگریس کے اندر بائیں اور دائیں جانبوں میں اختلافات ہیں جن کو نظر انداز کرنا بے کار ہوگا۔ کانگریس کے باہر برطانوی شہنشاہیت ہے جس کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے۔ ایسی نازک حالت میں ہم کیا کریں؟ کیا مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ ہم طوفانوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہیں اور اپنے حکمرانوں کے تمام ارادوں کو ڈھا دیں؟ کانگریس آج عوام کی جدو جہد کا سب سے بڑا اور بہترین آلہ ہے۔ اس میں دائیں اور بائیں بلاک موجود ہوں لیکن یہ تمام مخالف شہنشاہیت کے اداروں کے لیے جو ہندستان کی نجات کے خواہش مند ہیں ایک مشترک پلیٹ فارم ہے۔ اس لیے ہمیں چاہئے کہ پورے ملک کو انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے کے نیچے لا کھڑا کریں۔ میں خصوصاً تمام بائیں گروہوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اپنی پوری قوت اور ذرائع کے ساتھ وہ کانگریس کو جمہوری بنائیں اور وسیع ترین مخالف شہنشاہیت کے اصولوں پر اس کی تنظیم کریں۔ یہ اپیل کرنے میں مجھے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کے رویہ سے بڑی جرأت حاصل ہوتی ہے جن کی ہندستان کے متعلق عام پالیسی مجھے انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسی سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔

آخری میں میں آپ کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہوں کہ گاندھی جی ہماری قوم کے لیے کئی سالوں تک زندہ رہیں۔ ہندستان ان کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا، خصوصاً اس زمانہ میں ہرگز نہیں۔ ہمیں ان کی اس لیے ضرورت ہے کہ باشندے متحد رہیں۔ ہم ان کو اس لیے چاہتے ہیں کہ ہماری جدو جہد تلخی اور نفرت سے پاک رہے۔ ہم ان کو

ہندستان کی آزادی کے حق کے لیے چاہتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ ہمیں ان کی انسانیت کے لیے ضرورت ہے۔ ہماری جدوجہد نہ صرف برطانوی شہنشاہیت کے خلاف ہے بلکہ دنیا کی شہنشاہیت کے خلاف بھی ہے۔ پس ہم نہ صرف ہندستان کے حق کے لیے لڑرہے ہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے بھی۔ ہندستان آزاد ہو گیا تو انسانیت بھی آزاد ہو جائے گی۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس

تری پوری ——— مارچ 1939ء

ڈیلی گیٹ بہنو اور بھائیو! آپ نے دوسری مرتبہ مجھے انڈین نیشنل کانگریس کا صدر کر کے اور یہاں تری پوری میں پرتپاک خیر مقدم کر کے جو عزت بخشی ہے اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ آپ نے میری درخواست پر دھوم دھام کا پروگرام ترک کر دیا ہے جو عموماً ایسے موقعوں پر رکھا جاتا ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس سے اس گرم جوشی اور تپاک میں ذرہ بھر فرق نہیں پڑا جس سے آپ نے میرا سواگت کیا ہے۔

دوستو! پیشتر اس کے کہ میں اپنا ایڈریس پڑھوں۔ میں اس امر پر مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی جس مشن کو لے کر راجکوٹ گئے تھے وہ پورا ہو گیا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر انھوں نے برت کھول دیا ہے۔ اب سارے ملک نے اطمینان کا سانس لیا ہے اور خوشی کی عالمگیر لہر دوڑ گئی ہے۔

دوستو! یہ سال کئی پہلوؤں سے غیر معمولی ثابت ہوگا اس بار صدارتی انتخاب ادنیٰ قسم کا نہیں تھا۔ انتخاب کے بعد سنسنی خیز واقعات رونما ہوئے۔ ورکنگ کمیٹی کے پندرہ ممبروں میں سے بارہ سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی رہنمائی میں مستعفی ہو گئے۔ ورکنگ کمیٹی کے ایک اور سرکردہ ممبر پنڈت جواہر لال نہرو نے گو باضابطہ طور پر استعفیٰ نہ دیا تاہم ان کے بیان سے ہر ایک نے یہی سمجھا کہ وہ بھی

مستعفی ہو گئے ہیں۔ تری پوری کانگریس کے عین قبل راجکوٹ کے واقعات کے مدنظر مہاتما گاندھی کو مرن برت رکھنا پڑا۔ میں بیماری کی حالت میں یہاں پہنچا ہوں۔ اس لیے یہ حالات کے عین مطابق ہے کہ اس سال صدارتی ایڈریس لمبا نہ ہو۔

دوستو! آپ کو معلوم ہوا ہے کہ مصر کے ''ڈیلی گیٹ'' انڈین نیشنل کانگریس کے دوستوں کی حیثیت سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے ساتھ ان سب کا دلی خیر مقدم کریں گے۔ ہم انتہائی خوش ہیں کہ انھوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا اور سفر کر کے یہاں پہنچے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مصر کی سیاسی پیچیدگیوں کے مدنظر وفد پارٹی کے لیڈر مصطفیٰ نحاس پاشا ذاتی طور پر ڈیلی گیشن کی رہنمائی نہ کر سکے۔ میں وفد پارٹی کے پریذیڈنٹ اور سرکردہ ممبروں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اس لیے ان میں بہتوں کو یہاں پا کر انتہائی خوش ہوا۔ ایک بار پھر اپنے ہم وطنوں کی طرف سے میں ان کا گرم جوشی اور دلی تپاک سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

تری پوری کانگریس کے بعد جو فروری 1938ء میں منعقد ہوئی تھی۔ جس قدر اہم بین الاقوامی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم معاہدہ میونک ہے جو ستمبر 1938ء میں ہوا۔ اس میں فرانس اور برطانیہ نے نازی جرمن کے آگے بہت بری طرح ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس کے نتیجہ کے طور پر فرانس یورپ میں ایک غالب طاقت کے طور پر ختم ہو گیا اور ایک فائر بغیر یورپ کی لیڈر شپ جرمنی کو حاصل ہو گئی۔ حال ہی میں سپین کی ری پبلکن گورنمنٹ کے خاتمہ سے بھی فاشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ نام نہاد جمہوری طاقتیں فرانس اور برطانیہ سوویٹ روس کو سردست یورپین سیاسیات سے خارج کرنے کے لیے اٹلی اور جرمنی سے مل گئی ہیں۔ لیکن یہ حالت کب تک جاری رہے گی اور روس کو ذلیل کر کے فرانس اور برطانیہ نے کیا حاصل کیا ہے؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حال ہی میں یورپ اور ایشیا میں جو بین الاقوامی واقعات رونما ہوئے ہیں ان کی وجہ سے برطانوی اور فرانسیسی امپیریلزم کی طاقت اور وقار کو بھاری دھکا لگا ہے۔

اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے میں صرف چند اہم مسائل کا ذکر کروں گا کہ عرصہ سے میں جو کچھ محسوس کرتا رہا ہوں اس کا واضح الفاظ میں اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ سوراج کے سوال کو اٹھایا جائے اور اپنا قومی مطالبہ الٹی میٹم کی صورت میں برطانوی گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اب وقت نہیں رہا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ہمارے سامنے مسئلہ یہ نہیں کہ فیڈریشن اسکیم ہم پر کب ٹھونسی جائیگی۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر چند سال تک جب تک کہ یورپ میں امن قائم نہ ہو جائے۔ فیڈرل اسکیم کو معرض التوا میں ڈال دیا جائے تو ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں چار طاقتوں کے معاہدہ کی بدولت یا کسی اور طریقے سے پائیدار امن قائم ہو گیا تو سلطنت کے متعلق برطانیہ کی پالیسی سخت ہو جائے گی۔

اس وقت وہ یہودیوں کے خلاف عربوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ بین الاقوامی سیاسیات میں کمزوری کا احساس کرتا ہے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنا قومی مطالبہ الٹی میٹم کی صورت میں برطانوی گورنمنٹ کو پیش کرنا چاہیئے اور اسے پورا کرانے کے لیے کچھ مہلت دینی چاہیئے۔ اس کے اندر اندر جواب کی توقع رکھی جائے لیکن اگر اس عرصہ میں کوئی جواب نہ ملے یا جواب تسلی بخش نہ ہو تو ہمیں قومی مطالبہ منوانے کے لیے وہ تمام تدابیر کرنی چاہئیں جو ہم اختیار کر سکتے ہوں۔

ہمارے پاس جو طریقۂ کار ہے وہ سول نافرمانی یا ستیہ گرہ ہے اور آج برطانوی گورنمنٹ طویل عرصے تک آل انڈیا ستیہ گرہ جیسی بھاری تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جان کر مجھے دکھ ہوتا ہے کہ بعض کانگریسی مایوس ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی برطانوی

امپیریلزم پر بھاری حملہ کرنے کا وقت نہیں آیا۔ لیکن اگر حقائق کی روشنی میں صورت حالات کو دیکھا جائے تو ایسی مایوسی کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں۔ اس وقت جب کہ آٹھ صوبوں میں کانگریس برسر اقتدار آ گئی ہے ہماری طاقت اور وقار بڑھ گیا ہے۔ برطانوی ہند کے طول وعرض میں اجتماعی تحریک بہت زور پکڑ چکی ہے۔ اور یہ بھی کم اہم بات نہیں کہ دیسی ریاستوں میں بھی غیر متوقع بیداری آ گئی ہے۔ اس لیے سوراج کی طرف فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے ہماری قومی تاریخ میں اس سے زیادہ موزوں موقع کون سا ہو سکتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب کہ بین الاقوامی صورت حالات ہمارے لیے سازگار ہے۔ میں ایک پکا آشاوادی ہوں اور موجودہ حالات ہمارے لیے اس قدر مفید ثابت ہو سکتے ہیں کہ ہمارے حوصلے انتہائی بلند ہونے چاہئیں۔ اگر ہم اپنے اختلافات دور کر دیں، اپنے ذرائع کو متحد کریں اور تمام طاقت کو قومی تحریک پر لگائیں تو برطانوی امپیریلزم پر کاری چوٹ لگا سکتے ہیں۔ کیا ہم سیاسی تدبر سے کام لے کر اپنی موجودہ سازگار پوزیشن کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے؟ یا ایسے موقع کو کھو دیں گے جو ملک کی زندگی میں شاذ و نادر ہی آتا ہے:

میں ہندستان اور دیسی ریاستوں کی بیداری کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ میری یہ قطعی رائے ہے کہ ہم نے ریاستوں کے متعلق ہری پورہ کانگریس کے ریزولیوشن میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس پر نظر ثانی کی جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس ریزولیوشن پر یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ کانگریس کے نام پر ریاستوں کے اندر بعض قسم کی تحریکیں نہ چلائی جائیں۔ اس ریزولیوشن کی رو سے کانگریس کے نام پر نہ تو کوئی پارلیمنٹری کام کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ریاستوں کے موجودہ نظام کے خلاف جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہری پورہ کانگریس کے بعد کئی واقعات ہو چکے ہیں۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض ریاستوں کے حکام پیراماؤنٹ پاور کے مشورہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ ان حالات میں

کیا ہم کانگریسیوں کو ریاستی باشندوں کے زیادہ قریب نہیں ہونا چاہئے۔

مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ آج ہمارا فرض کیا ہے۔ نہ صرف متذکرہ بالا پابندی کو اٹھا دینا چاہئے بلکہ ورکنگ کمیٹی کو ریاستوں میں شہری آزادی اور ذمہ دار گورنمنٹ کی تحریک عامہ کی رہنمائی کرنے کے لیے کام کو باقاعدہ طور پر کرنا چاہئے۔ اب تک جو کچھ کام ہوا ہے وہ وقتاً فوقتاً اور تھوڑا تھوڑا ہوا ہے۔ بالکل باقاعدہ طور پر اس سلسلہ میں کوئی قطعی اسکیم مرتب نہیں کی گئی۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ورکنگ کمیٹی یہ ذمہ داری اٹھائے اور اسے باقاعدہ طور پر سرانجام دے اور اگر ضرورت محسوس کی جائے تو اس مقصد کے لیے سب کمیٹی مقرر کی جانی چاہئے۔ مہاتما گاندھی کے دلیرانہ مشورہ اور تعاون نیز آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کے مشورہ کا پورا فائدہ اٹھایا جانا چاہئے۔

میں نے مختصر بتایا ہے کہ ہمیں سوراج کی طرف فیصلہ کن پیش قدمی کرنی چاہئے۔ اس کے لیے کافی تیاری کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں بے دریغی سے ان خرابیوں اور کمزوریوں کو دور کرنا چاہئے جو عہدوں کے لالچ کی وجہ سے کانگریس میں آ گئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں ملک کی تمام انٹی امپیریلسٹ جماعتوں اور بالخصوص کسان تحریک اور ٹریڈ یونین تحریک کا قریبی تعاون حاصل کرنا چاہئے۔ ملک کے تمام انتہا پسند عناصر اور تمام انٹی امپیریلسٹ جماعتوں کی کوششوں کا مشترکہ مقصد یہ ہونا چاہئے کہ بالآخر امپیریلزم پر حملہ کیا جائے۔

دوستو! آج کانگریس کے اندر فضا مکدر ہے اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر ہمارے کئی دوست بددل اور بے حوصلہ ہو گئے ہیں۔ لیکن میں پکا آشاوادی ہوں۔ جو بادل آپ آج دیکھ رہے ہیں وہ گزر جائیں گے۔ مجھے اپنے ہم وطنوں کی دیس بھگتی پر اعتماد ہے اور مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ہم اپنی موجودہ مشکلات پر قابو

پالیں گے اور متحد ہو جائیں گے۔ 1922ء میں گیا کانگریس کے وقت بھی اسی قسم کی صورت حالات پیدا ہوگئی تھی جب کہ سورگیہ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ میری یہ پرارتھنا ہے کہ میرے پوجیہ سورگیہ گورو اور پوجیہ موتی لال جی اور ہندستان کے دیگر سپوتوں کی آتمائیں موجودہ الجھن میں ہمیں متحرک کریں اور مہاتما گاندھی جی جو ہماری قوم کو ہدایت اور مدد دینے کے لیے اب بھی ہمارے ساتھ ہیں کانگریس کو موجودہ الجھن سے نکالنے میں امداد دیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

رام گڑھ ——————— مارچ 1940ء

دوستو! 1923ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ قومی جدوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کردی ہے کہ اب وقت کے پرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور تھا اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرتے۔ ہم ہر منزل میں ٹھہرے مگر رکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں۔ مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے نہ چل سکے ہوں لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم 1933ء اور 1940ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ 1923ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر

اٹھایئے اور سامنے کی طرف دیکھئے نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ منزل بھی دور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے وہاں طرح طرح کی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دیں اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش ان کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بالکل نزدیک کر دے اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں الجھا دے۔ ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے بھروسہ کا اظہار کیا ہے۔ وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسہ ہے جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزت ہے اس لیے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزت کے لیے شکر گزار ہوں اور ذمہ داری کے لیے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرم جوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے ویسے ہی گرم جوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

اب میں سمجھتا ہوں مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آ جانا چاہئے۔ ہمارے وقت کا سب سے پہلا اور اہم سوال یہ ہے کہ 3 ستمبر 1939ء کے اعلان جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟

غالباً کانگریس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا کہ 1936ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین الاقوامی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک لمبی تجویز منظور کر کے اس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا اور اس کے بعد سے

وہ کانگریس کے سالانہ اعلان کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا۔

سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورت حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بتاتے ہوئے ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانہ کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے، اور فکر و عمل کی لہریں ایک گوشے میں اُبھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں ہندستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے کہ باہر کے حالات ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا جس نے اس فیصلہ کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فاشسزم اور نازی ازم کی جو ارتجاعی ری اویکشنری (Avactionary) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں۔ ہندستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصور کرتا ہے اور اس کا دل و دماغ ان قوموں کے ساتھ ہے جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فاشی ازم اور نازی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا تو

ہمارے لیے ناممکن تھا کہ ہم اس پرانے خطرے کو بھلا دیتے جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لیے مہلک ثابت ہو چکا ہے اور جس نے فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم نئی ارتجاعی قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے۔ یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لیے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھول دی کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی تو ہندستان جو اپنے آزادارادے اور آزاد پسندی سے محروم کر دیا گیا ہے اس میں حصہ لینے سے قاصر رہے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے جب کہ اسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی ازم اور فیشی ازم سے بیزار ہے۔ اگر ہندستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیتوں کے ساتھ موجود ہے اور ہندستان کسی حالت میں تیار نہیں کہ ایسی حالت میں برطانوی شہنشاہی کی فتح مندیوں کے لیے مدد کرے۔

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔

یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست 1939ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور ''لڑائی کی تجویزوں'' کے نام سے مشہور ہیں۔

کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست 39ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے اور 3 ستمبر کو لڑائی بھی شروع ہو گئی۔

اب میں اس موقع پر ایک لمحہ کے لیے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھئے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے۔

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 35ء ہندستان کے سر جبراً تھوپا اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصے کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا اور اس پر آمادہ ہوگئی کہ ایک خاص شرط پر وزارتوں کو قبول کرنا منظور کرے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جاسکتا ہے قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورت حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے ہندستان صاف صاف لفظوں میں نازسی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں اور صورت حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت Mentality میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی Diplomacy ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت محسوس کرے گی کہ اس موقع پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے اور ہندستان کو ایسا کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب وہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت کا طرز عمل کیسا رہا ہے۔ تبدیلی کی ذراسی پرچھائیاں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہ دیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے اس نے اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرلیا اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجہ تک بھی ہندستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو، لڑائی میں اس کے

شامل ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقع دیا جائے جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقع پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے طرز عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، آئرلینڈ سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا اور اس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ولیرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر (Ulster) کا سوال قابل اطمینان طریقے پر طے نہیں ہوتا۔ وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نوآبادیوں کے اس پورے مرقع میں ہندستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندستان کو آج یہ قیمتی خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں Dominion کا درجہ Status ملنے والا ہے۔ اس ہستی کا کیوں کر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح کہ اسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رخ کو ہم اس کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں۔ ہمیں جلدی نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم

اسے اور زیادہ نزدیک سے نزدیک اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے۔

1914ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشے میں سلگی تھی۔ اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یاد ش بخیر پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نقطے دنیا کے سامنے آئے اور ان کا جو کچھ حشر ہوا دنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورتِ حال دوسری تھی پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتح مندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِ فعل Reaction شروع ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فیشزم اور جرمنی میں نازیزم کا روپ اختیار کیا اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت Dictator Ship دنیا کے امن و آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو قدرتی طور پر دو صفیں دنیا کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی۔ دوسری ارتجاعی قوتوں کو آگے بڑھانے والی۔ اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔ مسٹر چیمبر لین کی حکومت جس کے لیے فاشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی سے زیادہ کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی نا قابل برداشت تھی۔ تین برس تک اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فاشسٹ اور نازی قوتوں کی جرأتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابی سینیا، اسپین آسٹریلیا، چیکوسلاواکیہ اور البانیہ کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں ابھر آیا اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہو گئی۔ اسے لڑائی کے میدان میں اترنا پڑا۔ کیوں کہ اگر اب نہ اترتی تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے نا قابل برداشت ہو جاتی۔ اب

چھوٹی قوتوں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ جمہوریت، آزادی اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ 3 ستمبر کا اعلان جنگ انگلستان اور فرانس نے ان صداؤں کی گونج میں کیا اور دنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے یورپ کی جوئی ارتجائی Reactionry قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیئے۔

3 ستمبر 39ء کو لڑائی کا اعلان ہوا اور 7 ستمبر کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگریس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے جو 36ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کیا جا سکتا اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اٹھایا ہے جسے آج ہندستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے کہ اس صورت حال میں اس کے لیے وہی ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندستان کا بلکہ دنیا کے امن وانصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندستان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی Tragedy کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے اور یہ واقعی اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ آزادی جمہوریت اور امن کے نئے نظم Order سے دنیا کو آشنا کیا جائے تو پھر یقیناً ہندستان کو اس

مطالبہ کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے کہ خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی کے اس مطالبہ کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا اور 14 ستمبر 1939ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا تو مجھے یقین ہے کہ میں آنے والے مؤرخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت کا ایک سادہ مگر ناقابل ردنوشتہ ہے جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندستان میں اٹھی لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندستان ہی کی آواز نہ تھی۔ یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ چکی ہیں مبتلا کی گئی اور صرف اس لیے مبتلا کی گئی تا کہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔ کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت خود اختیاری فیصلہ ہتھیاروں کی حد بندی، بین الاقوامی پنچایت کا قیام یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں لگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی۔ ہر جلوہ خواب وخیال ثابت ہوا۔ آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہونا چاہئے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

کانگریس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں

کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو ہندستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلہ کے لیے پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے جو 17 راکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومت ہند کے سرکاری علم وادب کے الجھے ہوئے انداز اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی اس قدر بتانے میں بمشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیراعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے۔ جو صرف یورپ کے امن اور بین الاقوامی رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے ''جمہوریت'' اور قوموں کی آزادی'' کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جاسکتے۔ جہاں تک ہندستان کے مسئلہ کا تعلق ہے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے 1919ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ 1935ء کے قانون کی شکل میں نکلا آج بھی وہی پالیسی اس کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔

17 راکتوبر 1939ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا اور 22 راکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کرسکتا۔ اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کردینا چاہیے جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا وہ اس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے:

> ان حالات میں کمیٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کرلے۔ کمیٹی کانگریس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے، اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہوجائیں۔''

چنانچہ آٹھ صوبوں میں وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہئے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ ترقی کر کے کہاں تک پہنچتا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونکے جو 5 رفروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انھوں نے 6 رفروری کو شائع کیا اس کی آخری کڑی سمجھی جاسکتی ہے اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندستان جلد سے جلد وقت میں جو صورت حال کے لحاظ سے ممکن ہو، برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کرے۔ اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ ہندستان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندستان کے لیے خوداختیاری فیصلے کا حق تسلیم نہیں کرسکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا۔ پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ مگر جوں ہی ہندستان نے یہ سوال اٹھایا۔ حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے۔ مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جاسکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہئے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں۔ مسٹر چیمبر مین نے 24 رفروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کردی ہے۔ اگرچہ ان کی تقریر

سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انھوں نے ہمارے لیے برطانوی حکومت کے صاف طرز عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچادیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں۔ ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کرلیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقع پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانوی نہیں ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اس عام ذہنیت کی ترجمانی کررہا ہے جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انسان کی انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لیے خاص سمجھا گیا۔ یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جاسکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنھیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔ وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندستان کے سیاسی اور قومی سوال کے حق نے بھی ہمارے سامنے پیش کردیا ہے۔ ہم نے جب اعلان جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے اور ہندستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی 17ء اور 19ء میں کیا رہ چکی

ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ 39ء کی اس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے۔ ہندستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی اپنے سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہشمند ہے۔ مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندستان کے حق کا ہے۔ ہندستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اس سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوال کا جواب موقوف ہے۔ ہندستان کے لیے یہ سوال بنیاد کی اصل اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لیے صورتِ حال بالکل واضح ہوگئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقصد بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جارہی ہے۔

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ 2 ستمبر کے اعلان جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں اس کا رخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف

ابھر آیا ہوگا کہ اب اسے صرف زبان تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں۔ میں آپ کے دلوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون کا جو قدم 37 میں اٹھایا تھا ہم نے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رخ ترک تعاون کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رخ کی طرف آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں۔ جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے۔

اس سلسلہ میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے جب کہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کردے اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرز عمل بدلتے رہے ہیں۔ مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خودغرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی قوموں نے کس طرح انسانوں کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ وبالا کردیے اور انصاف اور معقولیت کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصور کا یہ مایوس رخ ابھار رہی ہے وہاں امید کا ایک دوسرا رخ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلاامتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے۔ جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف ابھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے۔ اور معقولیت، انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بے قرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کردیا تھا اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر ابھر رہی ہے۔ اور ایسی

حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا۔ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی وہ بڑی قومیں جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا۔ آئندہ کے لیے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جائیں۔ معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتح مندی ہوتی اگر آج برطانوی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے۔

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے۔ مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے اور وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جوان پر کھولا جاتا ہے بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں۔ بلا تامل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ برطانوی کابینہ کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندستان سے بڑھ کر اور کون سا ملک ہو سکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کر سکتا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن وانصاف کی راہ روکے کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعوؤں کے لیے ایک کسوٹی تھی۔ دعوئے کسوٹی پر کسے گئے اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے۔

جہاں تک وقت کے اصلی سوالوں کا تعلق ہے معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گذشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جاسکے گا۔ بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں۔ جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جاسکتیں جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے۔ ہندستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے مخالفت کرنے کی جرأت کرسکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لیے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کی خواہش مند نہ ہوں، وقت کی عام آب وہوا کے تقاضا سے بے بس ہو رہی ہیں اور انھیں بھی ہندستان کی سیاسی منزل مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورت حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اٹھا دیے وہاں اس گوشہ کو بھی بے نقاب کردیا۔ ہندستان اور انگلینڈ دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کرکے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کردی جائے۔ بار ہا دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندستان کے سیاسی مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ خارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرز عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلاف کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے کام میں لائے تو یہ

ہندستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا اور ہمارے لیے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہش مند نہیں ہو سکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا۔ یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم اس گوشہ میں وہ اپنے طرز عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پہلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا اور جس دور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جارہا ہے کہ ختم ہو گیا اسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہر حال اب آپ خواہ کچھ ہی کہہ رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پرواہ رہ کر اٹھے گا یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہ نہیں ہونے چاہئیں کہ اسے ہندستان کے قومی حقوق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے تو

اسے معلوم ہونا چاہئے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنا چاہیں گے وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اوّل دن سے دعویٰ رہا ہے کہ وہ ہندستان کو بحیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے ہندستانی قوم کے لیے اٹھانا چاہتی ہے ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ کانگریس نے یہ دعویٰ کر کے دنیا کو اس بات کا حق دے دیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے اس کے طرز عمل کا جائزہ لے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگریس کے طرز عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈالیں۔

جیسا کہ میں نے بھی آپ سے کہا ہے اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی اس کی اہمیت اس کے فیصلے کا طریقہ کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ اس نے اس کی اہمیت کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس کے فیصلے کے لیے وہی طریقہ تسلیم کیا جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جاسکتا اور اگر بتلایا جاسکتا ہے تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یقین کریں! میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابل انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب

کبھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا۔

1 - ہندستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہئے۔

2 - اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں نہ کہ اکثریتیں، اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہئے نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرز عمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرز عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگریس اپنے ادنیٰ فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصہ میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گزرا جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرز عمل بھی تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرز عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ اس کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں۔ ان کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رایوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہو سکتی ہے تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرز عمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ بار بار ہمیں یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آ رہی ہے تو کیوں برطانوی حکومت ہندستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقع نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کر لیں۔

ہم میں فرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے

مٹانے چاہئیں۔ یہ صورتِ حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کردی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں۔ کیوں کہ ہماری راہ تمام دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

یہ ہندستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا لیکن کیا ہندستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لاسکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کردیتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے 28 برس پہلے میں ''الہلال'' کے صفوں میں لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں میں نے اس زمانہ میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ یہ بات کہ ہندستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے ایک جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق ومفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کردی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کردیا جس کے بعد وہ ہندستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی

شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیوں کر ڈھائی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور پر ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قوم کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی (اب یونائیٹڈ اونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی ''اقلیت'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے

جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد Number کے ساتھ نوعیت Kind کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے دوسرے کی زیادہ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا مگر سیاسی خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اسی نسبتی فرق کی بنا پر اسے ایک اقلیت فرض کر لیا جائے۔ کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کی نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل Factors کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت اقلیت کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے خود تعداد اور اس کی

نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خودنگہداشت نہیں کر سکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کردیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اقلیت اور اکثریت کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک اقلیت کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔

ہندستان کا آئندہ دستور اساسی Constitution اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق Fedration کا جمہوری دستور ہوگا جس کے کل حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خودمختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے۔ ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کرسکتا کہ ہندستان کے مستقبل نقشے میں ان

اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف وخطر کودنا چاہئے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا ہم معلوم کرلیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔

تقریباً20 برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو 1818ء میں کانگریس سے علیٰحدگی اور مخالفت کی صورت میں اختیار کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب وہوا میرے غور وفکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اس کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیوں کر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اس کی بنیادوں تک اتریں اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب میں موقوف ہے۔ ہم ہندستانی مسلمان ہندستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی

اعلان آئندہ کا کوئی وعدہ دستور اساسی کا کوئی تحفظ ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہوسکتا۔ ہم مجبور ہوجاتے ہیں کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور ہمیں بھی یہ خواہش رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہئے۔ تو پھر ہماری راہ بالکل صاف ہوجاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پر چھائیاں بھی نہیں پڑسکتیں۔ یقین، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ ہندستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں۔

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کا تصور بھی کرسکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔

میں نے 1912ء میں ''الہلال'' جاری کیا اور اپنا فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ 1912ء سے 1916ء تک کا زمانہ مسلمانان ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ 1920ء کے اواخر میں جب 4 برس کی نظر بندی کے بعد رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچہ ڈھل رہا ہے اس واقعہ پر بیس

برس گزر چکے۔ اس عرصہ میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے سیلاب آئے، خیالات کی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

ہاں اب وہ پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ آگے بڑھنے کی راہ اس پر بھی مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے 1914ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے۔ میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں اپنے مشاہدہ کو نہ جھٹلاؤں۔ میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے 12ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے 12ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا۔ مگر آج مجھ سے اختلاف ہے۔ میں اس اختلاف کے لیے انھیں ملامت نہیں کروں گا۔ مگر میں ان کے اخلاص و سنجیدگی سے اپیل کروں گا کہ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے۔ ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلے کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انھیں

حقیقت کی روشنی میں آنا چاہئے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پر غور کرلیں۔ وہ اس کے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شان دار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر حامل Factor ہوں۔ میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔

ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر یکے بعد دیگرے سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا

کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک شکم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرہ کی سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرہ کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا میں ہندستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ

زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر دیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اب ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب ومعاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ ایک قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید Renowal مذہب میں ضرورت ہے۔ مگر منافرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ایک ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیٰحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضامند ہونا چاہئے اور اپنی قسمت کی تعمیر

میں لگ جانا چاہئے۔

حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں۔ مجھے اک بات یاد دلانے کی اجازت دیجئے کہ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے۔ اتحاد۔ ڈسپلن (Discipline) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تیار کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی وسعت دے دی ہے۔ کوشش کیجئے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔

آچاریہ جے۔بی۔کرپلانی

میرٹھ ——— 23رنومبر 1946ء

دوستو!

اس سال آپ نے اپنے مشوروں پر صدارت کرنے کے لیے منتخب کر کے جو اعزاز مجھے بخشا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں ایسا خود پسند نہیں ہوں کہ خود کو اس نمایاں اعزاز کے لیے بہترین آدمی سمجھ لوں اور نہ میں غلط انکساری کے باعث یہ کہہ کر آپ کی توہین کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے آدمی کو چن لیا ہے جو آپ کے سپرد کیے ہوئے فرض کو ادا کرنے کے بالکل ہی نااہل ہے۔ ہمارے وہ کارآزمودہ رہنما جنھوں نے پچھلے زمانے میں اس عہدے کو عزت بخشی ہے، اپنے کندھوں پر اب دوسرے بار اٹھائے ہوئے ہیں اور ان مصروفیتوں کے باعث وہ اس آرگنائزیشن کی خدمت کلی طور پر نہیں کر سکتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جنھوں نے ہماری کشتی کو سب سے زیادہ خطرناک اور طوفان زدہ سفر کے وقت میں چلایا ہے عہدے کی ذمہ داریوں اور پریشانیوں سے الگ ہو کر اس آرام وسکون کے طالب ہیں جس کے وہ پورے طور پر مستحق ہیں۔ میں آپ کی خدمت بجالانے کے لیے آزاد تھا اور آپ نے مجھے اپنے پہلے خادم کی حیثیت سے چن لیا ہے اگر چہ میں اس اعزاز کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں تاہم اس سے زیادہ اس ذمہ داری کو محسوس کرتا ہوں جو اس اعزاز سے وابستہ ہے گاندھی جی نے اس کو" کانٹوں کا تاج" کہا ہے، اور حقیقت میں آج تو یہ

پہلے سے بھی بڑھا ہوا" کانٹوں کا تاج" ہے۔ جب کہ ہمارا جہاز ایک ایسی بندرگاہ کے قریب پہنچ رہا ہے جس میں کثرت سے سرنگیں بچھادی گئی ہیں۔ لیکن مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم اپنے مقصد سے سچی وفاداری برتیں گے اور آپس میں متحد رہیں گےتو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں منزل پر پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔

ہم آج پورے چھ سال کے بعد پھر جمع ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ صرف دنیا کی تاریخ ہی میں نہیں، بلکہ ہماری آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں بھی نہایت اہم تھا۔ اس مدت میں ہمیں برطانی حکومت کے ساتھ دومرتبہ کھلی ٹکر لینی پڑی۔ 1941ء میں انفرادی سول نافرمانی کی تحریک جاری کی تاکہ ہر ہندستانی کو اس جنگ کے متعلق آزادی سے اظہار رائے کا حق حاصل ہو جس میں ہندستان کو اس کی مرضی کے خلاف گھسیٹ لیا گیا تھا۔ یہ تحریک اس محدود مقصد کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

ہماری دوسری ٹکر" ہندستان چھوڑ دو" کی ایک وسیع ترین اجتماعی تحریک تھی۔ جب کانگریس نے پہلی جنوری 1930ء کو اپنے مقصد" پورن سوراجیہ" یا" کامل آزادی" کو دوبارہ واضح کیا تو یہ بھی غیر ملکیوں کو ہندستان چھوڑنے کے لیے ایک اطلاع تھی۔ لیکن یہ اطلاع مبہم یا غیر معین تھی۔ جس کو انھوں نے نظر انداز کیا اور ہم نے بھی اس پر عمل درآمد نہ کیا۔ لیکن جیسا کہ 1943ء میں صاف بتلا دیا گیا، یہ ہمارا قطعی اور واجب التعمیل حکم تھا کہ وہ ہندستان چھوڑ دیں۔ اس وقت اپنے سامراجی مقاصد کے جال میں پھنسا ہوا برطانیہ خود کو ایک دوسری عالمگیر لڑائی میں مبتلا کر چکا تھا۔ وہ ایک بڑی معرکہ آرائی کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے جلد ہی خود کو زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑا ہوا دیکھا۔ اس واقعہ کا اس پر جوردِ عمل مختلف محاذوں کے متعلق پیدا ہوا وہ جمہوریت کا ایک دلچسپ سبق ہے۔ خود اپنی سرزمین پر جہاں اس کے باشندے آزاد بااختیار تھے، اس حقیقت کے باوجود کہ وہاں خطرہ سب سے زیادہ تھا وہ پوری عالی ہمتی اور اولوالعزمی کے

ساتھ نازک حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا لیکن یہاں ہندستان میں جہاں اس کی حکومت ہے، حکمرانی عوام کی مرضی کے خلاف قائم تھی، وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا اور وحشت زدہ ہو کر اخلاقی ابتری میں پڑ گیا۔ جاپانی حملہ کے اندیشہ سے ڈر کر حاکموں نے لوگوں کو ان کے گھروں اور کھیتوں سے نکال دیا، ان کی فصلوں کو تباہ کر دیا اور یہاں تک کہ لوگوں کو ان کے ذریعۂ مُعاش سے بھی محروم کر دیا۔ جو لوگ اس قدر پریشان کیے جا رہے تھے ان کو مجال شکایت بھی نہ تھی۔ آزادانہ اظہار خیال اور اجتماع کے تمام ذرائع کا اور پلاٹ فارم اور پریس کا ایسے قانون کے ذریعہ جو واقعیت کے اعتبار سے مارشل لاء تھا، گلا گھونٹ دیا گیا۔ اب ملک کے سامنے صرف یہی صورت تھی کہ یا تو وہ پستی میں پڑے پڑے ان ذلتوں کو برداشت کرے، یا اس چیلنج یعنی دعوتِ مقابلہ کے سامنے آئے اور مزاحمت پیش کرے۔ کانگریس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس چیلنج کو نظر انداز کر دیتی۔ اگر وہ ایسا کرتی تو اس کا یہ عمل ویسا ہوتا، جیسا کہ فاشسٹ اور نازی دست درازیوں سے ڈر کر یورپین ممالک کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں نے کیا تھا۔ سوشل ڈیموکریٹک اپنے مقصد کے تحفظ کے لیے کوئی ضرب لگائے بغیر ہی ذلت کے ساتھ ناکامیاب ہوگئی۔ اس انتہائی نازک وقت میں گاندھی جی نے یہ چیلنج قبول کرنے کا فیصلہ کیا انھوں نے کانگریس کو دعوت دی کہ اگر ضرورت پڑے تو لڑ کر مر جائے۔ کانگریس اور قوم کی یہ دانائی تھی کہ انھوں نے ان کی رہنمائی کی پیروی کی۔

بہت سے عقلمند سیاست دانوں نے شک وشبہ سے اپنا سر ہلایا۔ ان کے خیال میں یہ خالص حماقت تھی کہ ایک غیر مسلح قوم ایسے وقت میں برطانیہ کا مقابلہ کرے جب کہ اس کی پوری مسلح طاقت حرکت میں لائی جا چکی ہو، اور امریکہ کے کبھی نہ ختم ہونے والے ذرائع اس کے استعمال میں ہوں لیکن ان عقلمند آدمیوں نے یہ فراموش کر دیا تھا کہ جب کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی انقلابات سیاسیات کو اختیار کیا تھا تو اس

نے رواجی وتقلیدی سیاسی دانائی کو ترک کر دیا تھا۔ اس نے یہ ہمت کی تھی کہ خطرے میں پڑے اور حاصل کرے۔ کیا کانگریس نے اس وقت عقلمندی کی تھی جب کہ اس نے خلافت کے مسئلہ کو سمجھے بغیر ہی اپنا لیا تھا؟ اس کے علاوہ کیا یہ عقلمندی تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے "نمک ستیہ گرہ" جاری کی جائے؟ بہ ظاہر تو نمک اور آزادی میں کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ بھلا اس میں کون سی عقلمندی ہو سکتی تھی کہ گاندھی جی اپنے غیر مسلح پیروؤں کی ایک جماعت کے ساتھ 21 روز تک پیادہ سفر کرتے رہے تا کہ سمندر کے ساحل تک پہنچ کر چٹکی بھر نمک اٹھائیں؟ یہ کیسی سیاسی یا کسی دوسری قسم کی عقلمندی تھی کہ پنڈت موتی لال نہرو اپنے کمرہ میں مٹی کے ایک ڈھیلے سے ایک اسپرٹ لمپ پر کیمیاوی جانچ کی نلکی میں نمک بنائیں؟ پھر یہ کیا عقلمندی تھی کہ انفرادی ستیہ گرہ کے لیے لوگوں کو چن کر جگہ جگہ پھرنے اور خلاف جنگ نعرہ لگانے کے لیے بھیجا جائے یہاں تک کہ وہ گرفتار کر لیے جائیں؟ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں کبھی وہ عمل نہیں کیا ہے جو صاف طور پر رسمی یا رواجی حیثیت رکھتا ہو۔ اور اگر وہ جنگ آزادی کے ختم ہونے اور کامل آزادی حاصل ہونے سے پہلے ایسا کرے گی تو وہ اپنے انقلابی فرض کی ادائیگی سے چوک جائے گی۔

ہر تحریک کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس تھک کر چور چور ہو گئی ہے اور جی چھوڑ چکی ہے۔ غیر ملکی حکومت نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے پامال کی جا چکی ہے۔ لیکن جدوجہد کے بعد اس بظاہر شکست خوردہ کانگریس نے جب بھی وقت آیا، خود کو پہلے سے زیادہ زندہ اور اپنی قربانی اور تکلیفوں سے حاصل کی ہوئی مزید طاقت کو استعمال کرنے کے لیے تیار کیا۔

اگست 1942ء کی جدوجہد ختم ہو گئی۔ لوگ ہندستان سے لاپتہ نہیں ہوئے تھے، وہ یہیں موجود تھے معلوم ہوتا تھا کہ قوم تھک کر بے جان ہو چکی ہے۔ اس تاریک

زمانے میں بہت سے جھوٹے غیب داں طعنہ دیتے تھے کہ ''کیا ہم نے ایسا نہیں کہا تھا؟'' لیکن جوں ہی گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے لیے جیل کے دروازے کھولے گئے تو ملک میں درماندگی اور تھکاوٹ کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ہم نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ ایک نئی زندگی ہر جگہ موجیں مار رہی تھی۔ شملہ کو لیڈروں کی روانگی ایک ایسی حکومت سے گفت وشنید کرنے کے لیے جو کانگریس کی پامالی کا دعویٰ کر رہی تھی ایک فاتحانہ مارچ تھا، شکست خوردہ اور ذلت یافتہ لوگوں کا مارچ نہ تھا۔ اس کے بعد انتخابات جاری ہوئے مرکزی بھی اور صوبجاتی بھی۔ نتیجوں کے متعلق کسی کو شک وشبہ نہ تھا۔ جن لوگوں نے کانگریس کی سیاسیات میں کوئی دانائی نہیں دیکھی تھی پھر اس کے حلقہ میں واپس ہونے میں ذرا بھی دیر نہ کی، اور اسمبلی کی نشستوں کے لیے اور طاقت کی ان جگہوں کے لئے جو ان کے خیال میں جلد ہی دستیاب ہونے والی تھیں خود کو پیش کیا۔ وہ تیزی سے واپس آئے اور قبول بھی کر لیے گئے۔

انتخابات نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس پر قوم کا اعتماد اور بھی بڑھ گیا ہے۔ جن لوگوں نے جنگ کی تھی اور مصیبتیں جھیلی تھیں وہ کامیاب ہوئے۔ ان کو انعام مل گیا۔ لیکن بہت سے لوگ جنھوں نے سب سے زیادہ جدوجہد کی تھی اور سب سے زیادہ دکھ جھیلا تھا وہ اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی حب الوطنی کی قیمت اپنی بیش قیمت جانوں سے ادا کی۔ آج ہم جمع ہوئے ہیں تاکہ پچھلے حالات کا جائزہ لیں اور آئندہ کے لیے پالیسیاں مرتب کریں۔ اس وقت ہمیں قومی تحریک کے ان بہادر سپاہیوں کی یاد تازہ کر کے، خواہ وہ معلوم ہوں، یا لامعلوم، ان کو عزت واحترام کا خراج ادا کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے اس لیے تکلیف اٹھائی کہ دوسرے لوگ آرام کریں، وہ اس لیے مر گئے کہ دوسرے لوگ زندہ رہیں۔

ورکنگ کمیٹی کے ممبران جون 1945ء میں برطانوی گورنمنٹ کی پالیسی میں

ایک تبدیلی پیدا ہونے کے باعث رہا کردیے گئے۔ وائسرائے نے مرکز میں ایک نیشنل گورنمنٹ قائم کرنے کے متعلق گفت وشنید کرنے کے لیے بڑی سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس شملہ میں طلب کی۔ یہ کانفرنس ناکامیاب ہوگئی۔ اس لیے کہ اسے کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ وائسرائے نے یہ پسند کیا کہ وہ مسلم لیگ کے انوکھے مطالبات کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں باوجود اس کے کہ وہ اس کو جائز اور معقول نہیں سمجھتے تھے۔ لیگ کے لیڈر اس امر کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ ایک غیر لیگی کو یہاں تک کہ ایک غیر کانگریسی مسلم کو بھی جو وائسرائے کا نامزد ہو کیبنٹ میں شامل کیا جائے۔ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اتنی رقم صرف کرکے اور اتنی تکلیف اٹھا کر آخر یہ کانفرنس کیوں طلب کی گئی تھی۔ اس سے ملک میں ایک مایوسی اور غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بہتوں نے یہ پوچھا کہ جو لوگ ''ہندستان چھوڑ دو'' کے ریزولیوشن کی سوگند اٹھا چکے تھے وہ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے کیوں کر رضامند ہوئے جو موجودہ رجعت پسندانہ آئین کی بنیاد پر طلب کی گئی ہو۔ لیکن ایک ستیہ گرہی اگرچہ لڑائی کرنے میں تامل سے کام لیتا ہے مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک پرامن اور باعزت سمجھوتہ کا موقع موجود ہے تو تیزی سے صلح کرنا چاہتا ہے۔ اگر بنیادی اور اصلی باتیں مان لی جاتی ہیں تو وہ تیار ہو جاتا ہے کہ معاملات پر بحث کرنے کے لیے اپنے مخالفوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ جائے۔ مزید برآں اس وقت ہندستان کا غذائی مسئلہ بہت سنگین ہوا جارہا تھا، اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ ایک قومی حکومت، اس دفتری حکومت کی بہ نسبت جو پچھلے دنوں افسوسناک ابتری پھیلا چکی ہے اس کا کہیں بہتر انتظام کرے گی۔ ملک کو بھی اطمینان اور سکون کی ایک مدت کی ضرورت تھی تاکہ وہ قومی صورت حال کا جائزہ لے سکے۔

شملہ کانفرنس ناکامیاب ہوگئی، لیکن برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ ہندستانی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے وہ جلد ہی کوئی زیادہ قابل عمل تدبیر نکالے گی۔

برطانوی دفتری حکومت ایک سست رفتار مشین ہے۔اس کے علاوہ برطانوی لوگ ہمیشہ وقت اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔خانگی اور بین الاقوامی صورت حال میں اگر ان کے مفید مطلب کوئی تبدیلی ہو جائے تو وہ اس لائق ہو جاتے ہیں کہ زحمت انگیز پابندیوں سے اپنا دامن بچالیں۔لیکن کوئی مناسب حال تبدیلی نہیں ہوئی۔لیبر پارٹی ایک بھاری اکثریت کے ساتھ براسراقتدار آگئی۔ بین الاقوامی صورتِ حال بھی خطرناک امکانات سے معمور ہوگئی۔امپائر میں ہندستان سب سے زیادہ کمزور مقام تھا۔اس کے لیے ایک حل کی ضرورت پیش آئی۔ایک گشتی پارلیمنٹری کمیٹی اس غرض سے آئی کہ مطالعہ اور تحقیقات کرے۔اس کے پیچھے پیچھے وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس کی رہنمائی میں کیبنٹ مشن آیا۔ بڑی سیاسی پارٹیوں سے گفت وشنید کے ایک طویل عرصہ کے بعد کیبنٹ مشن نے اپنے 16 رمئی کے بیان میں آزاد اور متحد ہندستان کا آئین بنانے کے لیے ایک آئین ساز اسمبلی اور مرکز میں ایک عارضی حکومت کے قیام کے لیے اپنی پیشکش کا اعلان کر دیا۔

دہلی اور شملہ میں تین ماہ تک جو تھکا دینے والی گفت وشنید جاری تھی اس کی تاریخ سب کو معلوم ہے اس لیے دہرانے کی ضرورت نہیں۔اس کا خالص نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ آئین ساز اسمبلی کے پلان کو کانگریس اور لیگ دونوں نے منظور کرلیا مگر مرکز میں کوئی عارضی حکومت نہیں بنائی جاسکی۔کانگریس کے بغیر ہی حکومت بنانے کی دعوت دینے سے وائسرائے کے انکار پر لیگ لیڈروں کو اتنی مایوسی ہوئی کہ بعد کو انھوں نے اعلان کر دیا کہ آئین ساز اسمبلی میں بھی مسلم لیگ شریک نہیں ہوگی۔ اس لیے وائسرائے نے برطانوی کیبنٹ سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ کانگریس کو اکثریت والی پارٹی ہونے کی حیثیت سے عارضی حکومت بنانے کی دعوت دے دی جائے ۔مسلم لیگ کو شریک کرنے کا کام دانشمندی کے ساتھ کانگریس پر چھوڑ دیا گیا تھا۔کانگریس نے اس

پیشکش کو قبول کرلیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسٹر جناح سے ملاقات کی ۔لیکن حسب دستور اس طرف سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔اس لیے کانگریس نے مجبور ہوکر ستمبر 1946ء میں عہدہ قبول کرلیا۔

پھر جلد ہی وائسرائے نے کیبنٹ میں اپنے ساتھیوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر اپنے طور پر لیگ لیڈروں سے بات چیت شروع کی ۔ یہ طریق کار پہلے سے دھیان میں نہ تھا۔کانگریس کو جو پیشکش دی گئی تھی وہ غیر مشروط تھی پھر بھی کانگریس نے جو ہمیشہ اتحاد کی خواہشمند اور متلاشی رہتی ہے ،کوئی اعتراض نہ کیا۔ وائسرائے کی وساطت سے کانگریس اور لیگ نے پھر گفت وشنید شروع کی ۔اس کا نتیجہ بھی ناکامیاب ہوالیکن آخر میں لیگ نے وائسرائے کی یہ دعوت قبول کرلی کہ وہ عارضی حکومت کے چودہ ممبروں میں سے پانچ ممبروں کو نامزد کردے۔اس طرح آج لیگ کے نمائندے قومی حکومت میں موجود ہیں اور ساتھیوں کی طرح اپنے نمائندوں کے ذریعہ کام کررہے ہیں۔امید کی جاتی ہے کہ ایک ہی طرح کی مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ایک ہی طرح کے مسائل کو حل کرنے کے باعث ایک ایسا عملی اتحاد پیدا ہو جائے گا جو ہمیں ان دشوار وقتوں سے گزر جانے کے لائق بنادے گا۔

مجھے یقین ہے کہ اگر کانگریس اگست 1942ء میں برطانوی امپیریلزم کا چیلنج قبول نہ کرتی تو ہم اس پوزیشن میں نہ ہوتے جو آج ہمیں حاصل ہے اور نہ مسلم لیگ یا دوسری اقلیتیں اس پوزیشن میں ہوتیں۔اگرچہ ان میں سے بعض لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پسند نہیں کریں گے۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے پورن سوراجیہ کا مقصد اب تک حاصل نہیں کیا ہے لیکن ہمارے نمائندوں اور لیڈروں نے طاقت کے قلعہ کو توڑ کر اس میں داخلہ حاصل کرلیا ہے ۔ یہ غیر ملکی حکمرانی کا خاتمہ نہیں ہے ۔لیکن یقیناً انتہاء کی ابتداء ہے، بشرطیکہ ہم اپنے مواقع سے فائدہ اٹھانا سیکھ لیں۔تاہم اگر مکمل آزادی کا

مقصد ہم حاصل بھی کرلیں جب بھی ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارا کام ختم ہوگیا ہے۔قومی آزادی یقیناً ایک بیش قیمت چیز ہے۔ایک قوم کی زندگی کے لیے یہ ناگزیر شئے ہے لیکن یہ خواہ کتنی ہی بڑی اہمیت رکھتی ہو پھر بھی ایک منفی کامیابی ہے۔یعنی بیرونی زنجیروں کے توڑنے کا عمل ہے۔یعنی صرف ایک رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔یہ بہت ممکن ہے کہ جب کسی شخص کی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں دور کردی جائیں تو وہ اپنی نو یافتہ آزادی سے اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچانے لگے۔اگر ہم عقلمند ہیں تو ہم صرف بیرونی بندشوں کے ٹوٹ جانے پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اپنے معاملات کو اس طرح منظم کریں گے کہ جو آزادی ہم حاصل کریں وہ ہمارے برادرانِ وطن کے لیے حقیقی بہبودی میں مبدل ہوجائے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا انقلابی جوش پرانے نظام کو نیست و نابود کرنے کے بعد ہمیشہ تعمیری سرگرمیوں میں تخلیقی قوت کے اظہار کی صلاحیت حاصل کرتا رہے۔یہ تعمیری کوشش ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہ ہوگی ہماری انقلابی تحریک، جو کہ عدم تشدد پر مبنی ہے تاریخ میں بے مثال ہے۔عام طور پر سیاسی انقلابات صرف پرانے نظام کی تباہی کے لیے ہوتے ہیں۔ان کی حکمت عملی صرف طاقت پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے مرتب کی جاتی ہے اور قوم کی زندگی کو پھر سے سانچے میں ڈھالنے کی تمام تعمیری کوششیں پرانے نظام کو پورے طور پر تباہ کرنے اور طاقت پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد میں ہوتی ہیں۔اس طریقہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات کے درست و روبراہ ہونے اور تعمیری کوششوں کو شروع کرنے سے پہلے صرف ایک نہیں بلکہ کئی انقلابات آتے ہیں۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس طریق عمل سے خانہ جنگی پیدا ہوتی ہے اور بالآخر ڈکٹیری حکومت قائم ہوجاتی ہے۔خانہ جنگی اور ڈکٹیٹری دونوں ایسی چیزیں ہیں جو انقلاب کے مقاصد ہی کو شکست دے دیتی ہیں۔ فرانسیسی اور روسی انقلابات نے یہی نتیجہ پیدا کیا۔

کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں صرف پرانے نظام کی بیخ کنی اور حصول طاقت پر حد سے زیادہ زور دینے سے پرہیز کیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تعمیری پروگرام پر بہت زور دیا ہے۔ اس کے تخریبی اور تعمیری پروگراموں پر گزشتہ 26 سال سے عمل کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کے لیے سول نافرمانی کی مؤثر تیاری صرف اسی میں ہے کہ تعمیری پروگرام پر پوری شدت سے عمل کیا جائے۔ اب جب کہ ارباب کانگریس بہت سے صوبوں میں نظم ونسق چلا رہے ہیں اور مرکز میں بھی ایک قسم کی قومی حکومت موجود ہے ہمارے لیے یہ کام دشوار نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اپنی کوشش کو بڑھائیں اور گاندھی جی کے بنائے ہوئے اور کانگریس کے منظور کیے ہوئے تعمیری پروگرام کے پورے امکانات سے فائدہ اٹھائیں۔

ہماری قومی جدوجہد جوں جوں آگے بڑھتی گئی ہے ہمارے کام کی نوعیت بھی واضح سے واضح تر ہوتی چلی گئی ہے۔ بہت دن پہلے ہم نے صرف تخریب اور حصولِ طاقت کی ترکیبوں کے خلاف فیصلہ کیا تھا اسی لیے ہم نے پستول اور بم کے استعمال کو متروک کر دیا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمارا انقلاب ایک کھلی ہوئی سازش کی شکل کا ہونا چاہئے اور اس میں بتدریج عوام الناس کو شامل کرنا چاہئے اس لیے یہ لابدی ہوا کہ اس میں اخفائے راز اور تشدد کا کوئی شائبہ موجود نہ ہو۔ ایک ایسا انقلاب جو عوام کے ہاتھوں لایا گیا ہو اور وہ بھی عدم تشدد پر مبنی ہو، جمہوریت کے معنی رکھتا ہے۔ اس لیے ہمارا کانگریس آرگنائزیشن بھی ایک جمہوری آئین رکھتا ہے۔ حقیقت میں اگر جمہوریت کو اصلی اور مؤثر جمہوریت ہونا ہے اور صرف رسمی و دستوری جمہوریت نہیں ہونا ہے تو اس کی بنیاد یقیناً عدم تشدد پر ہونی چاہئے اور عدم تشدد اگر صرف ظاہری اور زبانی جمع خرچ نہیں ہے تو ضرور ہے کہ یہ جمہوریت کی طرف رہنمائی کرے۔ عدم تشدد اور ڈکٹیٹری متضاد چیزیں ہیں ہم آج کانگریس کی اس جمہوری نوعیت کو بدل نہیں سکے اور نہ ایسا کرنا

مناسب ہوگا۔ اس لیے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہم سیاسی جمہوریت کا عہد کر چکے ہیں اور ہمارا سوراجیہ جمہوری قسم کا ہوگا یہ کسی ایک شخص کی حکمرانی نہ ہوگی چاہے وہ شخص کتنا بڑا ہو یا کسی ایک خاندان کی حکمرانی نہ ہوگی چاہے وہ خاندان کتنا ہی مشہور اور درخشاں ہو اور نہ یہ کوئی ایسا سوراجیہ ہوگا جو کسی خاص فرقہ یا مسلک یا جماعت کے تحت میں ہو، یہ عوام کی حکمرانی ہوگی، عوام ہی کے ہاتھوں اور عوام ہی کی بہبودی کے لیے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ساری دنیا میں سیاسی جمہوریت اگر کسی قسم کی اقتصادی برابری پر مبنی نہیں ہوتی تو وہ صرف ایک ظاہری صورت بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی سوسائٹی میں جہاں دولت کی تقسیم بہت غیر مساوی ہوتی ہے، جمہوری صدا اپنی بڑی معنویت سے محروم ہو جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یورپ کے چھوٹے ممالک مثلاً ناروے، سویڈن، ڈنمارک وغیرہ بڑے سرمایہ دار ممالک کی بہ نسبت زیادہ حقیقی جمہوریت رکھتے ہیں، جس کا واحد سبب یہ ہے کہ ان کی جمہوریت بڑی حد تک اقتصادی برابری پر قائم ہے۔

لیکن اقتصادی برابری کمیونسٹ نظام کے تحت میں بھی ہو سکتی ہے۔ جو مرتکز کی ہوئی یعنی ایک مرکز پر لائی ہوئی بڑی بڑی صنعتوں پر مبنی ہو۔ میرا عقیدہ ہے کہ اقتصادی برابری ایک ایسی سوسائٹی میں جس کا اقتصادی نظام صرف بڑی انڈسٹری پر قائم ہو یقینی طور پر صرف چند آدمیوں کے ہاتھوں میں طاقت جمع کر دینے کا باعث ہوتی ہے۔ اگر سیاسی طاقت یہ رجحان رکھتی ہے کہ طاقت والوں کو بداخلاق بنا دے تو یہ رجحان اس وقت اور بھی دوگنا ہو جاتا ہے جب سیاسی اور اقتصادی دونوں طاقتیں ایک ہی ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہیں۔ سرمایہ داری نے جمہوریت کو اس طرح ہلاک کر دیا کہ سرمایہ دار طبقہ بالواسطہ یا بلا واسطہ سیاسی طاقت کا مالک بن بیٹھا۔ کمیونزم اقتصادی طاقت کا پورا کنٹرول سیاسی ڈکٹیٹر یا دفتری ملازم کے ہاتھوں میں رکھ دیتا ہے۔

اس میں جمہوریت کے لیے وہی خطرہ موجود ہے جو سرمایہ داری میں ہے۔

اس لیے اگر جمہوریت کو برقرار رہنا ہے تو اس کو ایک ایسا طریقہ ضرور دریافت کرنا چاہئے جو اقتصادی طاقت کو حکمراں یا حکمرانوں کے ہاتھوں میں خواہ وہ کتنے ہی برگزیدہ یا منتخب ہوں، مرتکز ہونے سے روک دے، اگر فرد کے لیے آزادانہ سرگری کے کوئی میدان باقی نہیں رہیں گے تو سیاسی جمہوریت بھی ڈکٹیٹر بن جا سکتی ہے۔ اقتصادی میدان میں کانگریس کی تاریخی کارگزاری یہ رہی ہے کہ اس نے لامرکزی صنعت کی کھلی علمبرداری کی ہے۔ تقسیم بنگال کی تحریک سے اب تک ہمارے سیاسی مفکروں نے ہمیشہ دیہاتی اور گھریلو صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ جب سے گاندھی جی نے ہندستانی سیاسیات میں قدم رکھا یہ حمایت اور بھی زور پکڑ گئی ہے اور قومی تعمیر کے ایک واضح پروگرام میں مبدل کردی گئی ہے۔ اس لیے اس منزل پر پہنچ کر ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سوراجیہ کی اصلیت کو صاف طور پر ظاہر کردیں اور یہ کہہ دیں کہ موجودہ حالات میں اس کی کوشش اسی سمت رہے گی کہ جتنا زیادہ ممکن ہو صنعت کو لامرکزیت کی طرف لے جایا جائے اور ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ صرف لامرکزیت ہی کے ذریعہ ہم اپنی زرعی آبادی کی بھاری اکثریت کی پرانی بے روزگاری کے مسئلہ کو مؤثر طور پر حاصل کرسکتے ہیں۔

کانگریس نے 1939ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر صدارت ایک تعمیری کمیٹی مقرر کی تھی۔ یہ کمیٹی چند سال سے کام کررہی ہے۔ اس نے بہت سی معلومات اور اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کی محنتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن ہم اس کی فراہم کردہ معلومات کو اس وقت تک کام میں نہیں لا سکتے جب تک کانگریس یہ فیصلہ نہ کرے کہ کن کن صنعتوں کو مرتکز کرنا ہے اور کن کن صنعتوں کو لامرکزی بنادینا ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو ہر صوبہ اپنا اپنا راستہ اختیار کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ

اب بھی بڑی انڈسٹری کے میدان میں کانگریسی صوبوں کے درمیان ایک قسم کا مقابلہ جاری ہوگیا ہے۔ ہر صوبہ یہ چاہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ ملیں اور فیکٹریاں قائم کی جائیں۔ ہم نے خیال کیا تھا کہ کپڑا بنانے کی صنعت ایک ایسی صنعت ہے جو زیادہ سے زیادہ ''لامرکزیت'' کے لائق ہے مگر اس میں بھی ہر صوبائی حکومت دوسری صوبائی حکومت سے کپڑے کا نیا نیا کارخانہ قائم کرنے میں مقابلہ کررہی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کپڑے کی موجودہ کمی کی حالت میں زیادہ پیداوار کے تمام ذرائع اختیار کیے جائیں لیکن یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اس سے لابدی طور پر نئے سرمایہ دارانہ مفادات بڑھتے ہیں۔ کھدر کا کام کرنے والے کی حیثیت سے میرا عقیدہ ہے کہ کمتر سرمایہ اور کمتر کوشش سے اور کمتر مدت میں چرخہ اور کرگہ کی منظم حوصلہ افزائی کے ذریعہ بہت کچھ کام انجام دیا جاسکتا ہے بہ نسبت اس کے کہ نئے نئے مل کھولے جائیں۔ میں نے صرف کپڑے کی صنعت کی مثال پیش کی ہے، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے یہ فیصلہ کریں کہ کن کن صنعتوں کو مرکزیت اور کن کن صنعتوں کو ''لامرکزیت'' کی بنیاد پر چلایا جاسکتا ہے۔

جب میں ''لامرکزی'' صنعت کا ذکر کرتا ہوں تو میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف ہاتھ کی طاقت کا استعمال ناگزیر ہے۔ کام کرنے والے گھر اور دیہات میں اس کی قابلیت اور میدان عمل کو بڑھانے کے لیے برقی طاقت بھی کام میں لائی جاسکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انڈسٹری کی اس ''لامرکزیت'' سے قومی دولت کے وقتاً فوقتاً ضائع ہونے کا وہ عمل رک جائے گا جو صنعتی جھگڑوں اور ہڑتالوں وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے جس حد تک یہ جھگڑے روکے جاتے ہیں لوگوں میں اچھے پڑوسی بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ''مرکزی'' صنعت ''کوآپریٹو'' یعنی امداد باہمی کی بنیاد پر قائم کی جاسکتی ہے ضرورت اس کی ہے کہ پیداوار اور تقسیم دونوں کی کوآپریٹو سوسائٹیاں بنائی جائیں۔

اگر پیداوار کی کواپریٹو سوسائیٹیوں کا فوری قیام ممکن نہیں ہے تو تقسیم ہی کی کواپریٹو سوسائٹیاں ابھی پبلک اداروں اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے قائم کی جاسکتی ہیں۔ دیہات کا کام کرنے والا شخص چیزوں کی پیداوار میں اتنی مشکل محسوس نہیں کرتا جتنی کہ ان کو بازار تک بھیجنے اور فروخت کرنے میں۔

ہماری زراعت کو بھی زیادہ سے زیادہ لامرکزی صنعت کے نمونہ کی تقلید کرنی چاہیئے۔ اس میں خاص طور پر کسانوں کو حق ملکیت مل جانا چاہیئے اس شرط کے ساتھ کہ کسی اراضی کی خواہ وراثت، خواہ قرضہ یا کسی دوسرے سبب سے، ایسی ضمنی تقسیم نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ ایک دیہاتی گھرانے کی کفالت کرنے کے لائق نہ رہے۔ لامرکزی صنعت اور زراعت دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہونا چاہیئے۔ جہاں تک ممکن ہو مؤخر الذکر کا انتظام بھی امداد باہمی کی بنیاد پر ہونا چاہیئے کاشتکاری کے لیے بھی اور بازاروں میں فروخت کے لیے بھی۔

کانگریس یہ عہد کر چکی ہے کہ وہ سلطنت (اسٹیٹ) اور کسان کے بیچ سے درمیانی آدمی کو خارج کر دے گی۔ پچھلے دنوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک غیر سرکاری ریزلیوشن کی موافقت میں ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ صوبائی حکومتوں سے اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے دفتر میں زمینداری سسٹم کو منسوخ کرنے کے لیے ان کی اسکیمیں طلب کی جائیں۔ اب جو مواد اس سلسلہ میں موصول ہوا ہے ان کو منظم کر کے ورکنگ کمیٹی میں غور و خوض کے لیے پیش کیا جانا چاہیئے۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں ورکنگ کمیٹی کی ہدایت پر تیزی سے عمل کیا جائے گا اور ہماری زرعی اقتصادیات سے درمیانی آدمی کو خارج کرنے کے مسئلہ پر ایک جامع اسکیم تیار کرنے کے لیے ماہروں کی ایک جماعت مقرر کی جائے گی۔ ماہروں کی یہ جماعت ایسے خاکے بھی تیار کر سکتی ہے، جو مناسب تبدیلیوں کے ساتھ مختلف صوبوں کی ضروریات پوری کریں۔ صوبہ

یو پی میں زمینداری سسٹم کی تنسیخ کے لیے ایک سرکاری بل جلد ہی لیجسلیچر میں پیش کیا جانے والا ہے اور ایک کمیٹی اس لیے مقرر کردی گئی ہے کہ یو پی لیجسلیچر نے جو رزولیوشن پاس کیا ہے اس کی مناسبت سے ایک بل کا مسودہ تیار کیا جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ بل آسانی سے پاس ہو جائے گا۔ زمینداروں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے اس لیے کہ اس بل میں ان کو کافی معاوضہ ادا کرنے کی شرط داخل کردی گئی ہے۔

وہ غذائی مسئلہ جس نے جنگ کے زمانے میں خطرناک وسعتیں اختیار کر لی تھیں آج بھی ہمارے لیے ایک بڑا دردِ سر بنا ہوا ہے۔ ہم اب تک غیر ممالک کی امداد کے محتاج ہیں۔ غیر ملکوں پر ہمارا یہ انحصار جہاں تک ہماری زندگی کی ابتدائی ضرورتوں کا تعلق ہے جلد از جلد دور ہونا چاہئے۔ ضروری زراعتی اصلاح کے بعد یہ پیداوار کو فوراً بڑھانا اور ہندستان کی موجودہ آبادی کے لیے غذا بہم پہنچانا مشکل نہیں ہونا چاہئے۔ ہماری زرعی پیداوار بیحد پست ہے۔ جاپان میں لوگ فی ایکڑ 3909 پونڈ چاول پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ہندستان میں صرف 939 پونڈ حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح گیہوں کی پیداوار جاپان میں 2010 پونڈ فی ایکڑ ہے لیکن ہندستان میں صرف 774 پونڈ ہے۔ اس میدان میں منظم زرعی ریسرچ کا ایک بڑا موقع موجود ہے یہاں کافی مقدار میں غیر آباد زمین بھی موجود ہے جو کنوئیں اور نہر کی آبپاشی اور مناسب کھاد کے ذریعہ زیر کاشت لائی جا سکتی ہے۔ مزید برآں غذائی فصلوں اور ''روپیہ کی فصلوں'' کے درمیان مناسب رشتہ بھی از سرِ نو قائم کرنا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو، دونوں ذرائع سے کاشتکار کی آمدنی کو مساوی بنا دینا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو زیادہ روپیہ والی فصلوں کو چھوڑنے اور کم آمدنی والی فصلوں کو اختیار کرنے کے لیے کسانوں پر کوئی مشورہ یا ترغیب کارگر نہ ہوگی۔ مستقبل میں قحط کو اور قحط کے خطرے کو روکنے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ملک ایسے بڑے یا چھوٹے علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے

جو انسانی غذا کی بنیادی چیزوں کے سلسلہ میں کافی بالذات ہوں۔ اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان علاقوں میں وہی چیزیں پیدا کی جائیں جو سائنس کے اعتبار سے ایک متوازن غذا مہیا کر سکیں۔ ہماری زرعی آبادی کی صحت جو ہماری قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس وقت تک ترقی نہیں کر سکے گی جب تک اس کو روزانہ دو وقت پیٹ بھر کر سائنٹفک اعتبار سے متوازی غذا نہیں ملے گی۔ دیہاتی صحت وصفائی کی پہلی شرط مناسب غذا ہے۔ متوازن غذا کے مسئلہ پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔ لیکن گاندھی جی کی کوشش سے اتنا کافی کام کیا جا چکا ہے کہ ایک مفید ابتداء کی جا سکتی ہے۔

آج مرکز میں ہمارے محترم لیڈر بابو راجندر پرشاد موجود ہیں جو محکمہ غذا کے بہت ہی بااحتیاط اور راست باز وزیر ہیں اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمیں صرف موجودہ مشکلات پر ہی عبور حاصل کرنے کے لائق نہیں بنائیں گے بلکہ مستقبل کے لیے ایسے انتظامات کریں گے کہ ہم غیر ملکی دروازوں پر غذا کی بھیک مانگنے کے لیے کبھی مجبور نہ ہوں گے۔

اگر نئی دنیا میں جمہوریت بہت سی اقتصادی سطحوں کو بلند و پست کیے بغیر ممکن نہیں ہے تو وہ ان بین الاقوامی رقابتوں سے بھی موافقت نہیں رکھتی جو وقتاً فوقتاً عالمگیر لڑائیاں پیدا کرتی ہیں۔ جنگ میں ہمیشہ طاقت مرتکز ہو جاتی ہے۔ جنگ سیاسی آقاؤں اور ضابطہ پرست حاکموں کی طاقت کو بڑھا دیتی ہے۔ شہری آزادیاں کم کر دی جاتی ہیں۔ آزادانہ اجتماع اور آزادانہ اظہار رائے کے حقوق خواہ وہ پلاٹ فارم، یا پریس یا ریڈیو سے تعلق رکھتے ہوں بڑی حد تک چھین لیے جاتے ہیں۔ جدید لڑائیاں عالمگیر بن جانے کا رجحان رکھتی ہیں۔ بہت کم ممالک اپنی غیر جانبداری کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ غیر جانبدار ممالک میں بھی جنگ کا خوف شہری آزادیوں کو گھٹا دیتا ہے اور سلطنت (اسٹیٹ) کے اختیارات کو بڑھا دیتا ہے اس لیے اگر جمہوریت کو

مناسب اور مکمل طور پر کام کرنا ہے تو باہمی نیک نیتی اور اتحادِ عمل کو بین الاقوامی نزاع وجنگ کی جگہ لینی چاہئے۔ لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو جنگ کے متعلق کسی ایک قوم کے رویہ سے حل نہیں ہوسکتا جب تک سامراجی سلطنتیں قائم ہیں۔ خواہ وہ فاشسٹ ہوں جمہوری ہوں یا سوشلسٹ ہوں، بین الاقوامی رقابتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے جنگ ہی ایک ذریعہ بنی رہے گی۔ میں نے یہاں پر سوشلسٹ سامراجوں کا تذکرہ کیا ہے اس پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ سوشلزم اور امپیریلزم دو متضاد چیزیں ہیں لیکن اسی طرح جمہوریت اور امپیریلزم بھی تو متضاد چیزیں ہیں پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ شہنشاہی جمہوریتیں موجود ہیں۔ جمہوریت کی طرح سوشلزم بھی عملی اعتبار سے سیاسی اور اقتصادی شہنشاہیت کے ساتھ ہوسکتا ہے بالشویک روس کو اب تک دنیا کو اس امر کا یقین دلانا باقی ہے کہ اس نے اپنے پڑوسیوں پر منہ مارنے کی زاری پالیسی ترک کر دی ہے۔ انگلستان کی سوشلسٹ حکومت سے بھی ایسی یقین افزا علامتیں ظاہر نہیں ہوتی ہیں کہ اس نے اپنے شہنشاہی مقبوضات پر سے اپنا قبضہ اٹھالینے کا ارادہ کرلیا ہے۔ ہندستان میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں وہ بھی مذبذب اور سست ہیں اور یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ شہنشاہیت کو ترک کرنے کی حقیقی خواہش کی بہ نسبت زیادہ تر بین الاقوامی صورتِ حال کی پیداوار ہیں۔

مختصر یہ کہ ہماری تحریک آزادی کا تاریخی ارتقاء چونکہ عدم تشدد اور عوام کی بہبودی سے وابستہ ہے اس لیے اس کا تقاضا ہے کہ ایک ایسا سوشل نظام قائم کیا جائے جو اقتصادی لوٹ سے آزاد ہو، جمہوری اصولوں پر عمل کرتا ہو اور بین الاقوامی امن واتحاد عمل کا حامل ہو۔ ایسی سوسائٹی ہمارے موجودہ زمانے کے بلند ترین آدرشوں سے موافق ہوگی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں کانگریس انھیں مقاصد کے لیے کام کرتی رہی ہے۔ آج اس کا فرض ہے کہ وہ ان مقاصد کو زیادہ صفائی سے واضح کردے اور ان کو

حاصل کرنے کے لیے زیادہ شعور وادراک کے ساتھ کام کرے اور جونئی طاقت اسے حاصل ہوئی ہے اس کو اسی نتیجہ کے لیے استعمال کرے۔

آج مرکز میں ایک طرح کی قومی حکومت موجود ہے۔ اور صوبوں میں لوگوں کی منتخب کی ہوئی حکومتیں کام کر رہی ہیں جلد ہی ہم ہندستان کے لیے ایک نیا آئین مرتب کرنے کی غرض سے جمع ہوں گے۔ آزادی اگر چہ حاصل نہیں ہوئی ہے تاہم یقینی طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اہل برطانیہ کے ارادے خواہ کچھ بھی ہوں وہ اب ہمیں آزادی دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگر آج ہم اپنے مقصد سے محروم رہ جائیں گے تو یہ قصور ہمارا ہوگا اور ان غلطیوں کا نتیجہ ہوگا جو اس نازک موقع پر ہم سے سرزد ہوں گی۔ ایک مریض کے لیے سب سے زیادہ خطرناک وقت وہ نہیں ہوتا جب کہ مرض کی شدت ہو بلکہ وہ ہوتا ہے جب کہ مریض بحالی صحت کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کی نگرانی ڈھیلی پڑ چکتی ہے اور اسے خود ہی اپنا خیال کرنا پڑتا ہے۔ ہم اس وقت اسی نازک حالت میں ہیں اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہمارے دشمن بہت چالاک اور ہوشیار ہیں۔ ہندستان میں برطانی شہنشاہیت کی سب سے بڑی طاقت اس چیز میں ہے کہ خود ہندستانیوں کو آلۂ کار بنا کر اپنے برے منصوبوں کو کام میں لانا اس کے لیے ممکن بنا رہا ہے۔ ہندستان خود ہندستانی روپیہ سے، ہندستانی ذرائع سے، ہندستانی سپاہیوں سے اور اکثر ہندستانی دماغوں سے فتح کیا گیا ہے۔ ہمارا افسوس ناک سانحہ ہماری تقسیموں اور اختلافات میں موجود ہے اور اس رجحان میں کہ وسیع تر قومی مفادات کو فرقہ، مسلک یا جماعت کے مفادات پر قربان کر دیا جائے۔ ہم چھوٹے چھوٹے اجزا کے ساتھ وہ وفاداری برتتے ہیں جو ہمیں ''کل'' کے ساتھ برتنی چاہیے۔ یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ تمام سیاسی اچھائیوں میں، اتحاد سب سے بڑی اور اہم ترین چیز ہے بہ شرطیکہ یہ اتحاد دباؤ یا طاقت کے ذریعہ اوپر سے

عاید نہ کیا گیا ہو بلکہ فطری اور طبعی ہو۔ اس میں اہل برطانیہ صرف ہندستانیوں ہی پر نہیں بلکہ دوسری یورپین قوموں پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ اپنی تاریخ کی ہر نازک گھڑی میں اہل برطانیہ نے مذہبی جماعتی اور پارٹیوں کے اختلافات کو ترک کر دیا ہے۔ سولہویں صدی میں بھی جب کہ مذہبی اختلافات کے باعث مذہبی لڑائیاں ہوتی تھیں اور کیتھولک لوگ پروٹسٹنٹ لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ جس وقت برطانیہ کو اسپین کے کیتھولک بادشاہ کی طرف سے حملہ کا خطرہ ہوا برطانوی کیتھولک جماعت اگر چہ مظالم کا شکار تھی تاہم وہ ایک غیر ملکی حملہ کی مدافعت کے لیے اپنے پروٹسٹنٹ برادرانِ وطن کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہوگئی۔ پچھلی لڑائی میں بھی جب کہ قومی ضرورت نے انھیں مجبور کیا برطانیہ کے سوشلسٹوں نے چرچل جیسے رجعت پسند، گھمنڈی اور جماعت پرست شخص کے تحت میں کام کرنے میں کوئی پس وپیش نہ کیا۔ لیکن ہندستان میں چھوٹے چھوٹے اختلافات ناقابل عبور خلیج پیدا کر دیتے ہیں جو نقطے مشترک ہوتے ہیں۔ ان کو لوگ بھول جاتے ہیں اور ادنیٰ اختلافات پر زیادہ زور دینے لگتے ہیں۔ اگر ہمیں ایک قوم کی طرح زندہ رہنا اور ترقی کرنا ہے، تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مرکز سے گریز کرنے کے اس طبعی رجحان کو روک دیں۔

اس وقت ہماری آزادی کے لیے سب سے بڑا خطرہ فرقہ وارانہ اختلافات ہیں جو بالخصوص دو بڑی جماعتوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ غیر ملکی حکمران نے گذشتہ دنوں میں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ آج وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تاش کا آخری ترپ کا پتہ یہی ہے وہ اس کو نہایت چالاکی اور باریکی سے کھیل رہا ہے۔ یہ غیر تاریخی، غیر علمی اور غیر فطری خیال ہے کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ ان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مفادات ایک ہیں۔ ان کے مشترک نقطے بے شمار ہیں۔ ان کے اختلافات آسانی سے شمار کیے جاسکتے ہیں۔

اورصرف سطحی ہیں۔ غیر ملکی لوگ لباس کے اتفاقی امر کے علاوہ اور کسی چیز سے ہندو اور مسلم میں تمیز نہیں کر سکتے اور وہ اس حالت میں جب کہ وہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کے اختلاف لباس سے واقف ہوں۔ ہندستان سے باہر ہندستان کو ایک واحد ملک سمجھ لیا جاتا ہے۔ کسی فاتح نے خود کو اس وقت تک محفوظ نہیں سمجھا، جب تک کہ اس نے پورے ملک پر قبضہ نہ کر لیا ہو۔ کسی دیسی فرمانروا نے اپنی سلطنت کو مکمل خیال نہ کیا جب تک کہ اس نے اس پورے قدیم ملک پر اپنا تسلط نہ جمایا۔ ہندستان کی تاریخ کے وہی دور سب سے زیادہ بار آور ہیں جن میں ہندستان ایک ہی حکومت کے تحت میں متحد تھا۔ خواہ وہ قدیم موریہ یا گپتا خاندان کے تحت میں ہو یا مغلوں کے تحت میں۔

اگر چہ موجودہ غیر ملکی حکمرانی نے ہندستان کی فطری قابلیت کو ایک غیر فطری اجنبی تعلیم کے سسٹم سے، اور اختراعی کاموں کے تمام مواقع کی محرومی سے، سخت نقصان پہنچایا ہے تاہم ایک واحد اور مشترک ''بدانتظامی'' بھی خیال وعمل کے اکثر میدانوں میں تخلیقی قوت کی پیداوار کا باعث ہوئی ہے۔ ہندستان میں ایک دورِ جدید بھی آ گیا ہے۔

ایسی حالت میں ہندستان کو ہندو اور مسلم دو قوموں میں منقسم سمجھنا ایک رجعت پسندانہ فعل اور پیچھے کی طرف ہٹنے کا عمل ہے خود میرے پوتے اور پوتیاں سندھ میں ہیں جو مسلمان ہیں۔ وہ مجھ سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح میرے ہندو پوتے پوتیاں محبت کرتے ہیں۔ میں یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ میں ایک ہندو اور ہندستانی کی حیثیت سے اور وہ لوگ مسلمانوں کی حیثیت سے مختلف قومیت کے افراد ہیں۔ ان میں سے ایک نے جو ایک خوبصورت چھوٹی دلہن ہے مجھے پچھلے دنوں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ''ہم آپ کو وہ سب سے بڑا اعزاز حاصل کرنے پر جس کی آرزو کسی ہندستانی کو ہو سکتی ہے مخلصانہ مبارک پیش کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ بڑی مدت تک امتیازی حیثیت اور خدمت کے ساتھ کانگریس کی گدی کو زینت بخشیں۔ یہ ایک حقیقت

ہے کہ ہم پکے مسلم لیگی ہیں، لیکن ہم دعا کرتے ہیں کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے۔"

اس سلسلہ میں ہندستانی مسلمانوں کے لیے اس عہدے پر اپنے پیش رو کے الفاظ دہرانا چاہتا ہوں۔ مولانا صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا تھا "ہم ہندستانی مسلمان کیا مستقبل کے آزاد ہندستان کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں یا ہمت واعتماد کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مستقبل کے لیے کوئی موجودہ اعلان، کوئی آئینی تحفظ ہمارے شکوک وشبہات کا علاج نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں ہم تیسری طاقت کی موجودگی کو برداشت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ تیسری طاقت اس وقت بھی یہاں مضبوطی سے موجود ہے اور واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور اگر ہم خوف وشبہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیں اسی کی طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ لیکن اگر ہمیں یقین ہے کہ ہمارے لیے خوف وشبہ کی کوئی جگہ نہیں ہے اور ہمیں مستقبل کو ہمت واعتماد کی نگاہوں سے دیکھنا ہے تو ہمارا راستہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ ہم خود کو ایک نئی دنیا میں پاتے ہیں جو شک اور تذبذب کی بے عملی اور مایوسی کے تاریک سایوں سے بالکل پاک ہے اور جہاں اعتماد اور قوت ارادی، عمل اور جوش عمل کی روشنی کبھی نہیں بجھتی۔"

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ اعتماد اور ارادے کی کمی نے اسلام کو باعظمت نہیں بنایا۔ آج ہندستان میں مسلم لیگ خوف اور شبہ کا درس دیتی ہے اور پوری مسلم جماعت کو اس سے متاثر کرتی ہے جب مسلمان ہندستان میں پہاڑوں کی دوسری سمت سے آئے تھے تو صرف چند ہزار کی تعداد میں تھے۔ لیکن وہ کروڑوں ہندوؤں سے خوف زدہ نہ تھے وہ اپنے عقیدہ اور جوش عمل کی طاقت لے کر آئے تھے۔ آج وہ ہندستان کی آبادی کا چوتھا حصہ ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں جیسا کہ مولانا صاحب نے صحیح طور پر فرمایا تھا

"ہندستانی سیاسیات کی ترکیب میں اس سے زیادہ حقیقت سے بعید کوئی بات نہیں ہے کہ ہندستانی مسلمان ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اقلیت کا لفظ ایک ایسی جماعت کے معنی نہیں دیتا جو تعداد میں کم ہو اس لیے مخصوص تحفظ کی مستحق ہو اس کے معنی ایک ایسی جماعت کے ہیں جو تعداد میں اتنی قلیل ہو اور قوت عطا کرنے والے اوصاف سے اس قدر محروم ہو کہ اس کو اپنے چاروں طرف کی بہت بڑی جماعتوں سے خود اپنی حفاظت کرنے کے لیے اپنی صلاحیت پر بھروسہ نہ ہو۔ اس طرح یہ محض تعداد کا سوال نہیں ہے، اس میں دوسرے عناصر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ گیارہ صوبوں میں سے چار صوبوں میں مسلم اکثریت موجود ہے اگر برطانی بلوچستان بھی شامل کردیا جائے تو مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہوجاتے ہیں اگر ہم اس وقت مذہبی جماعت بندی کی بنیاد پر اس سوال پر غور کرنے کے لیے مجبور ہوں جب بھی مسلمانوں کی پوزیشن صرف اقلیت کی نہیں ہے اگر وہ سات صوبوں میں اقلیت میں ہیں تو پانچ صوبوں میں اکثریت میں ہیں۔ ایسی صورت میں اس کا قطعاً کوئی سبب نہیں ہے کہ وہ اقلیت میں ہونے کے احساس سے مغلوب ہوجائیں۔"

اس لیے میں یہ نظریہ رکھتا ہوں کہ جو ہندو کسی مسلم کو اجنبی یا غیر سمجھتا ہے وہ صرف اپنے مذہب ہی کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ وہ ہندستان کی آزادی اور ترقی کا دشمن ہے اسی طرح اگر مسلمان جو گوشت وپوست کا ایک جزو ہیں ایسا عقیدہ رکھتا ہے یا عمل کرتا ہے جیسے کہ وہ اجنبی یا غیر ہو تو وہ بھی اپنی جماعت اور پوری قوم کو برابر کا نقصان پہنچاتا ہے ہم میں مذہب کے سوا تقریباً تمام چیزیں مشترک ہیں اور مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے۔ مذہب کے سوال پر لڑنا بربریت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی موجودہ جنگ کوئی مذہبی جنگ نہیں ہے یہ صرف ایک خالص فرقہ وارانہ لڑائی ہے۔ اس کو ان سیاسی اور اقتصادی امور سے کوئی واسطہ نہیں ہے جو دونوں فرقوں کے عوام کی

بہبودی سے تعلق رکھتے ہیں یہ عوام الناس چالاک اور اکثر غیر دیانتدار رہنماؤں کے ہاتھوں میں آلہ کار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ لیکن اسباب خواہ کچھ بھی ہوں ہمیں موجودہ کھنچاوٹ اور تلخی کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا اور اپنا راستہ اس طرح نکالنا ہوگا کہ بڑی نزاع سے ہم بچے رہیں۔

میں اپنے انتخاب کے بعد پبلک بیانات میں کہہ چکا ہوں کہ کانگریس کا فرض ہے کہ وہ اقلیتوں کے مطالبات کو مان لے لیکن اس طرح نہیں کہ ان پر قومی مفاد کو قربان کر دیا جائے۔ گذشتہ دنوں میں بات ماننے اور راضی ہو جانے کا ایسا ہی عمل زیادہ تر ہمارے لیے پریشانیوں کا باعث ہوا ہے۔ مزید برآں جب حقیقتیں متضاد اور الجھن پیدا کرنے والی ہوں تو بہترین طریقہ یہی ہے کہ بنیادی اخلاقی اصولوں کی طرف رجوع کیا جائے جب حقیقتیں بالکل صاف اور غیر مشتبہ ہوں تو اصولوں کے متعلق کچھ مصالحت کر لی جا سکتی ہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑے سے جو بنیادی اصول وابستہ ہیں وہ قومیت اور جمہوریت کے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے قومیت فرقہ داری سے بلند تر اصول ہے اور جمہوریت جماعتی اقتدار سے بلند تر ہے اس لیے ہم جو کچھ بھی کریں۔ اسی میں ہمیں قومیت اور جمہوریت کے اصولوں پر فرقہ وارانہ اور غیر جمہوری اصولوں کو فتح حاصل کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اس نظریہ کی رو سے میرا یہ خیال ہے کہ کانگریس کو کبھی جداگانہ انتخابات جو غیر جمہوری اور قومیت کش ہیں قبول نہیں کرنے چاہیے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم دلیری کے ساتھ جداگانہ انتخابات کا غیر جمہوری اصول ماننے سے انکار کر دیتے تو ہماری بہت سی موجودہ مشکلات پیدا نہ ہوتیں۔ فرقہ وارانہ جھگڑے نے آج صرف سنگین ہی نہیں بلکہ ایک شر انگیز صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ موجودہ پریشانی سے بچنے کے لیے ہم ان اصولوں کو تسلیم کر لیں جو قومیت اور جمہوریت کی جڑیں کاٹتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو نہ صرف قوم کے

ساتھ بلکہ بالآخر مسلم اور دوسرے فرقوں کے ساتھ بھی یہ ہماری دغا بازی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے بزرگان آئندہ کسی قسم کی قومیت کش اور غیر جمہوری مصالحتوں میں دباؤ یا ترغیب کے باعث پڑ جانے سے خود کو اور ملک کو بچائیں گے۔

چند روز ہوئے میں پوربی بنگال اور بہار گیا تھا۔ واقعات کے اظہار میں رکاوٹ سے کام لینا میرے لیے ایک مجرمانہ حرکت ہوگی اور پبلک فرض کو ترک کر دینے کے برابر ہوگا۔ جو لوگ پوربی بنگال میں فساد کے ساتھ ذمہ دار تھے انھوں نے عوام کو یہ بتلایا تھا کہ پاکستان طاقت کے ذریعہ قائم کیا جا سکتا ہے اگر عوام کے دماغ میں ایک مرتبہ یہ بات جگہ بنالے گی کہ فرقہ وارانہ مسئلہ طاقت کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے تو صرف ہندستان ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام متعلقہ فرقوں کے لیے بہت برا دن ہوگا۔ عدم تشدد ایک نیا مسلک ہے۔ اس پر ضرورت سے بہت زیادہ بار نہیں ڈالا جا سکتا۔ موجودہ حالات میں وہ اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے کہ لڑائی کے دونوں فریق ضبط و احتیاط سے کام لیں۔ اگر ایک پارٹی غیر معمولی اور غیر رسمی حربوں کو استعمال کرتی ہے تو دوسری پارٹی بھی اپنے خالص تحفظ کے لیے یا اس سے بھی بدتر یہ کہ انتقام لینے کے لیے انہیں حربوں کو استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں نے عوام کو تبدیل مذہب پر مجبور کرنے یا جبریہ شادی وغیرہ کا پرچار کیا تھا وہ آگ سے کھیل رہے تھے۔ میں یہاں پر وہ بات دہراؤں گا جو میں نے پوربی بنگال سے واپس آنے پر اپنے بیان میں کہی تھی

'' بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہلاکت ہی وہ سب سے بڑی مصیبت ہے جو انسان پر نازل ہو سکتی ہے لیکن باعزت لوگوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کو پستول دکھلا کر اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اگر وہ تمام لوگ جو زبردستی تبدیل مذہب پر مجبور کیے گئے ہیں اور وہ تمام عورتیں جن کا اغوا کیا گیا ہے اور جبریہ شادی کی گئی ہے قتل کر دی جاتیں تو طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بہ نسبت

یہ کمتر سانحہ ہوتا۔ میں عدم تشدد پر قطعی عقیدہ رکھنے والا شخص ہوں۔ لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ مشرقی بنگال میں لوگوں پر جو دباؤ پڑا ہے اگر مجھ پر پڑتا تو میں نہیں جانتا کہ میرے دماغ پر اس کا کیا ردعمل ہوتا۔ اگر معقول اور تعلیم یافتہ افراد سخت ترین اشتعال کے وقت نامطبوع ردعمل سے متاثر ہو سکتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ جماعتیں اور بھی اس سے متاثر ہوں گی۔ اس لیے جو بھی تشدد کا پرچار کرتا ہے، اس کی منظوری دیتا ہے یا حوصلہ افزائی کرتا ہے بالخصوص ایسا تشدد جو مشرقی بنگال میں کیا گیا خواہ وہ فرد ہو یا جماعت ہو، پارٹی ہو، یا فرقہ ہو، قوم کو بہت ہی شدید نقصان پہنچاتا ہے وہ انسانیت کے خلاف کام کرتا ہے اگر ہمارے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹیں تو ہمیں صاف اور دلیرانہ طور پر انسانوں کی طرح ایسا کرنا چاہئے۔ ایسے ہولناک اور بزدلانہ طریقوں سے نہیں کرنا چاہئے جو ہمیں درندوں کی سطح تک گرا دیتے ہیں۔

اگر میں فرقوں کو یہ انتباہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لیے تشدد کی ابتداء نہ کریں تو میں ان کو اس امر کی بھی چتاونی دیتا ہوں کہ جیسا کہ بہار میں ہوا وہ انتقام اور انتقامی حملوں کے طور پر کبھی تشدد استعمال نہ کریں۔ دو برائیاں کبھی ایک دوسرے کو مٹا نہیں سکتیں اور یہ انتقامی ضربیں ان لوگوں پر پڑتی ہیں جو بے گناہ ہوتے ہیں خواہ یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ابتدائی حملہ ان لوگوں کے خلاف تھا جو حقیقت میں ضرر پہنچانے والے اور قابل سزا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرقہ وارانہ تشدد میں خواہ وہ اشتعال انگیز ہو یا انتقامی قسم کا ہو صرف غریب اور مجبور لوگ مصیبتوں میں پڑتے ہیں۔ ایسے ہنگاموں کے ''مصنفین'' ہمیشہ بچ کر نکل جاتے ہیں۔ خانہ جنگی میں یا قوموں کے درمیان لڑائیوں میں تشدد کا بے روک قابل نفرت استعمال صرف اسی صورت میں کامیاب ہوگا کہ ایٹم بم جیسی کوئی چیز پیدا کر لی جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو نیست و نابود کر دے۔

مرکزی حکومت چونکہ بنگال میں کوئی مداخلت نہ کر سکی صوبے عملی طور پر آزاد ہو گئے۔ ان حالات میں بنگال کے پڑوسی صوبہ کو یہ اختیار تھا کہ بہاریوں پر کلکتہ میں جو مصیبتیں نازل ہوئی تھیں ان کے خلاف احتجاج کرے۔ بہار کی حکومت کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ پوربی بنگال میں ہندوؤں پر جو مظالم ہوئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی چشم پوشی سے ہوئے ان کے خلاف بنگال کی حکومت کو انتباہ دیتی۔ وہ حکومت بنگال کو یہ بات صاف طور پر بتلا سکتی تھی کہ بہار کے ہندو بنگال میں اپنے ہم مذہبوں کے حشر پر سخت ترین ہیجان میں مبتلا ہو گئے ہیں اور بہترین خواہشات کے باوجود بھی حکومت شاید اس لائق نہ ہو سکے کہ اگر لوگوں کے جذبات ایک خاص حد سے گزر جائیں تو وہ صورت حال پر قابو رکھ سکے۔ بہار کے ہندوؤں کو چاہئے تھا کہ اس پر ایجی ٹیشن کرتے اور اپنی حکومت پر زور دیتے کہ وہ یہ رویہ اختیار کرے یہ ایک مناسب اور آئینی طریقہ ہوتا۔ اگر مرکز صوبوں کے اندر تحفظ کے لیے ذمہ داری لینے میں ناکامیاب رہے تو میری صاف رائے یہ ہے کہ صوبوں کی عمومی حکومتوں کو ان معاملات پر آپس میں تصفیہ کرنا چاہئے اگر وہ ایسا کریں گے تو قرینہ ہے کہ وہ ایک بہتر انتظام کی منزل تک پہنچ سکیں گی بہ نسبت اس کے کہ فرقے خود قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور انتقامی کارروائیاں کرنے لگیں۔

ہر حالت میں تشدد ایک بدنما اور بے نتیجہ چیز ہے۔ لیکن ایک جم غفیر کا غیر منظم اور مجنونانہ تشدد بہت زیادہ بے نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ اسی کاز کو ہلاکت میں ڈالتا ہے جس کے نام پر اس کو ابھارا جاتا ہے۔ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر اشتعال اور انتقام کی یہ ہلاکت آفرینی جاری رہی تو مسلم لیگ کی لیڈری اگر اپنے پیروؤں کو روکنے کا بھی فیصلہ کرے جب بھی ان پر قابو حاصل نہیں کر سکے گی اور یہ صورت کانگریس کی بھی ہوگی اگرچہ کانگریس نے لوگوں کو تشدد کے اس جنون سے بچانے کے لیے بہت کچھ کیا ہے اگر ایسا

ہی واقعہ پیش آیا تو ہندستان فرقہ وارانہ تعصب رکھنے والے پاگلوں کے دو کیمپوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اہل برطانیہ اپنی سنگینوں سے دونوں کی نگرانی کریں گے۔ ہندستان کی آزادی کا دن غیر معین مدت کے لیے ملتوی ہو جائے گا۔

اگر ہمیں آزادی کے لائق وشایاں بننا ہے تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا سیکھنا چاہیے۔ ہندو اور مسلم اقلیتیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پولیس اور فوج کی حفاظت کی کوئی مقدار بھی ان کو اکثریت والے فرقوں کے غیظ وغضب سے مستقل اور موثر طور پر نہیں بچا سکتی۔ اگر موخر الذکر اقلیتوں کے سلسلہ میں اپنی تمام اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ترک کر دیں۔ اگر کسی ہندو کی زندگی، ملکیت اور عزت مسلم اکثریت کے صوبہ میں محفوظ نہیں ہے اور کسی مسلم کی زندگی، ملکیت اور عزت ہندو اکثریت کے صوبے میں محفوظ نہیں ہے تو متمدن زندگی ایک ناممکن چیز بن جائے گی یہاں تک کہ مسٹر جناح کا خواب پاکستان بھی، اگرچہ اسی نے اس مسئلہ کو اس نوعیت کا بنا دیا ہے اس کے حل کے کوئی آثار پیدا نہیں کرتا کیوں کہ یہ اقلیتوں کو وہیں پر چھوڑ دیتا ہے جہاں پر وہ اب ہیں۔ اگر ان کی اسکیم میں یہ نقطہ نظر ہوتا کہ پوری پوری آبادیوں کو ادھر سے ادھر منتقل کر دیا جائے اور مسلمانوں کو ایک ایسے سالم اور باہم گر پیوستہ علاقہ میں رکھا جائے جہاں کوئی بھی ہندو یا سکھ یا عیسائی یا پارسی باقی نہ رہے اور خود مسلمان بھی ہندستان کے کسی علاقہ میں باقی نہ رہیں تو البتہ اس اسکیم کو اس مسئلہ کا کم از کم ایک منطقی حل سمجھا جا سکتا تھا، خواہ اس پر عمل کرنا کتنا مہنگا، اندوہناک اور غیر انسانی ہو۔ اگر مسلمانوں کو اپنا خاص دینی "اسٹیٹ" رکھنا ہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان کو اس امر کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی مملکت میں ہندوؤں، سکھوں، اور دوسری اقلیتوں پر اسے عائد کریں۔ ان اقلیتوں کو بھی خود اختیاری فیصلہ کا وہی حق حاصل ہے جس کا مطالبہ

مسلمان اپنے پورے ہندستان میں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی ہندستان سے معقولیت کے ساتھ یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے درمیان ایسی آبادی کے بڑے حصوں کو جگہ دے جو کھلے طور پر اس مملکت میں شہری حق کو مسترد کرتے ہیں۔ اگر مسلم لیگ مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر پاکستان طلب کرتی ہے تو وہ ان تمام مفہومات اور نتیجوں کا مقابلہ کرے اور یہ کوشش نہ کرے کہ کیک کو کھا بھی جائے اور اپنے پاس بھی رکھے۔ یہ ایک ہیبت ناک حل ہے جو آخر کار مسلمانوں کے مفادات کو بھی اتنا ہی نقصان پہنچائے گا جتنا کہ ہندوؤں کے مفادات کو۔ لیکن لیگ اپنے پیروؤں کو جس زہر آلود فرقہ داری سے متاثر کررہی ہے اور جس نے ایک مشترک متمدن زندگی کو مشکل بنادیا ہے اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے۔ لیکن اب ہمیں کسی صورت بھی فرقہ وارانہ نزاع کو اپنی قومی اور منظم زندگی کو تباہ و برباد کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ کسی حالت میں بھی ہمیں خود کو آبادی کے ایک حصہ کے دھونس یا دباؤ سے اس امر پر مجبور نہیں ہونا چاہئے کہ ہم دوسروں کے جائز حقوق کو قربان کردیں۔

بہرحال میں امید کرتا ہوں کہ دونوں فرقوں کے متعصب لوگوں کے لیڈر زیادہ معقولیت اور انسانیت سے کام لیں گے اور ایسے خطرناک اور ازمنہ وسطیٰ کے ذرائع اختیار نہیں کریں گے۔ اس مسئلہ کا حل آسان ہے۔ اگر ہم صرف اس کھلی ہوئی حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ اگر ہندستان میں دو قومیں موجود ہیں تو دونوں کی دونوں اقتصادی لوٹ کی شکار ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مشترکہ دشمن موجود ہے اور یہ دشمن افلاس بیماری اور بے علمی ہے اگر ہم صرف اپنی اصلیت کو سمجھ لیں تو ہم میں کوئی جھگڑا نہیں ہوسکتا۔

میں نے اس نکتہ میں زیادہ تفصیل سے اس لیے کام لیا ہے کہ ہماری آزادی اور ترقی کی راہ میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اب بھی جب کہ بہت سا وقت گزر چکا

ہے اور اب جب کہ مسلم لیگ مرکزی حکومت میں شریک ہے اور کانگریس کے ساتھ ذمہ داریوں میں حصہ لے رہی ہے میں امید کرتا ہوں کہ کلکتہ پوربی بنگال اور بہار کے ہولناک ہنگامے اور دوسری جگہوں کے چھوٹے چھوٹے ہنگامے گذشتہ زمانہ کا خواب پریشان اور گئی گزری بات ہو جائے گی اور اب ہم ایک مشترک مادروطن کی اولاد کی حیثیت سے برادرانہ محبت اور اتحادِ عمل کا ایک نیا باب سادہ صفحہ پر تحریر کریں گے۔

اگر ہندو مسلم سوال ہمارے لیے ایک دردِ سر ہے تو ہندستانی ریاستوں کا مسئلہ بھی اس سے کم تکلیف دہ نہیں ہے لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی طرح ریاستی مسئلہ کا حل بھی آسان ہے اگر ہم ٹکڑوں یا فرقوں کا خیال اپنے دل نہ لائیں بلکہ پورے ہندستان کو اپنے ذہن میں رکھیں۔ والیانِ ریاست کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ ہندستان بھی نصف آزاد اور نصف غلام نہیں رہ سکتا اور یہ کہ آزاد ہندستان میں وہ اپنی موجودہ حالات میں باقی نہیں رہ سکتے اور نہ اپنا کاروبار چلا سکتے ہیں۔ آج ایک غیر ملکی حکومت ان کی طاقت کی پشت پناہی کرتی ہے تاکہ ان کو وہ اپنے سامراجی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ جہاں اس کا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا وہ ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرتی ہے، ہندستانی والیانِ ریاست کو پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے احکام کے مطابق اپنا ضمیر بدلنا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی رعایا کی بہبودی کے امانت دار ہو سکتے تھے ایک غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئے ہیں۔ ان حالات میں ان کے بلند آہنگ خطابات اور ان کے قدیمانہ شان و شوکت کے ساز و سامان بدنما بے اصل اور مضحکہ انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اوہام کے مطابق ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جو اکثر ضرر رساں بھی ہوتی ہیں۔ ان کے مصرفانہ ذاتی اور خاندانی اخراجات ان عوام کو زیادہ مفلس بناتے ہیں جو اب بھی تنگ دست ہیں اور شہریت کے ابتدائی حقوق تک سے محروم ہیں۔ ریاستوں کی رعایا کو ایک ''دوآتشہ'' غلامی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ وہ

آقا جو ان کو پریشان کرتے ہیں خود بھی غلام ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آقاؤں کو اپنی زنجیریں اس لیے پسند ہیں کہ انھیں ایک ذلت آمیز آرام وعیش کی زندگی بسر کرنے کے لائق بناتی ہیں۔ اگر وہ خود اپنے ذاتی مفاد کو سمجھتے، تو وہ تیزی سے بجھتی ہوئی شہنشاہیت کی غیر مستقل امداد پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنی آزاد، مسرور اور خوش حال رعایا کی محبتوں پر اعتماد کرتے۔ سیاسی ہندستان کو ان کے وجود پر کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ وہ لوگ ایک جمہوری اور آئینی فرمانروا کی حیثیت سے رہیں اور کام کریں۔ اس میں وہ اپنے رسمی بڑے آقا بادشاہ انگلستان سے سبق لے سکتے ہیں۔ ان سے محبت اور ان کا احترام اس لیے کیا جاتا ہے کہ انھوں نے حکمرانی ترک کردی ہے۔ چونکہ وہ اپنی رعایا کی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں وہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کی بادشاہی صرف ایک علامت ہے ایسی قوم کے اتحاد وعظمت کی جو اپنے معاملات کا انتظام کرنے میں بالکل آزاد ہے۔ اس لیے وہ اپنی قوم کی اقتصادیات میں ایک باعزت فرض ادا کرتے ہیں۔ سابق بادشاہ جو اب ڈیوک آف ونڈسر ہیں اپنی شادی جیسے ایک ذاتی معاملہ تک میں اپنی رعایا کے منتخب نمائندوں کی بات نہ اٹھا سکے۔ ہندستانی والیانِ ریاست کو بھی اس اسپرٹ میں کام کرنا چاہیے۔ ایسی حالت میں ان کے سامنے پرامن اور وطن پرستانہ خدمتوں کی ایک طویل زندگی موجود ہوگی۔

اگر یہ تمام باتیں سچی ہوئیں اور یقیناً سچی ہیں تو کشمیر دربار نے اپنی پچھلی کارروائیوں میں معقولیت سے کام نہیں لیا ہے۔ اس نے والیان ریاست کی جماعت کو ایک کھلا ہوا نقصان پہنچایا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جیسے شخص کی توہین کر کے جو خود انسانوں میں ایک شاہزادے کی حیثیت رکھتے ہیں کشمیر کے دیوان نے پوری ہندستانی قوم کی توہین کی ہے۔ یہ امر بھی کم افسوسناک نہیں ہے کہ حیدرآباد جسے

ہندستان کی سب سے بڑی ریاست ہونے کا دعویٰ ہے اپنی رعایا کو شہریت کے وہ ابتدائی حقوق بھی عطا نہ کرے جو برطانی امپیریلزم تک عطا کرنے پر مجبور ہے۔ ہندستان کے باشندے جن میں ریاستوں کے باشندے بھی شامل ہیں والیانِ ریاست سے جو کچھ طلب کرتے ہیں وہ خالی الفاظ نہیں ہیں جو درباروں میں اور ایوانِ والیان ریاست میں استعمال کیے جاتے ہیں بلکہ ان کی رعایا کی آزادی کے لیے جو ان کی مطلق العنان فرمانروائی کے بارے دبی جارہی ہے کوئی عملی کارنامہ ہے۔ چاہیے کہ ان کی طاقت وعظمت ان کی آزاد اور خوشحال رعایا کی مسرتوں سے پیدا ہو یہ ان کی زندگی کا ایک شاندار مقصد ہے جو ان کے موجودہ عیش ونشاط کی زندگی اور سامراجی غلامی سے کہیں زیادہ بلند و بہتر ہے۔ اس میں وہ ریاست اوندھ کے فرمانروا کی مثال کی تقلید کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی رعایا کو ان کے جائز حقوق دے کر خود کو ان کا محبوب بنالیا ہے۔

ہماری قوم کی آزادی کی راہ میں چھوت چھات کا زہر بھی کوئی کم رکاوٹ نہیں ہے۔ اس کا تعلق صرف ہندو فرقہ سے ہے۔ لیکن یہ اتنا پرانا اور ایسا غیر انسانی رواج ہے کہ اگر یہ جاری رہا تو اس کا زہر ہماری پوری قومی زندگی کو زہریلا بنادے گا۔ آزادی اور برابری کے لیے ہمارے مطالبہ کا زور کم ہو جاتا ہے جب ہم خود اپنی سوسائٹی میں عدم مساوات کی سخت ترین زہریلی اور سخت ترین ذلت آمیز شکل کو برداشت کرتے ہیں، یہ حقیقت کہ یورپین ممالک اور سفید فام نوآبادیوں میں ہم سے اچھوتوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے میرے خیال میں قدرت کا انتقام ہے جو ہم پر اس کے ایک بنیادی قانون یعنی انسانی برابری کو توڑنے پر نازل ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے مصلح نے ہندو فرقہ کی گیر کو اس برائی کے خلاف اتنا کافی بیدار کر دیا ہے کہ اس کے انسداد کے لیے قانونی ذریعہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ صوبجاتی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ چھوت

چھات کے پبلک اظہار کو جرم قرار دیں، کوئی پبلک مقام، خواہ وہ سڑک ہو، یا کلب ہو، یا تفریح یا تعلیم کی جگہ ہو یا کھانے پینے کی جگہ ہو ہمارے ہریجن بھائیوں کے لیے بند نہیں ہونا چاہئے۔ مزید برآں میرا خیال ہے کہ صوبجاتی حکومتوں کو یہ قانون بنانا چاہئے کہ کسی خاص مندر میں جب پجاریوں کی اکثریت یہ خواہش ظاہر کرے کہ اس مندر کو ہریجنوں کے لیے کھول دیا جائے تو اسے کھول دیا جائے گا۔ دوسرے طریقہ پر بھی ہریجنوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تا کہ وہ نام نہاد اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ برابری کی جگہ حاصل کریں۔ یہ برابری مکمل ہونی چاہئے۔ ذاتی طور پر میں ایک ایسی سوسائٹی پر عقیدہ رکھتا ہوں جو عدم تشدد کے ذریعہ جماعتی اور ذات پات کے امتیازات سے پاک کردی گئی ہو کیوں کہ میرا خیال ہے کہ تشدد یقیناً نئی نئی ذات پات اور نئی نئی جماعتیں پیدا کرتا رہے گا۔ یہ جماعت بندیاں جسمانی اور نفسیاتی تشدد ہی کی پیداوار ہیں۔ برابری اور جمہوریت کے معنی بھی وہی ہیں جو عدم تشدد کے ہیں۔

ہمارے گر جانے کے دوسرے گڑھے بھی ہیں جن سے ہمیں بچنا پڑے گا۔ ہماری جدوجہد کے دوران میں ہمارا مقابلہ خدمت، مصیبت اور قربانی کے میدان میں ہوا ہے۔ اب جب کہ طاقت اور سرپرستی کے مقامات ہمارے لیے دستیاب ہیں ہمیں اس زینے کو ٹھکرانا نہیں چاہئے جس کے ذریعہ ہم ان مقامات تک چڑھے ہیں۔ کسی ایسے ملک میں جہاں آزادی بہت دنوں سے قائم ہو طاقت کی سیاسیات اس قدر جلد اور اتنی آسانی سے قوم کو پستی میں نہیں لے جاسکتی کہ وہ تباہی کے قریب پہنچ جائے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں سیاسی آزادی ابھی مکمل طور پر حاصل بھی نہیں ہوئی ہے بلکہ ابھی ترازو کے پلڑے میں لٹک رہی ہے کوئی بھی غلط قدم نہایت تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ طاقت کی سیاسیات ہماری قومی زندگی کی اس منزل میں یقیناً ہمیں تباہ کردے گی۔ مزید برآں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ابھی بہت سے محنت طلب تعمیری کام باقی

ہیں جو اسی حالت میں انجام پاسکتے ہیں۔ جب کہ ہم خود کو ہندستان کے کروڑوں محنت کش اور فاقہ کش لوگوں کا ناچیز خادم سمجھیں۔ امانت، طاقت اور ذمہ داری کی ہر پوزیشن کو خدمت کے لیے ہونا چاہئے۔ نہ خود اپنی سر پرستی، اپنی ترقی اور غرور کے لیے اور ہم جب کہ بلند درجوں پر ہوں، ہمیں مسلک ذات پات اور خاندان کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لانا چاہئے۔ بلکہ صرف کارکردگی اور قابلیت کا خیال کرنا چاہئے۔ پبلک خادموں کی حیثیت سے ہمارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ دشمن ہے اگر قابلیت اور ملک کی وفادارانہ خدمت اور فرض شناسی کے اوصاف موجود ہوں تو پرانے تعصبات اور اختلافات کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ہر پبلک پوزیشن میں ہم پورے ضمیر کے ساتھ دیانتدار ہوں اور شک وشبہ سے بالاتر ہوں۔

ہم جلد ہی آزاد ہندستان کا آئین بنانے کے لیے آئین ساز اسمبلی میں جمع ہوں گے۔ یہ آئین ایک جمہوری آئین ہوگا اور وفاقی نوعیت کا ہوگا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ انتظامی اور اقتصادی میدانوں میں وہ مرکزیت جو قطعی ضرورت سے زیادہ ہو، آزادی کی سخت منافی ہے۔ اس لیے یہ اچھا ہے کہ آزاد ہندستان کے صوبے خارجی وداخلی تحفظ کی شرط کے ساتھ زیادہ سے زیادہ خودمختار ہوں گے۔ لیکن ہمارے بعض صوبے اتنے بڑے ہیں کہ یورپ کے ممالک کے برابر ہیں۔ اس لیے خود صوبوں کے نظم ونسق میں بھی ضرورت سے زیادہ مرکزیت ہوسکتی ہے۔ جس سے ہمیں بچنا چاہئے۔ بہت پرانے زمانے میں دانایان ہند نے دیہاتی اور مقامی پنچایتیں قائم کی تھیں۔ بہت سے پرشور زمانوں میں یہی ہماری حفاظت کا قلعہ تھا۔ بادشاہ اور بادشاہی کرنے والے خاندان لڑتے جھگڑتے رہے۔ سلطنتیں پیدا ہوئیں حکمرانی کرتی رہیں پھر بدانتظامی کرکے لاپتہ ہوگئیں۔ مگر دیہاتی زندگی نے میدان جنگ سے اور ترقی وزوال پذیر

سلطنتوں سے دور اپنی شکل قائم رکھی۔ دیہاتیوں کے پاس ایک ''دیہاتی سلطنت'' تھی جو اس کی جان اور مال کی حفاظت کرتی تھی اور متمدن زندگی کو ممکن بناتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہمیں چھوٹے چھوٹے فوجداری و دیوانی مقدمات کے فیصلہ کے اختیارات بھی دیہاتی پنچایتوں کو عطا کرنے ہوں گے۔ مقامی پولیس بھی مقامی پنچایت کے تحت میں رکھی جاسکتی ہے اگر ہم حکومت خود اختیاری کی اس دیہاتی ''اکائی'' پر اپنی عمارت بنائیں گے اور اس کو ترقی دے کر موجودہ حالات کے مطابق کر دیں گے تو ہم اپنے لوگوں کی عقل و ذہانت سے کام لیں گے۔ یہی قدرتی اور آسان طریقہ ہے۔ صرف مغرب کی تقلید کرنا ہمارا مقصد نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ مغرب نے جمہوریت کو بالخصوص بڑے ممالک میں بہت پیچیدہ اور مہنگا بنا دیا ہے۔ مغرب ہی نے دفتری لال فیتہ ایجاد کیا ہے جو جمہوری مشین کو بھاری اور سست بنا دیتا ہے ہمارا فرض ہے کہ نئے آئین میں ان تمام خرابیوں کو دور کر دیں۔

ہمارا عدالتی سسٹم بھی سادہ اور مؤثر ہونا چاہئے۔ قانون کی روایتی تاخیر اور اخراجات اور پیچیدگی دور ہونی چاہئے، مزید برآں شہری آزادیوں کو برتنے کے لیے بھی کافی مواقع نئے آئین میں ہونے چاہئیں۔ ان کو ایک جمہوری اور نمائندہ حکومت کی مطلق العنان دست برد سے بھی محفوظ ہونا چاہئے کہ طاقت ایسی چیز ہے جو عہدوں پر محبّ وطن حضرات کو بھی بداخلاق بنا دیتی ہے۔ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے بھی ملک کے وسیع تر مفادات کی شرط کے ساتھ پورا انتظام ہونا چاہئے۔ ان کی زبان اور ان کی تہذیب کو ترقی کا پورا میدان ملنا چاہئے۔ عقیدہ اور مذہب کے معاملات میں پوری رواداری ہونی چاہئے ہر فرد اور ہر جماعت کو امن اور پبلک اخلاق کی شرط کے ساتھ اپنے خیالات کے پرچار کی آزادی ہونی چاہئے۔

کانگریس نے بہت دنوں سے بین الاقوامی واقعات میں دلچسپی لی ہے ہم بھی ان

واقعات سے متاثر ہوئے ہیں اور آج دنیا کا کوئی ملک بیرونی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری قومی تحریک چونکہ عدم تشدد پر مبنی ہے اس لیے ہم ہمیشہ بین الاقوامی ترک اسلحہ، اور امن اور اتحاد عمل اور کھلی ڈپلومیسی کے حق میں رہے ہیں۔ اپنی مصیبتوں سے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایک محکوم قوم کے لیے جارحانہ کارروائی کیا معنی رکھتی ہے۔ غیر ملکی حکمرانی کی سخت اور بے رحم ضربوں نے ہمیں سکھلا دیا ہے کہ ہم بین الاقوامی امن و نیک نیتی کی قدر کریں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سبق جو مصیبت کے زمانے میں سیکھے گئے ہیں پوری آزادی حاصل کرنے کے بعد بہتر اور زیادہ مسرت انگیز زمانے میں بھی فراموش نہیں کیے جائیں گے۔

ہم دنیا کے ایسے نئے دور پر عقیدہ رکھتے ہیں جو نیک نیتی اور اتحاد عمل پر مبنی ہو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ مقاصد ایک ایسے بین الاقوامی آرگنائزیشن سے حاصل ہو سکتے ہیں جو آزاد اور برابر قوموں پر مشتمل ہو۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جب تک امپریلزم موجود ہے امن کے لیے خواہ کوئی بھی بین الاقوامی آرگنائزیشن بنایا جائے وہ یقیناً طاقتور اور ضمیر فروش قوموں کے حرص و ہوس کے آلہ کار میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ وہ برابری انصاف اور دیانت داری پر نہیں بلکہ چند طاقت ور قوموں کی مجموعی قوت پر مبنی ہوگا۔ ہمیشہ بڑی تین طاقتیں یا چار یا پانچ طاقتیں موجود رہیں گی۔ معمولی چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح بین الاقوامی چور اور ڈاکو بھی جلد یا دیر آپس میں جھگڑنا شروع کر دیں گے اور جب یہ لوگ ایسا کرتے ہیں تو دنیا کی بنیادوں کو ہلا دیتے ہیں جیسا کہ وہ گذشتہ تیس سال میں دو مرتبہ کر چکے ہیں۔ جب تک دنیا میں محکوم قومیں ہوں گی اس وقت تک نزاع و جنگ بھی موجود رہے گی۔ مزید برآں ہمارا عقیدہ ہے کہ جمہوریت کی کسی بین الاقوامی آرگنائزیشن کا اطمینان و کامیابی سے عمل کرنا بھی صرف خارجی اور اداراتی انتظامات کا سوال نہیں ہے۔ قانون و آئین بین الاقوامی عدالتیں اور فوجیں اپنی

حد تک اچھی ہیں۔ لیکن جس طرح انسانی جذبات کو ایک اندرونی خود ضبطی کے ذریعہ روکنا ہوتا ہے، اسی طرح یہ ضرور ہے کہ قوموں کے جذبات اور حرص وہوس کو بھی کسی بیرونی ترکیب کی کامیابی سے پہلے قلب کی منظم اصلاح کے ذریعہ روکنا چاہئے۔ انسانوں کو یہ سیکھنا چاہئے کہ وہ صرف ایسے رہنماؤں اور سیاست دانوں کی عزت کریں جو پرامن اور مفید مقابلہ کی طرف لوگوں کو لے جائیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو طاقت، دولت، امپائر اور اقتدار کی رنگین تصویریں ان کے سامنے رکھ کر لوگوں کے جذبات اور حرص وآز کو ابھارتے ہیں۔ جب ایسا کیا جائے گا اور قومیں ایک دوسرے کے ساتھ اپنے کاروبار میں دیانتدار، انصاف پسند، اور حق پسند بننے کی خواہش پیدا کرلیں گی تو آئین وقانون کی خارجی مشینوں کو مرتب کرنا اور عمل میں لانا مشکل نہ ہوگا۔ ہندستان اقوام کی ایک سوسائٹی کے حق میں ہے جس میں ہر ملک خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اہم ہو یا غیر اہم ہو، آزاد ہو یا بین الاقوامی سرپرستی میں ہو، ایک جمہوریت میں ایک وزن رکھتا ہو جس طرح داخلی سیاسیات میں ہم ایک یا کئی اشخاص کی ڈکٹیٹری کے خلاف ہیں اسی طرح بین الاقوامی سیاسیات میں ہم یہ نہیں چاہتے کہ کسی ایک طاقتور قوم یا ان چند قوموں کے مجموعہ کو ڈکٹیٹری کا اختیار حاصل ہو۔ ایسی دنیا میں جو غیر مساوی بین الاقوامی حیثیت رکھنے والی قوموں سے بھری پڑی ہو، جمہوری اداروں کا قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔

اس وقت بھی جب کہ جنگ جاری تھی، اتحادیوں نے عملی میدان میں ان بنیادی آزادیوں کو ترک کردیا تھا جن کا جنگ کے سلسلہ میں شور مچارہے تھے۔ اخلاقی اصولوں کی ہر خلاف ورزی کے لیے جنگ کا بہانہ پیش کردیا جاتا تھا۔ لیکن اب بھی جب کہ جنگ ختم ہوگئی ہے۔ بنیادی آزادیاں پہلے کی طرح مردہ پیدا ہونے والے بچہ کی صورت میں ہیں۔ امن کی کانفرنس ذرا بھی پرامن نہیں ہے اور یونائیٹڈ نیشنز

آرگنائزیشن ذرا بھی ''یونائیٹڈ'' یعنی آپس میں متفق نہیں ہے تمام قوموں کے اعصاب میں کھنچاوٹ موجود ہے اور ان کے خیالات میں ایک تیسری عالمگیر لڑائی کا خوف موجود ہے۔ دنیا کی بڑی قومیں جن خیالات میں پڑی ہوئی ہیں وہ یہ نہیں ہیں کہ جنگ کے اسباب کو کیوں کر دور کیا جائے بلکہ یہ ہیں کہ زیادہ بڑا اور زیادہ بہتر ایٹم بم کیوں کر بنایا جائے۔ یہ حقیقت پہلے ہی سے صاف ہونی چاہئے تھی کہ ایٹم کی طاقت تباہ کاری کے کاموں کے لیے دستیاب ہوئے بغیر صرف پرامن مقصد کے لیے دستیاب نہیں ہوسکتی۔ آج ماہروں نے اپنا یہی خیال ظاہر کر دیا ہے۔ اگر اس طاقت کے استعمال کو کسی طرح ممنوع قرار نہیں دیا جائے گا تو موجودہ قومی رقابتوں اور حرص وہوس اور انتقامی خیالات کی حالت میں صرف دنیا کے امن ہی کو خطرہ نہیں ہے بلکہ اس سیارے پر انسانی نسل کے وجود کو بھی خطرہ ہے۔

شکست خوردہ قوموں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے۔ اس سے خوف، غصہ اور انتقام کا نشان باقی رہ گیا ہے۔ سماج کو نقصان پہنچانے والے شخص کے لیے سزا اور انتقام اس کی اصلاح کا سب سے زیادہ متمدن طریقہ نہیں ہے۔ جو بات فرد کے لیے صحیح ہے وہی قوموں کے لیے بھی صحیح ہے۔ اگر فرد کے لیے یہ غیر منصفانہ اور غیر انسانی بات ہے کہ باپ کے گناہ کا بدلہ بیٹے سے لیا جائے تو جماعتوں کے لیے یہ اور بھی برا ہے کہ انسانوں کی ایک پشت کا بدلہ دوسری پشت سے لیا جائے۔ شکست خوردہ قوموں کو کاٹ چھانٹ کر بین الاقوامی سیاسیات کی بساط کا مہرہ نہیں بنانا چاہئے۔ بلکہ اس امر کی ہر کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ اور ان کو اس کا ہر موقع دینا چاہئے کہ وہ ایک معتدل اور صحیح سیاسی واقتصادی زندگی بسر کر سکیں۔

آزاد ہندستان بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں دوسرے ممالک سے ابھی تک کے غلامی کے زمانہ کی بہ نسبت زیادہ فطری اور اپنی جغرافیائی پوزیشن کے نظریہ

سے زیادہ موزوں تعلقات قائم کرے گا۔ دراصل ابھی تک ہم آزادانہ تعلقات پیدا ہی نہ کر سکے تھے۔ ہم انگلستان کے بین الاقوامی تعلقات کی چکی کے نیچے پس رہے تھے جو سامراج پسند برطانیہ کا دوست تھا وہ ہمارا بھی دوست تھا اور جو برطانیہ کا دشمن تھا وہ اسی وجہ سے ہمارا بھی دشمن سمجھا جاتا تھا۔ برطانیہ کی دوستیوں اور عداوتوں کی وجہ سے ہندستان نے دومرتبہ جنگ میں شامل ہوکر بڑی بڑی تکلیفیں اور جانی نقصان برداشت کیے۔ آزاد ہندستان کو یہ بھاری بوجھ اتار پھینکنا چاہیے۔ ہماری اپنی خارجہ پالیسی ہونی چاہیے ہم نے زمانہ ماضی میں کوئی وعدے نہیں کیے ہیں نہ آئندہ کے لیے ہمارے سامراجی ارادے ہیں۔ ہمیں اپنی آزادی کے حصول اور اس کے قیام کی فکر ہے تاکہ ملک اور بیرونجات میں ہمارے ہم وطنوں کو اپنے ذرائع اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق مکمل اور آزادانہ ترقی کے مواقع جائز طور پر مل سکیں۔ ہم ان برائیوں کو بھول جانے کے لیے تیار ہیں جو برطانیہ نے ہمارے ساتھ کی ہیں بشرطیکہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی کرے اور ہماری گردن سے اپنا جوا اٹھالے۔ ہمیں دکھنی افریقہ سے بھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اگر نسلی غرور کی آڑ میں آکر اس کی سفید فام اکثریت ہندستانیوں کو لالچ دے کر انھیں اپنے ملک سے دکھنی افریقہ میں بسانے کے بعد انھیں شہریت کا ابتدائی حق بھی غصب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم ہر قوم کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بغیر دوسری اقوام کو اس حق سے محروم کیے ہوئے اپنے لیے وہ طریقہ حکومت منتخب کرے جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو۔ ہم کمیونزم کی روسی مہم، جمہوری اشتراکیت کے برطانی تجربے اور ذاتی تجارت کے امریکی اعتقاد کو یکساں دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ ہم ان میں سے کسی کی نقل نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ ہم ان تینوں سے کچھ نہ کچھ سیکھنا ضرور چاہتے ہیں۔ ہم ان تینوں عظیم الشان قوموں سے مساوات اور ایک دوسرے کے حقوق کی منظوری کی بنا پر دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اس بات میں

ہوشیار رہیں گے کہ دنیا کے پریس کے ایک حصے میں ہونے والے روس کے خلاف پرچار اور دوسرے حصے میں ہونے والے مغربی جمہوریتوں کے خلاف پرچار کے ذریعہ گمراہ نہ ہوں ۔ ہمیں اصولی بم چخ میں پڑ کر بین الاقوامی جھگڑوں میں کسی کی طرف ہوکر اس امید میں تیسری عالمگیر جنگ میں بھی نہ پڑ جانا چاہئے کہ ہم دنیا کی خدمت کرر ہے ہیں۔ دوسری قوموں کو اصلاح دینے کی بجائے ہمارے اصلاحی جوش کے لیے اپنے ملک میں ہی بہت کچھ گنجائش ہے۔

حالانکہ ہم سبھی قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھائیں گے۔ لیکن اپنے ایشیائی دوستوں اور آسٹریلیا کے ساتھ ہمارے تعلقات قدرتی طور پر بڑھیں گے۔ چین اور جاپان کے ساتھ ہمارے پرانے تمدنی تعلقات ہیں۔ آج بھی پنڈت جواہر لال نہرو کی وجہ سے جو کہ بہت موزوں طریقہ سے ہمارے وزیر خارجہ بنائے گئے ہیں، ہمارے چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں۔ لیکن ہم اپنے قریب ترین ہمسائے سے اتنے علیحدہ کر دیے گئے ہیں کہ کوئی کیبل چین سے یہاں براہ راست نہیں آ سکتا۔ اس کو لندن ہوکر آنا پڑتا ہے اور اس کے آنے میں اکثر چوبیس گھنٹے سے بھی زیادہ لگ جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں بدلنی چاہئیں۔ جونہی کہ جاپان اپنے سامراجی جکڑے کے مرض سے شفایاب ہوکر جمہور پسند بنے گا ہندستان اس کے ساتھ ضرور دوستی کرے گا ہم دوسروں کے تعصب کے اثر میں نہ آئیں گے خواہ وہ پوربی ہو یا پچھمی۔ انڈونیشیا اور پوربی جزیروں کے ساتھ بھی ہمارے تمدنی تعلقات ہیں جنہیں کہ ہمیں بڑھانا چاہئے۔ ان جزائر میں ہمارے آپسی فائدے کے لیے ہماری تجارت پر آزادی ہونی چاہئے۔ ہندستان اور آسٹریلیا میں قریبی تعلقات کے قیام سے ان میں کسی کا کوئی نقصان نہیں ہے اور دونوں کا بہت فائدہ ہے وسطی ایشیا اور بیچ پورب بھی ہمارے تمدنی تعلقات ہیں ہماری آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ان ممالک کی طرح رسول اللہ ﷺ کا

پیرو ہے ہمیں ان تعلقات کو اور نیا کرنا اور دوستی کے نئے ذرائع پیدا کرنے ہیں۔ سوویٹ روس کے ساتھ بھی ہمیں قریبی تعلقات رکھنے چاہئیں ان سب باتوں کے ساتھ مغربی جمہوریتوں کے ساتھ بھی ہمیں اپنے موجودہ تعلقات قائم رکھنے ہیں۔

اس سے پہلے ہماری جماعت ضرورت پڑنے پر فوری بین الاقوامی حالات پر تبصرہ کرتی آئی ہے۔ اب چونکہ ہمارے نمائندگان کے ہاتھ میں اختیارات آگئے ہیں لہٰذا ہمیں زیادہ ضبط سے کام لینے کی ضرورت ہے ہمیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ آزاد حکومتوں کے پاس ہزاروں ذرائع سے دوسرے ممالک کے خیالات اور کارروائیوں کے متعلق خبریں آیا کرتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں ان کی مستقل ڈپلومیٹک اور خفیہ سروسیں کام کرتی رہتی ہیں۔ ان کے طلبا یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں ان کے تاجر اور صنعتی وتجارتی ایجنٹ بھی دوسری جگہوں پر ہوتے ہیں اور حکومتیں ان اطلاعات کے ذرائع کے قیام کے لیے لاکھوں پونڈ خرچ کرسکتی ہیں۔ چنانچہ بین الاقوامی خبررساں ایجنسیوں کے علاوہ ان حکومتوں کے پاس کئی ذرائع سے دوسرے ملک کے متعلق خبریں آتی ہیں اتنے پر بھی ان سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے خفیہ یا ظاہراً طور پر ملی ہوئی اطلاعات سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ اگرچہ نہیں ہوتا تاہم کبھی کبھی گمراہ کن ضرور ہوتا ہے۔ ہمیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ آج اطلاعات کے ان ذرائع کا راستہ ہم پر بند ہے ہمیں بین الاقوامی ایجنسیوں کا یہ جال ابھی بچھانا ہے اس وقت بین الاقوامی حالات کی زیادہ تر خبر ہمیں ایک جانب دار پریس ایجنسی کے ذریعہ ہی ملتی ہے۔ ان سب باتوں کا تقاضا ہے کہ ہم دوسرے ممالک کے متعلق اپنی رائے کے اظہار میں احتیاط رکھیں۔ ہمیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ہمیشہ سے زیادہ آج ہماری زبان سے نکلے ہوئے غیر ذمہ دارانہ اظہار خیال سے ہم پر ایسی ذمہ داریاں پڑسکتی ہیں جن کے لیے ہم تیار نہیں ہیں اس لیے اس سمت میں ہمیں بہت ہی صبر وضبط سے کام لینا چاہئے

ہمارا نصب العین پہلے ہی کی طرح آزادانہ حیثیت سے جمہوریت کے قیام کی معاونت مظلوموں کی امداد اور بین الاقوامی امن وامداد باہمی کا رہے گا۔ ہم اپنے ہی اداروں میں ان اصولوں پر عمل کر کے ان مقاصد کو دوسری قوموں کا فیصلہ کرنے کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح پورا کر سکتے ہیں۔

ہمارے بین الاقوامی تعلقات کا ایک پہلو ایسا ہے جس کے متعلق قیام امن کے نقطۂ نظر سے ہمیں اپنا رخ صاف کر دینا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ حالانکہ ہم قومی اقتدار اعلیٰ کا ڈھول نہیں پیٹتے اور دنیا کے امن اور امداد باہمی کے لیے تمام قوموں کے ساتھ قطعی مساویانہ بنیاد پر ہم لوگ اس پر پابندی بھی برداشت کر سکتے ہیں لیکن ہم یہ ہرگز برداشت نہ کریں گے کہ طریقہ حکومت کا انتخاب کرنے کے لیے ہمارے ہم وطنوں کے حق میں مداخلت کی جائے۔ یا ہندستان کی علاقہ وارانہ ایکتا کو ختم کیا جائے خواہ وہ ہمارے منتخب نمائندگان کی خواہش کے خلاف برطانوی افواج کا قیام ہو یا ہماری صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے غیر ملکیوں سے روپیہ پانے والوں کا پرچار ہو۔ یا پورتوگیز یا فرانسیسیوں کے ذریعے کسی بہانے سے ہندستان کی سرزمین کے کسی حصے پر قائم رہنے والا قبضہ ہو۔ یہ ان بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔ جن سے کسی قوم کو محروم نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ انھوں نے صاف صاف وعدہ کیا ہے۔ اگر برطانوی لوگ ہندستان خالی کر دیں تو پورتوگیز حکام کا یہ دعویٰ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے کہ گوا ان کے ہزاروں میل دور پر بسے ہوئے ملک کا حصہ ہے۔ میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس زبردست ناانصافی اور توہین کا بھانڈہ پھوڑ دیا جس کے شکار ہمارے گوا کے بھائی تھے۔ میں اپنے گوا کے ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی حصول اختیارات کی جنگ میں ہماری پوری ہمدردی ان کے ساتھ ہے اور آزاد ہندستان خارجی حکومت کے ماتحت ان کی غلامی کو ہرگز برداشت

نہ کرے گا میں پورتوگیز حکام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس چیز کا دعویٰ کر کے جو ایمانداری سے ان کی نہیں ہے الجھی ہوئی بین الاقوامی صورتِ حالات کو اور نہ الجھائیں اور اب تک ہونے والی غلطی کو دور کر کے دونوں قوموں کے درمیان دوستی کی ایک مضبوط بنیاد ڈالیں۔ سامراجیت کے دن لد گئے اور آج جب طاقتور قومیں بھی اپنی سلطنتیں ختم کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں چھوٹی قوموں کو خود اپنے ہی محاذ میں اپنی سلطنتوں سے دست بردار ہو جانا چاہئے اور اس طرح قوموں کے درمیان جنگ کی اصلی وجہ کو ختم کر دینا چاہئے۔

جنوبی افریقہ میں ہمارے برادران وطن کی حیثیت کا سوال یکا یک ایک عالمگیر اہمیت کا مسئلہ بن گیا ہے اور ''یو۔این۔او'' کے روبرو ہندستانی ڈیلی گیشن نے اس کو قابلیت سے پیش کیا ہے۔ فیلڈ مارشل اسمٹس نے یہ غلط اعتراض کیا کہ یہ مسئلہ گھریلو ہے۔ اس لیے ''یو۔این۔او'' میں سماعت کے لائق نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس اعتراض کو انجمن مذکور نے مسترد کر دیا۔ یہ اس امر کا خیال کرنا مناسب ہے کہ یہ طویل لڑائی اس لیے ممکن ہوئی ہے کہ ہمارے برادرانِ وطن نے تاریخ میں پہلی مرتبہ سونے اور ہیرے کی اس سرزمین پر ستیہ گرہ کا حیرت انگیز حربہ استعمال کیا ہے۔ اس مسئلہ کا اختتام ہم نے نہیں دیکھا ہے اور شاید کچھ مزید دنوں تک نہیں دیکھیں گے لیکن یہ دیکھنا کافی ہے کہ ہمارے برادران وطن عدم تشدد کی اس جنگ کو جاری رکھے ہوئے ہیں جس میں تمام حصوں اور جماعتوں کے مرد اور عورتیں شریک ہیں یہ لڑائی روٹی اور مکھن کے لیے نہیں ہے بلکہ قومی خودداری اور عزت کے لیے لڑائی ہے جو روٹی اور مکھن سے زیادہ دقیع ہے۔ آپ کی طرف سے میں اپنے برادران وطن سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی اس باعزت جنگ میں پورا ہندستان ان کی پشت پر ہے ضمنی طور پر میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت دنیا کی تمام رنگدار اور محکوم قوموں کی نگاہیں اس جدوجہد کی

طرف لگی ہوئی ہیں۔

جنوبی افریقہ کی جدوجہد سے کینیا اور ٹنگانیکا کی جدوجہد بھی پوری مشابہت رکھتی ہے ان علاقوں میں جنوبی افریقہ کی بہ نسبت سیاہ فام لوگوں کی پوزیشن اور بھی نا قابل برداشت ہے اگر بہت سے مسائل پر اس تبصرہ میں جگہ ہوتو میں اس رومان پر بھی روشنی ڈالتا کہ ہمارے برادران وطن یورپین لوگوں سے پہلے کس کس طرح پوربی ساحل کے ذریعے پرامن طریقہ پر افریقہ میں داخل ہوئے تھے اس سلسلہ میں آپ کی توجہ صرف ان کاغذات کی طرف مبذول کرتے ہیں جو ''ایسٹ افریقہ انڈین ڈیلی گیشن'' نے پیش کیے ہیں۔ آپ کے نام پر میں جنوبی افریقہ کی طرح پوربی افریقہ کے برادران وطن کو ہندستان کی تائید وامداد کا یقین دلاتا ہوں اور ان کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔

سیلون اور برما دونوں ہی ہمارے پڑوسی ہیں۔ سیلون کو ہندستان سے پانی کی ایک چھوٹی سی پٹی ہی جدا کرتی ہے۔ برما کی طرح یہاں بھی بدھ مذہب ہندستان سے گیا تھا۔ سیلون ہندستان سے جغرافیائی، تمدنی اور روایاتی طریقہ پر متحد ہے اور اسے آسانی سے اپنی مادر وطن کہہ سکتا ہے۔ سیلون کا اتری حصہ جتنا ہندستان سے بالکل مختلف نہیں ہے بدقسمتی سے یہاں کچھ دنوں سے ایک تحریک ہندستانی مزدوروں کو شہری حقوق سے محروم کرنے کے لیے اس بنیاد پر کی گئی ہے کہ وہ لوگ خود کو ہندستانی قوم سے وابستہ رکھتے ہوئے شہری حقوق کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ دکھنی افریقہ کی طرح ہی پہلے یہاں بھی ہندستانی مزدور سیلون کی اقتصادیات درست کرنے کے لیے لالچ دے کر بلائے گئے تھے۔ سیلون اور ہندستان ہمیشہ عمدہ پڑوسی رہے ہیں اور کانگریس نے طے کیا ہے کہ وہ ان تعلقات کو بڑھائے گی مارچ 1946ء میں کانگریس نے سری آر بیانائکم اور مسٹر جی رام چندرن کو بھیجا تھا کہ وہ سیلون کے وزراء

سے مل کر ہندستانی مزدوروں کے پیچیدہ مسئلہ پر گفت وشنید کریں۔ وہ کچھ اختلافات دور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے پنڈت نہرو اور سری راجگو پال آچاریہ کو بھیجنا طے کیا گیا تھا۔ لیکن اپنی موجودہ مصروفیتوں کی بنا پر یہ لوگ نہ جا سکے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس مسئلہ کا پرامن حل ناممکن ہے سیلون اور ہندستان کی قسمت ایک ہے۔ ہندستان سے علیحدہ ہو کر سامراجیوں کے عالمگیر تنازعوں میں نگل لیے جانے کا خطرہ رہے گا۔

نسلی اور تاریخی طور پر برما ہندستان کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن مشترکہ غلامی اور بیرونی قبضہ سے آزادی کی مشترکہ جدوجہد کی وجہ سے دونوں کے درمیان ایک روحانی تعلق ہو گیا ہے۔ گذشتہ جنگ کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ آزاد ممالک کی طرح رہنے کے لیے دونوں کے لیے ایک دوسرے کی کتنی زبردست اہمیت ہے۔ برمی اقتصادیات کی ترقی میں ہندستانیوں نے نمایاں پارٹ ادا کیا ہے۔ انھوں نے وہاں ڈھیروں مال روپیہ جمع کر دیا ہے۔ انھیں برمیوں کو یہ بتانا چاہئے کہ وہ ان کو (برمیوں کو) کو نقصان پہنچا کر منافع نہیں کھانا چاہتے اور ان کی کارروائیاں برمی مفاد کے خلاف نہیں ہیں۔ ہم خود لٹے ہوئے ہیں ہم کو اپنے سر پر دوسروں کو لوٹنے کا الزام نہ لینا چاہئے۔ برما کے ہندستانیوں کو برمیوں کے ساتھ شیر وشکر ہو جانا چاہئے۔ ہندستان، برما اور سیلون اپنے دوستانہ تعلقات کو مضبوط کر کے ایسی پوزیشن میں ہو جائیں گے کہ سامراجیت اور لوٹ کے خلاف خواہ وہ پوربی ڈھنگ کی ہو یا پچھمی ڈھنگ کی مورچہ جمانے کے لیے ایشیائی طاقتوں کا ایک فیڈریشن بنالیں۔

ہماری تنظیم

ہمیں صاف صاف یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کانگریس کیا ہے؟ ہم آج کانگریسی

حکومتوں کے متعلق گفتگو سنتے ہیں۔ یہ ایک گمراہ کن اصطلاح ہے۔ کہی جانے والی کانگریسی حکومتیں دراصل مقبول عام جمہوری حکومتیں ہیں۔ کانگریس نے صرف ہندستان کو ان حکومتوں کے قائم کرنے اور آسانی کے ساتھ چلانے کے لیے تیار کیا ہے۔ آج کانگریس نے ہندستان کو اپنا راج سنبھالنے کے لائق بنا دیا ہے۔ کئی سالوں تک کانگریس نے ہمارے ہم وطنوں کو برطانوی حکام کی آمری حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے منظم کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جمہوری حکومت کے قیام کی تنظیم کی بجائے کانگریس کو پھر تن تنہا جنگ آزادی کی تنظیم کرنی پڑے۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ایسا نہ ہوگا۔ لیکن میں آپ کو جو بات بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کانگریس ہندستانیوں کی تنظیم کی اور مؤثر قومی خدمت کی صرف ایجنسی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس قومی خدمت کی شکل بھی بدل سکتی ہے۔

اس طرح پر کانگریس ایک جمہوری جماعت ہے جو ہندستان کی نمائندگی اور ہندستان کے رہنے والوں کی طرف سے کام کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سیواؤں اور قربانیوں کے ذریعہ اور مصیبت اٹھا کر ایسا کیا ہے اور طرح تو یہ ہو بھی نہیں سکتا کیوں کہ اسے ایک بدیسی سامراج کو جس نے دیس کو کچل ڈالا ہے اور نامرد بنا دیا ہے طاقت کی جگہ سے ہٹانا ہے۔ ہمیں یہ بات صاف صاف سمجھ لینا چاہیے کہ کانگریس حکومت نہیں ہے بلکہ ایک والنٹیر جماعت ہے یہی اس کی طاقت اور یہی اس کی کمزوری ہے۔ ایک والنٹیر جماعت کو ریاست کی مادی طاقت حاصل نہیں ہوتی۔ اپنے نظام یا اپنے حکموں کی پابندی کرانے کے لیے اسے مجسٹریٹ، کانسٹبل یا سپاہی کا سہارا نہیں لینا ہوتا بلکہ وہ اپنے ممبروں کی ارادی وفاداری پر ہی کام کرتی ہے۔ اس کی طاقت اخلاقی ہوتی ہے۔ مادی یا جبریہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کانگریس یہی کر سکتی ہے کہ کسی ممبر کو اپنی جماعت سے نکال دے۔

اس لیے ایسی جماعت کے قائم رہنے اور موثر طریقہ پر کام کرنے کی پہلی شرط ایکتا ہے جو کسی ڈکٹیٹر یا نوکرشاہی کے ذریعہ اوپر سے نہیں تھوپی جاسکتی۔ یہ تو اسی صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے کہ یہ سیکھ لیں کہ جانتے بوجھتے ذاتی اور پارٹی کے خیالوں کو تمام جماعت کے بڑے فائدہ کے ماتحت رکھنا ہے انھیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ بڑے میں چھوٹا شامل ہے۔ ہندستان جیسے ملک میں یہ اور بھی ضروری ہے جہاں ذات، پات، فرقہ، طبقہ اور تنگ جغرافیائی حدود کی پارٹی بندی صدیوں سے لعنت رہی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کانگریس میں اختلاف رائے نہ ہو یا پارٹی یا گروہ کا وجود نہ رہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ مختلف جتھوں اور پارٹیوں کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ایک مجموعی واحد سے ہیں۔ ایک شخص جب تک کل کی جانب سچا نہ ہو جزو کی جانب سچا نہیں ہوسکتا۔ اس بارے میں ہم انگلستان سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اپنے ملک کے ساتھ ایک انگریز کی جو وفاداری ہوتی ہے وہ تمام خاندانی، مقامی اور پارٹی کی وفاداریوں سے بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے۔

یہ ایسے ہوسکتا ہے کہ ہم ان باتوں پر زور دینے کے بجائے جو ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں ان باتوں پر زور دیں جو ہمیں ایک کرتی ہیں۔ یہ کام مشکل نہیں ہے کیوں کہ اقلیت میں کانگریس کے اندر مختلف جتھوں میں اتفاق کے مسئلے اختلاف کے مسئلوں سے کہیں زیادہ اور کہیں اہم ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو اتنا اٹھادیں کہ وہ اصولوں کی برادرانہ بلندیاں معلوم ہونے لگیں۔ ہمیں ذاتی رابطے بھی پیدا کرنے چاہئیں کیوں کہ اکثر مرد اور عورت اپنے ذاتی خیالوں اور آدرشوں سے زیادہ اونچے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کسی جتھے کو یوں کام نہ کرنا چاہئے جیسے کسی باعزت پڑوس میں شراب کی دکان ہوتی ہے جو خاندان کے اکتائے ہوئے نراس اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

کانگریس کے ٹھیک اور موثر طرح پر کام کرنے کی دوسری شرط ضابطہ کی پابندی ہے جسے اپنے اوپر آپ عائد کرنا ہے۔ ہمیں ایسی روایتیں ورواج بنانے چاہئیں جن سے ضابطہ توڑنا مشکل ہوجائے ۔ جو آدمی ایسا رویہ اختیار کرے جس سے اس جماعت کو یا ملک کو نقصان پہنچنے والا ہو اسے کانگریس میں اچھوت بنادینا چاہئے۔ کچھ کام ایسے ہونے چاہئیں جنھیں کانگریس میں کوئی کر ہی نہ سکے۔ جو کبھی نہ کیے جائیں نہ طاقت کے لیے چیخ و پکار ہونا چاہئے نہ جماعت پر قبضہ کرنے کے لیے۔ طاقت خدمت سے نکلنی چاہئے اور اسے اور زیادہ خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہئے۔ کانگریس کی جماعت حکومت نہیں ہے ہم اس میں سے اتنا ہی پاسکتے ہیں جتنا لوگوں کی سیوا کر کے ہم اس میں داخل کریں۔ جیسا گاندھی جی کرتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کی محبت میں اپنا سب سے بڑا انعام اور اپنی سب سے بڑی تکمیل محسوس کرنی چاہئے۔

بدیسی سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد میں ہم نے اپنی آزادی کی منزل حاصل کرنے کے لیے مقابلہ اور سرگرمیوں کے کچھ طریقے سیکھے ہیں اور استعمال کیے ہیں۔ چونکہ پہلے ہمیں ان طریقوں کا پھل ملا ہے۔ اس لیے ہم یہ ماننے پر آمادہ ہوسکتے ہیں کہ یہ عام استعمال کے ہیں۔ ہم یہ تصور کر لیتے ہیں کہ وہ اس جمہوری طور پر قائم ہوئی حکومت کے خلاف بھی ہمارے کام آسکتے ہیں۔ جسے ہم نے خود گدی پر بٹھایا ہے۔ ہم نے تو ان لوگوں کو وہاں اس لیے بھیجا ہے کہ آزادی کے مقصد کو ترقی دیں۔ اس لیے جو طریقے ہم نے بدیسی حکومت کے خلاف جدوجہد میں استعمال کیے تھے وہ ہماری اپنی حکومت کے لیے بالکل موزوں نہیں ہیں۔ بدیسی حکومت تو ہمیں اپنی پالیسی کے چلانے میں تو کیا، اثر ڈالنے کے طریقے بھی حاصل نہیں ہونے دیتی۔ اگر ہم کوئی تعمیری تجویزیں پیش کرتے ہیں تو ان کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ ابھی کوئی جمہوری

تدبیر ہی نہ تھی جس سے ہم اس انتظامی صیغہ کو ہٹا سکیں۔ انگریز باوجودیکہ چرچل کی تعریف کرتے تھے اور اس کی جنگی خدمتوں کے قدر دان تھے اسے نکال باہر کر سکے۔ کیوں کہ صلح کے مسئلوں کے لیے انھیں زیادہ موزوں لیڈری کی ضرورت تھی لیکن یہاں ہندستان میں تو ہم ایک گاؤں کے چوکیدار کو بھی بدلنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ چاہے وہ اپنے آپ کو پبلک کے لیے وبال ہی کیوں نہ بنا لے۔ ان حالات میں صرف چیخ و پکار اور نکتہ چینی ہی ہو سکتی تھی اور یہ کام زیادہ ترنفی کے ہوتے ہیں۔ تعمیری تجویزوں کو نہ برداشت کیا جاتا تھا نہ قبول کیا جاتا تھا۔ ہم نے اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے ڈائرکٹ ایکشن (براہ راست عمل) بھی کیا۔ لیکن آج جب کہ ہم اسمبلی اور کونسل کے ممبروں اور وزیروں کو بدل سکتے ہیں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں تو اب نکتہ چینیوں میں احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ صوبوں میں اور مرکز میں ہمارے وزیروں کو اتنے سیاسی اور انتظامی مسئلوں سے سابقہ پڑ رہا ہے کہ وہ ہماری نیک فہمی اور ہمدردی کے مستحق ہیں اور قوم یہ چاہتی ہے کہ بہت سی باتیں جلدی جلدی ہو جائیں۔ ہم اتنی مدت سے اور اتنی شدت سے آزادی کی چاہ کرتے رہے ہیں کہ ہمیں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ آزادی کے آتے ہی ہمارے تمام مسئلے حل ہو جائیں گے اس لیے اس کا بہت امکان ہے کہ ہم بے صبر ہو جائیں اور ان دشواریوں کو نظر انداز کر دیں جن سے ہمارے نمائندے ایک ایسی حکومت میں دوچار ہیں جس میں خدمت کی کوئی روایت نہیں ہے اور جس کے افسروں نے ہمیشہ لوگوں کے مال کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ اس ابتدائی منزل پر قومی حکومت کا کام اس وجہ سے اور بھی مشکل ہو گیا ہے کہ دیسی اور بدیسی، سرکاری اور غیر سرکاری مخصوص مفاد ریشہ دوانیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہماری نکتہ چینی تعمیری اور ہمدردانہ ہونی چاہیے۔ محض تخریبی کبھی نہ ہونی چاہیے۔ ہمیں اس گڑبڑ میں جو ہمارے نمائندوں کو سرکاری ترکے

میں ملی ہے ذرا سانس لینے کی مہلت دینی چاہیے۔

بدیسیوں کے خلاف تو ہم اس دعوے میں حق بہ جانب تھے کہ صرف ہمیں محب وطن ہیں۔ لیکن اپنے ایسے آزمائے ہوئے اور بھروسے کے لیڈروں کے مقابلے میں جنھوں نے کم از کم اتنی ہی قربانیاں اور مصیبتیں برداشت کر کے اپنی سند حاصل کی ہے جتنی ہم نے اپنے ملک کے لیے کی ہے ایسا دعویٰ کھوکھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ طاقت دیس بھگتوں اور عوام کے خادموں کو بھی خراب کر دیتی ہے لیکن اس خطرے سے تو کبھی بچا ہی نہیں جا سکتا۔ آج کل کے پیچیدہ سماج میں انتظامیہ صیغے کو اپنے بوجھل فرض ادا کرنے کے لیے کافی اختیارات ہونے چاہئیں۔ طوطے کی طرح انیسویں صدی کے لبرلوں کا یہ نعرہ دہراتے رہنے سے کام نہ چلے گا کہ بہترین حکومت وہ ہے جو کم سے کم حکمرانی کرے۔ آج تو سماج کو ایسے لوگوں اور ایسی جماعتوں کے کاموں سے بچائے رکھنا ہے۔ جو لطیف قانونی طریقوں سے اسے لوٹنا کھسوٹنا چاہتے ہیں۔ ریاست کا فرض ہے کہ شہریوں کے حقوق کو ایسے لوگوں اور جماعتوں سے محفوظ رکھے۔ اس لیے اسے اپنے ذمہ ایسے کام لینے پڑیں گے جنھیں کوئی پرانا حکمران ممکن ہی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے اگر قومی انتظامیہ جماعت کو اپنے فرض اچھی طرح صلاحیت کے ساتھ ادا کرنے ہیں تو ان کو ضروری اختیارات ہونے چاہئیں۔ آج جمہوریتوں میں بھی انتظامیہ جماعت کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہیں کہ (انگلستان کے بادشاہ) چارلس اوّل کو بھی اپنے لیے ان کے دعویٰ کرنے کی کبھی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے سرکاری اختیارات کا واحد علاج مسلسل بیداری ہے اور یہ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ عام اور سیاسی علم کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ اسی اثناء میں جو ذریعے ہم نے قائم کیے ہیں ان سے اپنی تجویزیں قومی انتظامیہ صیغہ تک پہنچاتے رہنا چاہیے، کوئی ایسی بات کہنا یا کرنا نہ چاہیے جسے ہمارے دشمن حکومت میں ہمارے نمائندوں کی ساکھ بگاڑنے

کے لیے استعمال کر سکیں۔ یہ تو نکتہ چینی کرنے والوں کے لیے کیا گیا۔ لیکن جو لوگ حکومت کر رہے ہیں انھیں بھی یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ لوگوں کے سیوک ہیں مالک نہیں۔ انھیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس سیڑھی سے وہ اپنی موجودہ بلندی تک پہنچے ہیں۔ اسے وہ ٹھکرا نہیں سکتے اس لیے انھیں ہمیشہ کانگریس کا اور کانگریس کے ذریعہ ہندستان والوں کا وفادار رہنا چاہئے۔ ان سے ہی انھوں نے طاقت حاصل کی ہے اور انھیں کی جانب پہلی اور سب سے بڑی ذمہ داری ہے انھیں یہ بھی دیکھتے رہنا ہے کہ کہیں نوکر شاہی مشین انھیں ہڑپ نہ کر جائے۔ انھیں چاہئے کہ اس مشین کی اصلاح کریں اور اسے سیدھا سادہ بنائیں۔ کاغذوں ہی میں نہ پھنسے رہنا چاہئے اور اپنے فرض عامہ کے ساتھ ساتھ پبلک کی پہنچ کے اندر ہونا چاہئے۔ انھیں اس دکھاوے کے ٹھاٹ باٹ کا بھی بہت کچھ خاتمہ کر دینا چاہئے جسے ایک بدیسی حکومت نے اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے ضروری سمجھا تھا۔ ان کا وقار تو خدمت سے ہے اور اس اپنے اوپر عائد کی ہوئی غریبی سے ہے جو انھوں نے اس وقت اپنائی تھی جب تک عہدے ان کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔

اکثر اس بات کی شکایت کی جاتی ہے کہ کانگریس کا آئین ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اب وہ ٹھیک ٹھیک کام نہیں کرتا۔ کانگریسی نظام اس آئین کے لیے بہت بڑا اور پیچیدہ ہو گیا ہے اس لیے اس میں ادل بدل کرنے کی مانگ ہے اسی لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے کہ وہ ضروری تبدیلیوں کی سفارش کرے۔ اس کمیٹی کی بہت سی بیٹھکیں ہو چکی ہیں اور اس نے کئی سفارشیں کی ہیں۔ اگر ورکنگ کمیٹی اور سبجیکٹ کمیٹی نے انھیں منظور کر لیا تو آپ کی منظوری کے لیے پیش کی جائیں گی، اگر کسی وجہ سے ان تبدیلیوں کو فوراً منظور کرنا ممکن نہ ہو تو آئینی کمیٹی نے کچھ عارضی تبدیلیوں کی سفارش کی ہے۔ جو ہمارے چناؤ کے ضابطے کے متعلق ہیں تا کہ ہمارے

چناؤ میں گڑ بڑ، عہدوں کے لیے چیخ و پکار اور تشدد نہ ہو لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ باہر کی پابندیاں مؤثر نہیں ہو سکتیں جب تک ہم نیکیوں کو نہ اپنائیں۔ پچھلی لڑائی نے تمام آدرشوں کا ستیاناس کر دیا ہے اور اوسط شہری کو سنکی بنا دیا ہے۔ ہر جگہ چور بازار کے طریقے جاری ہو گئے ہیں۔ یہ طریقے کانگریس کے چناؤ میں بھی استعمال ہوتے ہیں ووٹروں پر دباؤ ڈالنے کے لیے رشوت جعلسازی، فرضی شخصیت اور بعض اوقات تشدد کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ووٹ کے بکس چرا لئے جاتے ہیں یا تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ سب ذلت کی باتیں ہیں۔ ان سے نہ صرف ہمارے تمام جذبات بلکہ اخلاقی اصولوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ یہ اچنبھے کی بات ہے کہ ہم بدیسی سامراج کے مقابلے میں تو اہنسا سے کام لیں اور آپس میں ہنسا کا بیوپار کریں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری اہنسا کمزوروں کی ہے طاقتوروں کی نہیں۔ کمزور اور اہنسا تمک ہونے سے طاقتور اور ہنسا تمک ہونا اچھا ہے۔

ہم موجودہ نسل والوں کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ایک اعلیٰ مقصد کے آلہ کار بننے کا موقع ملا ہے صرف اسی لیے کوشش اور کام نہیں کرنا ہے کہ ہمارے آدمی بدیسی بوجھ سے آزاد ہوں ایسے مواقع تو تاریخ میں بہت سے لوگوں کو پیش آ چکے ہیں۔ ہمیں تو ایک بے مثل موقع ملا ہے کہ سچائی اور اہنسا کے طریقوں سے آزادی حاصل کریں اور سچے مقصدوں کے لیے اخلاقی طریقوں سے کوشش کریں ہمارے لیے یہ موقع ہے کہ مختلف ذاتوں اور مسلکوں اور نسلی و مذہبی طبقوں میں ایکتا پیدا کریں۔ ہمیں یہ موقع حاصل ہے کہ جو تمدن ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد معلوم ہوتے ہیں ان میں ایکتا پیدا کریں۔ ہمیں کثرت میں وحدت پیدا کرنا ہے اور ایک رنگا رنگ گلدستہ بنانا ہے۔ ہمیں مختلف سروں کو جو ایک دوسرے سے کسنرے بولتے ہیں یکجا کرنا ہے تاکہ وہ ساز تیار ہو جو کبھی زمین پر یا سمندر میں سنا ہی نہیں گیا۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آج

انسانیت کو اپنی اخلاقی اقتصادی سیاسی اور نسلی جھگڑوں کا پرامن حل تلاش کرنا ہے یا تباہ ہو جانا ہے۔تشدد کے ذریعہ کوئی حل نہیں ہوسکتا۔تشدد اپنی انتہا کو پہنچ چکا وہ تو مرض اور مریض دونوں کو ختم کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ کچھ اور طریقے معلوم کرنے چاہئیں۔ ہندستان نے وہ طریقہ معلوم کرلیا ہے اور اسے مفید مقصد کے لیے استعمال کیا ہے اور اسے ایسی رہنمائی ملی ہے جو کہیں صدیوں میں ایک بار حاصل ہوتی ہے یہ ایک نیا طریقہ ہے غلطیاں ہوتی رہی ہیں لیکن یاد رکھو کہ تاریخ میں کوئی انقلاب جان و مال کے اتنے کم نقصان عام زندگی کی اتنی کم گڑبڑ کے ساتھ نہیں ہوا نہ اتنی کم نفرت اور مار دھاڑ ہوئی ہے جتنی ہمارے ہندستانی انقلاب میں جو کہ (اگر ہم غفلت سے کام نہ لیں) کامیابی کی حد تک پہنچ گیا۔ لیکن چاہے ہماری کوششوں میں فوری کامیابی ہو یا نہ ہو ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم ایک بڑے اور اچھے مقصد میں لگے ہیں ایسے مقصد میں بالآخر کوئی ہار نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو خود کارکنوں کو اچھا اور بڑا ہونا چاہیے غلامی نہ تو نیکی کے لیے کام کرتی ہے نہ برائی کے لیے لیکن اُجالا آتے ہی صدیوں کا اندھیرا دور کیا جاسکتا ہے۔ ہندستان میں روشنی آچکی ہے ہمیں اسے روشن رکھنا اور اس کی رہنمائی میں چلنا ہے اور ہمارا اب بھی بھلا ہی ہوگا۔

بندے ماترم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

تحریک خلافت

منصف
قاضی محمد عدیل عبّاسی
صفحات: 277
قیمت:-/65 روپے

جان کمپنی سے جمہوریہ تک

منصف
مشیرالحسن
صفحات: 345
قیمت:-/114 روپے

تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند (جلد اوّل)

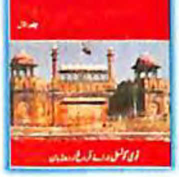

مصنف
ڈاکٹر تاراچند
صفحات: 496
قیمت:-/103 روپے

تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند (جلد دوم)

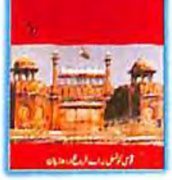

مصنف
ڈاکٹر تاراچند
صفحات: 499
قیمت:-/163 روپے

تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند (جلد سوم)

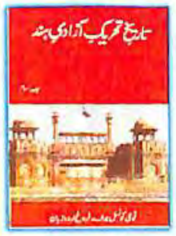

مصنف
ڈاکٹر تاراچند
صفحات: 762
قیمت:-/170 روپے

تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند (جلد چہارم)

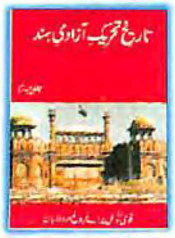

مصنف
ڈاکٹر تاراچند
صفحات: 963
قیمت:-/358 روپے

ISBN: 81-7587-093-1
कौमी काउन्सिल बराए फरोग-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066